انوار الایقان

ابوالفارق واسطی

انوار الایقان

تصنیف ——————— ابوالفارق واسطی (مرحوم)

کتابت ——————— لعل حسن

سرورق ——————— اقتدار۔ تہذیب

چہارم ——————— تعداد پانچ سو

سن اشاعت ——————— ۱۹۹۲ء مطابق ۱۴۰۸ھ

مطبوعہ ——————— مشہور آفسٹ پریس کراچی

باھتمام ——————— سید اینڈ سید کراچی

قیمت ———————

ملنے کا پتہ

(۱) فضل ربی فاؤنڈیشن ۲۸۔ بی۔ بلاک ۱۱، فیڈرل بی ایریا، کراچی

فون: ۶۸۲۸۱۱

(۲) ۱۵۔ ایف بلاک ۲۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کراچی

فون: ۴۳۱۷۶۷-۴۴۱۸۴۸۲-۲۰۵۰۳۷

مضامین

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

حرفِ اوّل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَنۡبِیَآءِ وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ الطَّاھِرِیۡنَ وَاَصۡحَابِہٖ الصَّالِحِیۡنَ ○

امابعد خدمتِ برادرانِ اسلامی میں عرض ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ مذہب کے خلاف جیسا منظم پروپیگنڈا موجودہ صدی میں ہو رہا ہے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ضرورت تو اس کی تھی کہ تمام اہلِ مذاہب متفق ہو کر لادینی اور دہریت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرتے مگر بجائے اس کے وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں سب سے زیادہ ذمہ داری اہلِ اسلام پر عائد ہوتی ہے۔ تمام فرقِ اسلامیہ پر لازم تھا کہ وہ اپنے اندرونی اختلافاتِ فروعی نظرانداز کر کے مخالف اسلام مشنوں کے مقابل متحد ہو کر مسلمانوں کو ان کے زہریلے اثرات سے بچانے کی کوشش کرتے مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ تمام فرقِ اسلامی ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں اور بیرونی حملوں سے اسلام کو بچانے کی طرف سے بالکل غافل ہیں۔

پاکستان تو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ جنابِ رب العزت نے ہمیں یہ نعمت اسی لئے عطا فرمائی ہے کہ ہم خود احکام اسلام پر عمل کریں اور اس کی توسیع اشاعت پر دامے درمے قدمے سخنے کوشاں رہیں مگر یہاں تو یہ شان نظر آ رہی ہے کہ ایک طرف عیسائی مشن ہر سال مسلمانوں کی ایک جمعیت کو اپنے میں جذب کرتا رہتا ہے حالانکہ ان کے پاس الہامی کتاب بھی موجود نہیں اصل کتاب کا تو ذکر ہی کیا ان کے پاس تو ڈیڑھ دو سو سال پہلے کے تراجم بھی موجود نہیں۔ اور اگر

ہیں بھی تو منظر عام پر نہیں لائے جاتے یہ اس لئے کہ ان میں بہت کچھ تحریف کی جا چکی ہے اور مروّجہ عیسائیت سائنسی مذہب بھی نہیں۔ وہ عقل و فطرت کی کسوٹی پر پرکھا جانے کے قابل نہیں۔ دوسری طرف بہائی اور قادیانی مشن مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں مصروف ہیں اور ہر سال متعدد افراد کو اسلام سے برگشتہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمارے اسلامی ملک میں ہو رہا ہے۔

اسلام کے خلاف سب سے زیادہ مُضر دہریت کا پروپیگنڈا ہے۔ جب کوئی دہریت کا پروپیگنڈا کرنے والا ہمارے علمائے کرام کے سامنے قرآن و رسول ملک العلّام و انبیاء کرام علیہم السّلام کے متعلق کوئی اعتراض پیش کرتا ہے تو یہ حضرات اس کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ جب دہریت کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو جانے والے کسی نوجوان کا سرپرست علمائے اسلام کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ حضور میرے حال پر رحم فرما کر اس بچے کو حق کی طرف ہدایت فرمائیں تو اس نوجوان کے دو ایک اعتراض سُن کر فرماتے ہیں کہ اس کا تو قلب ہی سیاہ ہو گیا ہے اب تو اس کو خدا ہی ہدایت کرے تو ہو سکتی ہے۔ یہ تو ایسی باتیں کرتا ہے جس کا ہمیں سُننا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ ایسے جوابات سُن کر یہ معترضین مذہب سے بالکل متنفر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو اپنا ہم خیال بنائیں تاکہ ان کی جماعت میں اضافہ ہو رہا ہے اس وقت تعلیم یافتہ طبقہ میں تقریباً چالیس پچاس فیصد ایسے لوگ ملیں گے جو محض آبائی مذہب کی محبت یا سوسائٹی کے خوف سے مسلمانوں میں شامل ہیں اور دہریت کا اظہار کرنے سے باز رہتے ہیں ورنہ ان کے قلوب میں مذہب کی قدر و وقعت کا احساس موجود نہیں اور ایسے افراد قوم و ملک و ملّت کے لیے مارِ آستین بن جاتے ہیں۔ اگر آٹھ دس سال اور یہی حال رہا تو اندیشہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں سچے مُسلمان تقریباً نا پید ہو جائیں گے۔ جب ایسے مسلمان نما دہریوں کی کثرت ہو جائیگی تو کیا پاکستان کُفرستان نہ ہو جائے گا؟

کسی تحریک کو طاقت کے زور سے نہیں دبایا جا سکتا۔ دُنیا کی تاریخ بتا رہی ہے کہ جب کسی تحریک کو مادّی طاقت سے دبانے کی کوشش کی گئی تو وہ (UNDERGROUND) زیرِ زمین چلی گئی اور خُفیہ طریقہ پر اس کا پرچار ہوتا رہا۔ یہاں بھی دہریت کی تحریک خفیہ طور پر پھیلائی جا رہی ہے۔ پروپیگنڈا کرنے والے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ وہ ایک ایک نوجوان سے

تنہائی میں بات چیت کرتے رہتے ہیں۔ گھروں میں عورتوں، بچّوں کے سامنے مذہب کے خلاف زہر اُگلتے رہتے ہیں۔ اَب وہ بچّے جو اس فضا میں تربیت پا رہے ہیں اور ان کے ذہنوں میں مذہب کے خلاف نفرت کا زہر بھرا جا رہا ہے جوان ہو کر کیا اسلام کے دشمن نہ ہوں گے؟

تمام ادیانِ عالم میں صرف اسلام ہی دینِ فطرت ہے اور اللہ کی فطرت ہی حق ہے، پھر کیا سبب ہے کہ ہمارے علماء کرام دہریت کے خلاف اس دینِ مقدس کی حفاظت کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں اور مسلمانوں کو عیسائیت، بہائیت اور دہریت کی طرف راغب ہونے سے نہیں روک سکتے اس عجز کے بہت سے اسباب ہیں جن کے منجملہ چند حسبِ ذیل اسباب نہایت اہم ہیں:

① حکماء یونان میں حکیم بطلیموس نے جو حضرت عیسٰیؑ سے ڈیڑھ سو سال قبل تھا نظامِ عالم کا یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ ہماری زمین ساکن ہے اور نظامِ عالم کا مرکز ہے۔ اس کے اوپر فلکِ قمر محیط ہے۔ اس میں صرف ایک چاند ہے۔ اس کے اوپر فلکِ عطارد محیط ہے۔ اس پر فلکِ زہرہ ہے، پھر فلکِ شمس ہے، پھر فلکِ مریخ ہے، پھر فلکِ مشتری، پھر فلکِ زحل ہے۔ اور ہر ایک نیچے کا آسمان اوپر کے آسمان سے گھرا ہوا ہے۔ فلکِ زحل کو آٹھواں آسمان محیط ہے جس میں تمام ثوابت و سیارے ہیں۔ یہی فلک البروج ہے اور اس فلکِ ثوابت پر نواں آسمان محیط ہے۔ یہ نواں آسمان فلک الافلاک ہے جو تمام ثوابت و سیاروں اور بروج وغیرہ اور اپنے اندر کے تمام آسمانوں سمیت ہماری زمین کے گرد ایک دن رات میں ایک گردش کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

آسمانوں کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ شفّاف و سخت و صُلب اجسام ہیں جو پھٹنے اور پھر جُڑ جانے کے قابل نہیں۔ ناقابلِ خرق و التیام ہیں۔ غرض نظامِ عالم کا یہ نظریہ تمام اہلِ عرب کے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا۔ بعض فلاسفروں نے اس نظریہ کی تردید بھی کی اور حکیم فیثاغورث یونانی کی ہیئت کی تائید کی جو نو سو پچاس برس قبل مسیح پیدا ہوا تھا جس کا نظریہ تھا کہ اس نظامِ شمسی کا مرکز آفتاب ہے جس کے گرد ہماری زمین اور سبعہ سیارہ گردش کرتے ہیں۔ اور زمین ایک شب و روز میں اپنے محور کے گرد گھومتی ہے جس سے اس کے دن رات ہوتے ہیں۔

اَب فلاسفرانِ یورپ میں سے سب سے پہلے کوپرنیک پیرسی متوفی ۱۵۴۳ء نے قاطع براہین سے ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد حرکت کرتی ہے۔ اس کے اپنے مدار پر ایک چکّر کرنے سے ایک

سال پورا ہوتا ہے اور اپنے محور کے گرد ایک شب و روز میں گھومتی ہے اور یہ سبعہ سیارے بھی سورج کے گرد اپنے اپنے مدار پر حرکت کرتے ہیں۔ اب عالم اسلام کا حال دیکھیں کہ دوسری تیسری چوتھی صدی ہجری میں دنیا کی کثیر آبادی کی طرح تمام عالم اسلام کے ذہنوں پر نظام بطلیموسی چھایا ہوا تھا اور اسی زمانہ میں علماء سلف تصنیف و تالیف کتب مذہبی میں مصروف رہے۔ علم کلام اور فلسفہ کے تمام مباحث اسی زمانے میں شائع ہوئے۔ لہٰذا تمام علماء سلف آیات قرآنی اور احادیث رسول ؐ یزدانی کو اسی نظام پر منطبق کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔ اگر کوئی حدیث یا آیت ان کے تخیل ذہنی کے خلاف نظر آئی تو اس کی تاویل کر کے اپنے تخیل ذہنی سے تطابق کر لیا اور یہی نظریہ آج تک ہمارے اکثر علماء کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ اسی کو وہ عین دین اور اصل اسلام سمجھے بیٹھے ہیں اس لئے کہ علماء سلف کے مسلمات کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ وہ تو ان کے خیال میں کفر کے مترادف ہے۔

(۲) کچھ یہودی اور نصرانی اہل علم بھی مسلمان ہوئے تھے۔ عہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں نے فلسفہ اور نظام کائنات کے متعلق جب ایسے حضرات سے سوال کیے تو انھوں نے نیک نیتی سے وہی جوابات دیئے جو ان کو اپنے سابق علم کے ذریعے سے معلوم تھے۔ وہ روایات سینہ بہ سینہ چلی آتی رہیں اور تدوین کتب کے وقت تفاسیر میں نقل کر دی گئیں۔ دوسری صدی ہجری میں خلفاء بنی عباس نے قسطنطنیہ سے فلسفۂ قدیم کی کتب منگوا کر عربی میں تراجم کرائے اور تمام مملکت اسلامی میں انکی درس و تدریس ہوتی رہی۔ علماء متقدمین نے قرآن کریم اور احادیث کی تفاسیر کو بہت غور و فکر و محنت شاقہ سے فلسفہ قدیم کے نظریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے علماء متقدمین کی کسر شان ہوتی ہے ایسا خیال تو قطعاً باطل ہے۔ انہوں نے تو نہایت نیک نیتی اور خلوص سے خدمت دین میں عمریں گزار دیں۔ اعمال کی جزا تو نیت پر ہے۔ لہٰذا وہ عند اللہ ماجور ہوں گے۔

پھر یہ بھی نہیں کہ اس وقت حقائق جاننے والے موجود نہ تھے، تھے اور ضرور تھے مگر عوام کو چونکہ اپنے تخیل اور عقائد ذہنی سے محبت ہوتی ہے لہٰذا ان کے خلاف کوئی بات

سُن نہیں سکتے۔ مخالف نظریات سے نفرت کرتے ہیں بلکہ ان کے دشمن ہوجاتے ہیں۔
پس اگر وہ واقفانِ حقائق ان کا اظہار کرتے تو وہ عوام کی گمراہی اور انتشار کا باعث ہوکر فساد و تفرقہ کا سبب بن جاتا ہے نفسِ انسان کی اس فطرت کا اظہار علی کرم اللہ وجہ کے اس شعر سے ہوتا ہے ؎

وَاعرِض عَن اَخَا الجَاھِلِ وَاِیَّاکَ وَاِیَّاہُ
فَکَم مِن جَاھِلٍ اَردٰی حَکِیمًا حِینَ اٰخَاہُ

(اور اپنے نادان بھائی سے بچا رہ۔ اُس کو بھی اپنے سے بچائے رکھ،
کتنے ہی جاہل ایسے ہوئے کہ انھوں نے بھائی چارہ کرنے کے بعد بھی
حکیم بھائی کو چھرا گھونپ دیا)

اس بندۂ حقیر کو خود بھی اس کیفیت کا ایک تجربہ ہوا ہے جس کا ذکر موقع کے مُناسب ہے لہٰذا تحریر کرتا ہوں دیکھیے اکثر اشخاص کو اس کا تجربہ ہوا ہوگا کہ ریل میں سفر کرتے وقت اگر رُخ مثلاً جنوب کی جانب ہے اور یہ سمجھ رہے ہوں کہ جنوب کی جانب جا رہے ہیں اور ریلوے لائن کے خم کھانے سے رُخ جنوب مشرق کی طرف ہوگیا تو نفس کو اس کا احساس نہیں ہوتا اسی طرح موڑ کھاتے ہوئے رُخ اگر مشرق کی طرف بھی ہوجائے تو نفس کو سمت بدلنے کا احساس نہیں ہوتا پس اگر کسی ایسے مقام پر اُتریں جہاں پہلے کچھ عرصہ نہ رہے ہوں تو سمت مشرق سے جنوب کا ہی احساس ہوتا رہے گا ایسے وقت کوفت بھی ہوتی ہے اور ہر چند نفس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سمت مشرق ہے دیکھو سورج ادھر سے نکل رہا ہے مگر حضرتِ نفس یہی کہتے رہتے ہیں "نہیں نہیں یہ تو جنوب ہے"! چنانچہ سنہ ۱۹۱۳ء میں یہ حقیر ایک شہر میں اپنے ایک عزیز کے یہاں گیا۔ انھوں نے شام تک کے لیے باصرار ٹھہرا لیا۔ دوپہر کو ایک صاحب ان سے ملنے کے لیے آئے وہ مجھ سے بھی واقف تھے۔ دورانِ گفتگو کہنے لگے "بھائی عجیب بات ہے، یہاں سورج ادھر سے نکلتا ہے اور ہمارے یہاں (دوسری سمت کو اشارہ کرکے) ادھر سے نکلتا ہے بات یہ ہے کہ کہیں سورج اس طرف سے نکلتا ہے اور کہیں اس طرف سے" اور مختلف سمتوں کی طرف اشارہ کرتے رہے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ وہ بگڑ گئے کہ آپ ہنسے کیوں۔ میں نے سمجھانا چاہا کہ بھائی صاحب سورج تو تمام دنیا میں ایک ہی سمت سے نکلتا

ہے۔ یہ تو ہمارے نفس کے احساس کی غلطی ہوتی ہے کہ اپنے رُخ بدلنے کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ مگر وہ جناب غصے سے کانپنے لگے اور کہا "تو مجھے احمق سمجھتا ہے"۔ میں نے بمشکل تمام ٹالا۔ اگر میں خاموش نہ ہوا ہوتا تو فساد کی نوبت آجاتی۔ یہ تو ایک معمولی سی بات تھی، تو پھر عوام جن خیالات کو مذہبی عقائد سمجھے ہوئے ہوں اُن کے خلاف اگر کہیں حقائق کا اظہار کر دیا جاتا تو کیسا حشر برپا ہوتا؟ پس جب ہمیں اس کا بھی علم نہیں کہ ہمارے علمائے سلف نے لاعلمی سے ایسا کیا یا دفع فساد کیلئے حقائق کا اظہار نہیں کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کا دل سے احترام نہ کریں۔

(۳) قرآن کریم میں اکثر آیات متشابہ ہیں۔ ان کو محکم سمجھ لیا گیا چونکہ ان کے مفاہیم سمجھنے کے لئے مجاہدۂ نفس کی ضرورت ہے جس سے کیفیاتِ نفس کا شعور ہوتا ہے اور کلمات کے مفاہیم سمجھ میں آتے ہیں اور نفس کی تربیت ہوتی ہے جبکہ نا تربیت یافتہ نفسوں کے لئے حقائق کا اظہار گمراہی کا باعث ہوتا ہے اس لئے تمام واقفانِ اسرار رازوں کو مخفی رکھتے تھے۔ فقرائے عظام و اولیائے کرام اس راز سے واقف تھے۔ لہٰذا وہ صرف ان ہی اشخاص پر اس کا اظہار کرتے تھے جن میں بار اُٹھانے اور اس پر صبر کرنے کی اہلیت پاتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آج تک دُنیائے اسلام میں بجز معدودے چند افراد کے اور کوئی واقف نہیں کہ محکم آیات و متشابہ آیات میں مابہ الامتیاز کیا ہے۔ اس کتاب میں واضح کر دیا گیا ہے کہ محکم و متشابہ سے کیا مراد ہے اور محکم و متشابہ آیات کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے۔ متشابہات کی بعید از عقل تاویلات سے کتب تفاسیر مملو ہیں موجودہ زمانہ سائنس میں متشابہات کی یہی تاویلات تعلیم یافتہ طبقہ کو مذہب سے مشکوک کرنے کا خاص ذریعہ ہیں اور دہریت کے پروپیگنڈا کرنے والوں کا بہترین ہتھیار اور ہر مدعیٔ نبوّت و مہدیت انہیں متشابہ آیات و احادیث کے ذریعے سے اپنے کذب کو صدق کا رنگ دے کر عوام کو گمراہ کرنے اور ان سے اپنی پرستش کرانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اس بندۂ حقیر کو اکثر دہریہ حضرات سے واسطہ پڑتا رہا ہے مگر مالک کے کرم سے چار پانچ گھنٹے سے زیادہ ان پر صرف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اتنی ہی دیر میں وہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے۔ مگر دو ایک ایسے گرگہائے باراں دیدہ سے واسطہ پڑا کہ ان کو کلمہ پڑھوانے پر بہت وقت صرف کرنا پڑا۔ ان کے اعتراضات اس قدر سخت و شدید تھے کہ جواب

کے لئے کبھی دو تین گھنٹے اور کبھی کچھ زیادہ ہی وقت صرف تمہید پر صرف ہو جاتا تھا۔ وہ ایسے مکروہ الفاظ استعمال کرتے تھے کہ مسلمان سننا گوارا نہ کرے گا مگر چونکہ ابتدا ہی میں ان لوگوں نے یہ کہا تھا کہ مذہب کو گلا دبا کر نہیں منوایا جا سکتا۔ ہمیں تو بولنے کی اجازت ہی نہیں دی جاتی پھر ہم اپنے مافی الضمیر کو کیسے ظاہر کریں اور میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ہمارا رب فرماتا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) لہٰذا آپ آزاد ہیں خواہ کیسے ہی الفاظ استعمال کریں میں سننے کے لئے تیار ہوں۔ اس معاہدہ کی وجہ سے سب کچھ خون کے گھونٹ پی کر سننا پڑا۔ مالک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جوابات سن کر قائل و نادم ہوتے اور صدقِ دل سے کلمہ طیبہ پڑھ لیا۔

زیادہ رکیک اعتراضات تو لکھے ہی نہیں جا سکتے البتہ ناظرین کی اطلاع کے لئے پچاس، ساٹھ اعتراضات میں سے صرف چند ہی تحریر کرتا ہوں جو حسب ذیل ہیں:

① آپ کے قرآن میں آپ کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (الملک:۳) (وہ ذات (خدا) جس نے تہ بہ تہ سات آسمان خلق کئے) اب بتائیے یہ تہ بہ تہ سات آسمان کہاں ہیں۔ اب تو یہ بات مشاہدے میں آگئی کہ آسمان محض حدِ نظر ہے۔ یہ سات آسمان جن کی بنیاد نظام بطلیموسی پر ہے جو مدت ہوئی باطل ثابت ہو چکا ہے۔ زمانہ جاہلیت کے ڈھکوسلے ہیں۔ اس روشنی اور سائنس کے زمانے میں ایسے خدا اور ایسے قرآن کو کون ذی عقل مان سکتا ہے؟

② قرآن میں ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰہٰ:۵) (اللہ تعالیٰ عرش پر چڑھ گیا) میں نے ایک قرآن میں اس آیت پر حاشیہ دیکھا۔ لکھا تھا کہ تمام سلف صالحین کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات سے دور عرش پر ہیں۔ جو کوئی ایسا عقیدہ نہ رکھے وہ واجب القتل ہے۔ اس کو قتل کر کے مزبلہ پر ڈال دینا چاہیئے تاکہ لاش سڑنے سے تعفن پھیلے جس سے لوگوں کو اذیت ہو اور عبرت حاصل کریں اور اپنے عقائد فاسدہ سے تائب ہو کر حق کو تسلیم کرلیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات سے دور عرش پر ہیں۔ اب بتائیے کہ ہزاروں سال پرانا فلسفہ اور نظام بطلیموسی جو مدت ہوئی باطل ثابت ہو چکا اور مشاہدہ میں آ گیا کہ یہ آٹھ نو آسمان جاہلوں کا وہم تھے۔ لہٰذا عرش تو ہے ہی نہیں۔ پس جب آپ کے اللہ تعالیٰ عرش پر تھے اور وہ معدوم ہو گیا تو یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بھی فرضی ہی تھے۔

③ امریکہ و یورپ میں بعض ٹیلی پیتھی کے عامل ایسے موجود ہیں جو سیکڑوں میل کے حالات کا مشاہدہ کرلیتے ہیں اور آپ کے حضرت یعقوب، یوسف کو نہ دیکھ سکے۔ فراقِ یوسف میں روتے روتے اندھے ہوگئے۔ یہ شان ہے انبیاء کی (جواب باب پنجم میں ہے)۔

④ دیگر انبیاء کا کیا ذکر خود اپنے رسول اور اللہ تعالیٰ کے دربار کا حال ملاحظہ فرمائیں دیکھئے ہر معقول شریف آدمی سفر میں جب اہل و عیال ساتھ ہوں تو انکی حفاظت و نگرانی کرتا ہے آپ کے رسول ایک لڑائی میں ام المومنین کو ساتھ لے جاتے ہیں مگر خبر نہیں رکھتے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ خالی محمل اٹھا کر اونٹ پر رکھ لیا گیا اور ام المومنین ششدر و حیران میدان میں تنہا رہ گئی ہیں اور عجیب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی خبر نہ پہنچی ورنہ جبریل امین کو بھیج کر خبر کردیتے کہ ام المومنین رہ گئی ہیں۔ منافقین کو موقع مل گیا۔ کیا کیا تہمتیں لگائیں۔ رسول اللہ بہت غمگین رہے ام المومنین کو میکے بھیج دیا مہینہ ڈیڑھ مہینہ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے دربار میں فرشتوں نے شاید رپورٹ نہیں کی معلوم نہیں کیوں اتنی سستی واقع ہوئی۔ جب ام المومنین ایک ماہ تک روتی رہیں اور مدینہ میں خوب ڈگی پٹ لی۔ تب کہیں اللہ کے دربار میں رپورٹ پیش ہوئی۔ اس وقت ان کی برأت کی آیات نازل ہوئیں یہی ہے آپ کا اسلام؟" (اس کا جواب باب پنجم میں ہے) یہ بندہ عاصی کسی طرح مالک کا شکر ادا نہیں کرسکتا کہ اس نے اس ذلیل و نافرمان بندے کو کیسی نصرت و تائید فرمائی کہ ایک دہریے کو مسکت و دندان شکن جواب دے سکا جس کو سن کر وہ حضرت نادم و شرمسار ہوئے اور تائب ہو کر مسلمان ہوگئے۔

اب دوسرے صاحب کا ذکر سنئے۔ وہ ہفتہ عشرہ میں ایک روز آکر ایک اعتراض پیش کرتے جوابِ شافی سن کر قائل ہوجاتے پھر کوئی اور اعتراض تلاش کرکے لاتے اس طرح بہت عرصہ گزر گیا ان کے آخری تین اعتراضات مندرجہ ذیل ہیں۔

اعتراض ۱ : لیڈر میں فطری اثر و نفوذ ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوتِ ارادی سے مجمع کو متاثر کردیتا ہے: مگر آپ کے رسول جب اہلِ مکہ کو متاثر نہ کرسکے تو یہ اچھا بہانہ تراشا گیا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ⑥ البقرۃ (لیکن وہ جو کافر ہیں ان کے لئے یکساں ہے خواہ ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ایمان نہیں لائیں گے)

کیا اللہ تعالیٰ پہلے سے نہ جانتے تھے اور جانتے تھے تو رسول ہی کو کیوں بھیجا (جواب باب سوم میں ہے)۔

اعتراض ۲: پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ البقرہ (اللہ نے انکے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے) بھلا ان بیچاروں کا کیا قصور، دلوں پر مہر کردی کہ سمجھ نہ سکیں، کانوں پر مہر کردی کہ حق سُن نہ سکیں۔ آنکھوں پر پردہ ڈال دیا کہ دیکھ نہ سکیں۔ پھر ان پر عذاب عظیم بھی وارد کیا جائیگا یہ کہاں کا انصاف ہے۔ پھر رسول کو کس لئے بھیجا تھا؟۔ (جواب باب دوم میں اور مزید تفصیل باب ۴ میں ہے)۔

اعتراض ۳: اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوّا کو جنّت میں ٹھہرایا اور شیطان کو جنّت میں جانے کی ممانعت کردی مگر شیطان نے وہ چال چلی کہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنّت میں چلا گیا اور آدم و حوّا کو بہکایا۔ لیکن اس کی چال بازی کی کسی کو خبر نہ ہوئی۔ رضوان صاحب دروازے پر پہرہ دیتے رہے مگر کچھ نہ کرسکے ان کو خبر ہی نہ ہوئی۔ یہ ہے آپ کے اللہ تعالیٰ کا انتظام (جواب باب پنجم میں ہے)۔

دُوسرے حضرات اپنے سوالات کا جواب سُن کر قائل تو ہو گئے۔ ابھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ ان کے ذہن سے ان کے معبود مارکس کے نظریات خارج ہوئے یا نہیں۔ اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا سوال نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے جوابات بھی مشتمل بہ حقائق جو قرآن و حدیث سے مستخرج ہیں ناظرین کی تسکین خاطر کے لئے پیش کردیئے جائیں۔

(۱) جناب ربّ العزت کا ارشاد ہے: اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ (وہ ذاتِ اقدس ہے جس نے تہ بہ تہ سات آسمان بنائے) پچھلی صدی کی ابتدا میں اس نظام شمسی میں سات سیارے معلوم تھے اور سبعہ سیارہ کا محاورہ آج تک زبان زد ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ہمارے نظام شمسی میں نو سیارے ہیں۔ ہماری زمین اور سورج کے درمیان دو سیارے ہیں۔ زمین سورج سے تیسرے درجہ پر ہے۔ لہٰذا ہماری زمین کے مدار (ORBIT) کے اوپر چھ سیاروں کے مدار ہیں اور قرآن کریم میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ (اور بتحقیق ہم نے تمہارے اوپر سات راستے خلق کئے ہیں) ظاہر ہے کہ زمین کے مدار کے اوپر تہ بہ تہ ایک چاند اور چھ ستاروں کے راستے ہیں۔ انہیں کو سات آسمان کہا گیا ہے مفسرین

نے یہ تاویل کی ہے کہ آسمانوں میں چونکہ فرشتے چلتے پھرتے رہتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو راستے کہہ دیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم رب رحیم ان پر رحمت نازل فرمائے خوب کہہ گئے ہیں ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

۲ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (رحمٰن عرش پر سوار ہو گیا) بیشک اس میں کیا شبہ کی گنجائش ہے جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان بنا لیئے اور انسان کو پیدا کیا تو مومنین کے قلوب میں اس کی جگہ ہوئی۔ جیسا کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰہِ (مومن کا دل اللہ کا عرش ہے) یہ حدیث بھی ایک آیت کی تفسیر ہے اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ (۲۴) انفال۔ (اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے بیچ حائل ہوتا ہے) نیز حدیث میں وارد ہے کہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالےٰ سے سوال کیا کہ ہر بادشاہ کی سیر گاہ ہوتی ہے۔ ربا تیری سیر گاہ کہاں ہے۔ ارشادِ باری ہوا کہ اے موسیٰؑ میری سیر گاہ قلبِ مومن ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل وہ ہے کہ جہاں تو سما سکے

ارشادِ باری ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (قسم ہے گھومنے والے آسمان کی) اور کتنے ہی مقامات پر ارشاد ہے وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (اللہ نے آسمان سے پانی برسایا) حقیقت یہ ہے کہ سماء کے معنیٰ ہیں "بلندی" لہٰذا اس کا ترجمہ ہوا "اس نے بلندی سے پانی برسایا" اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں زمین کے ایٹماسفیر یعنی کرۂ بادی کو سمآء کہا گیا ہے! اور اب کون نہیں جانتا کہ زمین کا کرۂ بادی (ATMOSPHERE) زمین کے ساتھ ہی گردش کرتا ہے۔ سبحان اللہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۱۱) الطارق۔

جنابِ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (اور دیکھتا ہے تو پہاڑوں کو اور گمان کرتا ہے ان کو جمے ہوئے حالانکہ وہ تو چل رہے ہیں جیسے بادل چلتا ہے۔ یہ اللہ کی کاریگری ہے (یا صنعت) ہے جس نے ہر شئے کو مضبوط بنایا) (سورۃ نمل ۸۸)

یہ درست ہے کہ فارسی و عربی میں صیغہ مضارع، حال و استقبال دونوں کے لئے آتا

ہے لہٰذا تَرَی کے معنی دیکھتا ہے یا دیکھے گا۔ تَحۡسَبُهَا کے معنی گمان کرتا ہے تو ان کو یا گمان کرے گا تو ان کو۔ تَمُرُّ کے معنی چل رہے ہیں یا چل رہے ہوں گے دونوں معنی درست ہیں مگر کلام پاک کی اکثر آیاتِ مُقدسہ میں قیامت میں پہاڑوں کے چلنے کا ذکر ہے مثلاً وَ تَسِیۡرُ الۡجِبَالُ سَیۡرًا ⑩ (سورہ طور) اور پہاڑ چل رہے ہوں گے تیزی سے چلنا) لہٰذا مترجمین نے وَ تَرَی الۡجِبَالَ کا ترجمہ اپنے قیاس کے مطابق ایسا کر دیا ہے گویا یہ بھی قیامت کا ذکر ہے انہ کسی مترجم صاحب نے تو بریکٹ میں (قیامت میں) بھی بڑھا دیا ہے۔

ان کا خیال اس طرف نہیں گیا کہ قیامت میں پہاڑوں کے چلنے یا اُڑنے کی شان یہ بیان کی گئی ہے۔ وَ تَکُوۡنُ الۡجِبَالُ کَالۡعِہۡنِ (یعنی قیامت میں پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی طرح ہوں گے) تو قیامت میں تو تباہی و بربادی کا تذکرہ ہے اور اس آیہ وفی ہدایہ میں ارشاد ہے۔ صُنۡعَ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ یہ اللہ کی صنعت و کاریگری ہے۔ یہاں تو تعمیر کی کاریگری دکھائی جارہی ہے نہ کہ تباہی۔ یہ آیت تو دعوت دیتی ہے کہ اللہ کی صنعت پر غور کرو۔ یہ کیسی کاریگری ہے مترجمین کے ترجمے میں دوسری بات جو نہایت تعجب خیز ہے یہ ہے کہ اُڑتے ہوئے پہاڑوں کو دیکھ کر بھی ساکن اور ٹھہرا ہوا ہی گمان کریگا یعنی دیکھ کر بھی اندھا ہی رہے گا۔ سُبحان اللہ تاویل سے قرآن کو کس طرح بازیچہ بنایا گیا ہے

اَب تو ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ یہ آیہ وفی ہدایہ زمین کی اپنے محور کے گرد گردش کرنے پر دلالت کرتی ہے اور اس کا یہی ترجمہ صحیح ہے (اور تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ تو اس طرح چل رہے ہیں جیسے بادل چلتا ہے۔ یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر شے کو مضبوط بنایا)" سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَلِلّٰہِ الۡحَمۡد۔

اَب ذرا قرآن کریم کی بلاغت پر بھی غور کیجئے کہ پہاڑوں کے چلنے کو بادل کے چلنے سے تشبیہ دی ہے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص واقف ہے کہ ہر چیز جو فضا میں حرکت کرتی ہے وہ کشش اتصال ارضی (GRAVITATION OF THE EARTH) کے زیر اثر سطح زمین کی گولائی (CURVE) کے متوازی دائرے میں چلتی ہے لہٰذا بادل بھی زمین کی گولائی (CURVE) کے متوازی دائرے پر ہی چلتے ہیں لہٰذا پہاڑ بھی دائرہ میں حرکت کرتے ہیں۔ سُبحان اللہ۔ قربان اس بلاغت کے کہ گردشِ ارض (ROTATION) کو بالکل واضح کر دیا اور تمام گمراہ کن تاویلیں باطل کر دیں۔

اس وقت جبکہ اسلام پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کے کثیر افراد گمراہ ہوتے چلے جا رہے ہیں جو اسلامی ممالک خصوصاً پاکستان کی سالمیت و بقا کے لئے سخت مُضر ہے لہٰذا اس اَمر کی اشد ضرورت ہے کہ تمام اسلامی ممالک خصوصاً پاکستان کے بچوں، جوانوں تعلیم یافتہ نوجوانوں اور غیر تعلیم یافتہ افراد غرضیکہ ہر طبقہ کے لئے اس گروہ کی اہلیت و کیفیاتِ نفسی کے مطابق علیحدہ علیحدہ لٹریچر تیار کیا جائے جو ان کے قلوب کو اسلام کی محبت سے بھر دے۔ دینِ حقّہ کی عظمت ان کے قلوب پر نقش ہو جائے اور تمام فرقِ اسلامیہ متحد ہو کر کوشش کریں۔ باہمی منافرت دُور ہو۔ دُنیائے اسلام خصوصاً پاکستانی بھائیوں میں رشتۂ اخوت مضبوط ہو جائے! اسلامی ممالک خصوصاً پاکستان کے استحکام و بہبودی کے لئے یہ نہایت ضروری ہے اور یہ لٹریچر ایسا ہونا چاہیئے کہ اسلام کے مخالف تمام پروپیگنڈوں کو باطل کر دے۔

ان مقاصد کے مدِ نظر چند پمفلٹ اور رسالے اس حقیر نے تحریر کئے ہیں۔ انکے منجملہ ایک یہ کتاب موسوم بہ "انوارالایقان" ہدیۂ ناظرین ہے جو بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے ہے اور دہریت، بہائیت اور اسلام کے خلاف تمام معاندانہ نظریات اور پروپیگنڈے کو باطل کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے اس کو پانچ ابواب پر تقسیم کیا ہے۔

باب اوّل : محکمات۔ آیات مشتمل بہ تذکرہ محکم و متشابہ۔ محکم و متشابہ کا مفہوم۔ ان کے درمیان مابہ الامتیاز معرفتِ نفس کا حکم۔ آیات کی وہ اقسام جو یقیناً محکم ہیں۔ ہر قسم کی آیات کی مثالیں اور ان کی شرح۔

باب دوم : متشابہات۔ الفاظ میں کیفیاتِ نفس کے بیان کا محال ہونا۔ بعثت رسول کا مقصد۔ تزکیۂ نفس کا مفہوم نفس کی تشریح۔ شرکِ باطنی یا شرکِ حقیقی۔ غفلت و لاشعوری فطرت اسلام۔ خدا کی وہ کتاب جس میں شک نہیں ہو سکتا۔ آیات کی وہ اقسام جو یقیناً متشابہ ہیں۔ بعض متشابہ آیات کی تفسیر دہریوں اور مشککین کے اعتراضات اور ان کے جوابات۔

باب سوم : احساس غیب نفسِ انسان کے لئے غیر محسوس عالم کی طرف توجہ کرنا محال ہے۔ پھر اس کو کیسے توجہ دلائی جا سکتی ہے۔ نفس فطرتِ نفس۔ فلسفۂ مذہب: "میرے مذہب" کا خدیہ۔ یقین کے مدارج شعورِ باطن۔ جنت و جہنم کی تشریح دہریوں کے اعتراضات اور انکے جوابات۔

باب چہارم: نور و بیت نور۔ آیات قرآنی سے نور کا مفہوم۔ آیۂ نور۔ اللہ۔ سماوات والارض کا مفہوم۔ نظام شمسی اور سیارے۔ نظام کوکبی۔ کہکشاں۔ گلیکسی (GALAXY) یونیورس میں بیشمار سحابیۓ یا گلیکسیز۔ عرش اور اللہ کے نور کا مفہوم۔ خلقتِ ارواح۔ تخلیق نظام شمسی پر علمِ طبیعات کا حالیہ نظریہ۔ خطبہ تخلیق عالم از علی کرم اللہ وجہہٗ۔ نظام شمسی کی تخلیق کی مدت۔ زمین پر حیات کی ابتدا۔ خلقت جنات و آدم۔ علم طبیعات کا حالیہ نظریۂ نور۔ آیۂ نور کی تفسیر اور بیتِ نور کا مفہوم۔

باب پنجم: مَکَرُوا وَمَکَرَ اللّٰہ۔ آیاتِ قرآنی سے مکر کا مفہوم، مکر اللہ، مکر الناس۔ مکر السالکین والعارفین، مکر الانبیاء۔ نبی کی تعریف بلحاظ علم کلام و بلحاظ اصول فطرت۔ ہدایت کے بنیادی فطری اصول۔ ہدایت خلق کے لئے انبیاء کے فطری طریقے۔ مندرجہ ذیل انبیاء و رسل کے قرآن و حدیث و روایات سے ایسے حالاتِ زندگی جن پر معاندینِ اسلام اور دہریوں کی طرف سے اعتراضات ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ ایسے شکوک و وساوس و اعتراضات کے عقل و فطرت کی روشنی میں جوابات ــــ (۱) حضرت آدمؑ۔ جنت و شیطان (۲) حضرت نوحؑ (۳) حضرت ابراہیمؑ (۴) حضرت یعقوبؑ و حضرت یوسفؑ (۵) حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ (۶) حضرت یونسؑ (۷) حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔

ناظرین کی خدمت میں التماس ہے کہ یہ کتاب دہریت کے خلاف لکھی گئی ہے اور دہریت کے پروپیگنڈے کے ابطال کیلئے حقائق کا اظہار ضروری ہے جس کے بغیر اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہے اور اظہارِ حقائق ناتربیت یافتہ اذہان کے لئے مضر ہے۔ مگر تعلیم یافتہ طبقہ کو دہریت سے بچانے کے لئے اس کے سوائے کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ان رازوں کو ظاہر کر دیا جائے جو تیرہ سو سال سے اولیاء اللہ صاحبانِ معرفت کے سینوں میں محفوظ رہے ہیں اور سینہ بسینہ ہی چلے آئے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ قرآن و حدیث کے وہ حقائق جو سائنس جدید کی تحقیقات سے منظر عام پر آ گئے ہیں جس سے تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو گئی ہے ظاہر کر دیئے جائیں۔

ایک مشکل یہ ہے کہ جن کیفیاتِ نفسی کا کسی شخص کو شعور حاصل نہ ہوا ہو اس کے لئے ان کا بیان پرستان کے قصے کہانیوں کی مثل ہوگا۔ لہٰذا اس کو ان سے کچھ فائدہ نہ ہوگا ایسی کیفیات کے بیان کا مطالعہ کرنے یا سننے سے ایک فائدہ ضرور ہے کہ بعض اوقات ایک شخص کو ایسے ماحول سے

گزرنا پڑجاتا ہے جس سے ایک کیفیت نفسی شعور میں آتی ہے اگر اس کے متعلق اس کو کچھ علم نہیں ہوتا تو اس کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس کی کچھ قدر نہیں کرتا۔ اور اگر مطالعہ کیا ہو یا ذکر ہی سُنا ہو تو اس نعمت کی قدر کرتا ہے اور اس سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔ جناب باری تعالیٰ ہم کو توفیقِ خیر عطا فرماتے۔ آمین۔

خادم المسلمین

ابوالفارق واسطی

محکمات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام وہ صفات قدسیہ جو عقل انسانی کی رسائی سے بالاتر ہیں اسی ذاتِ صمدی کے لئے خاص ہیں جس کی بارگاہ کی راہ ہی میں طائرِ وہم و گمان کے پَر جل جاتے ہیں۔ ہزار ہزار درود و سلام اس کے محبوب عبدِ کامل پر جو قوسین وجوب و امکان کا قاب اور خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ و حجاب ہے، اور اس کی آل پاک پر جنھوں نے مخلوق کو خالق سے ملانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کیا اور اس کے اصحاب پر جنھوں نے کفر کے قلعوں کو ویران کیا۔

امابعد جناب باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ؗ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ

(۷) آلِ عمران

(وہ وہی (ذاتِ اقدس) ہے جس نے نازل کی تم پر کتاب اس میں بعض آیتیں محکم ہیں وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری (باقی سب) متشابہ ہیں پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے پیروی کرتے ہیں اس کی جو اس میں متشابہ ہے۔ شورش (فتنہ) ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کے (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کی حقیقت (صحیح مطلب) نہیں جانتا کوئی بجز اللہ اور جو علم میں راسخ ہیں کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نہیں

نصیحت پاتے مگر صاحبان عقل ○)

اس آیہ و فی ہدایہ کے متعلق پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محکم اور متشابہ کا مفہوم کیا ہے۔ تو محکم کے متعلق تو مابین علماء اُمت کوئی اختلاف نہیں کہ ایسا کلام جس کے الفاظ سے جو ظاہری مفہوم ذہن میں آئے وہی اس کا اصل مطلب ہو۔ محکم ہے۔ جیسے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو) یعنی ضرورت کے مطابق ہی کھاؤ پیو۔ ضرورت سے زیادہ نہیں۔ یہاں الفاظ کے جو ظاہری معنی ہیں وہی اصل مراد بھی ہیں لہٰذا یہ آیت محکمات میں سے ہے۔

دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ایک واقعہ بیان کرنے کے لئے کہتا ہے "وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار آئے، آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ آتے ہی سب پر برس پڑے"۔ ہم ایسے کلام کو استعارہ کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم ہر ذی فہم سمجھ سکتا ہے کہ وہ نہایت تیزی سے آئے۔ غصّے سے آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں تمام ملازمین کو زجر و توبیخ کرتے رہے۔ ان فقرات میں سے اگر چند الفاظ نکال دیئے جائیں اور پھر ان کی تکرار کریں اور اس طرح کہیں کہ "وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار آئے، آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے آتے ہی برس پڑے"۔ تو اب یہ ابر و برق و باراں پر بھی صادق آسکتا ہے۔ اگر یہ فقرے بادل کے آنے، بجلی چمکنے اور بارش ہو جانے کا اظہار کرنے کی نیت سے کہے گئے تو بھی ایک استعارہ ہی ہے۔ پس ایسے کلام کو جس میں الفاظ کے ظاہری معنی مراد نہ ہوں متشابہ کہتے ہیں۔

دوسرے معنی متشابہ کے ہیں "ظاہری شکل و صورت میں ایک جیسا ہونا"۔ اور اس معنی میں بھی یہ لفظ کلام پاک میں کئی مقامات پر آیا ہے جیسا کہ سورۂ بقر میں ہے:-

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۚ (۲۵) البقر

(جب بھی رزق دیا گیا ان کو اس سے کوئی پھل کہنے لگے یہی تو وہ ہے جو ہمیں پہلے بھی رزق دیا گیا تھا۔ حالانکہ جو ان کو دیا گیا وہ شکل و صورت میں ایک جیسا ہے)

اب اس معاملہ میں اُمت مرحومہ میں کئی اختلافات ہیں۔ بعض جو لفظ متشابہ سے تو تمثیل و استعارہ ہی مراد لیتے ہیں مگر اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن میں متشابہ آیات ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں لفظ کتاب ہے جو اور بھی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے در کلام پاک میں بھی استعمال

کیا گیا ہے۔ چونکہ یہاں ھٰذا القرآن نہیں کہا گیا لہٰذا یہاں لفظ "کتاب" سے قرآن مراد نہیں اور قرآن میں متشابہ آیات نہیں ہیں اِس قول کے قائلین کو میں سورۃ واقعہ کی ان آیات کی طرف توجہ دلاتا ہوں اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۙ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (اور بے شک وہ قرآن کریم پوشیدہ کتاب میں ہے اسے مس نہیں کرتے سوائے پاک شدہ لوگوں کے رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ)

اس آیت سے ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن رب کی نازل کردہ کتاب مکنون میں ہے اور کتاب میں بہت تھوڑی آیتیں محکم ہیں باقی تمام متشابہ ہیں پس جب قرآن اور کتاب دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں ہیں تو قرآن میں متشابہ آیات ہونے سے انکار کرنا ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی ہے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ کلمہ "متشابہ" کلام اللہ میں کئی مقامات پر ظاہری شکل وصورت میں ایک جیسا ہونے" کے معنی میں آیا ہے اس کے خلاف اور کوئی معنی لینا گمراہی ہے۔ لہٰذا سورۃ آل عمران کی اس آیت میں بھی متشابہ سے یہی مراد ہے کہ اُمم سابقہ پر جو احکام نازل ہوئے تھے۔ ان سے ملتے جلتے احکام جن آیاتِ قرآنی میں نازل ہوئے ہیں وہ تمام آیات متشابہات ہیں۔

اگرچہ بحث میں وقت ضائع کرنے سے اصل مقصد سے بُعد ہوا جاتا ہے مگر اس آخری قول کو تو یہ آیہ دنی ہدایہ ہی باطل کر دیتی ہے۔ اگر آیاتِ متشابہات سے کلام اللہ کی وہ آیات مُراد ہوں جن میں اُمم سابقہ پر نازل شدہ احکام کی مثل و متشابہ احکام نازل ہوئے ہیں تو ان کی پیروی تو باعثِ حصولِ ثواب دارین ہو گی نہ کہ گمراہی ایگر اس آیت میں متشابہات کی پیروی کو کجروی اور گمراہی ظاہر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ خیال باطل ہے۔

مذکورہ صدر گروہوں کے سوائے تمام فرق اسلامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں متشابہات سے تمثیلی استعارے اور تشبیہیں ہی مُراد ہے اور کلام اللہ میں زیادہ تر آیات متشابہ ہیں۔ مگر کوئی گروہ اس کا تعین نہیں کر سکتا کہ پورے قرآن میں کتنی آیات متشابہ ہیں اور کتنی محکم اور نہ یہ ہی بتلا سکتے ہیں کہ محکم و متشابہ کے مابین مابہ الامتیاز کیا ہے۔ وہ خود ہی نہیں جانتے کہ کون سی آیت متشابہ ہے تاکہ اس کی پیروی سے احتراز کر کے گمراہی سے بچ سکیں۔ مشکل یہ ہے کہ کلام پاک میں متشابہ کے مفہوم کی کوئی تفصیل موجود نہیں۔ نہ یہ ظاہر کیا گیا ہے

کہ محکم و متشابہ کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے اور نہ اس کے متعلق احادیث رسول کریمؐ سے ہی واضح طور پر کچھ پتہ چلتا ہے۔ لہذا یہ امر سخت دشوار ہو جاتا ہے کہ بغیر نص صریح محکم و متشابہ کے درمیان کیسے تمیز کیا جائے۔ اس کے لئے بجز اقوال خدا و رسولؐ کسی دوسرے کا قول حجت نہیں ہو سکتا۔ لہذا احادیث رسول کریمؐ اور کلام ربِّ عظیم ہی میں تلاش کرنا ضروری ہے اگر تلاش کریں گے تو اس کا حل معلوم ہو جانا لازمی ہے حضور سرورِ دو عالم کا ارشاد ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا)۔

اور جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ ﴿۵۳﴾ حٰم السجدہ (عنقریب ہم دکھلائیں گے ان کو اپنی نشانیاں کائنات میں اور خود ان کے نفسوں میں یہاں تک کہ ان پر آشکارا ہو جائے گا کہ بے شک یہ حق ہے۔

اس آیہ مجیدہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر حق کی تلاش کرنا ہے تو وہ نفس کی اندرونی آیات میں تلاش کرنے سے ہی ظاہر ہو سکتا ہے۔ رب نے تو فرمادیا ہے کہ ہماری نشانیاں ہماری آیات تو آفاق میں یا تمہارے نفسوں ہی میں ہم تمہیں دکھلائیں گے۔ ان ہی آیات سے حق تم پر ظاہر ہو سکتا ہے اور بالکل یقین حاصل ہو جائے گا کہ ہاں یہ حق ہے۔ دوسری آیت میں دیکھیں ارشاد ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾ الروم (پس قائم کرلے اپنے نفس کو دین کے لئے یکسو ہو کر وہ فطرت اللہ کی ہے جس پر لوگوں کو خلق یا فطر کیا۔ اللہ کی خلقت میں تبدیلی نہیں۔ یہی سیدھا (یا مضبوط) دین ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے)۔

اس آیہ مبارکہ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اصل دین اور عین اسلام خدا کی بنائی ہوئی وہ فطرت ہے جو اس نے نفسِ انسان میں ڈالی ہوئی ہے۔ اسی کیلئے سورۂ والشمس میں جنابِ ربّ العزت

کا ارشاد ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ﴿۷﴾ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿۸﴾ الشمس (قسم ہے نفس کی اور جس کی جس نے اس کو پورا کیا الہام کر دیں اس پر اس کی برائیاں اور بھلائیاں ○)

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دینِ فطرت کے راز اگر کہیں مل سکتے ہیں تو نفسِ انسان ہی میں ملیں گے۔ اسلام تو دینِ فطرت ہے۔ اس کو فطرتِ نفس ہی میں تلاش کرنا چاہیے۔ خدا کا فرمان اور اس کے رسول ؐ کا ارشاد تو حق ہی حق ہے! اگر اس کے سوا اور کہیں ڈھونڈیں گے تو عمر بھر ٹکریں مارتے پھریں گے اور کچھ حاصل نہ ہوگا لہٰذا ضروری ہے کہ نفس انسان کی طرف ہی رجوع کریں۔

فطرتِ نفس

نفسِ انسان کے پاس حصولِ علم کے ذرائع اس کے حواسِ خمسۂ ظاہری ہیں۔ باصرہ، سامعہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ۔ یعنی دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے کی حس۔ بچہ جس وقت سے پیدا ہوتا ہے اس کے پانچوں حواس اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے ہر پلک جھپکنے پر اس کی تصاویر نفس پر بنتی رہتی ہیں۔ جو سنتا ہے ان کی آوازوں کے نقش، سونگھنے سے خوشبو اور بدبو کے احساسات، جلد کے ذریعہ لمس کے احساسات اور زبان و تالو کے ذریعے ذائقوں کے احساسات کی کیفیات کے خزانے نفس میں جمع ہوتے رہتے ہیں! ان ہی پر اس کے علم کا انحصار ہے۔ چونکہ بغیر تمثیل کیفیاتِ نفس کا سمجھنا قریب قریب ناممکن ہے لہٰذا چند تمثیلیں درج کی جاتی ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ان تمثیلوں کو کتاب میں پڑھ لینے سے پورا فائدہ نہ ہوگا۔ ضرورت اس کی ہے کہ دو شخص ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ جائیں ایک پڑھے دوسرا غور سے سنے اور پڑھنے والا ہر تمثیل پر سننے والے سے دریافت کرے کہ بتلاؤ کچھ نفس کے اندر احساس ہوا؟ اس وقت ہی پتہ چل سکتا ہے اور پورا فائدہ حاصل ہو سکے گا ورنہ ممکن ہے کہ قصے کہانی کی طرح ان مضامین پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر جائیں تمثیلیں حسبِ ذیل ہیں:

باصرہ۔ یا دیکھنے کا حِس اگر کوئی شخص ہمیں مخاطب کر کے کہے "دیکھئے یہ مُرغی چوزوں کو لئے پھر رہی ہے۔ پانچ ہیں پانچ۔ آہا کیسے خوشنما ہیں معلوم ہوتا ہے جیسے اون کے پھندنے اوہ اوہ مُرغی۔ چوزے" اگر غور کریں تو اس کے سُنتے ہی سینے کے اندر مُرغی اور چوزوں کی تصویر اُبھرتی محسوس ہوگی۔ بعض اشخاص کو اپنے ذہن میں تصاویر کا احساس ہوگا۔

ایک شخص کہتا ہے "ارے اونٹ اونٹ۔ اس پر دو آدمی سوار ہیں وہ جارہا ہے۔ اُونٹ۔ اونٹ" سُننے والے کے ذہن میں تصاویر اُبھریں گی۔

سامعہ یا سننے کا حِس سُننے سے بے شمار الفاظ اور آوازوں کے ذخیرے نفس میں جمع ہیں۔ تمام اشیا کے ناموں کی آوازوں کا ذخیرہ اس میں موجود ہے مگر کسی شے کو دیکھنے سے اس کا نام ذہن میں نہیں اُبھرتا البتہ اگر کوئی شخص ہمیں تصویریں دکھلائے اور کہے کہ دیکھو یہ کا ہے کی تصویر ہے اس وقت ذہن میں نام اُبھر آتے ہیں مثلاً ہاتھی کی تصویر سے ہاتھی کا نام بلّی کی تصویر سے بلّی کا نام ذہن میں اُبھرتا ہے۔

ذائقہ۔ یا چکھنے کا حِس اگر ہمارے سامنے کوئی شخص کہے "یہ حلوہ کس قدر میٹھا ہے۔ بھائی بہت میٹھا ہے" اگر غور کریں گے تو زبان پر بہت خفیف شیرینی کے احساس کی کیفیت نمودار ہوگی۔ ممکن ہے کسی شخص کو اتنا حِس نہ ہو کہ یہ کیفیت اس کے وقوف میں آسکے۔ مگر یہ تو نفس کی فطرت ہے کہ کسی شئے کے ذائقہ کے ذکر سے زبان و تالو پر بہت خفیف وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو کبھی اس چیز کو کھانے کے وقت محسوس ہوئی تھی۔ ہر ذائقہ کے ذکر سے طاری ہونے والی کیفیت کا تو ممکن ہے بعض اشخاص کو وقوف نہ ہو اس لئے کہ اس کے جاننے اور محسوس کرنے کے لئے بہت زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے مگر ترشی ایسا ذائقہ ہے کہ اس کے ذکر سے ہر شخص کو اس کیفیت کا وقوف ہو جاتا ہے۔ سُنئے میں کہتا ہوں "اوہ۔ یہ نیبو کا لیموں چوس رہا ہے۔ بڑا ترش ہے۔ چوسے جا رہا ہے"۔ یا دوسری مثال سُنئے "ارے یہ تو کچا آم چبا رہا ہے۔ چبائے جاتا ہے"۔ اس کے سُننے سے ہر شخص کے مُنہ میں پانی آجاتا ہے اور ہر شخص کو اس کا وقوف ہو جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کسی شے کے ذائقہ کا ذکر سُن کر نفس انسان اپنے ذائقوں کے خزانوں میں سے اسی ذائقہ کے حِس کی خفیف کیفیت اپنے اوپر

طاری کرکے سمجھتا ہے۔

شامہ۔ یا سونگھنے کا حس سونگھنے سے جتنے احساسات کے خزانے نفس میں جمع ہیں ان ہی کے ذریعے سے خوشبو اور بدبو کی تمیز کرتا ہے ایک شخص کے سامنے چند قسم کے عطر پیش کئے جائیں تو سونگھ کر کہے گا۔ یہ کیوڑہ ہے۔ یہ گلاب ہے۔ یہ موتیا ہے۔ یہ چنبیلی ہے۔ غرضکہ ہر خوشبو یا بدبو سونگھ کر اسی کیفیتِ حس کو اپنے خزانوں میں سے نکال کر لاتا ہے اور اس سے ملا کر تمیز کرتا ہے۔

لامسہ۔ یا چھونے کا حس سُنئے، میں کہتا ہوں "اوہ یہ کتنا نرم ہے۔ اس میں تو انگلیاں پیوست ہوتی جارہی ہیں۔ بہت نرم ہے" اور سنئے "ارے یہ تو بالکل پلپلا ہے۔ بالکل پلپلا" ان فقروں کو سُننے سے انگلیوں کے پوروں میں بہت خفیف سی برقی رو جیسی لہر کا بہت ہلکا احساس ہوتا ہے۔ یا یہ سمجھ لیں کہ بہت خفیف گدگدی سی ہوتی ہے۔

یہ تو حواس ظاہری کی تمثیلیں تھیں۔ اب چند تمثیلیں حسِ باطنی کی بھی ملاحظہ فرمائیں کیفیاتِ نفس کے لئے بہت غور و سکون سے اپنے اندر نظر کرنا ضروری ہے ورنہ کچھ پتہ نہ چلے گا۔

ایک شخص ہمارے سامنے کہتا ہے "اُف۔ سر میں درد ہے۔ اُف سخت درد ہے۔ آہ۔ سر میں درد ہے" بس اگر غور کریں تو سر میں خفیف لہر محسوس ہوگی۔ ایک شخص کہتا ہے۔ "میرے پیر کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ گیا۔ اُف انگوٹھے میں کانٹا۔ پیر کے انگوٹھے میں کانٹا لگ گیا۔ بڑی تکلیف ہے" سُننے والا اگر غور کرے تو پیر کے انگوٹھے میں بہت خفیف سرسراہٹ سی وقوف میں آتے گی۔

ایک شخص کہتا ہے "میرا جی مالش کر رہا ہے۔ اُف اُلٹی ہو جائے گی طبیعت متلا رہی ہے۔ اوہ جی متلا رہا ہے" اس کے سُننے سے ہر شخص کو وقوف ہوگا کہ خفیف سی متلی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

اچھا اب ذرا اس پر بھی غور کریں کہ نفسِ انسان اعضائے جسم کے نام سُن کر کیسے سمجھتا ہے۔ سُنئے، میں کہتا ہوں۔ "کان۔ کان۔ کان" اس کے سُننے سے تصویر ذہن میں نہیں آتی بلکہ کان پر بہت خفیف برقی رو جیسی ایک لہر دوڑتی وقوف میں آتی ہے۔ اور سُنئے۔ "ناک۔ ناک۔ ناک" اب ایک خفیف لہر ناک پر محسوس ہوتی ہے۔ اور سُنئے "پیر۔ پیر۔

پیر" اس کے سُننے سے پیر پردیسی ہی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعضائے جسم کا نام سن کر حضرت نفس اُس عضو کو چھُو کر آتے ہیں۔ کہ یہ یعنی یہ۔

نفسِ انسان کے حس و احساسات کی کیفیات کے احصا کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔ حِسّ بصارت سے ہر پلک جھپکنے پر ایک تصویر بنتی ہے۔ تو ایک گھنٹے کی تصاویر کا ہی شمار مُشکل ہے چہ جائے کہ ایک دن کی۔ پھر ایک ماہ۔ اور ایک سال کی پھر تمام عمر کی تصاویر کے شمار کا تصوّر کریں کیا ان کا احصا ممکن ہے حِسّ سماعت کے ذریعے بے شمار آوازوں کے خزانے جمع ہوتے رہتے ہیں۔ کیا ان آوازوں کے شمار کا تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ذائقے کے ذریعے سے ان گنت ذائقوں کے احساس کے ذخیرے جمع ہوتے رہتے ہیں۔ شامّہ کے ذریعے خوشبو و بدبو کے احساس نفس میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ لامسہ کے ذریعے روزانہ بے شمار کیفیات و احساسات کے لاتعداد و لاتحصیٰ خزانے نفس میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ باطنی احساسات کی طرف بھی اگر توجّہ کریں تو بحرِ حیرت میں غرق ہوجاتے ہیں۔ ان کا تو لفظوں میں تذکرہ کرنا بھی مشکل ہے کسی ایک جذبہ یا احساس کے بے شمار مختلف مدارج کی کیفیات بھی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اچھا باطنی کیفیات و احساسات کو نظر انداز کرکے صرف حواس خمسہ ظاہری پر ہی نظر کریں۔ کسی ایک حس کے مختلف مدارج کی کیفیات کا شمار نہیں ہوسکتا۔ اچھا ان پانچ حواس کے بے شمار لاتعداد و لاتحصیٰ احساسات کا خیال چھوڑ کر ان میں سے صرف ایک حس لمس ہی کو لے لیں! ذرا اس حس کی کیفیات پر غور کریں کہ سختی۔ نرمی۔ گرمی۔ سردی۔ خشکی۔ نمی۔ چکناہٹ۔ کھردراپن وغیرہ وغیرہ کے بے شمار حس ہوتے ہیں اور جیسے گرمی سردی کے ذرا ذرا سے درجۂ حرارت میں خفیف سے خفیف کمی بیشی ہوتی ہے ویسے ہی حس کی کیفیت بھی جُداگانہ ہوتی ہے۔ سردی گرمی کے مختلف مدارج کے مختلف حس کی طرح دیگر تمام لمسوں کے مختلف احساسات کا بھی ذرا تصوّر کیجئے۔ اچھا ان تمام لاتعداد و لاتحصیٰ احساسات و کیفیات کو چھوڑ کر حسِ لمس کی صرف ایک "چبھن" ہی لے لیں۔ یہ اندرونی بھی ہوتی ہے اور بیرونی بھی۔ اندرونی چبھن کے احساسات و کیفیات تک تو ہمارے وہم و گمان کی رسائی ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ اچھا اندرونی چبھن کو بھی چھوڑیں۔ صرف بیرونی چبھن کی کیفیات ہی پہ غور کریں تو یہ حس بے شمار اشیاء سے ہوتا ہے۔ کانٹا، سوئی، آلپین، لکڑی، پتھر، کپڑا، کاغذ، گتہ، غرض

کہ ان چیزوں کا اور ان کی مختلف اور بیشمار اشکال و صورتوں کا شمار تو کجا ہمارے لئے تو ان کا تصوّر کرنا بھی ممکن معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہر ایک شے کی ہر مختلف شکل کی چبھن کی کیفیت مختلف۔ پھر ہر مختلف کیفیت کے مدارج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اور ہر درجہ کی حس کی کیفیت جداگانہ۔ اللہ اکبر۔ سبحان اللہ و للہ الحمد۔ ہم نے بیشمار حس باطنی چھوڑے۔ حواس خمسہ ظاہری کے لاتعداد لاتحصیٰ احساسات نظر انداز کئے۔ صرف ایک حس مس لیا۔ اس کی بھی اربوں سنکھوں کیفیات کا خیال چھوڑ کر صرف ایک چبھن کو لیا اس کے بھی بے شمار و لاتعداد باطنی حس کا خیال ترک کیا۔ صرف ظاہری احساسات کا تصوّر کیا تو اس کا احصا بھی محال عقلی نظر آتا ہے۔ سبحان اللہ تب ہی تو وہ فرماتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴿۴﴾ التین۔ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۴﴾ المومنون

(البتہ ہم نے خلق کیا انسان کو بہترین انداز میں۔ بڑی برکت والا ہے اللہ وہ تو خوب ترین خالقین ہے)

اب تو اس پر ہمارا نفس ایمان لے آئے گا۔ جیسا کہ ارشاد رب العزّت ہے:

قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ الکہف

(اے حبیب) کہدو کہ میرے پروردگار کے کلمات کے لئے اگر سمندر سیاہی ہو جائے (ختم ہو جائے) قبل اس کے کہ میرے ربّ کے کلمات تمام ہوں اگر چہ ہم اسکی مثل اور بھی اسکی مدد کو لائیں)۔

پیارے بھائیو! یہ تو صرف ایک انسان کے نفس کی کیفیات کا حال تھا کہ تصوّر ہی سے حواس گم ہونے لگے۔ پھر ذرا تمام دُنیا کے انسانوں اور پھر حیوانوں، درختوں کا تصوّر کرو۔ کیا ان کا تصوّر کرنا ممکن ہے؟ اور یہ تو صرف ایک نظام شمسی کی ایک دُنیا کا ذکر ہے۔ یہ تو صرف ایک کرۂ ارض کی کیفیات نفسی ہیں اور چیزوں کا ذکر نہیں۔ پھر جب ایسے ہی اور اس سے ہزاروں گُنا بڑے اربوں اور سنکھوں عوالم اور بھی ہیں تو سب کے متعلق اگر کوئی سوچنے لگے تو شاید دماغ ہی پھٹ جائے یا حواس کھو بیٹھے۔ اللہ اکبر جلّ جلالہٗ۔ اب تو اس فرمان باری پر صدق دل سے ایمان لے آئیں گے ہم بھی اور آپ بھی۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْۢ

بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾ لقمان

(اور اگر جتنے بھی درخت زمین میں ہیں سب قلم ہوں۔ اور سمندر سیاہی ہو جائیں اور اس کے بعد سات سمندر اور بھی ہوں۔ تب بھی اللہ کے کلمات تمام نہ ہوں اللہ تو سب پر غالب اور بڑی حکمت والا ہے)۔

اللہ اکبر۔ اس بارگاہ عظمت وجلال کی بادشاہت کی وسعت کا کون تصور کر سکتا ہے فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾ الجاثیہ (بس اللہ ہی کے لئے تمام حمد جو آسمانوں کا رب، زمین کا رب اور تمام جہانوں کا رب ہے) یعنی تمام حمد اسی ذات اقدس کے لئے ہے جو صرف آسمانوں اور تمہاری زمین ہی کا رب نہیں بلکہ تمہارے عالم سے ہزاروں گنا بڑا بے شمار ان گنت لاتعداد ولاتحصیٰ عالموں کا رب ہے۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَاۗءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾ الجاثیہ (بس کبریائی اسی کی ذات اقدس کے لئے ہے۔ تمام آسمانوں اور زمین میں وہ ہی سب پر غالب رہنے والا اور حکمت والا ہے) کوئی قسی القلب ہی ایسا ہو سکتا ہے جس کا قلب اس کی عظمت وجلال کے تصور سے لرزنے نہ لگے۔

غرضکہ یہ امر تو قارئین پر واضح ہو گیا کہ نفس انسان کے احساسات وکیفیات کا شمار کرنا یا تصور میں ان کا احصا کرنا محال عقلی ہے۔ انسان کے لئے تو کسی طرح بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

یہ حقیقت بھی قارئین پر بالکل آشکار ہو گئی کہ نفس انسان کے کسی بات کو سمجھنے کا انحصار اس کے احساسات کے ان خزانوں اور ذخیروں پر ہے جو اس کے اندر جمع ہوتے رہتے ہیں۔ کسی شے کا نام سننے پر تصاویر کے جمع شدہ خزانوں کو الٹ پلٹ کر سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں وہی تصویر نکال کر لاتا ہے اور اس سے ملا کر سمجھتا ہے۔ یہ یعنی یہ۔ مثلاً درد، چبھن، سوزش وغیرہ وغیرہ۔ اگر اعضائے جسم میں سے کسی کا نام سنتا ہے تو چونکہ اعضاء تو اس کے پاس موجود ہیں لہٰذا اس کی تصویر نہیں بلکہ تصویر اٹھانے کے بجائے اس عضو کو چھو کر سمجھتا ہے کہ یہ یعنی اس عضو کا ذکر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا جن چیزوں کا حس یا احساس اس کو پہلے کبھی نہ ہوا ہو یا جو کیفیت یا کیف اس پر کبھی طاری نہ ہوا ہو اور اس کے گزشتہ تجربات

کے ذریعہ اس کے اندرونی خزانوں میں موجود نہ ہو اس کا سمجھنا اس کے لئے محال ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ خیال کرنے لگے کہ نفسِ انسان کسی چیز یا کیفیت کا نام سنتے ہی تصویر بنا تا ہے یا کیف طاری کرلیتا ہے اس کے اندر جمع شدہ ذخیروں سے اس کا تعلق کیسے سمجھ لیا جائے تو میں عرض کروں گا کہ سنئے۔ "یہ لڑکا نمبولی کھا رہا ہے۔ نمبولی۔ نمبولی"۔ اور سنئے "مرگدار۔ مرگدار۔ مرگدار۔ مرگدار۔ مرگدار۔ مرگدار" کہئے کچھ نفس نے اثر قبول کیا۔ اور سنئے۔ قنور۔ قنور۔ قنور۔ قنور۔ قنور" اور بھی سنئے "امیرت۔ امیرت۔ امیرت۔ امیرت۔ امیرت" ان الفاظ و کلمات کے بار بار کہنے سے بھی کیا سننے والوں کے نفس پر کوئی اثر ہوتا ہے؟۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا آواز کان کے پردے سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہے۔ نفس کو کسی قسم کا احساس نہیں ہوتا۔

اَب کیفیت کی مثال سُنیں۔ ایک شخص کہتا ہے "میرے ٹھواں لڑ گیا"۔ "اُف بچھو نے کاٹ لیا۔ اُف یہاں تک چڑھ گیا"۔ "ارے اب یہاں تک چڑھ گیا"۔ جس شخص کو کبھی ٹھواں نہ لڑا ہو جس کو کبھی بچھو نے کاٹا ہی نہ ہو اس سے ذرا دریافت کریں کہ اس کے نفس پر کوئی اثر ہوا؟ کچھ نہیں۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کیا چڑھ گیا کہاں چڑھ گیا۔ ہمیں تو کچھ چڑھتا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے نفس کیوں اثر قبول نہیں کرتا؟ اس کا سبب یہ ہے کہ اس تصویر یا احساس کا کیف یا کیفیت کی حالت کا اس کو تجربہ نہیں ہے۔ وہ اس کے باطنی خزانوں میں موجود نہیں جس کو نکال کر لائے اور اس سے ملا کر سمجھے اور اثر لے سکے۔

اَب تو قارئین کو اس بات کا یقین ہو گیا ہو گا کہ نفسِ انسان کا کسی بات کو سمجھنا اسکے ان احساسات و کیفیات کے خزانوں پر منحصر ہے جو سابقہ تجربات سے اس کے اندر جمع ہو گئے ہیں اور اس کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی تمام آیات و احادیث جن کا تعلق عالمِ محسوس سے ہے اور جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے محکمات ہوں گی۔

اس اُصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اگر غور کریں تو مندرجہ ذیل اقسام کی آیات و احادیث کے محکم ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔

(۱) **اوامر** ۔ ایسی تمام آیات و احادیث جن میں کسی فعل یا عمل کے کرنے یا اس کو کسی خاص

طور پر بجالانے کا حکم دیا گیا ہو محکم ہیں۔ جیسے "کُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (۱۷۲) البقرۃ (کھاؤ پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے"۔

(۲) نواہی۔ ایسی تمام آیات واحادیث جن میں کسی فعل یا عمل سے منع کیا گیا ہو۔ محکم ہیں جیسے لَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ (۱۵۴) البقرۃ (جو اللہ کی راہ میں قتل ہوتے انہیں مُردہ نہ کہو)۔

(۳) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں اُمم سابقہ کے عوام کے حالات، ان کی کیفیات نفسی (نہ کہ انبیاء کی) اُمّت کی نافرمانیاں۔ ان پر نزولِ عذاب اور ان کی ہلاکت و تباہی کا ذکر ہو محکم ہیں۔

(۴) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں معاشرت و تمدّن کے متعلّق تعلیم ہو مثلاً عقد و طلاق و میراث حقوق ذوی القربیٰ۔ پڑوسیوں کے حقوق خدمت خلق وغیرہ۔ محکم ہیں۔

(۵) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں عالم مادّی کی تمثیلیں بیان کی گئی ہوں مثلاً ابر و برق و باراں، سمندر دریا، پہاڑ وغیرہ کی مثالیں اور تذکرے ہوں۔ محکم ہیں۔

(۶) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں نفسِ انسان کی ایسی کیفیات کا ذکر ہو جو ہر شخص کے نفس پر طاری ہوتی رہتی ہیں اور ان کا احساس بھی ہوتا رہتا ہے۔ محکم ہیں۔

(۷) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں ایمان لانے، اسلام قبول کرنے یا دین وایمان کا ذکر ہو قریب قریب محکم ہوں گی اگرچہ پوری محکم نہ ہوں گی۔

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اقسام میں سے ہر ایک قسم کی چند آیات مع شرح ہدیۂ ناظرین کی جائیں۔

۱۔ اوامر کی مثالیں

(۱) يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا (۱۶۸) البقرۃ (اے لوگو کھاؤ جو کچھ کہ زمین میں ہے حلال اور پاک) پھر یہ بھی ظاہر فرما دیا کہ کیا حلال نہیں اور کیا پاک نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے: إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَ

مَآ اُهِلَّ بِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴿۱۱۵﴾ النحل (حرام کیا گیا تم پر مردار، خون اور سور کا گوشت اور جس چیز پر غیراللہ کا نام لیا جائے) اب یہ کہ طیبات کیا ہیں اس کو بھی ظاہر فرمادیا تاکہ ہم ان کو پہچان سکیں۔ دیکھیں سورہ بقر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ البقر

(اے ایمان لانے والو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو ان پاک چیزوں میں سے جو تم نے کمایا اور جو ہم نے زمین سے باہر نکالا تمہارے لئے اور گندی چیز پر نیت نہ رکھو کہ اس میں سے خرچ کرنے لگو حالانکہ تم خود لسے نہ لوگے مگر یہ کہ چشم پوشی کرو اور جان لو کہ اللہ بے پرواہ اور لائق حمد ہے)۔

آیہ وفی ہدایہ میں طیبات میں وہ اشیاء ہیں جو اللہ نے زمین سے باہر نکالی ہیں اس سے ظاہراً تو پھل اور نباتات مُراد ہے۔ اب اگر حیوانات کے متعلق ان کا اطلاق کریں تو معلوم ہوتا ہے تمام کیڑے مکوڑے جو زمین میں، دیواروں میں، سوراخوں میں رہتے ہیں یا چوپائے جو بھٹ بنا کر زمین میں رہتے ہیں طیبٔت سے خارج ہیں۔ طیبٔت کا اطلاق صرف انہیں چوپاؤں پر ہوگا جو زمین کے اوپر ہی رہتے ہیں۔ نیز وہ جانور بھی طیبٔت میں شامل نہ ہوں گے جنکی فطری غذا مردار، خون اور فضلات ہوں جن سے ہر شخص نفرت کرتا ہے۔

(۲) وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴿۱۹۰﴾ البقرۃ (اور اللہ کی راہ میں قتال کرو)

یہ تو ہر مُسلمان جانتا ہے کہ مسلمان پر جہاد فی سبیل اللہ فرض ہے مگر قتال اور جہاد کی آیات پڑھ کر اور سُن کر ایسے ہو جاتے ہیں گویا کہ کچھ دیکھا سُنا ہی نہ تھا۔ جب قتال فی سبیل اللہ واجب ہے تو مسلمان کو اس کے لئے ہر وقت تیّار رہنا واجب ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ ہر نماز کے بعد نفس سے محاسبہ کرے آیا تو راہِ خدا میں قربان ہونے کو تیّار ہے شہادت کا طالب ہے کہ نہیں۔ یہ تو ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے جو ایسا عمل کرے گا اس کو تقربِ ایزدی حاصل ہوگا۔ راہِ خدا میں کچھ نہ کچھ ضرور بڑھے گا۔

(۳) قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۹۴) البقر

(کہہ دو (اے حبیب) اگر آخرت کا گھر یعنی جنّت اللہ کے پاس خاص تمہارے لئے ہی ہے اور لوگوں کے سوائے پس آرزو کرو موت کی اگر تم سچے ہو"۔

اور حضور سرکار دو عالم کا فرمان بھی ہے " ستفترق اُمّتی علیٰ ثلاثۃ وّ سبعُوْنَ فرقۃ کُلّھم فی النّار الا واحدۃً (عنقریب میری اُمّت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ سب کے سب جہنمی ہوں گے سوائے ایک کے) یہ حدیث اسلام کے ہر فرقہ کی کتابوں میں موجود ہے، اور اسی حدیث کی رو سے ہر فرقہ اپنے ہی کو ناجی قرار دیتا ہے۔ تمام فرقے ایک دوسرے سے لڑے مرے جاتے ہیں۔ مناظرے ہیں۔ مجادلے ہیں، شور و شر ہے ثبوت دیئے جارہے ہیں فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے اس کی رُو سے ہمارا ہی فرقہ ناجی ہے بس ہم ہی جنت کے ٹھیکیدار ہیں۔ اچھا صاحب ہوں گے، جنّت آپ کو مُبارک مگر بھائیو جنّت جس نے بنائی ہے جو جنّت کا خالق ہے اس سے بھی کسی نے پوچھا۔ اس کی کتاب میں اس کا فرمان بھی دیکھا؟

تو پہلے ایک مثال سُن لو۔ دو بھائی لاہور میں رہتے تھے دونوں ہوٹل میں کام کرتے تھے۔ ایک پر ہوٹل کا مالک مہربان ہو گیا۔ اس کو موٹر کا کام سکھوایا۔ پڑھایا لکھایا۔ اس نے کار سپانڈنٹ کورس لندن کا بھی لے لیا۔ اور موبائل انجینئرنگ کا ڈپلوما حاصل کر لیا پھر وہ دوبئی چلا گیا وہاں موٹر ٹریننگ اسکول کھول دیا۔ خوب کمایا۔ کئی لاکھ کا بینک بیلنس۔ کوٹھی بڑی خوبصورت ایک دن قلب کی حرکت بند ہونے سے ختم ہو گیا۔ اب وہاں سے اس کے بھائی کے پاس خط آتا ہے۔" تمہارے بڑے بھائی صاحب حرکتِ قلب بند ہونے سے فوت ہو گئے۔ فوراً پہنچو۔ جائداد و اموال تمہارا حق ہے، اس پر قبضہ کرو"۔ ناظرین بتلائیں اس شخص کی قلبی کیفیت کیا ہو گی۔ وہ دُنیا کا کام تو کرتا رہے گا۔ مگر دل میں ہر وقت یہی خواہش کروٹ لے گی کہ کب دوبئی پہنچوں اور کب قبضہ کروں۔

تو بھائیو! جنّت کا مالک یہ کہتا ہے کہ اگر فرقوں والی حدیث کی رو سے آخرت

کا گھر یعنی جنت تمہاری ہے اور کسی کا اس میں حق نہیں پس تمہارا ہی فرقہ "ناجی" ہے تو کبھی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کب وہاں پہنچوں؟ سوچو، سمجھو، غور کرو۔ فرقہ ناجی ہونے کا لفظی دعویٰ دمِ واپسیں کام نہ آئے گا اور اس وقت کا پچھتانا فائدہ نہ دے گا۔

(۴) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۱۰۳ آل عمران

"اور مضبوط پکڑ لو اللہ کی رسّی کو سب اور فرقہ فرقہ اور گروہ گروہ نہ ہو جاؤ"۔ اس آیت پر نفسِ امّارہ اور عقلِ فطری کے درمیان بڑی جنگ ہوگی۔

عقلِ فطری: دیکھو اللہ تعالیٰ تو کہتے ہیں تم ٹکڑیاں نہ بناؤ تم سب مسلمان ہو ایک ہو کر رہو۔ تم ایک قوم ہو تم کو ایک کرنے کے لئے ہی رسولؐ کو بھیجا گیا۔ اسی کے لئے خدا کے حبیب نے مصیبتیں جھیلیں۔ تین سال شعب ابی طالب میں دشمنوں کے گھیرے میں رہے! اسی لئے پتھروں کی بارش میں کتنی مرتبہ سر سے پیر تک زخمی ہو کر بے ہوش ہوئے۔ مگر تم ہو کہ وہی رٹ لگائے ہو۔ "ہم پٹھان ہیں، ہم بلوچ ہیں، ہم پنجابی ہیں، ہم سندھی ہیں، ہم کشمیری ہیں، اور ہم مہاجر ہیں!"۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم میں کوئی مسلمان بھی ہے؟؟۔ رسولؐ تو اسلئے آیا کہ سب کو ایک کردے "حسن از بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم، سلمان از فارس، سب ایک ہوگئے۔ تم نے یہ نیا اسلام کس جعلی ٹکسال میں گھڑا کہ فرقہ فرقہ ہوگئے۔ اسی کو اسلام کہتے ہو، کہاں ہے اسلامی اخوّت؟

نفس:۔ واہ بھئی واہ خوب رہی اللہ میاں آپ ہی تو کہتے ہیں وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ (ہم نے بنا دیا تم کو کنبے قبیلے) بھلا یہ ہم نے کنبے قبیلے بنائے ہیں یہ تمہاری ایسی بے تکی باتیں ہوتی ہیں۔ بھلا اپنی نسل کو صوبہ کو، زبان کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ یہ تو فطرت کے خلاف ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے۔ وطن کی محبت تو فطری ہے ؎

یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد
میگفت گدا بودن کنعاں خوشتر

بھلا حضرت یوسفؑ جیسا نبی تو وطن کی محبت میں غرق رہے۔ ہم سے کہو کہ صوبہ پرستی، قوم پرستی، قبیلہ پرستی چھوڑ دو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

عقلِ فطری: ٹھیک ہے کہ رب نے ہی قومیں قبیلے بنائے ہیں مگر اس کا مقصد بھی تو دیکھنا چاہیے۔ آیت کا اگلا حصّہ تو دیکھو۔ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾ الحجرات

(اور ہم نے تمہاری برادریاں اور قبیلے بنا دیئے کہ تم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تو وہی زیادہ عزّت والا ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ بے شک اللہ بڑا جاننے والا اور خبردار ہے) غور تو کرو اگر برادریاں اور قبیلے نہ ہوں تو ہر ایک کو پہچاننے کے لئے نمبر اور کارڈ لگانے کی ضرورت ہوگی۔ رب تو فرماتا ہے ہم نے برادریاں اور قبیلے اس لئے بنائے ہیں کہ تم آسانی سے ایک دوسرے کو شناخت کر سکو نہ اس لئے کہ ایک دوسرے پر فخر کرو کہ ہمارا خاندان اونچا ہے ہم بڑے عزّت دار ہیں۔ یہی تو باہمی نفرت و عداوت کا باعث ہوتا ہے۔ مالک نے تو ظاہر کر دیا کہ ہمارے نزدیک تو وہی زیادہ عزیز ہے جو سب سے زیادہ احکامِ الٰہی کی اطاعت کرنے والا ہو۔ بُرائیوں سے پرہیز کرنے والا ہو تم نے اس کو دشمنی یا منافرت کا سبب بنا لیا۔

مالک تو فرماتا ہے: وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ﴿١٠٣﴾ آلِ عمران

(اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے جب کہ تم دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت کی بدولت بھائی بھائی ہو گئے) جب اس کی رحمت شاملِ حال ہو جائے اور اخوت قائم ہو جائے پھر تو قوم و قبیلہ، نسل و رنگ، شہر و قصبہ کا سوال ہی نہیں رہتا۔ حُبّ اللہ ملتے ہی باہم اُلفت پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھو اسی رکوع میں پیارا مالک پھر ارشاد فرما رہا ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾ آلِ عمران

(اور ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جو فرقہ فرقہ ہوئے اور آپس میں اختلاف کیا۔ بعد اس کے کہ ان کے پاس کھُلی نشانیاں آ چکی تھیں۔ انہی کے لئے تو بڑا عذاب ہے) خدا کی کھُلی ہوئی نشانیاں اس کی کتاب مقدس میں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے دیکھنے کے بعد اگر آپس

میں مل کر نہ رہے اور فرقہ فرقہ بنے رہے تو ایمان نہیں حاصل ہوا اور اس کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہے۔ ایمان اور نعمت حب اللہ تو بندوں کو طلب سے ملتی ہے۔ اگر رب سے بہ خلوص دل طلب کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہمارے دل کو نور محبت سے نہ بھر دے۔ پھر کسی قسم کی منافرت و اختلاف باقی نہ رہے۔ پیارے مالک نے کتنی جگہ بہ تکرار حکم دیا ہے۔ فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ۔ پارٹیاں نہ بناؤ ورنہ عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

نفس: اچھا اس بات کو اگر مان بھی لیا جائے کہ نسلی، لسانی اور صوبائی تعصب باعث تفرقہ ہے۔ اس کے لئے رب سے بہ خلوص دل استدعا کرنی ضرور ہے کہ وہ ہمیں نور محبت عطا فرمائے تاکہ ہم بھی بھائی بھائی بن جائیں مگر سیاسی پارٹیاں تو اس زمانہ میں ضروری ہیں بغیر مخالف پارٹیوں کے تو حکومت ہی نہیں چل سکتی یہ تو ڈیموکریسی کا زمانہ ہے ہر ملک میں سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں ان کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے! اللہ تعالیٰ نے بھی ایمان والوں کی یہی تعریف بیان فرمائی ہے: وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (۳۸) الشوریٰ

(اور وہ لوگ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کا امر باہم مشورہ سے ہوتا ہے اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں)۔ دیکھو جب شوریٰ کا حکم ہے تو سب متفق ہو ہی نہیں سکتے لہٰذا پارٹیوں کا ہونا ضروری ہے اور کثرت رائے سے ہی کام چل سکتا ہے۔

عقل فطری: اسلام میں شوریٰ کثرت رائے سے نہیں بلکہ اجماع سے ہوتا ہے اسلام تو سب کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہے۔ ایک خدا کو ماننے کا فائدہ یہی ہے کہ توحید فکری پیدا ہو جائے۔ سب کے سوچنے کا ڈھنگ ایک ہو جائے۔ پھر اختلاف کیا سب کو ایک امر پر متفق ہونا چاہیے۔ صرف کثرت حق کی علامت نہیں۔ فاطر فطرت نے تو اپنے کلام پاک میں ظاہر فرمایا ہے کہ لوگوں کی کثرت حق پر نہیں ہوتی۔ دیکھو آیات ذیل:

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ (۲۴۳) البقرۃ

(اور لیکن کثرت ان لوگوں کی ہے جو شکر کرنے والے نہیں ہیں)۔

- وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ المائدہ

(اور بہ تحقیق لوگوں میں اکثریت ان کی ہے جو ناسق ہیں)

- وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ الانعام

(اور لیکن ان میں اکثر لوگ نادان ہیں)

- وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ الاعراف

(اور تو ان میں اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا)

- وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ الاعراف

(اور لیکن لوگوں میں اکثر (وہ ہیں جو) نہیں جانتے)

- وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾ الرعد

(مگر بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے)

غرضیکہ قرآن پاک میں ایسی آیات بہت زیادہ ہیں جن میں ظاہر کیا گیا ہے کہ کثرت نادانوں اور کم عقلوں کی ہوتی ہے اور دنیا میں ہر ملک و قوم میں ظاہر ادیکھ لو کہ علماء و فضلا صاحبانِ عقل و تدبیر اہل فہم وذکا کم ہوتے ہیں۔ اکثریت عوام کالانعام ہی کی ہوتی ہے۔

نفس: یہ باتیں اس زمانے میں تو چل ہی نہیں سکتیں۔ یہ تو اس زمانہ جاہلیت کیلئے موزوں تھیں جب علم کی روشنی عام نہ تھی۔ بے شک اس وقت تعلیم یافتہ اشخاص شاذ ہی تھے اور جاہلوں کی کثرت تھی۔ اب زمانہ ترقی کر گیا ہے ہم مہذب (CIVILIZED) مسلم ہیں۔ ہمارے اکثر علماء کرام اس پر متفق ہیں کہ اسلام جمہوریت ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس زمانہ میں جو شخص اس کے خلاف آواز اٹھائے گا اس کی زبان بند کر دی جائے گی۔ نیز بزرگوں کا قول ہے "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"۔ ایسا ہی ایک فارسی مقولہ بھی ہے "زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز"۔ اور اسلام تو ایسا مذہب ہے کہ ہر زمانے کے لئے موزوں ہے۔ اب قرآن پاک کی آیات سے وہی سیکڑوں برس پرانے مفاہیم لینا سخت غلطی ہے۔ اب ان کو بدلنا چاہیئے۔

عقل فطری: بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان ہو کر، قرآن کو خدا کا کلام مان کر بھی آپ یہ چاہیں کہ قرآن کریم کے مفاہیم کو بدل دیا جائے۔ دیکھو جناب باری تعالیٰ عزّ اسمہ

قرآن پاک میں یہ خبر دے رہا ہے کہ کفار و مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی کہتے تھے کہ اس قرآن کو بدل دو۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۵﴾ یونس

(اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان پر ہماری کھلی ہوئی آیات تو جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو۔ تم کہہ دو یہ میرا کام نہیں کہ میں اپنے جی سے اس کو بدل دوں۔ میں تو اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پہ وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں)

اتنا تو سمجھنا چاہیے کہ قرآن تو کتابِ فطرت ہے۔ کیا فطرت بدل سکتی ہے۔ جب سے زمین و آسمان خلق ہوئے ہیں اس وقت جو قانونِ فطرت جاری و ساری تھے کیا کروڑہا سال گزرنے پر بھی کسی قانون میں تبدیلی ہوئی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصدِ وحید تزکیۂ نفسِ مخلوق ہے اور دین کا تعلق نفسِ انسان سے ہے تو کیا نفس کی فطرت میں ہزاروں سال میں ذرا سی بھی تبدیلی ہوئی ہے۔ پس جب تیجر کے قانون نہیں بدلے نفس کی فطرت نہیں بدلی تو نفس کے متعلق جو قانون ہے وہ کیسے بدلا جا سکتا ہے۔ کتاب فطرت تو یہی کہہ رہی ہے۔ حضرت طالوت کے لشکر کے ذکر میں دیکھو۔ ایمان والوں نے کہا:

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۲۴۹﴾ البقرۃ

(ایسا بہت ہوا ہے کہ چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر بحکم خدا غالب آئی ہے اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے) اور حضرت طالوت نے اپنے لشکر سے کہا تھا کہ اللہ تمہیں نہر سے آزمائے گا جو ایک گھونٹ سے زیادہ اس میں سے نہیں پئے گا وہ میرا ہے۔ تو رب فرماتا ہے:

فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۔ (پس تھوڑے سے لوگوں کے سوائے سب نے پانی پیا)۔

نفس: دیکھو یہ امر کہ کثرت حق پر نہیں ہوتی دُنیاوی معاملات کے لئے نہیں۔ دُنیا میں دیکھو یورپ اور امریکہ کتنی ترقّی کر گئے ہیں کہ آسمان کی خبریں لاتے ہیں۔ وہ سب کثرت رائے پر ہی عامل ہیں۔ وہاں بھی ڈیما کریسی ہی ہے بھلا اس زمانے میں دُنیا کا ساتھ چھوڑ دیں! اہلِ عالم کی نظر میں ہمارا وقار گر جائے گا اور زمانے کے ساتھ نہ چلے تو ترقی کر ہی نہیں سکتے۔ ترقی یافتہ ممالک سے آگے بڑھنا تو مضحکہ خیز ہے۔ ان کی منزل ترقّی تک پہنچنا ہی سخت دُشوار ہے۔

عقلِ فطری: اس معاملہ میں الزام نہیں دیا جا سکتا! اس لئے کہ نفسِ انسان کی فطرت ہے کہ جب اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ کسی کے پاس ایسی قوّت وطاقت، دولت وثروت یا علم وہنر ہے جس سے یہ محروم ہے تو پہلے خائف ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ خوف رُعب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مرعوب ہو جانے کے بعد قوّتِ تنقید مفقود ہو جاتی ہے۔ عقل سے کام لے ہی نہیں سکتا۔ اس کو مرعوب عنہ کا ہر عیب بھی ثواب نظر آتا ہے! ان کی نقل کرنے کی خواہش شدید پیدا ہو جاتی ہے! اور ان کی نقل کرنے کو فخر سمجھنے لگتا ہے۔ مدّت دراز تک اقوامِ مغرب کی غلامی میں رہنے کا یہ فطری اثر ہے کہ ان کا ہر عیب ثواب نظر آتا ہے۔ عقل بالکل کام نہیں کرتی۔ ممکن ہی نہیں کوئی مرعوب عنہ کے اعمال واقوال پر تنقید کرنے کے لئے عقل سے کام لے سکے اور جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۰۰﴾ (اور وہ یعنی اللہ ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے نجاست ڈال دیتا ہے) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ہمیشہ گمراہی وہلاکت میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کو فلاح نصیب نہیں ہوتی۔ کیا ہم میں سے کسی نے آج تک عقل سے کام لیا۔ کبھی یہ سوچا کہ مغرب کی ترقّی کا راز وعلّتِ غائی کیا ہے؟ کون نہیں جانتا کہ قوانینِ فطرت کا علم ہی ان کی مادّی ترقّی کا باعث ہے۔ یہ ان معدودے چند سائنسدانوں کی محنتوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے جو شب وروز اُصولِ فطرت پر غور کرنے میں منہمک رہتے تھے اور اب بھی اسی میں مصروف رہتے ہیں۔ اب بتائیں کہ کثرت مفکرین کی ہے یا عوام کالانعام کی؟ افسوس صد افسوس زبانی دعویٰ تو یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے مگر مسلمان دینِ فطرت کے پیرو ہونے کے مدّعی علومِ فطرت سے نابلد ہوں۔ ہم نے خود ہی تو دینِ فطرت کو دینِ روایت بنا دیا۔ علّامہ اقبال مرحوم بھی کہہ

گئے ہیں ؂

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

اُلٹی سیدھی روایات و گمراہ کُن فلسفہ قدیم پر دین کی بُنیاد قائم کر کے ایک نیا اسلام بنا لیا۔ جب مغرب کی طاقتوں سے مرعوب ہوتے تو قرآن کے مفاہیم کو بدلنے لگے۔ مرعوب ہونے کے بعد مرعوب عنہ کی نقل کرنا فطری امر ہے مگر کس قدر افسوس کے قابل بات ہے کہ مغرب کی نقل بھی پوری نہ کی۔ اگر ان کے تمام اعمال کی نقل کرتے تو کچھ فائدہ بھی ہوتا۔ کیا کسی نے آج تک عقل سے کام لیا۔ کیا کسی نے اس پر بھی غور کیا کہ مغرب میں کتنی ہی انجمنیں ایسی ہیں جو نہایت مفید کاموں میں مصروف ہیں۔ مثلاً لندن میں ایک ایسی سوسائٹی ہے جو نفسِ انسان کے قوائے باطنی پر ریسرچ کر رہی ہے۔ بعض ایسی سوسائٹیاں ہیں جو روح و روحانیت پر تحقیق کرنے میں مصروف ہیں۔ کتنی ہی ایسی انجمنیں ہیں جن کا مقصد خدمتِ خلق ہے۔ بعض گم شدہ اشیاء کو جو کسی شخص سے گر گئی ہوں یا کہیں رکھ کر بھول گیا ہو اصل مالک کو پہنچانے کا کام سرانجام دیتی ہیں۔ ان کا ہر کام باقاعدہ اور منظم ہوتا ہے۔ کیا ان تمام کاموں میں سے کسی کام کو نقل کرنے کی ہم میں سے کسی کو خواہش پیدا ہوئی؟ نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ان میں تو نفس کو اذیت اُٹھانا پڑتی ہے۔ وہ تو صرف ایسے کاموں کی نقل کرے گا جس میں اسے عارضی حظ حاصل ہو۔ ہم نے نقل کی تو ناچ رنگ کی اور صرف ایسے کاموں کی جو تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ مغرب نے عورت کو مرد کے مساوی حقوق دیئے۔ ہم بھی اس کی نقل کرنے لگے۔ حالانکہ مغرب تو اب سر بگریباں ہے اور اس کے مضر نتائج سے پریشان۔ کوئی صورت اصلاح کی نظر نہیں آتی۔ خانگی زندگی تباہ ہو گئی۔ طلاقوں کی کثرت شمار نہیں ہو سکتی۔ شوہر فریاد کر رہے ہیں بیویاں شوہروں سے شاکی ہیں کسی کو گھریلو زندگی میں سکون میسر نہیں۔ مخلوط تعلیم اور کورٹ شپ کے نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مغرب میں اکثر حکومتوں کو لاوارث بچوں کی پرورش گاہیں بنانی پڑی ہیں۔ کیا آپ نے بھی ایسی کوئی تربیت گاہ بنائی؟ نقل ہو تو پوری ہو۔ ضروری ہے کہ نفسِ امّارہ صاحب آپ ہی کہیں گے کہ ابھی تو

ہم بہت BACKWARD (پیچھے) ہیں۔ ہمارا ملک تو ترقی پذیر ملک ہے بھلا ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم بھی ترقی کے منازل طے کرلیں تو ان معاملات میں ان سے آگے بڑھ کر دکھادیں گے۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ بندر پالتے ہیں، ان کو ناچ سکھاتے ہیں تو سدھانے والوں کی غیبت میں بھی بندر وہی ناچتا ہے۔ اور کتا تو مالک کا بڑا وفادار ہوتا ہے جس طرح مالک نچاتا ہے وہی ناچ ناچتا ہے اور اسی طرح دُم ہلاتا ہے۔ پس اگر آقا چلا بھی جائے تو وفاداری اسے مجبور کرتی ہے کہ وہی ناچ ناچے اور اسی طرح دُم ہلاتے۔ مرزا غالب مرحوم کہہ گئے ہیں ؎

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے
مرے گر دیر میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو"

کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم عقل سے کام لیں اور فطرت پر عمل کریں اور بارگاہ ربّ العزت میں بہ تضرع وزاری عرض کریں کہ ہم کو اپنے احکام پر عمل کرنے، عقل و فطرت کے مُطابق اعمال بجالانے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمارے نفوس سے باہمی منافرت واختلاف دُور کردے۔ ہمارے قلوب میں باہمی اُلفت ومحبّت پیدا کردے تاکہ ہم تیرے حکم "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" پر عمل کرسکیں اور تیری رسّی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ لیں۔ اے مولا تو ارحم الرّاحمین ہے۔ ہمارے حال پر رحم فرما۔ جس طرح قرنِ اوّل میں تو نے قلوب میں اُلفت پیدا کردی تھی اور سب کے دل ملادیتے تھے ایسے ہی ہمارے دلوں کو بھی ملادے اور ہم کو بھی "اَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا" کا مصداق بنادے۔ آمین ثم آمین والحمدللہ ربّ العالمین۔

(۵) قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ (۴۲) الروم

(اے رسول) کہہ دو کہ زمین پر چل پھر کر دیکھو تو کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو پہلے تھے۔ ان میں کے اکثر مُشرک تھے)

اسی مضمون کی دُوسری آیت

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ

قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ المومن

(کیا ان لوگوں نے زمین پر چل پھر کر نہیں دیکھا کہ کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اُن سے زور میں بڑھے ہوئے تھے اور اُن نشانیوں میں بھی بڑھے ہوئے تھے جو زمین پر چھوڑ گئے۔ پس اللہ نے اُن کے گناہوں سے انھیں پکڑا اور ان کے لئے اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوا)

کلام پاک میں ایسی آیات بہ کثرت موجود ہیں کہ روئے زمین پر چل پھر کر امم سابقہ کی تباہی و بربادی کا مشاہدہ کرلو۔ اگر ہم خود خدا کی زمین پر چل پھر کر ظالموں کا انجام بچشم خود نہیں دیکھ سکتے تو کیا حالات سے واقفیت بھی نہیں کر سکتے۔ اب تو دُنیا میں ہر ملک و قوم کے حالات تمام روئے زمین پر نشر ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ ہم عبرت حاصل کریں اور ہمارے نفوس پر رب العالمین کی عظمت و قہاریت کے نقوش ثبت ہو جائیں تاکہ ہمارے اعمال کی اصلاح ہو سکے اور تقویٰ کی صلاحیت پیدا ہو۔

کیا ہم نے زار روس کی تباہی و بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا؟ وہ زار روس جو اتنی بڑی سلطنت کا شہنشاہ تھا جس کے برابر دُنیا میں کوئی دوسری سلطنت نہ تھی جب اس کے مظالم اِنتہا کو پہنچ گئے تو خدائے قہار کا عذاب اس پر نازل ہوا اور دُنیا نے دیکھا کہ شہنشاہ رُوس اور اس کے افرادِ خاندان کو نہایت ذلّت و خواری کے عالم میں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔

ایک بزرگوار متوطن جہلم ۱۹۱۱ء سے پہلے ایران میں برٹش سفارت خانہ میں کسی ملازمت پر تھے بندۂ حقیر سے ان کی ملاقات ۱۹۴۲ء میں لاہور میں ہوئی۔ اس وقت ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ انھوں نے زار روس کے مظالم کی عجیب و غریب داستان بیان کی ناظرین کی واقفیت و عبرت کے لئے یہاں تحریر کرتا ہوں:۔

موصوف نے بیان کیا کہ عرصہ سے انگریز اور روس ایران پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ جنوبی ایران میں انگریزوں کا اثر زیادہ تھا۔ شمالی حصّہ پر رُوس کا اثر تھا۔ روسی سفارتخانہ نے ایک مجتہد سید طاہر کا ایمان خرید لیا۔ ان کو اپنا ایجنٹ بنا لیا۔ انہوں نے حسب ہدایت روس

کے خلاف زہر اُگلنا شروع کر دیا اور لوگوں میں رُوس کے خلاف نفرت و بغاوت کی آگ بھڑکانا شروع کی۔ لوگوں سے کہتے تھے کہ حکومتِ ایران ناکارہ ہے اس میں اتنی طاقت نہیں کہ رُوس سے اپنے ان علاقوں کو خالی کرا سکے جن پر بظلم و جور اس نے جبراً قبضہ کر رکھا ہے۔ میں بحکم امام رُوس کے خلاف جہاد کروا دُں گا۔ تمام مشہد میں اور شمالی ایران میں جگہ جگہ نقارے پر کرتے پھرتے تھے اور عوام میں روس کے خلاف جوش پھیلاتے۔ روسی سفارت خانہ سے حکومتِ ایران کو احتجاجی مراسلے وصول ہوتے رہتے تھے۔

بالآخر سید طاہر کے پاس ہزاروں آدمی جمع ہو گئے تو لوگوں کو بشارت سُنانے لگے کہ حضرت امام ضامن علیہ السّلام نے مجھے حکم دیا ہے کہ جس وقت ہماری ضریح سے تلوار باہر نکلے تم جہاد شروع کر دینا۔ اَب وہ وقت بہت قریب ہے۔ میں تو حکم کا منتظر ہوں۔

روسی سفارت خانہ کی دوسری کارروائی یہ ہوئی کہ طہران (دارالحکومتِ ایران) اور مشہد کے دَرمیان جو قبائل آباد تھے ان کو رشوتیں دے کر حکومتِ ایران کے خلاف بغاوت کرادی۔ اسی زمانہ میں صحنِ روضہ میں روزانہ اجتماع ہونے لگے اور جناب قائد صاحب پُرزور تقریریں اور وعظ فرمانے لگے کہ ایہا النّاس بس اَب جہاد کا حکم ہوا ہی چاہتا ہے۔ تم لوگ تیّار رہو۔ ہم اس ظالم حکومتِ روس سے اِنتقام لیں گے اور اپنے ملک کو ظالموں سے خالی کرالیں گے۔

رُوسی سفارت خانہ سے حکومتِ ایران کو الٹی میٹم پر مشتمل مراسلہ بھیجا گیا کہ مشہد میں حکومتِ روس کے خلاف بغاوت کا پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ حکومتِ ایران کا فرض ہے کہ اس فساد کو فوراً روکے یا یہ کہ اس کا انتظام رُوسی سفارت خانہ کے سُپرد کر دے یا جنگ کے لئے تیّار ہو جائے۔

چونکہ طہران اور مشہد کے دَرمیان قبائلی علاقے میں بغاوت پھیلی ہوئی تھی افواج کا طہران سے مشہد جانا دشوار تھا۔ لہٰذا حکومتِ ایران کو مشہد کا انتظام مجبوراً روسی سفارت خانہ کے حوالے کرنا پڑا۔

طہران اور مشہد کے دَرمیان قبائلی علاقے کی بغاوت کے سبب مشہد میں پولیس اور

فوج کو تنخواہیں نہ مل سکی تھیں۔ رُوسی سفارت خانہ نے اعلان کیا کہ حکومتِ ایران نے اس علاقہ کا انتظام ہمارے سپرد کر دیا ہے۔ تمام ملیشیا اور پولیس کے ملازمین مع ہتھیاروں کے رُوسی سفارت خانہ میں آجائیں اور اپنی تنخواہیں وصول کرلیں۔ اس اعلان پر جب تمام فوج اور پولیس روسی سفارتخانہ میں جمع ہو گئے تو دروازے مقفل کر دیئے گئے اور ان سے کہا گیا کہ ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔ اب جو ان لوگوں نے اوپر نظر اٹھائی تو توپیں نصب تھیں اور رُوسی فوجی ان کی طرف بندوقیں تانے ہوئے تھے سب نے ہتھیار حوالے کر دیئے۔ پھر سب کو کچھ رقم دے کر واپس کر دیا گیا۔ عین اس وقت جناب قائد صاحب صحن روضہ میں برسرِ منبر تقریر فرما رہے تھے اور روس کے خلاف لوگوں کو خوب جوش دلا رہے تھے۔ کہتے جاتے تھے بس اب حکم جہاد ہوا ہی چاہتا ہے۔ وقت آگیا ہے دفعتہً روسی سفارت خانہ سے توپ کا ایک فائر ہوا۔ یہ فائر پہلے سے طے شدہ اسکیم کے مطابق خالی تھا قائد صاحب نے شور مچا دیا "معجزہ شد معجزہ شد" یعنی گولا لوٹ گیا اور آپ لوگوں تک نہیں پہنچ سکا۔ اس پر لوگوں میں جوش اور بڑھ گیا۔ اب دوسرا خالی فائر ہوا۔ قائد صاحب نے پھر نعرے لگائے "معجزہ شدہ معجزہ شد" اس کے بعد منبر سے اُتر کر کہیں غائب ہو گئے۔ پھر تیسرا خالی فائر ہوا۔ اب لوگ ان کو پکارنے لگے کہ جہاد کا حکم دیجئے مگر ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ان کے غائب ہوتے ہی گولے برسنے لگے اور ہزاروں آدمی ہلاک ہو گئے۔ گولہ باری بند ہوئی تو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ انگریزی سفارت خانہ میں تو گویا صفِ ماتم بچھی تھی کہ روس کی چال کامیاب ہو گئی۔ سفارت خانے کے انگریز افسر دوسرے روز حالات کا معائنہ کرنے گئے۔ جناب راوی صاحب بھی ہمراہ تھے۔ کہتے تھے کہ تمام صحن خون سے بھرا ہوا تھا۔ انگریزوں نے عوام سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ دوسرا دن بخیر گزر گیا۔ تیسرا دن نکلا تھا کہ بے شمار کوّوں نے رُوسی سفارت خانہ کے جھنڈے پر حملہ کر دیا اور جھنڈے کا کپڑا نوچنے لگے۔ یہ دیکھ کر سفارت خانے سے کوّوں پر فائر ہونے لگے۔ کوّے مر رہے تھے۔ جتنے گرتے جاتے تھے اس سے زیادہ آتے جاتے تھے۔ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ یہاں تک کہ کوّوں نے جھنڈے میں ایک تار بھی نہ چھوڑا۔ دیکھنے والوں کو حیرت تھی کہ اتنے کوّے کہاں سے آگئے اور بندوقوں کے فائر سے بھی نہ بھاگے۔ ہم تو سمجھ گئے تھے کہ یہ خدائے قہار کے غضب کی علامت ہے۔ روس پر

ضرور تباہی آنے والی ہے (راوی کا بیان ختم)۔

قارئین کو اس وقت کے حالات سُناتا ہوں جو ہندوستان میں واقع ہوئے۔ جب مشہد پر رُوسی گولہ باری کی خبریں ہندوستان پہنچیں اور اخبارات میں شائع ہوئیں اس وقت مولانا ابوالکلام کا پرچہ الہلال کلکتہ سے شائع ہوتا تھا اس میں کئی روز روس کی مذمت میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ کوّوں کے روسی جھنڈے پر حملے کی خبر بڑے شد و مد سے شائع ہوئی اور تمام اخبارات نے اس کو جلی سُرخیوں سے شائع کیا اس وقت ہندوستان میں بہت سے مقامات پر روس کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ لکھنؤ میں مرحوم سر محمد علی محمد خاں صاحب، مہاراجہ ریاست محمود آباد نے ایک بڑے مجمع میں ایک مسدس پڑھا جو رُوس کی مذمت پر مشتمل تھا جس کا کچھ جزا ایک شخص نے مجھے سُنایا تھا۔ اس وقت صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے:

پندِ عیسیٰ ابھی ان لوگوں کو کیا یاد آئے
نشہ نخوت کا اُتر لے تو خُدا یاد آئے

اس وقت صوبہ یوپی۔ انڈیا (موجودہ اُتر پردیش) کے لیفٹیننٹ گورنر نے مہاراجہ صاحب محمود آباد کو بُلا کر بہت کچھ فہمائش کی کہ رُوس ہمارا حلیف ہے اور دوست ہے۔ اس کے خلاف انگریزی حکومت میں پروپیگنڈا کرنا جائز نہیں۔ یہ مظاہرے بند ہونے چاہئیں۔ اس پر مہاراجہ صاحب بگڑ گئے۔ کہنے لگے رُوس جلد ہی تباہ ہو جائے گا۔ اس کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ اس پر لیفٹیننٹ گورنر نے کہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ رُوس کی کتنی بڑی وسیع سلطنت ہے۔ راجہ صاحب نے کہا کہ اس نے ہمارے رسول ؐ کے ایک فرزند کے روضہ پر گولہ باری کر کے ہزاروں بے گناہوں کا خُون بہایا ہے اس پر ضرور بالضرور تباہی آئے گی۔ اگر تین سال کے اندر حکومتِ رُوس پر تباہی نہ آئی تو میں مذہب اسلام ترک کر دوں گا۔

غرضیکہ راجہ صاحب کا کہنا بالکل دُرست ہُوا کہ اس واقعہ کو تین سال نہ گزرے تھے کہ جولائی ۱۹۱۴ء میں رُوس پر بلا نازل ہو گئی اور جنگِ عظیم شروع ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۷ء میں روس میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو گئی اور زار رُوس کو مع افرادِ خاندان نہایت ذلت و خواری کی حالت میں گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ کتنے ہی دن ان کی لاشیں خاک و خون میں غلطاں پڑی سڑتی رہیں۔

فَاعْتَبِرُوْا یَااُولِی الْاَبْصَارِ ﴿۲﴾ الحشر (اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو)۔

(۶) وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ البقرة

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس کی جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں ہم تو اسی پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا۔ اگرچہ انکے آبا کچھ عقل نہ رکھتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے)

وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ الزمر

(اور اس نیک بات پر چلو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کی گئی ہے قبل اس کے کہ تم پر اچانک ہی عذاب آجائے اور تم کو شعور بھی نہ ہو)

کیوں بھائیو! یہ ہمارے رب کا فرمان نہیں ہے؟ ذرا تو سوچنا چاہیئے ہم مالک کے کن کن احکام کی پیروی کر رہے ہیں؟ ہم تو رشوت ستانی، چور بازاری، بے ایمانی بددیانتی میں مصروف ہیں۔ عذاب بھی آتے رہتے ہیں مگر ان کو ہم عذاب سمجھتے ہی نہیں۔ ان کو تو اتفاقاتِ زمانہ سمجھ لیتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جن کو کسی سخت و شدید اہم واقعہ سے رب کی طرف توجہ ہوتی ہے؟ کراچی میں ایک سال شب برات سے پہلے صدر میں آگ لگ گئی کتنی ہی جانیں تلف ہوئیں، لاکھوں روپیہ کا مادّی نقصان ہوا مگر ہم میں سے کسی کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ کیا ایک فرد بھی ایسا تھا جس نے بارگاہِ احدیت میں توبہ واستغفار کیا ہو؟ یہ تو بڑی بات ہے کسی کا قلب بھی مالک کی طرف رجوع نہ ہوا۔ اس پر ہم بہ بانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ ایک خدا کو مانتے ہیں۔ کیا اسی کو ماننا کہتے ہیں؟ کیا ہماری آنکھیں نہیں ہیں۔ کیا ہم قرآن میں نہیں دیکھتے کہ جب حضور سرورِ دوعالمؐ کے پاس عورتیں بیعت کرنے کے لئے آتی تھیں تو ان سے کیا عہد لئے جاتے تھے۔ سورہ ممتحنہ کے آخری رکوع میں ان کی تفصیل موجود ہے۔ پہلا عہد یہ ہے کہ کسی شے کو خدا کا شریک نہ ٹھہرائیں، کسی کو اس کے سوا کارساز نہ مانیں۔ اب ذرا اپنے حال پر غور کریں۔ ہم نے تو دُنیا کے مال و دولت کو ہی کارساز سمجھا ہوا ہے اسی وجہ سے رشوت و چور بازاری کا بازار گرم ہے۔

مذکورہ رکوع میں آخری عہد یہ ہے کہ نیکی کے کاموں میں احکام خدا ور رسولؐ کی نافرمانی نہ کریں۔ ہم بغیر اس کے کہ مالک سے کوئی عہد کیا ہو مسلمان ہونے کا دعوی کرتے پھرتے ہیں۔ بس مسلمان کے گھر میں پیدا ہونا ہی مسلمانی کے لئے کافی سمجھ لیا ہے۔ صرف زبان سے کلمہ پڑھ لیا اور ہم سچے اور پکے مسلمان ہو گئے۔ خدا اور رسولؐ کو تو اسی لئے مانا جاتا ہے کہ انکے بتلائے ہوئے راستہ پر چلیں۔ ان کے احکام کی پیروی کریں ہم کو خدا اور رسولؐ سے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ کیا ہمارے لئے ضروری نہیں کہ اپنے رب سے اس کے احکام کی تعمیل کرنے کا عہد کریں۔ عہد کے بعد ہی ہم کہہ سکیں گے کہ ہم مسلمان ہیں ورنہ اگر ہم جھوٹے مدعی ہی بنے رہے تو عذاب الٰہی سے ہمیں کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ رب العالمین ہمیں توفیق توبہ اور توفیق خیر عطا فرمائے تاکہ ہم اس کے احکام کی تعمیل کر کے اس کی رحمت کے مستحق ہو سکیں اور عذاب سے مامون ہو جائیں۔

آیئے ہم سب بارگاہِ احدیت میں صدق دل سے دعا کریں۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ○

۲۔ تمثیلاتِ نواہی

(۱) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ البقرۃ

(اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے انہیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم کو اس کا شعور نہیں ہے)

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ ۙ ﴿۱۶۹﴾ آل عمران

(اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو ہرگز مُردہ خیال نہ کر لینا بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے رب سے رزق پاتے ہیں)۔

کیوں پیارے بھائیو! مسلمانو! کچھ سمجھ میں نہیں آتا اللہ پاک تو فرماتے ہیں خدا

کی راہ میں شہید ہونے والے مرتے نہیں بلکہ وہ زندہ رہتے ہیں جس طرح فرشتے و جنات ہم کو نظر نہیں آتے حالانکہ ان کی قوتِ عمل اور طاقت کا ہم اعتراف کرتے ہیں مگر ہمیں ان کا احساس و شعور نہیں ہوتا۔ اسی طرح شہداء کی زندگی کا بھی ہمیں شعور نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں ان کو مردہ نہ سمجھ لینا۔

لائق غور امر یہ ہے کہ کیا محبوبِ کبریا اشرف الانبیاء کی منزلت سے کسی کی منزلت زیادہ ہو سکتی ہے؟ بھلا جس کے حکم پر جان قربان کر دینے والے کو درجۂ شہادت نصیب ہو اس کی شان ارفع ہوگی یا شہید ہونے والے کی؟ جس کی شان میں ربّ العزت فرماتے:

عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۷۹) بنی اسرائیل (قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود تک پہنچائے) بھلا اس کے مرتبے کس کا مرتبہ زیادہ ہو سکتا ہے۔ پس جب شہید راہ خدا نہیں مرتا بلکہ زندہ رہتا ہے تو جس کے حکم پر جان دینے سے شہادت نصیب ہو وہ کیسے مر سکتا ہے؟ اُس کو کیسے مُردہ سمجھا جائے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے اکثر علماء یہ کہتے ہیں کہ رسولؐ بھی ہم جیسے ہی آدمی تھے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے "قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" (۱۱۰) الکہف (کہدو میں تمہاری مثل بشر ہوں) اور یہ بھی فرمادیا ہے "اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ" (۳۰) الزمر (تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی سب مریں گے) لہٰذا رسولؐ بھی ایک آدمی تھے موت آئی اور مر گئے۔ مٹی مٹی میں مل گئی۔ اب سمجھ میں نہیں آتا۔ شہدا بھی تو ہمارے جیسے آدمی ہوتے ہیں ان کے اجسام بھی مُردہ ہو جاتے ہیں۔ مگر اللہ پاک کہتے ہیں ان کو مُردہ نہ جانو اور میت نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ بڑی سخت دُشواری ہے۔ ہم علماء کرام کی بات مانیں یا اللہ میاں کی؟ اصل بات تو یہ ہے کہ اللہ میاں کو نہ تو ہم نے دیکھا ہے، نہ بولتے سُنا، نہ چھُونے سے کبھی احساس ہوا مگر حضرات علماء کرام کو تو ہم دیکھتے ہیں، بولتے سُنتے ہیں، وہ ہی ہمیں دین کی باتیں بتلاتے ہیں، بھلا ان کی بات کیسے نہ مانیں۔ مگر معاملہ غور طلب ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہمیں حق کی طرف ہدایت کرے۔!!

(۲) وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (۳۷) بنی اسرائیل

(زمین پر اکڑ کر دھمکے سے نہ چل تو زمین کو ہرگز نہ پھاڑ سکے گا اور ہرگز نہ پہنچے گا تو پہاڑوں کی لمبائی کے برابر)

ہم میں سے جو لوگ قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں سرسری نظر سے آیات پر سے گزر جاتے ہیں۔ دیکھیں کہ یہاں غرور و تکبر سے زمین پر اکڑ کر چلنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ نفس امارہ تو ایسی آیات پر غور ہی نہیں کرنے دیتا۔ اگر کسی شخص کو کچھ احساس بھی ہو گیا تو وہ فوراً بولنا شروع کر دے گا۔ میاں سارے قرآن پر بھلا کون عمل کر سکتا ہے۔ یہ تو بڑے متقی اور پرہیزگار بھی نہیں کر سکتے۔ اور بھلا اللہ میاں کیا ذرا ذرا سی بات کی پکڑ کریں گے! ایک شاعر نے کہا تھا:

ہو جائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خفا
کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے

بھلا اس دُنیا میں رہتے ہوئے یہ باتیں کیسے ہو سکتی ہیں کہ نیا سوٹ پہن کر چلیں جبکہ بہت سے آدمی سامنے خراب کپڑے پہنے پھر رہے ہوں اس وقت بھی اکڑ کر نہ چلیں۔ اپنی بڑے سائز کی موٹر کار سے اُتریں عملہ سلام کے لئے حاضر ہو بہت سے پست آدمی سلام کہہ رہے ہوں۔ اس وقت بھی اکڑ کر نہ چلیں تو اسٹاف پر رُعب کیسے پڑے بھائی آج کل کی سیاست کے تو یہ بات خلاف ہے۔ یہ باتیں تو پُرانے زمانہ کے لئے ہی موزوں تھیں اس زمانہ میں چل نہیں سکتیں۔

عقل کہتی ہے نفسِ امارہ کی بات نہ سُن بلکہ اس پر غور کر کہ تو خاک سے بنایا گیا ہے۔ خاک ہی تجھ کو رزق دیتی ہے، خاک ہی سے تجھ کو غذا میسّر آتی ہے۔ وہ تو تیری ماں ہے۔ کیا ماں کی چھاتی پر اکڑ کر پیر رکھنا تجھے مکروہ معلوم نہ ہوگا؟ وہ دُنیا کی مخلوقات میں سب سے زیادہ امانت دار ہے۔ ان خوبیوں کے باوجود اس نے اتنا تذلّل اختیار کیا ہے کہ سب کے پیروں سے روندی جاتی ہے۔ اس کی یہ ادا خالق کو پسند آتی ہے۔ لہٰذا اس نے اتنی عزت افزائی فرمائی ہے کہ اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ میرا تقرب حاصل کرنے کو میرے آگے خاک پر منھ رکھو۔ سجدے میں خاک پر منھ رکھنا افضل ہے اس کی منزلت دیکھنا ہو تو اس پر غور کرو کہ سیّد الانبیاء والمرسلین، محبوب رب العالمین اپنے مالک و آقا کے سامنے خاک ہی پر منھ رکھتے تھے۔ اب ہمیں چاہیے کہ اسے ذلیل نہ جانیں اور اس کی قدر و منزلت پہچانیں۔

(۳) وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۸۹) البقرۃ

(آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حکام کے یہاں جھونکو تاکہ لوگوں کے مال میں سے کچھ حصّہ گناہ سے کھالو درآں حالیکہ تم جانتے بھی ہو)۔

نفسِ امّارہ تو کہتا ہے کہ یہ ڈیماکریسی کا زمانہ ہے قانون میں سزا سے بچنے کی گنجائش رکھی جاتی ہے اور بڑی مشکل ہے کہ اس زمانہ میں خالی سچ سے کام بھی نہیں چلتا۔ پھر اگر سب ایماندار ہو جائیں تو وکلا کا طبقہ تو بے روزگار ہو جائے گا؟ جب ایمانداری سے کام نہ چلے تو کچھ نہ کچھ بے ایمانی کرنی ہی پڑتی ہے زمانہ ہی ایسا ہے، کیا کریں۔

عقلِ فطری:۔ اے نفسِ امّارہ یہ تو بتلا کیا خدا و رسولؐ کو ماننے کا مقصد وحید یہی نہیں ہے کہ ہم ان کے احکام پر چل کر ہلاکتِ ابدی و عذابِ اخروی سے نجات حاصل کر سکیں؟ اور وہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم احکامِ خدا اور رسولؐ پر عمل کریں۔ اور جب عمل نہ کریں تو پھر اسلام قبول کرنے کا کیا فائدہ؟ ایسا اسلام تو بے دینی ہے جس میں خدا اور رسولؐ کے احکام کی پیروی نہ کی جائے۔ صرف ایک تمثیل سُن لو!

ایک شہر میں ایک ڈاکٹر نے ایسی دوا تیار کی جو مرضِ طاعون کے لئے اکسیر ثابت ہوئی شہر کے گردونواح میں جب بہت سی بستیوں میں یہ وبا پھیلی تو جس شخص نے بھی اس دوا کا استعمال کیا صحت یاب ہو گیا۔ لوگوں نے ڈاکٹر کا بہت احترام کیا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو اس کا یومِ وفات منانے لگے۔ دوا کا نسخہ مع ترکیب استعمال شائع کر دیا۔ شہر میں ہر شخص نے ایک نقل اس کی اپنے گھر میں رکھ لی۔ گھر والے اس کو پڑھتے بہت سوں نے اس کو حفظ بھی کر لیا۔ مگر جب شہر میں طاعون پھیلا کسی نے بھی دوا تیار کر کے اس کا استعمال نہ کیا اور کثیر تعداد طاعون سے ہلاک ہو گئی۔ آباد شہر ویران ہو گیا

کیوں اے نفسِ امّارہ تو بھی اس نسخے کے ساتھ جو حکیم مطلق کا نازل کردہ اور ہلاکتِ ابدی سے بچانے والا ہے ایسا ہی عمل کرنا چاہتا ہے کہ بس اس کو خدا کا کلام مان کر بوسے دے لیا کریں اور رشوت ستانی، چور بازاری، اسمگلنگ، بددیانتی میں مصروف رہتے ہوئے عذابِ الٰہی

ہیں گرفتار ہو کر ہلاک ہو جائیں، تو ایک مثال اور سُن لیں!

محکمہ جنگلات کا رینجر ایک موضع میں جا کر اہل دیہہ سے کہتا ہے کہ یہ درخت جو شارع عام پر ہے محکمہ جنگلات کا ہے۔ تم لوگ جو اس کو کاٹنے کی تیاری کر رہے ہو اسے روک دو۔ اگر کاٹو گے تو تم پر مقدمہ چلایا جائے گا اور سزایاب ہو گے۔ اہل دیہہ نے اس کو کاٹ ڈالا۔ چار آدمی اس جرم میں گرفتار ہوئے۔ عدالت میں بیانات ہوئے تو تین ملزموں نے بیان کیا کہ ہمیں تو اس کا علم ہی نہیں تھا کہ یہ درخت محکمہ جنگلات کا ہے۔ عدالت نے پوچھا کیا رینجر نے تم سے نہ کہا تھا تو جواب دیا کہ ہم تو اس کو جانتے ہی نہ تھے کہ یہ محکمہ جنگلات کا رینجر ہے۔ عدالت نے اُن کو جُرمانہ کی سزا دی۔ اب چوتھا شخص رینجر کو جانتا تھا۔ اس کے پاس کوئی عذر نہ تھا۔ اس نے یہ کہا کہ میں نے تو یہ جانا کہ رینجر صاحب ہنسی ٹھٹھہ کر رہے ہیں۔ اس شخص کو عدالت نے قید بہ سخت و جُرمانہ دونوں سزائیں دیں۔ پس جو خدا کو مان کر اس کے حکم کی ہنسی اُڑاتے ہیں وہ تو منافق ہیں جن کے لئے قرآن کہتا ہے " إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ " (منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے)۔

(۴) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾ الحشر

(اور تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جاؤ جنھوں نے خدا کو بھلا دیا پس اللہ نے ان کے نفسوں کو غافل کر دیا۔ وہی تو ہیں جو بدکار ہیں)۔

اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٩﴾ المجادلہ

(قابو پا لیا ان پر شیطان نے پس ان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ شیطان کے گروہ ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ شیطان کا گروہ ہی نقصان میں رہنے والا ہے)۔

اللہ کی یاد ہی وہ ہے جو بُرائیوں اور مُضر کاموں سے بچاتی ہے۔ اگر اللہ کی یاد دل میں ہو تو کوئی بُرا کام آدمی سے ہو ہی نہیں سکتا۔ بُرائی اسی وقت صادر ہوتی ہے جب اللہ کو بھول جائے۔ شیطان پہلا کام یہی کرتا ہے کہ خدا کو بُھلا دے جب خدا کی یاد دل میں نہیں

رہتی تو شیطان قابو پالیتا ہے۔ جیسا کہ ربّ العزت نے بتلادیا ہے "اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ" بُرے کاموں اور بے حیائی کے افعال کی ترغیب دیتا ہے اور آدمی اس کے پھندے میں پھنس جاتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے شر سے بچائے رکھے۔

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○

(۵) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ...... (۴۳) النساء

(اے وہ لوگ جو ایمان لائے نماز کے قریب بھی نہ جاؤ۔ جب کہ تم نشے میں یا غنودگی کی حالت میں ہو یہاں تک کہ تم یہ جان سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو)۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کو حکم دیا گیا ہے جن کی مادری زبان عربی ہے۔ ان کو آیاتِ قرآنی کا اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں وہ جو کچھ کلام الٰہی پڑھتے ہیں اس کے معانی و مفاہیم کو سمجھتے ہیں۔ ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ ایسی حالت میں نماز نہ پڑھیں جب کہ ان کے ہوش و حواس اتنے درست نہ ہوں کہ وہ یہ جان سکیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ جب تک تم جان سکو کہ کیا پڑھ رہے ہو۔ یہ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب وہ کسی سے بات چیت کرے اور اگر خود ہی نہ سمجھے کہ کیا کہہ رہا ہے تو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ وہ تو فعلِ عبث ہوگا۔ نماز تو اسی لئے ہے کہ بندہ مالک کی بارگاہ میں حاضر ہو کر صدق دل سے کچھ عرض کرے۔ مولائے اُمّم کا فرمان ہے "اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن" (نماز مومن کی معراج ہے)۔ اس وقت تو بندے کو مالک سے قُرب حاصل ہوتا ہے جب وہ صدق دل سے کہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" (اے رب مجھے سیدھا راستہ دکھا)۔ اگر دل سے کہے اور طلب صادق ہو کہ ربّا مجھے وہ راستہ دکھا دے جس پر چل کر تیرا تقرب حاصل کر سکوں تو کوئی وجہ نہیں کہ دریائے رحمت جوش میں نہ آئے اور بندے کی التجا کو وہ قبول نہ فرمائے اس کا تو وعدہ ہے اور وہ اصدق الصادقین ہے۔ وہ تو فرماتا ہے:

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ لا فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ (۱۸۶) البقرۃ

(اور جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو (کہہ دو) میں ان کے قریب ہوں اور جب بھی کوئی دعا کرنے والا مجھ سے دُعا کرتا ہے میں قبول کرتا ہوں۔ پس ان کو چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں)۔

ہر نمازی جب نیت کرتا ہے تو کہتا ہے میں اللہ کی قربت کے لئے نماز پڑھتا ہوں۔ روزہ ہو یا نماز ہر کارِ خیر کی نیت میں آخری فقرہ "قُرْبَتاً اِلَی اللّٰہ" ہی ہوتا ہے تو کیا طوطے کی طرح پڑھنے سے قربت حاصل ہو سکتی ہے؟ علی کرم اللہ وجہ کا بھی ارشاد ہے: "لَاخَیْرَ فِیْ عِبَادَۃٍ لَاتَفَقُّہَ فِیْہِ" (اس عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں سمجھ نہ ہو) یہی سبب ہے کہ نمازیں پڑھتے دسیوں برس گزر جاتے ہیں مگر نفس میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ ذرا سی بھی ترقی نہیں ہوتی حالانکہ نماز کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس سے نفس میں یہ اہلیت پیدا ہو جائے کہ ہم برائیوں سے بچ سکیں گناہوں سے کراہت ہونے لگے جیسا کہ جناب ربّ العزت نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمایا ہے:"..... اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ......" (۴۵) العنکبوت (بہ تحقیق کہ نماز بے شرمی کے اور بُرے کاموں سے باز رکھتی ہے اور اللہ کا ذکر البتہ بہت بڑا ہے (بڑا مرتبہ رکھتا ہے)۔

کیوں پیارے بھائیو! ہم نے نماز سے کوئی فائدہ اُٹھایا؟ یہ تو مالک کی نعمت ہے جس سے مراتب بلند ہوتے ہیں۔ ہم نے اس کو محض اٹھا بیٹھی سمجھ کر ضائع کر دیا ورنہ وہ تو خدا تک رسائی حاصل کرنے کا زینہ تھا۔ افسوس کہ ہم تو اس زینہ پر ایک سیڑھی بھی نہ چڑھے جناب ارحم الراحمین ہم پر رحم فرمائے اور اس کی طرف لو لگانے اور دل سے عرض و معروض کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

(۶) "وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ" (۳۶) بنی اسرائیل

(اور جس کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو)۔

دیکھئے انسان کے پاس حصولِ علم کے ذرائع اس کے حواس خمسہ ظاہری ہیں۔ دیکھنا، سننا سونگھنا، چکھنا اور چھونا۔ انہیں سے اس کو اشیا و حالات کا علم ہوتا ہے۔ پس جو کچھ عالم محسوس

سے باہر ہے اس کا علم اس کو ہو ہی نہیں سکتا مگر ہم نے غیر محسوس عالم پر مباحث کو ہی مذہب کی بنیاد بنالیا ہے۔خدا کے وجود اور اس کی صفات پر بحثیں، فرشتوں، جنت، دوزخ، شیطان وغیرہ جن کا عالم محسوس سے کوئی تعلق نہیں ان پر بحثیں کرنے سے سوائے تضیع اوقات اور گمراہی کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ عالم غیب تو ادراک سے ہی کچھ سمجھ میں آتا ہے اور قوت ادراک اوامر پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم احکام پر تو عمل کرتے نہیں اور بغیر قوت ادراک حاصل کئے غیب کو سمجھنا چاہتے ہیں اس لئے گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ عمریں گزر جاتی ہیں مگر غیب کا ادراک حاصل نہیں ہوتا ہمیں چاہیے کہ پہلے محکمات پر عمل کریں اور رب العزت کی بارگاہ سے استدعا کرتے رہیں کہ وہ اپنے احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

۳۔ امم سابقہ کے حالات

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ .... (۸۴) ہود۔ (اور ہم نے مدین والوں کے پاس ان کے بھائی شعیب کو پیغامبر بنا کر بھیجا انھوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں)۔

وَيَٰقَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ...... (۸۵) ہود

(اور اے میری قوم پیمانے اور ترازو انصاف کے ساتھ پورے اور برابر کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین پر فساد پھیلاتے نہ پھرو)۔

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ (۹۴) ہود

(اور جب ہمارا حکم پہنچا تو ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے نجات دی اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک چنگھاڑ نے لے ڈالا پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے)۔

اہل مدین یعنی حضرت شعیبؑ کی قوم میں یہ دو بڑی برائیاں تھیں۔ ناپ تول میں بے ایمانی

کرنا۔ زیادہ لینا اور کم دینا۔ دوسرے رہزنی۔ حضرت شعیبؑ نے ہر چند سمجھایا کہ خدا کو مانو یہ کام اس کی ناراضگی کے سبب ہیں۔ ان سے باز آؤ مگر کسی نے نہ سُنا بہت تھوڑے آدمی ان کے مطیع ہو گئے باقی سب باغی رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سخت گرمی پیدا کر دی۔ ایک نہایت ٹھنڈا بادل آیا اس کے نیچے سب جمع ہو گئے۔ اس اَبر نے سارے شہر کو گھیر لیا۔ پھر ایک زبردست چنگھاڑ کی آواز آئی کہ زمین لرزنے لگی اور سب ہلاک ہو گئے۔

کیوں پیارے بھائیو، مسلمانو! ہمارے کتنے بھائی چور بازاری، بد دیانتی، ڈاکہ زنی میں مصروف ہیں؟ خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہوئے وہی اعمال کر رہے ہیں جن کے سبب اُمم سابقہ ہلاک ہو گئیں۔ ہمارے ہاتھ میں خدا کی کتاب ہے اس کو پڑھتے بھی ہیں مگر اُمم سابقہ کی ہلاکت کے بیانات کو صرف قصّہ کہانی سمجھتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ قصے ہماری وقت گزاری اور تفریح طبع کے لئے بیان کئے ہیں؟ ان کے بیان کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم ان سے عبرت حاصل کریں اور ایسے اعمال نہ کریں جن کے باعث قومیں عذاب خدا سے ہلاک ہو چکی ہیں۔ فاعتبروا یااُولی الابصار۔

(۲) وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۷۳﴾ الاعراف ۔ (اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا صالح نے کہا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلی ہوئی نشانی آ چکی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اسے کوئی برائی نہ پہنچانا ورنہ دردناک عذاب تمہیں پکڑ لے گا

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۷۷﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿۷۸﴾ الاعراف ۔ (انھوں نے اونٹنی کو پے کر دیا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہا اے صالح اگر تو رسولوں میں سے ہے تو وہ عذاب لے آجس کا

تو عدہ دیتا ہے پس ان پر زلزلہ آیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے)۔

حضرت صالحؑ قوم ثمود کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ ان کی قوم نے ان سے یہ معجزہ طلب کیا کہ تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ اس پہاڑ سے ایک اونٹنی نکل آئے۔ پھر ایک بچہ دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ جب اونٹنی اور بچہ ان لوگوں کے سامنے آ گئے تب بھی سوائے چند نفر باقی ایمان نہ لائے بلکہ کہنے لگے یہ تو جادو ہے۔ حضرت صالحؑ نے قوم سے کہا کہ ایک دن چشمہ کا پانی یہ اونٹنی پیئے گی اور جتنا پانی پیئے گی اتنا ہی دودھ دے گی۔ اس روز تم اور تمہارے مویشی اس کا دودھ پئیں۔ دوسرے دن چشمہ کا پانی تم پیو اور اپنے مویشیوں کو پلاؤ۔ دیکھو! اس اونٹنی کو کوئی گزند نہ پہنچانا ورنہ تم پر عذاب آ جائے گا۔

حضرت صالحؑ کے اس کھلے ہوئے معجزے سے قوم کے دل میں اور زیادہ شقاوت ہو گئی۔ اس اونٹنی کے دشمن ہو گئے آخر ایک شخص نے اس کی کونچیں کاٹ دیں جب وہ گری تو تمام افراد قوم نے کلہاڑیوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ حضرت صالحؑ نے ان سے کہا کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم سے کہہ دوں کہ اگر اب بھی توبہ کر لو تو تمہارا جرم معاف کر دیا جائے گا۔ تمہیں صرف تین دن کی مہلت ہے۔ کل تمہارے منہ زرد ہو جائیں گے اور پرسوں سرخ۔ اس کے اگلے دن سیاہ ہو جائیں گے اور وہی دن تمہاری ہلاکت کا ہو گا۔ چنانچہ دوسرے دن ان کے چہرے زرد ہو گئے۔ تو آپس میں کہنے لگے کہ دیکھو جو کچھ صالحؑ نے کہا تھا وہی ظاہر ہوا مگر ان کے قلوب کی شقاوت کم نہ ہوئی۔ اس کے اگلے دن ان کے منہ سرخ ہو گئے۔ تیسرے دن سیاہ ہو گئے۔ مگر یہی کہتے رہے کہ یہ صالح کا جادو اور نظربندی ہے اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ ایک بڑی سخت چنگھاڑ کی آواز آئی اور زلزلہ آیا جس سے تمام افرادِ قوم ہلاک ہو گئے۔

افسوس کہ ہم نے قرآن کو قصّے کہانیوں کی کتاب سمجھ رکھا ہے! امم سابقہ کے واقعات پڑھ کر یہ سمجھ کر ان پر سرسری نظر کر کے گزر جاتے ہیں کہ یہ تو قوم ثمود کا قصہ ہے۔ کفار و مشرکین کا ذکر ہے اس کا بھلا ہم سے کیا واسطہ حالانکہ ربّ العزّت نے فرمایا ہے ﴿يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ (حق کی طرف توجہ نہ کرنے والے کہتے ہیں

اور کہتے رہیں گے کہ یہ تو صرف پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں)۔ اور جناب باری تعالیٰ نے ہمیں اس سے بھی آگاہ کردیا ہے کہ یہ قصّے تفریحِ طبع کے لئے نہیں بیان کئے گئے ہیں بلکہ ان میں صاحبانِ عقل کے لئے عبرت ہے۔ جیساکہ ارشاد ہے" لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ .... (۱۱۱) یوسف (البتہ ان کے (اُمم سالقہ) قصّوں میں صاحبانِ عقل کے لئے عبرت ہے)۔

بیشک ان میں عبرت ہے مگر ان کے لئے جو عقل سے کام لیں نہ کہ ہمارے لئے جو عقل سے کام ہی نہیں لیتے۔ اگر غور کرتے تو معلوم ہوتا کہ اس قصّے میں نفسِ انسان کی یہ فطرت ظاہر کی گئی ہے کہ جو خیالات و عقائد نفوس کو اپنے ماحول و آباء سے ورثہ میں ملتے ہیں ان کے خلاف وہ کچھ سُننا ہی نہیں چاہتے۔ کھُلی ہوئی نشانیاں اور ظاہر و باہر دلائل دیکھ کر بھی حق کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ ہم کو یہ عقیدہ ورثہ میں ملا ہے کہ ہمیں خدا کے وجود کا یقینِ قلبی حاصل ہے حالانکہ حواس خمسہ میں سے کسی ایک حس سے بھی ہمیں اس کا احساس نہیں ہوا۔ کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ موت کو تو ہم دیکھتے ہیں۔ ہمارے سامنے کتنے ہی آدمی مرتے ہیں ہم ان کو دفن کرتے ہیں۔ تجہیز و تکفین دیکھتے اور اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے ہوئے بھی کیا ہمیں اپنی موت کا یقینِ قلبی حاصل ہوا؟ ہرگز نہیں۔ اگر موت کا یقینِ قلبی حاصل ہوجاتے تو گناہوں اور جرائم پر جرأت کیوں ہو؟ کلام پاک میں کتنی جگہ کشتی کی سواری کی مثال دے کر ہمیں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دیکھو جب موت کا یقین ہوجاتا ہے تو تمہارے قلب کے تعلّقات ماسوائے منقطع ہوجاتے ہیں اور اس وقت خلوصِ دل سے اللہ کو پکارنے لگتے ہو۔ اگر ہمارے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والے قلوب ہوں تو دیکھیں اور سمجھیں کہ کسی شخص کی موت سے ہمارے قلوب پر وہ کیفیت نہیں پیدا ہوتی جو موت کے یقین سے ہونی چاہئیے کہ خلوصِ دل سے رب کی طرف متوجّہ ہوجائیں۔ جب ہمیں موت کا یقینِ قلبی حاصل نہیں جس کا ہمیں احساس ہوتا رہتا ہے تو خدا کے وجود کا یقینِ قلبی کیسے ہوسکتا ہے جس کا کبھی احساس یا ادراک ہوا ہی نہیں؟ یہ تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب صدق دل سے بارگاہِ رب العزّت سے طلب کریں۔ یہ تو ایسی نعمت ہے جو بغیر طلب حاصل نہیں ہوسکتی۔ رَبَّنَا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔

(۳) وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ
اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ
اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿
۲۰﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ
﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ
مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ
كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ
﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾ الدخان

(اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی ان کے پاس ایک کریم رسول آیا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دیں تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں اور اللہ سے سرکشی نہ کرو میں تمہارے پاس روشن دلیل لایا ہوں۔ میں اپنے اور تمہارے رب سے پناہ مانگ چکا ہوں اس سے کہ تم مجھے سنگسار کرو اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ ہو جاؤ پھر اپنے رب کو پکارا کہ یہ قوم مجرم ہے (حکم ملا) میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل وہ تمہارا پیچھا کریں گے اور دریا کو خشک چھوڑ جا البتہ وہ لشکر غرق ہونے والے ہیں۔ کتنے باغ اور چشمے وہ چھوڑ گئے اور کھیتیاں اور نفیس مکانات اور نعمتیں جن میں عیش و چین کیا کرتے تھے۔ یوں ہی ہوا۔ ان تمام چیزوں کا دوسرے لوگوں کو وارث بنا دیا۔ پس ان پر زمین و آسمان نے گریہ نہ کیا اور نہ انہیں مہلت دی گئی)۔

پیارے مسلمان بھائیو! ذرا سوچو اور غور کرو کہ فرعون کے مظالم، نافرمانی اور ہلاکت کا ذکر کلام پاک میں بیس سے زائد مقامات پر آیا ہے۔ اتنے تکرار کی کیا ضرورت تھی؟ صاحبان عقل جانتے ہیں کہ یہ سب ہماری ہدایت کے لئے ہے تاکہ ہم فرعون نہ بن جائیں۔ خدائے قہار کے عذاب سے ڈرتے رہیں ظلم و فساد سے بچیں۔ بے عقلی کے کام نہ کریں۔ مگر ان کو تو ہم قصہ کہانی سمجھتے ہیں۔ اور قصے کے طور پر ہی پڑھتے اور سنتے ہیں۔ کیا ان حالات کو پڑھ کر یا سن کر کبھی ہمارے قلوب لرزتے ہیں؟ اثر کیسے ہو فرعون اور اس کی قوم پر طرح طرح کے عذاب آئے، کبھی ٹڈیاں کبھی جوؤں کا طوفان، کبھی ان کا پانی خون ہو گیا جب عذاب سخت ہوتا تو کہنے لگتے یہ

ٹل جائے تو ایمان لے آئیں گے۔ ادھر عذاب ہٹا کر عہد شکنی کرنے لگے افسوس کہ ہمارا حال تو قوم فرعون سے بدتر ہو گیا ہے۔ ہمیں تو بلاد مصیبت میں بھی خدا یاد نہیں آتا۔ ہم تو اس کو عذاب ہی نہیں سمجھتے۔ جب تک بادشاہت کا دَور تھا تو جس بادشاہ کو فتوحات نصیب ہوتیں اور دشمنوں کے خوف سے مامُون ہو جاتا تو وہی فرعون بن جاتا تھا۔ اَب تو جمہوریت کا زمانہ ہے ہر ایک ہی بادشاہ ہے پھر ہم میں کا ہر شخص فرعون کیوں نہ بنے۔ دُرست کہ کچھ نیک نفس بھی ہیں مگر اطلاق تو کثرت پر ہوتا ہے۔ تاجروں کو دیکھتے ہیں تو مال ان کا معبود ہے۔ غذا میں مضر اشیاء ملا کر اپنے معبود کی محبت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان کو عوام کی صحت کی بربادی کا ذرا غم نہیں ہمارے عوام کی فرعونیت دیکھنی ہو تو مظاہرے دیکھیں۔ کس قدر بے عقلی اور فرعونیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کیا احتجاج بے عقلی کے کاموں ہی سے ہو سکتا ہے۔ ایک بے عقل و لاشعور بچہ ضد اور غصہ میں اپنا سَر دیواروں سے ٹکراتا ہے۔ اپنے ہی کپڑے پھاڑتا ہے۔ ہمارے مظاہرین بھی لاشعور بچوں کی طرح اپنے ہی نقصانات کرتے ہیں۔ اپنی ہی عمارتوں کو نقصان پہنچانا، اپنی ہی بسوں اور کاروں کو خراب کرنا مظاہرین کے کام ہوتے ہیں اس پر دعویٰ کہ ہم دینِ اسلام کے پیرو ہیں۔ قرآن تو کہتا ہے "وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ" (اور وہ (اللہ) نجاست ڈال دیتا ہے ان لوگوں پر عقل سے کام نہیں لیتے) اگر ہم مسلمان ہیں تو خدا کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے؛ ہم کو لازم ہے کہ بے عقلی کے کام نہ کریں۔

زعما کو دیکھتے ہیں تو وہاں بھی اکثریت ایسی ہی نظر آتی ہے کہ مال دُنیا، نام و نمود، عزّت و شہرت، عہدے اور کرسیاں ان کے اللہ ہیں جن کے حصول کی کوشش میں وہ بھی فرعون بن کر عوام کالانعام سے اپنی پوجا کراتے ہیں اگر فساد پھیلا کر حصولِ مقصد میں کامیابی کی اُمید ہو تو طلباء و عوام کو آلۂ کار بناتے ہیں۔ میرا گاؤں، میرا ضلع، میرا صوبہ، میری زبان۔ یہ میرا میری ایسے ہتھیار ہیں کہ ان کے سامنے نفسِ امّارہ فوراً سر خم کر دیتا ہے اور زعما کے ہاتھ میں یہی بہترین ٹول ہوتے ہیں۔ دارالعلوم اور کالجوں کے طلبا اور عوام جن کو دُنیا کی چالبازیوں کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا بڑی آسانی سے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ ان میں کوئی اس پر غور نہیں کرتا کہ انتخابات سے قبل جو منشور شائع ہوتے ہیں کیا برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان پر عمل کیا جاتا ہے؟؟۔

نہیں ہرگز نہیں۔ معاہدے تو ایفا کے لیے ہوتے ہی نہیں۔ اب ان باتوں کا زمانہ نہیں رہا۔ اب دُنیا ترقی کر گئی ہے۔ فرعون اور اس کی قوم تو جب ان پر بلا آتی تھی اس کو عذاب سمجھتے تھے مگر ہم نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ عذاب کو عذاب بھی نہیں جانتے۔ خدا ہمارے حال پر رحم کرے اور اس عذاب عظیم سے قبل ہی جو تمام دُنیا پر آنے والا ہے توفیق توبہ عطا فرمائے۔

(۴) لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ الاعراف

(ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا انھوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے میں تمہاری نسبت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ان کی قوم کے سرداروں نے کہا ہم تم کو دیکھتے ہیں کہ تم کھلی گمراہی میں ہو)......

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ الاعراف

(پس انھوں نے اس کو جھٹلایا پس ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو کشتی میں نجات دی اور غرق کر دیا ان لوگوں کو جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ بہ تحقیق کہ وہ لوگ اندھے تھے)۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَاۤ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾ الحاقۃ

(جب پانی چڑھنے لگا ہم نے تمہیں کشتی میں اٹھا لیا تا کہ اسے تمہارے لئے باعث نصیحت قرار دیں اور اسے یاد رکھنے والے کان یاد رکھیں)۔

پیارے بھائیو! مسلمانو! اسلام کی پیروی کا دعویٰ کرنے والو! ہماری عقل فطری کہتی ہے: دیکھو تمہارا رب تو فرماتا ہے ہم نے تم کو طوفان کے وقت کشتی میں اس لئے اٹھا لیا تھا کہ یہ طوفان تمہارے لئے نصیحت کا سبب ہو۔ تم اس سے سبق حاصل کرو اور حق کو یاد رکھنے والے کان سن کر یاد رکھیں مگر افسوس ہمارے پاس تو سننے والے کان بھی نہیں یاد تو بعد

میں رکھ سکیں گے، پہلے حق سُنیں تو سہی۔ طوفانِ نوحؑ کا تذکرہ کلام پاک میں بیس مقامات پر ہے۔ ہُوا کرے ہمیں کیا، یہ تو کفّار کا ذکر ہے۔ ہم تو بڑے کھرے مسلمان ہیں۔ پھر ہمیں اس قصّہ سے کیا واسطہ۔ قوم عاد پر ہَوا کا طوفان آیا۔ قوم نوحؑ پر پانی کا طوفان آیا اور تمام قوم ہلاک ہوگئی۔ کہانی سُن لی۔ خدا کی کتاب میں بھی پڑھ لیا تفریحِ طبع ہوگئی۔ کیا ہم پر ہَوا کے اور پانی کے طوفان نہیں آئے جن میں ہزاروں مویشی ہلاک ہوئے کھیتیاں، مکان، مال و اسباب تباہ ہوئے۔ کیا ہم نے اس کو عذاب سمجھا؟ کیا کسی قلب پر خوفِ الٰہی طاری ہوا؟ کیوں ہوتا اس لئے کہ ہم تو ہیں ہی مسلمان۔

نفس امّارہ کہتا ہے بات یہ ہے کہ جہالت کے زمانے میں علومِ فطرت سے لوگ ناواقف تھے جو بلیّاتِ ارضی و سماوی نازل ہوتی تھیں لوگوں کو ان کے اسباب و علل کا علم نہ تھا اسلئے اس کو عذاب سمجھ لیتے تھے۔ اب تو روشنی کا زمانہ ہے، دُنیا ترقّی کر گئی ہے، جہالت کی تاریکی دُور ہوگئی ہے۔ اَب تو ہر بات کا سبب معلوم ہوجاتا ہے۔ تمام مہذب دُنیا، سارے ترقی یافتہ ممالک میں (CAUSE AND EFFECT) اسباب و نتائج، علل و اثرات کا چرچا عام لوگوں کی زبان پر ہے پھر بتاؤ ہم (CIVILIZED) مہذب مسلم ہو کر ترقی یافتہ اقوام کے سامنے مسبب الاسباب اور علّتِ العلل کا ذکر کر کے کس طرح اپنے کو ان کی نظر میں ذلیل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم عذاب کا لفظ بھی زبان پر لائیں تو وہ ہمیں جہالت کا طعنہ دیں گے کہ ان لوگوں کو اس کا سبب معلوم نہیں۔

عقل کہتی ہے کہ کیا تمہارے پاس آنکھیں نہیں کیا تمہارے پاس سُننے والے کان نہیں۔ کیا ہم نہیں دیکھ رہے کہ (CAUSE AND EFFECT) کا سبق دینے والے سائنس کی بے انتہا ترقّی کے باوجود کسی طیّارے کو فضا میں آگ لگنے سے نہیں بچا سکتے۔ کسی (TANKER) کو جل کر تباہ ہونے سے محفوظ نہیں کر سکتے۔ کسی جہاز کو طوفان میں غرق ہونے سے نہیں روک سکتے۔ ٹریفک کے ایکسیڈنٹس میں سیکڑوں اشخاص کو ہلاک ہونے سے نہیں بچا سکتے۔ کسی بادی یا بحری طوفان، کسی آفتِ ارضی و سماوی کو نہیں روک سکتے۔ وہ تو صرف اصولِ فطرت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فطرت پر غلبہ ان کو حاصل نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ اہلِ دُنیا کتنی ہی ترقی کر جائیں نیچر کی

تباہ کُن طاقتوں کا مقابلہ کرنا کبھی ممکن نہیں ہوگا۔ یہ تو صرف ایک ہی ہستی ہے جس نے یہ قانون بنائے ہیں وہ ہی ان کو توڑ سکتی ہے۔ اگر اس سے لو لگائیں بہ خلوص دعا کریں تو البتہ بلائیں رَد ہو سکتی ہیں۔

نفسِ امّارہ کہتا ہے، بات یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں ترقّی اُن ہی اقوام نے کی جنھوں نے مذہب کو خیر باد کہہ دیا اور اگر کچھ رہا بھی تو برائے نام۔ اب ان ملکوں کی حالت دیکھو جو خدا کو ماننے والے ہیں کہ وہی دُنیا میں پست و ذلیل ہیں۔ مہذب اقوام کے سامنے اب مذہب کا نام لیتے بھی شرم آتی ہے۔ ان کے سامنے مسبّب الاسباب کا ذکر کرنا بھی اپنی ہنسی اُڑوانا ہے۔

عقل کہتی ہے ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ خدا اور رسولؐ کے ماننے کا دعویٰ کرتے ہوئے ان کے کس کس حکم پر عمل کر رہے ہو؟ خدا اور رسولؐ کو تو اسی لئے مانا جاتا ہے کہ ان کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ ایمان کے معنی تو یہ ہیں کہ زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرتے ہوئے عمل کرے۔ اگر عمل نہیں تو ایمان بھی نہیں۔ ایمان نہ ہونے پر خدا کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے منافق ہیں جس کے لئے قرآن کہتا ہے "اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ" (منافق جہنّم کے پست ترین طبقہ میں ہوں گے) کفار و مُشرکین کے لئے اتنا شدید عذاب نہیں جتنا منافق کے لئے ہے۔ مان کر نہ ماننے والا زیادہ مجرم ہوتا ہے۔

افسوس ہمارے ہاتھوں میں خدا کی کتاب ہے جس میں تمام آفات ارضی و سماوی کے اسباب اور ان کی تباہیوں سے محفوظ رہنے کے طریقے کھول کر بیان اور مادی و روحانی ترقی کے طریقے بھی واضح کر دیئے گئے ہیں۔ مگر ہم نے اس سے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا اور اب بھی اسکی طرف توجّہ نہیں کرتے۔ قرآن کو کتاب فطرت سمجھ کر اس پر غور و فکر کرنے والا ہی اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ افسوس مُشرکین تو اس کو اتنا سمجھ لیں کہ یہ کہہ اُٹھیں کہ جب تک مُسلمانوں کے ہاتھ میں یہ کتاب ہے اس قوم کو مُردہ نہیں سمجھنا چاہیئے یہ سویا ہوا شیر ہے۔ ہاں اے سوتے ہوئے شیرو! اب بھی وقت ہے کہ جاگ جاؤ اور اس کتاب پر عمل کرو تاکہ تم دُنیا کو ایک بار پھر ہلا دو اور قرنِ اوّل کی یاد تازہ کر دو۔

۴۔ آیات معاشرت و تمدّن

① لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۭ...... (۶۱) النور

(نہ تو نابینا کے لئے کوئی مضائقہ ہے اور نہ لنگڑے شخص کے لئے اور نہ بیمار کے لئے کوئی حرج اور نہ خود تم لوگوں کے لئے مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھانا کھاؤ یا اپنے دادا نانا کے گھروں سے یا اپنی ماں دادی نانی کے گھر سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اس گھر سے جس کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہیں یا اپنے دوستوں کے (گھروں سے) اس میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں کہ سب کے سب مل کر کھاؤ یا الگ الگ (تا آخر)۔

یہ اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا کیسا نفیس قاعدہ ہے کہ سب امیر و غریب، اندھے لنگڑے یا مریض ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں اس سے باہم موانست پیدا ہوتی ہے نفس سے غرور و تکبّر دفع ہوتا ہے! انکساری پیدا کرنے کے لئے بہت مفید ہے۔

② وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۲۳) وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۭ (۲۴) بنی اسرائیل

(اور تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ اور ماں باپ سے نیکی کرنا اور اگر ان میں سے ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کو کسی بات

کے جواب میں) اُف بھی نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے ادب سے بات کرنا، ان کے آگے عجز و نیاز کا پہلو جھکائے رہ اور ان کے حق میں (دعا کرتا رہ) اے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ ان دونوں نے بچپنے میں میری پرورش کی)۔

خالق کائنات ہمیں حکم دے رہا ہے کہ اپنے ماں باپ کا جو تمہارے مجازی خالق ہیں بہت احترام کرو۔ ان سے نہایت نرمی اور محبت سے بات کرو۔ جو شخص اس حکم کی تعمیل نہ کرسکے وہ ربّ العٰلمین کے دیگر احکام کی تعمیل بھی نہیں کرے گا اور اس کے تمام اعمال بھی رائیگاں جائیں گے۔

۳ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘-اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًاؕ-اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُؕ-وَ اتَّقُوا اللّٰهَؕ-اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ۱۲ الحجرات

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے گمان کر لینے سے بہت بچو۔ تحقیق کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور دوسروں کے حال کی ٹوہ نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ اس سے تم کو نفرت ہوگی اور خدا سے ڈرو۔ اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

کلام پاک میں ظن کی بابت کتنی جگہ کہا گیا ہے کہ اس سے بچو۔ ظن حق سے بے پروا نہیں کرسکتا، گمان حق نہیں ہوسکتا۔ کسی کا عیب اس کی غیبت میں ظاہر کرنا ایسا ہے جیسا کہ مُردہ بھائی کا گوشت کھایا۔ عیوب کا بیان کرنا اور سننا دونوں ہی نفس کے لئے مُضر ہیں۔

۵۔ عالم مادّی کی مثالیں

۱ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ۪ وَّ

تَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ
يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ البقرۃ

(بیشک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور دن اور رات کی تبدیلی میں اور کشتیوں میں جو دریا یا سمندر میں چلتی ہیں جن سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور اس پانی میں جو اللہ نے بلندی سے برسایا اور زندہ کیا اس سے زمین کو بعد اس کے کہ وہ مردہ ہوگئی تھی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادل میں جو زمین اور آسمان کے درمیان ٹھہرا رہتا ہے عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں)۔

کلام پاک میں عالم مادّی کی خلقت اور اصول فطرت سے جتنے عمل ورد عمل ہوتے رہتے ہیں وہ اسی لئے بیان کئے گئے ہیں کہ ہم ان میں غور کریں اور اصول فطرت سے واقفیت حاصل کریں مگر افسوس کہ ہم نے خدا کے کلام سے فائدہ نہ اُٹھایا۔ خدا سے تو کسی کی رشتہ داری نہیں ہے جو اس کے قوانین کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اس کو عطا فرمائے گا۔ جو احکام کی پیروی نہ کریں گے گھاٹے میں رہیں گے۔

(۲) اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزۡجِيۡ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيۡنَهٗ ثُمَّ يَجۡعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى
الۡوَدۡقَ يَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ جِبَالٍ فِيۡهَا مِنۡۢ بَرَدٍ فَيُصِيۡبُ
بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَصۡرِفُهٗ عَنۡ مَّنۡ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرۡقِهٖ يَذۡهَبُ بِالۡاَبۡصَارِ ﴿۴۳﴾
يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّاُولِى الۡاَبۡصَارِ ﴿۴۴﴾ النور

(کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے پھر انہیں باہم ملاتا ہے پھر ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے درمیان میں سے مینہ خارج ہوتا ہے اور آسمان میں (جو جمے ہوئے بادلوں کے) پہاڑ ہیں ان میں سے اولے اُتارتا ہے پھر وہ ان کو جس پر چاہتا ہے ڈالتا ہے اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں کی روشنی لے جائے۔ وہ تو رات اور دن کو ادل بدل کرتا رہتا ہے۔ بہ تحقیق کہ ان میں آنکھوں والوں کے لئے عبرت ہے۔

(۳) ... وَهُوَ بِكُلِّ خَلۡقٍ عَلِيۡمُ ۨ ﴿۷۹﴾ الَّذِيۡ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنَ الشَّجَرِ الۡاَخۡضَرِ نَارًا

فَاِذَآ اَنۡتُمۡ مِّنۡهُ تُوۡقِدُوۡنَ ﴿۸۰﴾ یٰسٓ

(اور وہ تو ہر طرح کی خلقت سے واقف ہے جس نے تمہارے لئے سبز درخت سے آگ پیدا کر دی۔ اب تم اسی سے آگ سلگاتے ہو)۔

اَفَرَءَیۡتُمُ النَّارَ الَّتِیۡ تُوۡرُوۡنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ ﴿۷۲﴾ الواقعہ

(کیا تم نے آگ پر غور کیا جسے تم سلگاتے ہو۔ کیا اس کا درخت تم نے پیدا کیا یا ہم پیدا کرنے والے ہیں)

درخت سبز سے آگ نکالنے کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ درخت کی لکڑی جلا کر آگ حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ بعض درخت مثلاً بانس ایسے ہیں کہ جب ہوا بہت تیز چلتی ہے اور شاخیں آپس میں رگڑ کھاتی رہتی ہیں تو ان میں آگ لگ جاتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ انسان کو دنیا میں پہلی مرتبہ آگ اسی طرح حاصل ہوئی ہو۔

۶۔ کیفیاتِ نفس جو ہر شخص پر عموماً وارد ہوتی ہیں

① زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِیۡنَ وَالۡقَنَاطِیۡرِ الۡمُقَنۡطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّةِ وَالۡخَیۡلِ الۡمُسَوَّمَةِ وَالۡاَنۡعَامِ وَالۡحَرۡثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۚ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ آلِ عمران۔

(زینت دی گئی لوگوں کے لئے محبت خواہشوں کی (کس کس چیز کی) بیویوں کی، بیٹوں کی، سونے اور چاندی کے بڑے بڑے لگے ہوئے ڈھیروں کی اور نشان کئے ہوئے (پلے ہوئے) گھوڑوں کی اور چوپایوں کی اور کھیتوں کی۔ یہ زندگانی دنیا (کمینی زندگی) کی پونجی ہے اور اچھا ٹھکانا تو اللہ کے پاس ہے)۔

اس کو تو ہر شخص جانتا ہے کہ نفسِ انسان کو یہ تمام چیزیں جن کا ذکر اس آیۃ وفی ہدایہ میں کیا گیا ہے پیاری ہوتی ہیں انہی خواہشوں پر اس کی زندگی گزرتی ہے۔ حالانکہ یہ سب

فانی ہیں۔ رب العزت کی جو ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں۔ ان کی طرف بھی دل کو متوجہ کرنا چاہیئے صرف دنیا میں ہی پھنسے رہ کر زندگی گزارنا باعثِ خسرانِ دائمی ہے، دیکھیں سورہ توبہ:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ .... (۲۴) التوبہ

(کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ دادا، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری عورتیں، تمہارا کنبہ قبیلہ اور وہ مال جو تم نے کمائے اور وہ تجارت جس میں تمہیں نقصان کا اندیشہ ہے اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ عذاب نازل کرے)۔

یہاں نفسِ امارہ وساوس پیدا کرتا ہے کہ جب خدا نے ہی ان چیزوں کی محبت دل میں پیدا کی تو پھر اس کی مذمت کے کیا معنی۔ ٹھیک ہے کہ ان کی محبت فطری ہے۔ یہ تو اس لئے ڈالی گئی ہے کہ جب تک شعور نہ آئے اور عقلِ فطری کام نہ کرنے لگے اس وقت تک حیاتِ مادی قائم رہ سکے جو بغیر ان خواہشات کے ممکن نہیں۔ پھر اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کا خدا نے ہی حکم دیا ہے۔ جب شعور آجائے گا تو خدا اور رسولؐ ان تمام چیزوں سے زیادہ پیارے ہو جائیں گے۔

(۲) وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲) یونس

(اور جب آدمی کو کوئی نقصان پہنچتا ہے پکارتا ہے ہمیں کروٹ پڑا ہوا یا بیٹھا ہوا یا کھڑا ہوا اور جب ہم اس کی تکلیف کو دفع کر دیتے ہیں تو چلا جاتا ہے گویا کہ اس تکلیف میں جو اس کو پہنچی تھی اس نے اس کے دفع کرنے کو ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح زیادتی کرنے والوں کے لئے ان کے اعمال زینت دیئے گئے ہیں)۔

قرآن کریم ہمیں جگہ جگہ ہماری کیفیات کا آئینہ دکھاتا ہے مصیبت کے وقت تو مالک کو پکارتے ہیں۔ ادھر بلا دفع ہوئی تو ایسے ہو جاتے ہیں گویا کہ ہم نے اس کو پکارا ہی نہ تھا اگر اس کی یاد دل میں رہے تو مصیبت ہی کیوں آئے۔ ایک ہندی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

دکھ میں سمرن سب کریں سکھ میں کرے نہ کوئے — جو سکھ میں سمرن[۱] کریں دکھ کاہے کو ہوئے

(۳) وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ ..... (۸) الزمر

(اور جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے پکارتا ہے رب کو اس کی طرف خلوص سے رجوع کر کے۔ پھر وہ جب اپنی طرف سے اسے نعمت عطا فرماتا ہے تو جس کے لئے پہلے اس سے دعائیں کرتا تھا اسے بھلا دیتا ہے)۔

جی ہاں جب مطلب نکل گیا تو اس کو یاد کرنے کی ضرورت کیا؟

(۴) وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِن بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ هَٰذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِندَهُ لَلْحُسْنَىٰ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ (۵۰) حٰم السجدہ

(اور جب ہم اس کو (آدمی کو) اپنی رحمت کا مزا چکھا دیں بعد اس کے کہ اس پر مصیبت پڑ چکی ہو تو کہنے لگتا ہے یہ تو ہے ہی میرے لئے اور میں نہیں گمان کرتا کہ قیامت قائم ہوگی۔ اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا بھی جاؤں تو اس کے پاس میرے لئے بھلائی ہی ہے۔ پس ہم روگردانی کرنے والوں کو ان کے اعمال سے خبردار کریں گے اور ان کو سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے)۔

قرآن حکیم کے ارشادات سے اگر فائدہ حاصل کرنا چاہیں تو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ وہ ہمیں ہمارے نفس کی کیفیات کا آئینہ دکھاتا ہے۔ یہ آیہ ذی ہدایہ کس قدر ہمارے حال کے مطابق ہے۔ جب ہم غیر ملکی حکومت کے جوتے تلے کراہ رہے تھے تو مالک نے ہمیں اپنے کرم سے آزادی کی نعمت چکھائی تو ہم کہنے لگے۔ یہ تو ہم نے ہی حاصل کی ہے۔ مہاجرین

---

[۱] سمرن ــــ مالک کی یاد

کہنے لگے پاکستان ہم نے بنایا ہے۔ مقامی حضرات کہتے ہیں یہ تو ہے ہی ہمارا۔ کیا ہم میں سے کسی نے بھی رب کا شکر ادا کیا؟ کیا اس وقت ہمیں رب کی یاد آئی؟ نہیں! بلکہ ہم تو رب کو، اس کے عذاب کو، قیامت کو، سب کو بھول گئے۔ آزادی کا نشہ سوار ہو گیا اعزہ و اقارب کو الاٹمنٹ ہونے لگے۔ سب کے سب لوٹ مار میں پڑ گئے۔ جس نے اپنے فضل و کرم سے پاکستان عطا فرمایا تھا اس کو ہر ایک نے بھلا دیا اس کا نتیجہ تو اس وقت ہی معلوم ہو گا جب اس کی طرف بازگشت ہو گی۔

⑤ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾ المومنون

(اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور جو تکلیف ان پر ہے اس کو دفع کر دیں تو وہ بہکے ہوئے اپنی گمراہی میں ہی پڑے رہیں گے اور ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا پھر بھی انھوں نے نہ تو اپنے مالک کے سامنے عاجزی کی اور نہ وہ اس کے سامنے گڑگڑائے)۔

افسوس صد افسوس ہمارے حال پر۔ تقسیم کے وقت ہندوستان میں لوٹ مار، قتل و غارت سے جو بچ کر پاکستان پہنچے اور امن و امان کی فضا میں سانس لیا تو گمراہی میں پڑ گئے۔ عذاب، مصائب، آلام تو اس لئے آتے ہیں کہ بندے رب کی طرف رجوع کریں مگر ہمارے قلوب میں ایسی شقاوت پیدا ہو گئی ہے کہ ان شدائد و مصائب میں بھی رب کے آگے تضرع و زاری نہ کی۔ وائے بر حالِ ما کہ اماں ملتے ہی ہم میں سے اکثر رشوت ستانی، دغابازی، چوربازاری بے ایمانی میں مصروف ہو گئے۔

⑥ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿٥١﴾ حٰم السجدة

(اور جب ہم انسان کو نعمت دیتے ہیں روگردان ہو جاتا ہے اور (ہماری طرف سے) اکڑ کر کروٹ لے لیتا ہے اور جس وقت اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو پھر لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے)۔

کیوں اے نفسِ امارہ جب پیارا رب تجھے اپنی نعمتیں عطا فرماتا ہے اور تجھے عیش و آرام میسر آتا ہے تو بجائے اس کے کہ مالک کی نعمتوں کا شکر ادا کرے تو اس کو بالکل بھلا دیتا ہے۔ اس سے منہ پھیر لیتا ہے مگر وہ تجھے پھر بھی نہیں بھولتا۔ تجھ سے اپنی نعمتیں سلب نہیں کرتا بلکہ اپنا دستِ عطا بھی نہیں روکتا اور مادی نعمتیں بخشتا رہتا ہے مگر اس پر بھی تو اس کو یاد نہیں کرتا۔ ہاں اے بے غیرت جب اپنے کیے سے اپنا نقصان کر بیٹھتا ہے اور تکلیف و اذیت ہوتی ہے تو پھر لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔ ادھر تکلیف دور ہوئی کہ پھر اس کو بھول جاتا ہے۔ اے غافل تجھے کب ہوش آئے گا؟ دیکھ رب کا فرمان اور سمجھنے کی کوشش کر!

⑦ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ
وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ
ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ
وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ
الْغُرُوْرِ ⑳ الحدید

(جان لو کہ حیاتِ دنیا (کمینی زندگی) عبث کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں اور دکھاوا اور آرائش اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال اور اولاد کی ہوس، وہ تو اس بارش کی مثل ہے جس کی روئیدگی کسانوں کو خوش کر دیتی ہے پھر سوکھ جاتی ہے تو تو اس کو زرد ہوا دیکھتا ہے پھر چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے اور نہیں ہے زندگانی دنیا (کمینی زندگی) مگر دھوکے اور فریب کی پونجی)

اے نفسِ امارہ تو نے خدا کا کلام دیکھا تجھے اس ذلیل زندگی کی پونجی سے ہی محبت ہے۔ تیری ہوس کسی طرح پوری نہیں ہوتی۔ تو سونے چاندی کے ڈھیروں کا خواہشمند ہے۔ تجھے یقین ہے کہ سونے چاندی کے خزانوں سے تجھے سکون و اطمینان ہو جائے گا۔ کیا تیرے منہ پر آنکھیں نہیں؟ ہاں ٹھیک ہے آنکھیں تو ہیں مگر ان سے دیکھتا نہیں۔ مالک نے تیری آنکھوں کے بارے میں کہہ دیا ہے "لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا" (ان کی آنکھیں تو ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں)۔ رب کا کلام سچا ہے اگر تو اپنی آنکھوں سے دیکھتا تو کیا یہ نظر نہ

آتا کہ یورپ اور امریکہ میں سونے چاندی اور جواہرات کے ڈھیر اکٹھا کرنے والوں کو دل کا سکون و چین میسّر نہیں۔ جتنی دولت بڑھتی ہے اتنے ہی تفکرات بڑھتے ہیں۔ وہ تو ہوا و ہوس کے جہنّم میں جل رہے ہیں۔ ہوس تو کبھی بھر نہیں سکتی۔ اگر ایک ملک کی سلطنت بھی مل جائے تو اس کے بڑھانے کی ہوس کبھی نہیں بھرتی۔ دیکھ مالک تیرے باطن کا آئینہ دکھا رہا ہے۔ مال و دولت، جائیداد و اسباب جن کو تو اپنا سمجھے ہوئے ہے اور ان پر تجھے بڑا بھروسہ اور گھمنڈ ہے سب فانی ہیں۔ ذرا سی دیر میں فنا ہو سکتے ہیں۔ تجھے ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کی طلب ہوتی تو تُو ان فانی چیزوں پر نہ مرتا۔ دیکھ رب کا فرمان:-

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾ الشوریٰ

(پس جو کچھ تم کو کسی چیز میں سے دیا گیا پس وہ حیاتِ دُنیا (ذلیل زندگی) کی پونجی ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہت بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں)۔

تجھے تھوڑی سی پونجی ذلیل و پست زندگی کی مل گئی اِسی پر اِتراتا ہے۔ وہ سب فنا ہونے والی ہے جس کی محبّت موت کے وقت تیرے حلق میں پھنسی رہے گی اور اس وقت یہ سب چیزیں تیرا ساتھ چھوڑ دیں گی مگر تیرے رب کے پاس تو نور ہی نُور ہے جو ایسی نعمت ہے کہ تجھے اس کی قدر و قیمت کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ نعمت تجھے مل جائے تو مادّہ کی بھی احتیاج نہ رہے۔ وہ نعمات کبھی فنا ہونے والی نہیں۔ موت کا کیا ذکر وہ تو قیامت تک بھی تیرے ساتھ رہیں گی بلکہ قیامت کے بعد ابدالاباد تیرا ساتھ نہ چھوڑیں گی۔ تجھے حیاتِ اَبدی مل جائے گی۔ دیکھ رب فرماتا ہے:-

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾ الشوریٰ

(جو آخرت کی کھیتی کا خواہشمند ہوتا ہے ہم اس کی کھیتی میں خوب زیادتی کر دیتے ہیں اور جو دُنیا کی کھیتی کا خواہشمند ہوتا ہے ہم اس میں سے تھوڑا دے دیتے ہیں مگر پھر آخرت

میں اس کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا)۔

دیکھا تو نے، اس ذلیل زندگی کی پونجی بھی تو رب ہی دیتا ہے۔ جو اس کا طالب ہوگا اس کو تھوڑی پونجی تو مل جائے گی مگر وہ تو فانی ہے۔ موت کے وقت تو ہاتھ ملتا اسے چھوڑ جائے گا۔ پھر آخرت میں تیرا کوئی حصّہ نہ ہوگا۔ وہاں ابدالاباد آتشِ حسرت میں جلتا تڑپتا رہے گا جیسا کہ رب فرماتا ہے:۔

...كَذٰلِكَ يُرِيهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ البقرۃ

(اور اسی طرح اللہ ان کو ان کے اعمال حسرتیں بنا کر دکھلائے گا اور وہ کبھی اس آگ سے نہ نکل سکیں گے)

اگر اس زندگی میں آخرت کی نعمتیں پیارے رب سے طلب نہ کیں اور خلوص سے اسے نہ پکارا تو وہاں سوائے حسرت و ندامت اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور اس آتشِ حسرت میں جلتا تڑپتا رہے گا جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ اگر تجھے یقین ہو جائے کہ دنیا و مافیہا میں جو کچھ ہے وہ رب کا ہے اور مالک کے فرمان "لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" پر ایمان لے آئے تو ایسا سرور و اطمینان حاصل ہو جائے جو دنیاوی سلطنت پا لینے سے بھی نہیں مل سکتا۔ تیرا ہر کام عبادت ہو جائے۔ تیری دنیا دین بن جائے مگر تجھے تو کبھی مالک کی یاد ہی نہیں آتی۔ دیکھ تیرا مالک تجھے تیرے باطن کا آئینہ دکھا رہا ہے وہ تو فرماتا ہے "اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ" یہ ذلیل زندگی جس میں مالک کی یاد نہ ہو بس کھیل تماشہ ہے۔ "وَّزِيْنَةٌ" اور فقط دکھاوا بھڑکدار لباس، چمکدار ساز و سامان اہلِ دنیا کے دکھانے کے لئے "وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ" (اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا) ایک سمجھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے ہم تو بڑے شریف ہیں۔ ہمارا خاندانی وقار بہت بلند ہے۔ فلاں شخص ہمارے سامنے کیا ہے۔ وہ ذلیل قوم اس سے ہمارا کیا مقابلہ۔ اس کا باپ ہمارے دادا کے پاس ملازم تھا۔ آج اگر وہ صاحبِ ثروت ہو گیا تو کیا ہے۔ ادھر مدِّ مقابل اکڑ رہا ہے۔ اپنے یاروں میں بیٹھا ڈینگ مار رہا ہے۔ میاں وہ ہیں کیا۔ ہزار دو ہزار کی نوکری

کرتے ہیں بس اسی پر اکڑتے ہیں۔ بھلا ہمارا ان کا کیا مقابلہ۔ میں تو سب سے بڑا ہوں ......۔

اے نفسِ امّارہ! اے غافل! تیرا رب کہہ رہا ہے "اِن ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ" (نہیں ہیں وہ مگر مثل جانوروں کے بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ)۔ کیا تو مرغوں کو نہیں دیکھتا کہ الگ الگ ٹاپے میں بند ہونے پر بھی ایک کہتا ہے "سب سے بڑا میں ہوں" تو دوسرا لیکارتا ہے "سب سے بڑا تو میں ہوں"۔ ان میں تو عقل و شعور ہی نہیں لیکن تو عقل والا ہوتے ہوئے بھی نہ سمجھے کہ سب سے بڑا تو مالک ہے "لَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَالْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ" (اسی کے لئے بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی عزّت و حکمت والا ہے)۔ اگر تو اس پہ ایمان لے آئے تو تیری سمجھ میں آجائے کہ میں تو اس کا ایک ذلیل بندہ ہوں۔ عزّت و بڑائی تو آسمانوں اور زمین میں ان کے رب کے لئے ہی ہے۔ ہاں اگر تو بڑا بننا چاہتا ہے تو رب کا فرمان دیکھ، وہ فرماتا ہے "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ"، اس کے نزدیک تو وہی عزّت والا اور شریف ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کا حکم بجالانے والا ہو۔

اے غافل نفس تجھے تو مال و اولاد کی بڑھوتری کی چاہ نے اپنے رب سے غافل کر رکھا ہے "وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ"۔ تو تو بڑھوتری کی چاہ یعنی ہوس میں ہی ڈوبا ہوا ہے۔ تجھے تو اس کا حس ہی نہیں کہ یہ چاہ لاشعوری کا تاریک کنواں ہے جس میں ڈوبنے والا اُبھر نہیں سکتا۔ اے یہ دنیا تو بڑی مکارہ ہے جو اس کے قریب میں آکر اس کی طرف دوڑتا ہے وہ اپنی اداؤں اور عمزوں سے اس کا دل لبھاتی آگے آگے بھاگتی چلی جاتی ہے تاکہ وہ پیچھے بھاگتا چلا جائے اور اپنے پیارے رب سے جو ماں باپ سے بھی کہیں زیادہ شفیق ہے برابر دُور سے دُور تر ہوتا رہے لیکن جو اس کے فریب میں نہ آیا اور اپنے رب سے منہ پھیر کر اس کی طرف متوجہ نہ ہوا اور حسب الحکم "فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ" (اللہ کی طرف دوڑو) مالک کی طرف دوڑے تو وہ اس کے پیچھے بھاگتی ہے اس کو پھنسانے کے لئے خزانوں کا منہ کھول دیتی ہے تاکہ کہیں تو پھنسے۔ دیکھ اے نفسِ امّارہ رب کی طرف دوڑنے سے دین بھی ملتا ہے اور بے طلب دنیا بھی مل جاتی ہے۔ اور جو صرف دنیا کا ہی طالب ہوتا ہے تو خواہ چند دن اکڑ فوں کرے مگر انجام میں "خَسِرَ الدُّنْيَا

وَالْاٰخِرَةِ" کا مصداق ہو جاتا ہے۔ نہ دُنیا باقی رہتی ہے اور نہ دین ہی ملتا ہے اور اس طرح اپنی آخرت برباد کر لیتا ہے۔

اے غافل نفس ذرا آنکھیں کھول اور ہوشیار رہ کہیں شیطان لعین کے فریب میں نہ آ جانا۔ تیرا رب تجھے آگاہ کر رہا ہے۔ دیکھ وہ فرماتا ہے "وَلَا یَصُدَّنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۶۲﴾ الزخرف"۔ وہ تو بتا رہا ہے کہ شیطان تیرا سب سے بڑا دشمن ہے اس کے فریب میں نہ آ جانا۔ وہ تجھے رب کے راستے سے ضرور روکے گا۔ اے غافل! وہ تیرا دوست اور تیرا مشیر بن کر آئے گا۔ بڑی ہمدردی جتا کر سمجھائے گا کہ میں تیرا خیر خواہ ہوں۔ وہ کہے گا کہ بھلا جب رسول کریمؐ نے ہی کہہ دیا ہے "لَا رَهْبَانِیَّةَ فِی الْاِسْلَامِ" (اسلام میں ترکِ دُنیا نہیں) دُنیا سے منہ موڑنا تو اسلام کو چھوڑنا ہے۔ آیاتِ قرآن کا مفہوم جو تجھے سمجھایا جا رہا ہے۔ ملاؤں کا قیاس ہے۔ کلام اللہ کی تفسیر تو رسولؐ اللہ ہی کر سکتے ہیں جنھوں نے کہہ دیا ہے کہ ترکِ دُنیا اسلام نہیں، تو ملاؤں کے دھوکے میں نہ آنا۔ اس چند روزہ زندگی میں رب کی نعمتوں سے فیض اٹھا مزے اڑا اور خوش رہ (EAT, DRINK AND BE MERRY) ۔ تو سُن نفس امارہ! شیطان کی یہ سب باتیں ایک بڑا فریب ہے۔ وہ تیرا دوست نہیں دُشمن ہے۔ دوست بن کر بہکاتا ہے۔ تیرا رب ترکِ دُنیا کا حکم نہیں دیتا۔ وہ تو فرماتا ہے اور اپنے حبیب کو حکم دیتا ہے:۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی ۙ عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۲۹﴾ النجم

"اور تم بھی اس سے منہ پھیر لو جو ہماری یاد سے روگردانی کرے اور سوائے حیاتِ دُنیا (پست و ذلیل زندگی کے) اور کچھ چاہتا ہی نہ ہو۔"

دیکھ رب تو یہ کہتا ہے کہ جو ہماری یاد سے غافل رہے آخرت کی اس کو طلب ہی نہ ہو، صرف دُنیا کے مال و متاع وغیرہ کی طلب میں ہی غرق رہے اس سے تم بھی منہ پھیر لو ہم بھی اسے بھلا دیں گے۔ آخرت میں اس کی خبر نہ لیں گے بلکہ ایسے لوگوں سے کہہ دیں گے

"اَلْیَوْمَ نَنْسٰکُمْ کَمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا" ﴿۳۴﴾ سورۂ جاثیہ

"آج ہماری رحمت بھی تمہاری طرف متوجہ نہ ہوگی جیسے کہ تم نے آج کی ہمارے سامنے حضوری کو بھلائے رکھا۔" دیکھ لیا تم نے؟ اس آیت کا ترجمہ حضرت مولانا جلال الدین رومی

نے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:۔

چیست دُنیا از خدا غافل بدن نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

یعنی دُنیا کا مال واسباب و بیویاں، اولاد، کاروبار یہ سب دُنیا نہیں ہے بلکہ رب کی یاد سے غافل ہوجانا دُنیا ہے۔ اگر رب کی یاد سے غافل نہ ہو، دُنیا کے مال واسباب، اولاد وغیرہ کو اس کی ملک جان کر اُن کی نگرانی وخدمت میں مصروف رہے تو عین عبادت ہے بلکہ عبادت حقیقی یہی ہے۔

اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ○

۷۔ ایسی آیات جن میں دین وایمان اور اسلام کا ذکر ہے

(۱) شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰۤى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ (۱۳) الشوریٰ

"اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ مقرر کی جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ کو حکم دیا تھا یہ کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔"

اکثر ناواقف لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام کا تعلق سلطنت سے وابستہ ہے بلکہ عیسائی اور یہودی تو یہی کہتے رہتے ہیں کہ اسلام تو تنظیم عسکری کے سوا کچھ نہیں۔ وہ تو مذہب ہی نہیں پس جو لوگ اسلام کو سلطنت وحکومت سے وابستہ جانتے ہیں ان کی نظر میں اسلام کی عمر چودہ سو سال ہے حالانکہ قرآن اس کو ازلی دین بتاتا ہے کہ آدم سے خاتم تک ہر نبی ورسول اسلام ہی لے کر آیا۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر اسلام سلطنت سے وابستہ نہیں تو پھر یہ کونسا دین ہے؟ اس کو چاہیئے کہ اس پر غور کرے کہ جب قرآن بتا رہا ہے کہ یہی وہ دین ہے جس کا حکم ہر نبی کو دیا گیا۔ تو کیا ہر نبی ورسول نے کوئی سلطنت قائم کی؟

نہیں! بلکہ سوائے معدودے چند اور کسی نبی کے ساتھ حکومتِ مادّی وسلطنتِ دُنیاوی وابستہ نظر نہیں آتی! اس کے سمجھنے کے لئے پہلے بعثتِ رسول کا مقصد دیکھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن میں ہر جگہ یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ رسول کو اس لئے بھیجا گیا کہ مخلوق کے نفسوں کا تزکیہ کرے اور یہ کہ دین کیا ہے اس کا مقصد کیا ہے سورہ والشمس میں واضح کر دیا گیا جیسا کہ ارشاد ہے:۔

(۲) وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ﴿۷﴾ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿۸﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿۹﴾ الشمس

" قسم ہے نفس کی اور اس کو دُرست کرنے والے کی پس الہام کر دیں اس پر ساری اس کی بُرائیاں اور بھلائیاں، فلاح اس نے پائی جس نے اس کو پاک کیا۔"

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی تزکیۂ نفسِ مخلوق ہے اور اس کا ثبوت کہ انبیاءِ سابقین پر اسی دین کی وحی کی گئی تھی قرآن میں صاف موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

(۳) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ الاعلیٰ

" فلاح اس نے پائی جس نے اس کا نفس کا تزکیہ کیا اور اللہ کے نام کی یاد کرتا رہا اور نماز ادا کی لیکن تم تو دُنیا کو (یعنی ذلیل زندگی) ہی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت بہت بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ بیشک یہی بیان اگلے صحیفوں میں ہے۔ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔"

ان آیات سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تزکیۂ نفس ہی وہ دین ہے جو تمام انبیاء سابقین کے صحیفوں میں ہے۔ اس کی سب پر وحی کی گئی ہے۔

(۴) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ .... ﴿۱۶۵﴾ البقر

" اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے سوا غیروں کو اس کا شریک ٹھہرالیتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی کہ اللہ سے کرنی چاہیئے اور وہ لوگ جو ایمان لائے وہ تو اللہ کی محبت میں بڑے شدید ہیں۔"

اس آیت نے ایمان کی تعریف بھی واضح کر دی کہ وہ حُبُّ اللہ ہے اور حُب بھی شدید

حُب اور یہ تو رب کی بڑی نعمت ہے جو طلب کرنے سے اس کی بارگاہ سے عطا ہوتی ہے۔

(۵) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (۲) انفال

"سوائے ان کے اور کوئی مومن نہیں کہ جب خدا کا ذکر ان کے سامنے کیا جائے تو ان کے دل لرز جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کے آگے تلاوت کی جائیں تو ان کے ایمان کو اور بھی زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر ہی بھروسہ کرتے ہیں"۔

دیکھئے ایمانِ حقیقی اور اللہ کی حُب کی علامت اس آیہ وافی ہدایہ میں ظاہر کی گئی ہے کہ اللہ کے ذکر سے ان کے دل لرز جاتے ہیں۔

(۶) اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَھُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ وَمَمَاتُھُمْ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ (۲۱) جاثیہ

"کیا وہ لوگ جنھوں نے بُرائیاں کمائیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انھیں ان لوگوں کی مثل قرار دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے کیا ان کی زندگی اور ان کی موت ایک جیسی ہو سکتی ہیں؟ یہ لوگ کیا ہی برا حکم لگاتے ہیں"۔

جو لوگ خدا پر ایمان لانے کے مدّعی ہوں ان کو چاہیئے کہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ زندگانی دُنیا میں ان کی کیفیاتِ نفسی اور خدا و رسولؐ کو نہ ماننے والوں کی کیفیاتِ نفسی میں کیا فرق ہے۔ کیفیاتِ نفس کا بیان پہلے گذر چکا ہے۔

(۷) فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۰) روم

"پس اپنے نفس کو دین کے لئے قائم کر لے یکسو ہو کر اللہ کی وہ فطرت جس پر لوگوں کو فطر کیا اللہ کی خلق میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی تو مضبوط دین ہے لیکن کثرت انھیں لوگوں کی ہے جو اس کو نہیں جانتے"۔

رب نے تو دین پڑھا سکھا کر پیدا کیا تھا۔ وہ فطری ترغیبات جو انسان کی فطرت میں

ڈال دی گئی ہیں وہی تو اصل دین ہیں۔ مَیں سب سے بڑا، مَیں سب سے اچھا، مَیں جو چاہوں فوراً ہو جائے۔ اِن فطری رُجحانات کی پیروی اور اس منزل کے حصول کی کوشش ہی مضبوط دین ہے۔ یہی تو اس کی منزل ہے جس کے لئے رَبُ العزّت کا فرمان ہے "لَهُمْ مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا" (وہاں ان کے لئے جو چاہیں موجود ہوگا)۔ جو رَب کے احکام اور دینِ فطرت پر عمل کریں تو ان کے لئے رب فرماتا ہے "سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" (ہم نے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کو تمہارا مطیع اور تمہارے لئے مسخّر کر دیا ہے)۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

(اے بندے)! تو اپنے رَب کے حکم سے سرتابی نہ کر تاکہ تیرے حکم کی اطاعت سے بھی کوئی مخلوق سرتابی نہ کرے!!

بابِ دوم

متشابہات

متشابہات

باب اوّل میں یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ جن اشیاء کا احساس نفسِ انسان کو پہلے نہ ہو چکا ہو یا جو کیفیات پہلے کبھی اس پر وارد نہ ہوئی ہوں اور ان کے احساس کی کیفیات یا اشیاء کی تصاویر اس کے خزانوں میں موجود نہ ہوں۔ ان کو انسان سمجھ ہی نہیں سکتا بلکہ ان کا سمجھنا محالِ عقلی ہے۔ مگر ابھی ہم نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو احساسات انسان کو ہوتے رہتے ہیں اور جن کیفیات کا شعور اس کو ہوتا رہتا ہے کیا اس کا بیان بھی لفظوں میں کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً کوئی شخص غصّے کے متعلق کہنا چاہے تو یہی کہہ سکتا ہے "اس کی بیہودہ باتوں سے میرے تو آگ لگ گئی۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا" غم و الم کے لئے ایسے ہی فقرات استعمال کئے جاتے ہیں "میرا تو دل پھٹ گیا" "میرے کلیجے پر چھُری چل گئی" "میرے دل میں نشتر لگا" "میرے دل پہ چوٹ لگی۔"

محبّت: میں نے اپنے چار سالہ بچّے سے پوچھا محبت کہاں ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر سوچا پھر دل پر ہاتھ مارا اور کہا "یہاں"۔ پھر میں نے پوچھا وہ ہوتی کیا ہے تو ذرا دیر سوچتا رہا پھر کہا "دل میں چبھا کرتی ہے۔ اس وقت حضرت شیفتہ کا ایک شعر یاد آ گیا:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

شرم کے لئے کوئی شخص ایسے ہی الفاظ میں اظہار کر سکتا ہے "میں تو پانی پانی ہو گیا"۔ "میں تو کٹ گیا"۔

روزمرّہ کے دیگر احساسات کو دیکھیں۔ آگ سے جلنے کا احساس، سردی گرمی کا احساس اس کی تکلیف کی کیفیت، کانٹا یا سوئی وغیرہ چبھنے کی تکلیف، مٹھائی، کھٹائی، تلخی، ترشی یا اور کسی ذائقہ کے احساس کی کیفیت، سر درد والم کی کیفیت۔ کیا ان میں سے کسی ایک

کا بیان بھی لفظوں میں ہو سکتا ہے؟ ناممکن! یہ تو محال عقلی ہے۔

ان تمثیلوں سے یہ تو واضح ہو گیا کہ نفسِ انسان کی ان کیفیات و احساسات کا اظہار بھی لفظوں میں کرنا ممکن نہیں جن کا تجربہ اس کو ہوتا رہتا ہے جو اکثر اس پر طاری ہوتی رہتی ہیں اور ان کے احساس کا اس کو شعور بھی ہوتا ہے۔ اگر ان کا اظہار لفظوں میں کیا جائے گا تو الفاظ کے ظاہری معنی مراد نہ ہوں گے۔ ابھی آپ ان فقرات کا مطالعہ کر چکے ہیں "میرے آگ لگ گئی"۔ "دل پر نشتر لگا" وغیرہ وغیرہ۔

قارئین پر واضح ہو گیا کہ کیفیاتِ نفس کے اظہار کے لئے یا حس و احساسات کے لئے جو الفاظ استعمال ہوں گے ان سے ظاہری معنی مراد نہیں ہو سکتے۔ اور مذہب کا مقصد اصلاحِ نفس ہے لہٰذا قرآن حکیم میں کیفیاتِ نفس کا بیان ہونا لازمی ہے۔ ممکن ہے کوئی حالتِ لاشعوری میں کہنے لگے مذہب کا مقصد تو خدا کی عبادت اور اس کی بندگی کرنا ہے تو وہ عبادت و بندگی کے مفہوم ہی سے ناواقف ہو گا۔ اس کا مفہوم اس بندۂ حقیر نے اپنی کتاب "جامع الانوار" میں کھول کر بیان کر دیا ہے۔ عبادتِ حقیقی تو بغیر اصلاحِ نفس ہو ہی نہیں سکتی۔ بغیر طلبِ اصلاحِ نفس تمام نمازیں، روزے محض تسکینِ عادتِ نسلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ علاوہ بریں ایسا خیال اسی شخص کو ہو سکتا ہے جس نے کلام اللہ پڑھا ہی نہ ہو۔ اس لئے کہ کلام پاک میں رسول کریمؐ کی بعثت کا مقصد وحید تزکیۂ نفس ہی ظاہر کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد رب العزّت ہے:۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۱۵۱) البقرۃ

"جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تم ہی میں سے کہ تلاوت کرے تم پر ہماری آیتیں اور پاک کرے تم کو اور پڑھائے تم کو کتاب اور حکمت"۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲) الجمعہ

"وہ ہی (ذاتِ اقدس) ہے جس نے بھیجا اہلِ مکہ میں ایک رسول ان ہی میں سے کہ تلاوت کرے ان پر ہماری آیات اور ان کو پاک کرے اور پڑھائے ان کو (فطرت کی) کتاب اور حکمت۔

اسی طرح کلام اللہ میں جہاں کہیں بھی رسولؐ کریم کی بعثت کا ذکر ہے اس کا مقصد تزکیہ نفس مخلوق ہی بتایا گیا ہے اور کتابِ فطرت کی تعلیم بغیر تزکیہ ممکن ہی نہیں، جب علوم فطرت کا وہ ذخیرہ جو حسبِ فرمان ایزدی " وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ " (اور سکھا دیا یا پڑھا دیا انسان کو تمام وہ علم جو وہ نہ جانتا تھا) نفسِ انسان میں خزانہ کیا ہوا ہے شعور میں آنے لگے اس کے بعد ہی اس کو عملی طور پر استعمال بھی کیا جا سکتا ہے اور اسی کو حکمت کہتے ہیں۔ علم حقیقی کا شعور اور اس کا استعمال بغیر تزکیہ نفس ممکن ہی نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تزکیہ کیا ہے؟ اس سے مراد کیا ہے؟۔ تو "تزکیہ" کے لغوی معنی ہیں پاک کرنا۔ اس پر بھی یہ سوال ہوگا کہ پاک کرنا تو نجاست دور کرنے کو کہتے ہیں نفسِ انسان میں وہ کونسی نجاست ہے جس کو دور کرنے کے لئے رسولؐ کریم کو بھیجا گیا۔ اچھا لیجئے نفسِ انسان کی وہ نجاست جس کو دور کر کے بندوں کے نفسوں کو پاک کرنے کے لئے رسولؐ اکرم کو بھیجا گیا کلام اللہ سے ہی دیکھ لیجئے۔ ارشاد جناب باری ہے " اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ " (سوائے اس کے نہیں کہ مشرک نجس ہیں)۔ اصطلاح فقہا میں نجاست دو قسم کی ہوتی ہے۔ نجاستِ غلیظہ اور نجاستِ خفیفہ۔ یہ نجاسات ظاہری کے لئے ہیں۔ نجاستِ باطنی شرک ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک شرکِ ظاہری یا شرکِ جلی۔ دوسری شرکِ باطنی یا شرکِ خفی۔ شرکِ ظاہری کے ساتھ شرکِ باطنی بھی موجود ہوتا ہے۔ کئی معبودوں کی پرستش کرنے والا جب ان کی پرستش چھوڑ کر معبودِ یکتا کو مان لیتا ہے اور ظاہراً ایمان لے آتا ہے تو وہ شرکِ جلی سے پاک ہو کر ایمان والوں کی برادری میں شامل ہو جاتا ہے مگر شرکِ باطنی سے پاک نہیں ہوتا۔

ممکن ہے کوئی شخص کہنے لگے کہ یہ شرکِ باطنی یا شرکِ خفی کیا ہوتا ہے، شرکِ ظاہری تو سب جانتے ہیں مگر شرکِ خفی اور شرکِ باطنی کی اصطلاح آج ہی سنی، ٹھیک ہے معترض نے نہ سنی ہو مگر قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ اس کے سمجھانے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایسی تفصیل کر دی جائے کہ ایک طالب باآسانی سمجھ سکے۔ لیجئے سنئے۔ قرآن کریم میں بیس سے زائد آیات ایسی ہیں جن میں مختلف طریقوں سے شہوات و ہوئی کی پیروی کی ممانعت یا مذمت کی گئی ہے۔ مگر ان کلمات کا مفہوم حقیقی ہمارے سامنے نہیں آتا۔ مشکل یہ ہے کہ جب کسی لفظ کا ایک مفہوم ذہن

میں قائم ہو جاتا ہے تو پھر اس کا اصل مفہوم معلوم کرنے کی خواہش ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر نہ آنکھیں دیکھتی ہیں نہ کان سنتے ہیں نہ دل سمجھ سکتا ہے۔ ایسے اشخاص ان آیات کا مصداق ہو جاتے ہیں "لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ط" (ان کی آنکھیں ہیں ان سے دیکھتے نہیں) "لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا" (ان کے کان ہیں ان سے سنتے ہیں) "لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا"، (ان کے دل ہیں ان سے سمجھتے نہیں)۔ اب غور کر کے سمجھنا لازم ہے۔ اسلام کیا ہے؟ تزکیہ نفس!۔ اب ضروری ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھیں، کان کھول کر سنیں اور دل سے بھی کہہ دیں کہ متوجہ ہو کر سمجھے۔ یہ نفسِ انسان کا ذکر ہے جس کی کیفیات کی تفصیل قرآن حکیم میں بیان کی گئی ہے۔

نفس، شہوات وہویٰ

نوجوانوں کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے پہلے اور آخری کلمے " لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه" کی تفصیل بیان کر دی جائے تاکہ ہر ایک اس طرح دیکھ لے جیسے آئینے میں اپنی شکل دیکھتا ہے۔ مسلمانوں میں بہت کم افراد اس کے مفہوم حقیقی سے واقف ہوں گے۔ اس کا مفہوم تو اولیائے کرام، فقرائے عظام صاحبانِ معرفت کے سینوں میں دفن رہا ہے یا وہ لوگ اس سے واقف ہوئے جن کو ان سے فیض پہنچا۔ جو حضرات راہِ معرفت پر گامزن ہوئے بغیر محض کتابیں پڑھ کر قرآن فہمی کے مدعی ہو جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی شخص سے دریافت کیا جائے کہ اِلٰہ کے معنی کیا ہیں تو کہیں گے "معبود" پھر اگر دریافت کریں کہ معبود کس کو کہتے ہیں تو اس کا جواب ہوگا "جس کی پرستش کی جائے، جس کی عبادت کی جائے، جس کو سجدہ کیا جائے جس سے حاجات طلب کی جائیں"۔

پیارے بھائیو! ذرا سوچو اور غور کرو۔ اگر اِلٰہ کے یہی معنی ہوں تو مندرجہ ذیل آیات کے معنی کیا ہوں گے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ الفرقان

"(اے حبیب) کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی ہوائے نفس ہی کو اپنا اِلٰہ بنایا ہوا ہے پس

تو اس کے امور کا درست کرنے والا کیسے ہو سکتا ہے۔"

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (۲۳) الجاثیۃ

"(اے حبیب) کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی ہوائے نفس ہی کو اپنا الٰہ بنایا ہوا ہے اور اللہ نے جان کر اس کو گمراہی میں چھوڑ دیا۔"

غور کریں اور سوچیں نفس کی کون پرستش کرتا ہے۔ کیا ایک شخص بھی دنیا میں ایسا ہے جو ہوائے نفس کو سجدہ کرتا ہو؟ اس سے حاجات طلب کرتا ہو۔ نہیں! اب تو ہم پر لازم ہو گیا کہ کلام اللہ میں جو بہ کثرت آیات پیروئ شہوات و ہوئ کی مذمّت میں نازل ہوئی ہیں ان کے معنی و مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے فطرتِ نفس کا مطالعہ ضروری ہے۔

نفسِ انسان اور فطرتِ نفس

ایک بچّہ کہتا ہے میرا جی مٹھائی کو چاہتا ہے۔ اگر اس سے پوچھیں کہ کون چاہتا ہے تو کہے گا دل چاہ رہا ہے۔ اب غور کریں کہ دل تو مردے میں بھی ہوتا ہے۔ کیا مردے کا دل بھی چاہ سکتا ہے نہیں اس میں تو جان ہی نہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اصل چاہنے والی یہ جان ہی ہے جو ہمارے جسم کے اندر ہے اسی جان کو نفس یا نفسِ امّارہ کہتے ہیں۔ جب یہ جسم سے نکل جائے تو انسان مر جاتا ہے۔ سارے کا سارا دین، تمام کا تمام مذہب بس اسی نفس کی درستی اور صفائی کرتا ہے۔ ہمارا پیارا رب تو فرماتا ہے:۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۸)
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۱۰) الشمس

"قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اس کو مکمّل کیا۔ پس الہام کر دی ہیں اس پر اس کی برائیاں اور بھلائیاں۔ پس فلاح اس نے پائی جس نے اس کو پاک کیا اور گھاٹے میں رہا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔"

کم از کم اس آخری جملے کا سمجھ لینا تو ضروری ہے کہ دبا دیا سے کیا مراد ہے۔ ہر نفس میں فطری خواہش ہے کہ میں اچھا ہوں لہٰذا اچھا بننے کی خواہش موجود ہے۔ جس نے اس کو

دبا دیا نقصان اُٹھائے گا۔ یا ایک یہ خواہش ہے کہ کوئی ایسی قوت مجھے مل جائے جس کے ذریعے سے جو چاہوں فوراً ہو جائے پس جس نے اس کو دبا دیا وہ گھاٹے میں رہے گا۔

نفسِ انسان کی صفائی کے لئے ہی انبیاء بھیجے گئے جنھوں نے اس کی طہارت کے طریقے بتلائے تا کہ انسان دُنیا کی تباہیوں، مصیبتوں، بیماریوں اور بلاؤں سے بچ سکے اور آخرت کی راحتِ اَبدی حاصل کر سکے۔ مگر افسوس کہ فرقِ اسلامیہ کے مروّجہ علومِ دین میں کہیں بھی اس کا ذکر موجود نہیں۔ پھر بتلائیں کہ دُنیا و آخرت کی تباہی سے کیسے بچ سکیں گے؟ گڑبڑ تو قیاس کرنے والوں نے کچھ پہلے ہی ڈال رکھی تھی۔ مگر جب دوسری صدی ہجری میں فلسفہ قدیم کی کتابیں قسطنطنیہ سے منگائی گئیں اور ان کے عربی میں تراجم ہوئے اور مملکتِ اسلامیہ کے مدارس میں پڑھائی جانے لگیں تو سب ان بحثوں میں پڑ گئے کہ دُنیا کیا ہے، کیسے پیدا ہوئی، انسان کیسے پیدا ہوا، خدا کیا ہے، اس کی صفات کیا ہیں، ہمیں کہاں جانا ہے، جنّت کیا ہے، جہنّم کیا ہے اور دینِ حقیقی تزکیہ نفس کو سب بھول بیٹھے۔ وہ صرف فقراء و عارفین ہی کا گروہ تھا جو اس کی طرف متوجہ رہا۔ مباحث مذکورہ بالا کے متعلق ایک تمثیل بھی سُن لیں :

تمثیل : ایک شخص ایک گاؤں میں رہتا ہے معمولی پڑھا لکھا، سوچنے سمجھنے والا، کچّے خس پوش مکان میں رہتا ہے۔ ایک شب شدید سیلاب آیا۔ تمام گاؤں پر آفت آگئی۔ مکان منہدم ہو گئے۔ جہیز، اسباب، مکان، چارپائیاں، تخت سب پانی بہا کر لے گیا۔ یہ شخص بھی ایک تخت پر بہا چلا جا رہا ہے۔ اب بتلائیے اس وقت اس کو کیا سوچنا چاہیئے؟ سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ صرف اسی پر غور کرے اور اپنی تمام توجّہ اور قوتِ فکر اسی پر صرف کرے کہ غرق ہونے سے کس طرح بچوں۔ اور اپنے آپ کو ہلاکت سے کس طرح بچاؤں۔ اگر اس کے بجائے یہ سوچنا شروع کر دے کہ یہ سیلاب کیوں آیا؟ آیا پہاڑ پر برف پگھلنے سے آیا یا کہیں زور کی بارشیں ہوئی ہیں؟ پانی کو جانچ کر دیکھنا چاہیئے کہ یہ برف کا پانی ہے یا بارش کا؟ راستہ میں اس طوفان نے کیسی تباہی مچائی ہو گی؟ اب یہ پانی پہلے ندی میں، پھر دریا میں جائے گا۔

یا سیدھا دریا ہی میں چلا جائے گا پھر آخر کار تو یقیناً سمندر میں جائے گا۔ اور ہم نے تو سمندر دیکھا نہیں معلوم نہیں کیسا اور کتنا بڑا ہو گا وغیرہ وغیرہ؟؟ اب صاحبانِ عقل بتائیں کہ یہ شخص

ڈوبنے سے کیسے بچ سکتا ہے؟؟

یہی مثال ہمارے مروّجہ علمِ دین کی ہے۔ ان بحثوں میں پڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظاہری علمِ دین اتنا طول طویل ہو گیا کہ جو شخص بھی تحصیلِ علومِ دین کی طرف راغب ہو اُس کے لئے ضروری ہے کہ اپنی عمر کے کم از کم پچیس تیس سال تحصیلِ علم کے لئے وقف کر دے تب قدم اُٹھائے۔ پہلے علم صرف و علم نحو پڑھے پھر علم الادب حاصل کرے، پھر علم الحدیث، علم الاصول، علم الکلام، منطق، فلسفہ، علم معنی بیان پڑھے۔ مگر یہ سب کچھ پڑھ ڈالنا بھی مفید نہیں جب تک علم الرّجال نہ پڑھے۔ اَب بتائیے کہ پچیس تیس سال عُمر کے صَرف کر کے جب عالمِ دین بنا تو معاش کے لئے کوئی اور ذریعہ کیسے پیدا کر سکتا ہے؟ لامحالہ وہ غریب مجبور ہے کہ علمِ دین ہی کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنائے اور قوم کی جیبوں پر بار ہو جائے۔

ممکن ہے بعض حضرات خیال کریں کہ میں علماء کو حقیر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور علماء سلف کی توہین کر رہا ہوں مگر نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے، یہاں جو کچھ تحریر کیا اس کا مقصد محض اصلاح اور خدمتِ خلق ہے۔ یہ دُرست ہے کہ وہ ایک پیچیدہ راستے پر پڑ گئے اور قیاسی بحثوں کے انبار لگا گئے مگر جو کچھ انھوں نے کیا وہ ضرورتِ زمانہ سے مجبور ہو کر نیک نیّتی اور خلوص سے کیا اور جناب ربّ العزّت کا فرمان ہے "ینالہُ التقوٰی منکُم" (اللہ تعالیٰ کو تمہارے دلوں کا خلوص پہنچتا ہے)، یہ بھی دُرست ہے کہ انہوں نے بےشمار موضوع روایات جمع کر دیں مگر ان کے ساتھ ایسی احادیث صحیحہ و روایاتِ واقعی بھی تو لکھی ہیں جو اُس وقت تو خلافِ عقل معلوم ہوتی تھیں مگر اب روشنی کے زمانے میں ان سے نور چمکنے لگا۔ سزا و عذاب تو احادیث کے وضع کرنے اور وضع کرانے والوں کیلئے ہے جمع کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں۔ ان کیلئے ان کی محنت و خلوص کا اجر ہے۔

یہ بیان تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل مقصود تو تشریح نفسِ انسان ہے۔ اب اسی کی طرف رجوع کرنا لازم ہے! اس وقت یہ بحث نہیں کہ جسمِ انسان میں کتنے نفوس ہیں ورنہ وہ ہی فلسفہ ہو جائے گا۔ اس وقت تو محض نفسِ امّارہ پر بحث مقصود ہے اور وہ ہی موضوعِ محل ہے۔

دیکھئے ایک کپڑے کو پانی میں بھگو کر نچوڑیں تو اس کی نس نس اور تار تار میں پانی سرایت کئے ہو گا۔ دوسری مثال دیکھیں، دودھ میں پانی ملانے سے ہر قطرہ میں پانی شامل ہو گا۔ مثلاً

بالکل اسی طرح نہایت لطیف غیر مرئی گیس کا ایک جسم ہمارے گوشت پوست کے جسم میں سرایت کئے ہوتے ہے۔ اسی غیر مرئی جسم کو نفس یا جان اور انگریزی زبان میں (MIND) کہتے ہیں۔

مادّی دُنیا کی اشیاء وغیرہ کو جاننے کے لئے اس کے پانچ ذرائع ہیں۔ دیکھنا، سُننا، چکھنا، سونگھنا اور چھُونا۔ ان کو حس کہتے ہیں۔ یہ حواس خمسہ ظاہری کہلاتے ہیں۔

① دیکھنے کا حِسّ۔ حسِّ بصارت یا باصرہ۔
② سُننے کا حِسّ۔ حسِّ سماعت یا سامعہ
③ چکھنے کا حِسّ۔ حسِّ ذائقہ یا ذائقہ
④ چھُونے کا حِسّ۔ حسِّ لمس یا لامسہ
⑤ سونگھنے کا حِسّ۔ حسِّ شموم یا شامّہ

اَب ان کا تجزیہ ملاحظہ کریں۔ صرف ایک قوّتِ باصرہ کا عمل ہی دیکھیں:۔

ایک طرف نظر پڑی بلی دیکھی۔ اس کی تصویر آنکھوں میں آئی۔ یہاں سے دماغ میں پہنچی۔ یہ حِسّ ہُوا (SENSE)۔

اَب نفس نے حکم لگایا یہ 'بلّی' ہے یہ نفس کو وقوف ہوا (COGNITION)

بلّی پر نظر پڑتے وقت اگر دودھ یا سالن کسی برتن میں رکھا ہُوا ہے جہاں بلّی پہنچ سکتی ہے تو فوراً دل پر اثر ہوگا۔ یہ احساس ہوا (FEELING)۔

احساس ہوتے ہی فوراً کہے گا بلّی۔ بلّی یا اس کو بھگانے کے لئے کوئی حرکت کرے گا۔ یہ ردِّ عمل ہوگا (RE-ACTION) ۔

ان تمام کیفیات کے مجموعہ کو شعور (CONSCIOUSNESS) کہتے ہیں۔

اسی طرح باقی چاروں حواس کا حال ہے کہ پہلے حس ہوتا ہے۔ پھر نفس حکم لگاتا ہے یعنی اس کو وقوف ہوتا ہے۔ پھر اگر اس پر کسی طرح کی ناگواری یا خوش گواری کا اثر ہوا تو یہ احساس ہوا اس کے جواب میں جو عمل ہوگا وہ رَدِّ عمل ہے۔ ان چاروں کیفیات کے مجموعہ کو شعور کہتے ہیں۔ یہ تمام کیفیات سیکنڈ کے بہت کم حصّہ میں گزر جاتی ہیں۔ ان کا تجزیہ کرنا محال ہے مگر یہ شعورِ ظاہری ہے شعورِ باطنی کی اس سے جُدا گانہ کیفیت ہے جس کو موقع پر بیان کیا جائے گا۔

اُب فطرتِ نفس کا مطالعہ فرمائیے :

اگر تالاب میں پتھر پھینکیں تو اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ پانی اُچھلتا ہے اور پھر لہریں حلقہ بہ حلقہ اُٹھتی اور پھیلتی جاتی ہیں اور بتدریج ہلکی ہوتی جاتی ہیں۔ اسی طرح نفسِ انسان میں بھی لہریں اُٹھتی رہتی ہیں۔ بعض تو خود بخود اُٹھتی ہیں اور بعض مہیج خارجی (EXTERNAL STIMULI) کے اثر سے۔ مہیج خارجی کے اثر سے اُٹھنے والی لہریں اُونچی اُٹھتی ہیں۔

خود بخود اُٹھنے والی لہریں دو اقسام پر تقسیم کی جا سکتی ہیں :-

اوّل : مثلاً ہوا خوری کو جی چاہا۔ یہ چاہ ہے۔ عربی میں اس کو شاء یا منشا، انگریزی میں (DESIRE) کہتے ہیں۔

دوم : وہ خواہشات جو دور کے طور پر اس پر وارد ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے بھوک، پیاس، نیند کی یا آرام کرنے یا حرکت کرنے کی خواہش جن کا اس کو احساس بھی ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی خواہش اس کی خواہشِ بقا ہے۔ یہ چاہتا ہے میں ہمیشہ رہوں۔ لہٰذا موت سے ڈرتا ہے فنا ہونا نہیں چاہتا۔ اس کا خیال ہے کہ آرام و راحت سے بقا میں مدد ملے گی۔ ہر خواہش کی تسکین سے اس کو سکون ہوتا ہے اور لُطف آتا ہے تسکین نہ ہونے سے ناگواری کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے یہ جانتا ہے کہ فنا سے قریب ہو جاؤں گا۔ ان ہی اسباب و وجوہات کی بنا پر تمام ذرائع تسکینِ جذبات و خواہشات اس کو محبوب ہوتے ہیں۔ بچپن میں تو یہ خواہشات چھپی ہوئی رہتی ہیں جن کا احساس تمیز آنے پر ہوتا ہے مثلاً جنسی خواہش، مال و اسباب، جائداد مکان، اسباب زینت وغیرہ کی خواہش۔ اور ہمیشہ باقی رہنے کے لئے اولاد کی خواہش بھی اس میں مستور رہتی ہے جس کا احساس جوانی تک نہیں ہوتا۔ ایسی تمام خواہشات کو جن کا تعلق خارج سے نہ ہو قرآن کریم میں شہوات کہا گیا ہے۔ ہم محض خواہش کہتے ہیں۔

خارجی اثرات سے پیدا ہونے والی خواہشات بھی دو قسم کی ہو سکتی ہیں :-

اوّل : اگر بھوک کا احساس ہوا اور صرف غذا کی خواہش ہے تو یہ شہوت ہے۔ اور اگر مٹھائی کھٹائی، پلاؤ، زردہ، گوشت وغیرہ کسی خاص شے کے کھانے کی خواہش ہو تو یہ ہوئی یا جذبہ ہے۔ پیاس کا احساس شہوت ہے۔ شربت، سوڈا واٹر، لیمونیڈ یا کسی خاص مشروب کی خواہش

ہوئی یا جذبہ ہے۔ جذبہ جنسی کی تسکین محض کی خواہش شہوت ہے اگر کسی مخصوص ذات کے خیال سے ہو ہوئی یا جذبہ ہے کسی خاص باغ یا سیرگاہ جانے کی خواہش ہوئی یا جذبہ ہے کسی شے کے گم ہو جانے یا فوت ہو جانے کی ناگواری، کسی اُمید کے پورا ہونے کی خوشی ہوئی یا جذبہ ہے۔ غرضیکہ جن خواہشات کا تعلّق کسی خارجی شے سے ہو یا مہیّج خارجی کے اثر سے بطور ردِّ عمل پیدا ہوں ان کو قرآن ہوئی کہتا ہے۔ ہم جذبات کہتے ہیں مثلاً سرور و الم، محبّت، نفرت، اُلفت، عداوت، غصّہ، بغض وحسد وغیرہ مال واسباب وجائیداد وغیرہ (جب موجود ہوں)، اولاد کی محبّت (جب موجود ہو) یہ تمام جذبات یا ہوئی ہیں۔

دوم : مہیّج خارجی کے اثر سے بطور ردِّ عمل پیدا ہونے والی خواہشات میں اگر شدّت بھی ہو مثلاً مال و اسباب وجائیداد کی کثرت کی شدید خواہش، کسی شے کی بہتات کی خواہش ہو تو اس کو قرآن کریم نے تکاثر کہا ہے اور ہم ہوس کہتے ہیں۔

کائنات میں تمام کام ہر حرکت وسکون، ہر عمل و ردِّ عمل جناب ربّ العزّت کے مُعیّن کردہ قوانین کے ماتحت جاری وساری ہیں جیسا کہ ارشاد ہے "وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی" (الاعلیٰ ۳) وہ وہی (ذاتِ اقدس) ہے جس نے (ہر شے کے لئے) اندازہ یا قانون مقرّر کیا اور (اسی کے مطابق ہدایت فرمادی)۔ وہ تمام کام جو مالک کے مقرّر کردہ قوانینِ فطرت کے تحت واقع ہوتے ہیں اور تمام کائنات میں جاری وساری ہیں، خدا کے کام کہلاتے ہیں مثلاً موت وحیات، فنا وبقا، ہدایت وضلالت، برق وباراں وغیرہ وغیرہ۔ اپنے قوانینِ قدرت کے متعلق ارشاد فرمایا ہے "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا" (۶۲ الاحزاب) (اللہ کی سُنّت کو ہرگز بدلا ہوا نہ پاؤ گے)۔ خدائی قانون کبھی بدل نہیں سکتا۔ اس کے قانون کو اگر کوئی توڑ سکتا ہے یا بدل سکتا ہے تو وہ اس کا مُعیّن کردہ قوی تر قانون ہو گا۔ مثلاً عالم نور یا عالم اَمر کے متعلقہ قوانین عالمِ مادّی کے قوانین کو بدل سکتے ہیں اور اسی کو خرقِ عادت یا معجزہ کہتے ہیں نفسِ انسان کے متعلقہ قوانین کو فطرتِ نفسِ انسانی کہتے ہیں۔

نفسِ انسانی کی فطرت ہے کہ جسم میں جہاں کہیں اذیّت کا احساس ہوا خون کو اس مہیّج سے مقابلہ کے لئے بھیج دیتا ہے۔ یہ اپنی غفلت کی وجہ سے عیب وثواب سمجھ نہیں سکتا اور ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔ مثلاً سانپ نے کاٹا۔ اس نے خون بھیج دیا۔ وہ زہر پر غالب نہ آسکا لوٹ گیا۔ قلب تک زہر ملا ہوا خون پہنچا تو موت واقع ہو گئی۔ اگر اس کو ذرا بھی ہوش ہوتا تو خون کو واپس

لوٹانے کے بجائے خارج کردیتا۔ زہر بھی نکل جاتا اور موت واقع نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ تو کسی کو نہیں مارتا وہ تو فرماتا ہے "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا..." (۴۲) الزمر۔ (اللہ تو نفس کو منتقل کردیتا ہے موت کے وقت)۔ معلوم ہوا کہ یہ غافل اپنی ہلاکت کے اسباب خود ہی پیدا کرتا ہے۔ اور چونکہ موت قوانینِ فطرت اور اس کی قدرت کے قوانین کے تحت واقع ہوتی ہے لہٰذا وہ خدا ہی کا کام ہے، وہی مارتا ہے، وہی جلاتا ہے۔ کائنات میں تمام کام قوانینِ قدرت کے تحت نوری شعاعوں اور مقناطیسی شعاعوں سے جاری و ساری ہیں جس طرح آفتاب و ماہتاب کی شعاعیں ہمارے خیالات، خواہشات و جذبات پر اثر انداز ہوتی ہیں اسی طرح تمام اجرام فلکی کی شعاعیں اور وہ شعاعیں جو دُور دراز فاصلوں سے آرہی ہیں، جن کے مراکز نامعلوم ہیں، اور وہ جن کو کاسمک ریز کہتے ہیں نفسِ انسان پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ ان تمام اقسام کی شعاعوں میں بعض کے اثرات مُفید اور بعض کے مضر اور ہلاکت خیز ہیں۔ ان اثرات پر انسان کو اختیار نہیں۔ چونکہ نفسِ انسان غفلت کی حالت میں ہے، جیسا کہ آگے اسی باب میں واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ بالکل سویا ہوا ہے، اس نوم (نیند) کی حالت میں اس کو بُرے بھلے کی خبر نہیں ہوتی لہٰذا مہلک شعاعیں اثر کرتی رہتی ہیں اور ہلاکت و تباہی اس کے لئے مُقدّر ہو جاتی ہے۔ اگر اس کو ذرا سا بھی ہوش آ جائے تو مہلک اثرات کو قبول نہ کرے۔

یہ تو غیر مرئی شعاعیں ہیں ان کا تو اس کو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تو اپنی غفلت ولاشعوری کے باعث اس کا یہ عالم ہے کہ یہ محض الفاظ ہی سے مہلک اثرات قبول کر لیتا ہے، تخیّل کے اثر سے ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ صرف دو مثالیں ہی دیکھ لیجئے:-

۱۔ ایک ریاست کے نواب صاحب کے مظالم جب رعایا کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئے تو ایک سازش کی گئی کہ ان کو گدی سے اُتار کر ان کے بیٹے کو نواب بنایا جائے۔ لوگوں نے بیٹے کو بھی سازش میں شریک کر لیا۔ نواب صاحب کے جاسوسوں نے ان کو مطلع کر دیا۔ بس بیٹے کی جان کے دشمن ہو گئے۔ نواب صاحب نے اپنے عیاشی کے شریک مصاحبین کی ڈیوٹی لگادی کہ صاحبزادے کے پاس جاتے رہو اور ہر ایک شخص یہ ہی کہے۔ "ارے جناب آپ کو کیا ہو گیا؟ کچھ طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے! آپ تو بہت کمزور نظر آرہے ہیں"۔ ایک ہی ہفتہ کے اندر اندر صاحبزادے بیمار ہو گئے۔ پھر ان کی تیمارداری بھی ان ہی دشمنوں کے سُپرد رہی۔ روزانہ ہر شخص شدّتِ مرض ہی کا

اظہار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ فوت ہو گیا۔ یہ ہے نفس کی غفلت و لاشعوری کا نتیجہ۔

۲۔ عرصہ دراز گزرا، اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ فرانس میں ایک ماہر علم النفس ڈاکٹر نے حکومت سے درخواست کی کہ مجھے ایک ایسے قیدی کی ضرورت ہے جس کو سزائے موت کا حکم دیا جا چکا ہو۔ میں اس پر ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں اور اپنے مجوزہ تجربہ کی تفصیل بھی واضح طور پر تحریر کر دی۔ اس پر اس کو ایک ایسا قیدی دے دیا گیا جس کو سزائے موت دی جانی تھی۔

ڈاکٹر قیدی کو اپنی تجربہ گاہ میں لے آیا اور اس سے کہا کہ تم کو سزائے موت کا حکم تو ہو چکا ہے۔ میں تم پر ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں جس میں نوے فیصد اُمید ہے کہ تم زندہ رہو گے۔ اگر تجربہ کامیاب ہو گیا تو پھر تم آزاد کر دیئے جاؤ گے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں نے ایک مکسچر تیار کیا ہے جو خون کا بدل ہے میں پہلے تمہارے جسم سے تمام خون نکال لوں گا پھر اپنا مکسچر پچکاری کے ذریعے سے تمہارے جسم میں داخل کر دوں گا تو وہ خون کے بدلے کام کرنے لگے گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے۔

ڈاکٹر نے قیدی کو پانی سے بھرے ہوئے ایک بڑے ٹب میں جس کے درمیان تکیہ دار نشست تھی بٹھایا۔ پانی اس کے کندھوں تک آ گیا۔ پھر سرنج یا نشتر سے اس کے بازو میں زخم لگایا۔ کچھ خون نکلنا شروع ہوا۔ ڈاکٹر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ایک ملازم ٹب کے پیچھے بیٹھا ہوا سُرخ رنگ پانی میں ڈالتا رہا۔ جب پانی کافی سُرخ ہو گیا تو ڈاکٹر نے کہا "اب تمہارا آدھا خون نکل گیا ہے بس جس وقت تمام خون نکل جائے گا میں فوراً اپنا مکسچر رگ میں داخل کر دوں گا"۔ اب ڈاکٹر نے قیدی کی نبض دیکھی تو وہ ڈوبنے لگی تھی اور اس پر کچھ بے ہوشی سی طاری تھی۔ جب ڈاکٹر نے کہا کہ اب تمام خون نکلا ہی چاہتا ہے تو اس کی گردن ڈھلک گئی، نبض ساقط ہو گئی اور قیدی مر گیا۔ یہ ہے غفلت و لاشعوری کہ تخیل ہی سے ہلاک ہو گیا۔

غرض کہ انسان کی ہلاکت و تباہی کا باعث اس کی غفلت و لاشعوری ہی ہے جس پر انسان کو کوئی قابو نہیں البتہ اس کا جگانا اس کے اختیار میں ہے۔ اسی لئے اس کو غفلت سے جگانے کے طریقے بتانے اور سکھانے کو انبیاء و رسل آتے رہے اور ایسے اعمال تعلیم کرتے رہے جن پر عمل کرنے سے اس کی غفلت و لاشعوری کم ہو سکے۔

انسان کو تو مالک نے اپنا خلیفہ بنایا تھا تاکہ یہ نیچر (فطرت) پر حکومت کرے اور اس کے

بُرے اور مہلک اثرات قبول نہ کرے اور ہلاکت و تباہی سے محفوظ رہے۔ صرف مُفید شعاعوں اور اشیاء سے فائدہ اُٹھائے۔ جب مُہلک شعاعیں آتی رہتی ہیں اور نفسِ انسان پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ یا اپنی غفلت سے ان کا اثر قبول کرتا رہتا ہے تو اسی کے اثر کے مطابق اس کی ہلاکت و تباہی کا وقت مُعیّن ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کو کچھ خبر بھی ہو جاتی ہے۔ ان مہلک اثرات کے نفس کے اندر بیٹھ جانے اور ہلاکت و تباہی کا وقت معیّن ہو جانے کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾ الحدید

"نہیں پہنچتی کوئی مُصیبت زمین میں اور نہ خود تمہارے نفسوں میں مگر یہ کہ وہ کتاب میں موجود ہوتی ہے قبل اس کے کہ ہم اس کو ظاہر کریں۔ بے شک اللہ کے لئے یہ بہت آسان ہے"۔

لائقِ غور امر ہے کہ وہ کتاب کونسی ہے جس میں وہ مصیبت پہلے سے موجود ہوتی ہے تو وہ بھی نفسِ انسان ہی ہے۔ اسی کو مالک نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے جیسا کہ اسی باب میں آگے واضح ہو جائے گا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہلاکت آفریں اثرات جو نفس قبول کرتا رہتا ہے اس کے تحت الشعور (SUB-CONSCIOUS MIND) میں نقش ہوئے موجود ہوتے ہیں، قبل اس کے کہ ہم اس کی ہلاکت ظاہر کریں۔ پس جب وقت مُعیّن آجاتا ہے تو ہم ظاہر کر دیتے ہیں پس ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ آگ لگ جاتی ہے۔ ہوائی جہاز گر جاتا ہے۔ سیلاب آجاتا ہے۔ سائیکلون آجاتا ہے۔ ٹرین ٹکرا جاتی ہے۔ بس اُلٹ جاتی ہے۔ تباہی مچ جاتی ہے۔ جن کے تحت الشعور میں ہلاکت کے اثرات مرتب ہو چکے تھے وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔

ان غیر مرئی شعاعوں کے اثرات کے لئے تو انسان عذر کر سکتا ہے کہ ہر شخص تو اس غافل نفس کو نہیں جگا سکتا۔ اس کی غفلت کم نہیں کر سکتا مگر زندگانی دُنیا کے کاموں پر تو اس کو اختیار ہے۔ مرغن غذائیں کھانے والوں ہی کا ہارٹ فیل ہوتا ہے۔ سادی غذا کچی سبزیاں کھانے والے اس مرض سے محفوظ رہتے ہیں اور ان کی صحت بھی اچھی رہتی ہے۔ پُر تکلف غذائیں کھانے والوں کے جسم میں زہریلا فاسد مادہ جمع ہوتا رہتا ہے جو نتیجہ میں ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ ہلاک تو یہ خود ہوتا ہے۔ اپنی ہلاکت کے سامان تو یہ بے خبری میں اپنے مزے اُڑانے سے جمع

کرتا رہتا ہے اور نتیجہ میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ کثرتِ جماع سے جگر و معدہ خراب ہو جاتے ہیں۔ عمر کم ہو جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اللہ کی مرضی! ارے اللہ ظالم تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو عادل ہے۔ کلام اللہ ایسی آیات سے مملو ہے جن میں ظاہر کر دیا گیا ہے کہ جیسا کوئی کرے گا ویسا ہی بھرے گا۔ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ دیکھیں آیاتِ ذیل:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ ﴿۴۰﴾ النساء (تحقیق کہ اللہ تعالیٰ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا)۔

ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ البقرۃ

(ہر نفس کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ط ﴿۵۱﴾ ابراہیم (تاکہ اللہ ہر نفس کو اس کے کئے کا بدلہ دے)۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ط ﴿۳۰﴾ الشوریٰ (کوئی بلا و مصیبت تمہیں نہیں پہنچتی مگر اس سے جو تم نے اپنے ہاتھوں کمایا)

وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ﴿۴۸﴾ الشوریٰ

(اور اگر پہنچتی ہے ان کو کوئی مصیبت اس سے جو اپنے ہاتھوں آگے بھیجا)

کہاں تک لکھوں کلامِ پاک میں بہت سی آیات ظاہر کر رہی ہیں کہ انسان کو جو بلا و مصیبت پہنچتی ہے۔ وہ اس کی خود پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں دُنیا میں ملتی ہیں۔ صرف دو مثالیں ہی سُن لیں:۔

۱۔ ایک قصّاب کے چھوٹے بیٹے کی شادی تھی۔ برات دوسرے شہر جانی تھی۔ بڑی بہو کو گھر میں چھوڑا گیا۔ دعوتوں میں دیگوں میں سے زائد چکنائی جو اُتاری گئی تھی ایک دیگچہ میں رکھی ہوئی تھی۔ جب برات واپس آئی تو بڑی بہو کی لاش پڑی تھی۔ پڑوسی دشمن تھے زہر خورانی کا شبہ ہوا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو معدے سے حلق تک جمی ہوئی چربی برآمد ہوئی۔ یہ ہے غفلت کا نتیجہ کہ نفس کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ جس چیز کو جی چاہ رہا ہے یہ میرے معدے کے لئے

مفید ہے یا مہلک۔ ہوس بڑی بہو کو مجبور کرتی رہی کہ برات واپس آنے سے پہلے جتنا تار (چکنائی) میں پی سکوں وہ ہی میرا ہوگا، سب سے زیادہ حصہ میں ہی لوں۔ بس اتنا تار پیا کہ سانس رُک گیا اور دَم نکل گیا۔

۲:۔ میرے ایک عزیز کی اہلیہ فوت ہوگئیں۔ کئی بچے چھوڑے۔ دو سال تک تو انہوں نے شادی کا نام نہ لیا۔ عمر تقریباً اڑتالیس سال ہوگئی تھی۔ آخر ایک نہایت خوبصورت جوان عورت سے شادی رچالی اور ہر وقت خلوت میں رہنے لگے۔ دوست، احباب، اعزّہ فہمائش کرتے تھے کہ تمہاری اولاد و احباب و اعزّہ کا بھی کچھ حق ہے ان کے پاس بھی تو کچھ وقت گزارنا ضروری ہے مگر کچھ اثر نہ ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ معدہ و جگر متورّم ہو گئے۔ سال کے اندر ہی انتقال ہوگیا۔ یہ تھا غفلت کا نتیجہ۔ بس جی چاہ رہا ہے مگر یہ پتہ نہیں کہ اس کا انجام ہلاکت ہوگا۔

یہ بھی قارئین کے مطالعہ سے گزر چکا ہے کہ ہلاکت خیز اثرات کے نفس پر نقش ہو جانے کا بعض اوقات اس کو خود بھی پتہ ہو جاتا ہے۔ مجھے کتنے ہی واقعات یاد ہیں مگر بخوف طوالت صرف تین ہی یہاں تحریر کرتا ہوں:۔

(۱) کراچی میں ایک موٹر میکینک نے ایک شخص کی موٹر سائیکل مرمّت کی۔ گاہک کو موٹر سائیکل دیتے وقت کہا۔ "لو ایسی مرمّت کی ہے مر جاؤں گا تو یاد کرو گے"۔ دوسرے دن ہی ایکسیڈنٹ سے ہلاک ہوگیا۔ یہ واقعہ بہ تفصیل اخبار جنگ مورخہ ۷ جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔

(۲) میرے ایک دُور کے رشتے دار ریلوے میں گارڈ تھے۔ ایک روز اپنے ساتھیوں سے ریلوے کے حادثات کا ذکر کرنے لگے۔ فلاں اسٹیشن پر ایک سگنل مین ریل سے کٹ گیا۔ فلاں اسٹیشن پر ایک قلی ٹرین سے کٹ گیا۔ دو روز برابر ایسے ہی حادثات کا ذکر کرتے رہے۔ اس ذکر کے سوائے ان کو کوئی اور بات پسند نہ تھی۔ تیسرے دن صبح دس بجے کے قریب وہ بھی ٹرین سے کٹ گئے۔

(۳) یو۔پی انڈیا ضلع بیلی بھیت میں سارداکینال بن رہی تھی۔ بن بسہا بڑا ہیڈ ورکس تھا۔ تقریباً ہزار بارہ سو مزدور کام کر رہے تھے۔ ایک روز ایک مزدور بہت خائف تھا۔ کہتا تھا مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہیں مجھے شیر نہ لے جائے۔ مزدوروں کی چار پائیوں کے گھیرے کے درمیان چار پائی ڈال کر سویا اور چار پائی کے چاروں طرف آگ بھی جلائی۔ رات کو شیر آیا اور گھیرے کی

چار پائیوں پر سے زقند مار کر اسی مزدور کو درمیان سے اٹھا کر لے گیا۔ میں اس زمانہ میں تن بسہا سے پندرہ میل جنوب دھیونی ہیڈ ورکس پر انچارج تھا۔ اس واقعہ کی اطلاع دوسرے روز ہی دھیونی پہنچ گئی تھی۔

دیکھی آپ نے اس آیت کی تفسیر "اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا" (مگر یہ کہ وہ بلا پہلے سے نفسِ انسان میں موجود ہوتی ہے قبل اس کے کہ ہم اس کو ظاہر کریں) اللہ اکبر!! الٰہی ہمیں تو نفس کے شر سے محفوظ رکھنا۔

ہمیں حواس خمسہ زندہ رہنے اور مضرات سے بچنے کے لئے دیئے گئے تھے۔ مشاہدات سے ثابت ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں شور و غوغا نہ ہو، فضا پُرسکون ہو تو صحت بہت اچھی رہتی ہے، عمریں طویل ہوتی ہیں۔ ہم ہر وقت گھر میں زور و شور سے ریڈیو چالو رکھتے ہیں۔ کسی کا کیا بگاڑتے ہیں۔ خود اپنے پیر میں کلہاڑی مارتے ہیں۔ ذائقہ و شامہ اس لئے تھے کہ مُضر اشیاء کھانے سے پرہیز کر سکیں مگر ان کو تو ہم چٹ پٹے مصالحوں سے اور مرغن غذائیں کھا کر مسخ کر دیتے ہیں۔ سادہ غذا کھانے والے بدتمیز کہلاتے ہیں حالانکہ ان کی صحت بہت اچھی رہتی ہے اور عمریں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ موت کو جلد آنے کی دعوت تو ہم خود دیں اور الزام اللہ پر کہ اللہ کی مرضی۔ جانوران صحرائی، تمام درندے، پرندے، چرندے جو آزاد رہتے ہیں، صحرائیں، جنگل میں زندگی گزارتے ہیں ان کو بھی یہی حواس خمسہ ظاہری دیئے گئے ہیں مگر وہ اپنی فطرت کے عین مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان کے حس شامہ و ذائقہ غلطی نہیں کرتے وہ کوئی مُضر شے نہیں کھاتے۔ اتنی مقدار سے زیادہ جو پوری طرح ہضم نہ ہو، نہیں کھاتے۔ لہٰذا نہ کسی کے سر میں درد ہوتا ہے نہ پیٹ میں۔ نہ قے آتی ہے نہ دست۔ نہ آشوبِ چشم ہوتا ہے نہ ناک و حلق میں ورم۔ تندرست رہتے ہیں، خوش و خرم اپنی طبعی زندگی گزارتے ہیں۔ تمام مخلوق میں حضرتِ انسان ہی وہ جانور ہیں کہ مزے مزے میں زیادہ کھا گئے۔ پیٹ میں درد، سر میں درد، اچار بہت سا کھا گئے تو زکام، نزلہ، کھانسی میں مبتلا ہو گئے۔ کبھی ایک مرض میں مبتلا کبھی دوسرے میں۔ غرضیکہ ہزار مصیبت۔ ڈاکٹر کو لاؤ، طبیب بلاؤ۔ فیس کے لئے بجٹ میں گنجائش نہیں، قرض لے لو۔ یہ انسان جس کو خدا نے اپنی نیابت کے لئے بنایا تھا "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ

اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ (البتہ پیدا کیا ہم نے اِنسان کو بہترین انداز پر) مگر یہ اپنی حرکات سے ایسا ذلیل ہوا کہ مالک کو کہنا پڑا ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ "۝۵ التین (پھر گرا دیا اس کو پست ترین سے پست ترین)۔ یہ تو ایسا ذلیل ہے کہ اس کے ساتھ جو جانور رہتے ہیں وہ بھی بیمار ہوتے رہتے ہیں۔ افسوس ہے ہماری حالت پر۔ اسی لئے تو ہم جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ مالک الملک ہم جیسا بن کر ہمیں شرم دلا کر ہمارے جیسے جذبات ہی کا اظہار فرمارہا ہے يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۝۳۰ یٰسین (ہائے کیسی حسرت ہے بندوں پر)۔ ہاں مالک! واقعی ہم ایسے ہی بے شرم اور بے غیرت ہیں۔ وہ کبھی ارشاد فرماتا ہے:- ...... وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝۱۲ محمد

(اور وہ جو فطرت سے مُنہ پھیرلے ہیں عیش کرتے ہیں اور جانوروں کی طرح کھاتے ہیں اُن کا ٹھکانہ آگ ہوگی)۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے:-

" اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۴۴ الفرقان

(نہیں ہیں وہ مگر مثل چوپاؤں کے بلکہ ان سے کہیں زیادہ گمراہ)

حق ہے، مولا تو سچّا ہے۔ ہم ایسے ہی ذلیل و باغی ہیں۔ جانور مزے مزے میں زیادہ کھا کر بیمار نہیں پڑتے۔ ہم ہی ایسے بدبخت ہیں کہ اپنی فطرت پر عمل نہیں کرتے بلکہ اس پاک و پاکیزہ فطرت کو بھی مسخ کر دیتے ہیں۔ تیرا کلام حق ہے۔ ہاں جو تیرے بندے تیرے وجود کا یقین رکھتے ہیں وہ اس فطرت صحیحہ پر جو تو نے سب اِنسانوں میں ڈالی ہے پورا پورا عمل کرتے ہیں اور نیچر کے مضرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ افسوس وائے ہو ہم پر! جب ہماری غفلت اور فطرت سے روگردانی کا یہ عالم ہے تب ہی تو رب فرماتا ہے:-

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۲۱ الجاثیہ

(کیا وہ لوگ جنھوں نے بُرائیاں کمائی ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کی طرح قرار دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے۔ ان کی حیات اور موت ایک جیسی ہوسکتی ہے؟ کیا ہی بُرا فیصلہ کرتے ہیں)

ہاں سب سے پیارے رب! تُو تو ماں باپ سے بھی ہزاروں بلکہ لاکھوں گنا زیادہ شفیق ہے۔ مگر تو کیا کرے جب ہم اپنے پیر پر خود ہی کلہاڑی ماریں۔ ہمارے حال پر رحم فرما تو ارحم الرّاحمین ہے! اس مقدّس فطرت پر جو تُو نے ہمارے اندر ڈالی ہوئی ہے پورا پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرما، واسطہ اپنے حبیب کا جس کے لئے تُو نے آسمان و زمین خلق فرمائے۔ صلی اللہ علیہ وسلّم۔

غرضکہ ہمارے نفسِ امّارہ کی یہ فطرت ہے کہ جہاں اس کو کوئی خواہش پیدا ہوئی، کوئی خیال آیا کوئی جذبہ طاری ہوا یہ فوراً حرکت کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ چشم زدن میں اس خواہش یا جذبہ کی تسکین ہو جائے۔ وہ تو یہی چاہتا ہے ادھر کہوں ہو جا اور فوراً ہو جائے۔ مالک تو فرماتا ہے:۔

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ⑪ بنی اسرائیل

(اور دُعا کرتا ہے انسان شر کی گویا اپنی بھلائی کی اور انسان تو بڑا جلد باز ہے)

اپنی اس جلد باز فطرت کے باعث ہر خواہش کی تسکین کی دُعائیں کرتا ہے حالانکہ وہ اس کے حق میں سخت مُضر ہوتی ہیں۔ وہ تو جلد بازی میں اس کو اپنے لئے بہت اچھا سمجھے ہوتا ہے اور یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اس سے کوئی نقصان تو نہ ہوگا۔ ہر شخص کو زندگی میں اس کا تجربہ ہوا ہوگا کہ بعض اوقات جوش میں ایسا کام کر لیا ہے کہ بعد میں عُمر بھر کے لئے پچھتانا پڑ رہا ہے۔ ایک ایسا ہی واقعہ یاد آ گیا، سُنئے!

۱۹۴۱ء میں جب کہ جنگ کی وجہ سے بڑی پریشانیاں لاحق تھیں ایک مزدور پیشہ شخص نے فاقہ شکنی کے لئے کسی سے دس روپے قرض لئے۔ نوٹ لئے ہوئے گھر آیا چار سالہ بیٹا کھڑا ہنس رہا تھا۔ باپ سے نوٹ مانگا۔ اس نے دے دیا۔ بچّے نے لیتے ہی نوٹ پھاڑ ڈالا۔ باپ نے جوشِ غضب میں بچّے کی پنڈلیاں پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور اس کو پھاڑنا چاہا۔ کچھ حصّہ جسم پھٹ گیا اور بچّہ اسی وقت مر گیا۔ اب رویا پیٹا، پولیس آ گئی۔ نتیجہ میں سات سال کی سزا ہوئی۔

یہ تو مادّی نقصانات ہیں۔ اگر باطن کی طرف توجّہ کریں تو یہ قانونِ فطرت ہے کہ بے سوچے سمجھے خواہش و جذبہ کی فوری تسکین کر لینے سے غفلت و لاشعوری اور زیادہ ہوتی ہے اور عقلِ فطری و ضمیر

جو صحیح اور سیدھا راستہ بتانے والی قوتیں ہیں، ان پر مزید حجاب آجاتے ہیں۔ پھر دُنیا کے کاموں میں بھی زیادہ غلطیاں ہونے لگتی ہیں اور عالمِ غیب، عالمِ نور یا نورِ ایمان سے بُعد بڑھتا جاتا ہے جو حیات بعد الموت میں عذاب کا باعث ہوتا ہے اور جس کا نتیجہ ہلاکتِ اَبدی ہے۔ اسی لئے ہمارا مالک جو ہم پر ماں باپ سے بھی لاکھوں گنا زیادہ شفیق ہے یہ چاہتا ہے کہ ہمیں اس مادّی دُنیا کے نقصانات و تباہی اور بلاؤں سے اور حیات بعد الموت کے عذاب و ہلاکتِ اَبدی سے بچائے جس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہم کسی شخص کے یا خود اپنے نفس کے کہنے پر بے سوچے سمجھے بغیر عقل سے کام لئے عمل نہ کریں۔ یہ منزلت تو اسی معبودِ حقیقی کے لئے مخصوص ہے کہ اس کے ہر حکم کی تعمیل لازم ہے۔ اس میں نہ چوں و چرا کی گنجائش ہے نہ سوچنے سمجھنے کی حاجت۔ اسی لئے تو اس نے ارشاد فرمایا ہے :۔

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (۴۳) الفرقان

(کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی ہوائے نفس کو اِلٰہ بنایا ہوا ہے پھر تُو اس کا کارساز کیسے ہو سکتا ہے ؟)

ٹھیک ہے رسولؐ کا کام راستہ دکھا دینا ہے۔ احکامِ خداوندی کا بندوں کو پہنچا دینا اس کا فریضہ ہے جن پر عمل کرنے سے دُنیا و آخرت کی تباہی و ہلاکت سے انسان محفوظ رہ سکے۔ کلام اللہ میں بہت آیات ایسی ہیں جن میں ظاہر کیا گیا ہے کہ رسولؐ کا کام صرف احکام پہنچا دینا ہے جیسا کہ ارشاد ہے "مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ" (۹۹ المائدہ) (رسول پر سوائے احکام پہنچا دینے کے اور کچھ نہیں)۔

اب تو واضح ہو جاتا ہے کہ آیہ دنی ہدایہ "اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ هَوٰىهُ" میں اِلٰہ کے معنی سوائے اس کے کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ ذات جس کے حکم کی بے چوں و چرا بے سمجھے بوجھے تعمیل کی جائے وہی ہمارا اِلٰہ ہے۔ لہٰذا اِلٰہ کے معنی مطاعِ مطلق ہی ہوتے ہیں اور نفس کو مطاعِ مطلق بنائے رہنا شرکِ خفی یا شرکِ باطنی ہے۔ اولیاء اللہ صاحبانِ معرفت، علی کرم اللہ وجہہ کا ایک فرمان نقل کرتے چلے آتے ہیں "اِنَّ اَكْبَرَ مَعْبُوْدٍ عُبِدَ فِي الدُّنْيَا اَلْهَوٰى" (سب سے بڑا معبود جس کی دُنیا میں عبادت کی جاتی ہے ہوائے نفس ہے)۔

آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ خواہشات و جذبات یعنی احکامِ نفس کی بے چوں و چرا فوری تعمیل کرنا نفس کو معبود بنانا ہے اور یہی شرکِ خفی یا شرکِ باطنی ہے۔

نفس پرستوں کے لئے یہ مضامین بہت گراں ہوں گے۔ ان کا نفس تو کہے گا ان آیات میں لفظ شرک تو ہے ہی نہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی یہ اعتراض پیش کرے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کلام اللہ میں کتنی ہی آیات ایسی ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان پر جب مصیبت پڑتی ہے تو خالص اعتقاد سے اللہ کو پکارتا ہے اور جب بلا ٹل جاتی ہے تو وہ پکارنے والے مشرک ہو جاتے ہیں صرف ایک آیت ہی دیکھ لیں:۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾ العنکبوت

(جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو خالص اعتقاد سے پکارتے ہیں پھر جب ان کو نجات دے کر وہ خشکی پر لے آتا ہے تو بس شرک کرنے لگتے ہیں)۔

معترض سے کہنا چاہیئے کہ آپ کو خدا کی قسم ذرا اپنے دل میں جھانک کر بتلائیں کیا آپ کے نفس کی یہ کیفیت نہیں کہ جب تک کشتی میں سوار رہتے ہیں کسی جذبہ یا خواہش میں جوش نہیں ہوتا خصوصاً اس وقت جب موجیں اونچی اُٹھ رہی ہوں اور کشتی ڈولتی ہو۔ اس وقت تو صرف خشکی پر پہنچنے کا خیال ہوتا ہے اور دل خلوص سے بچانے والے کو پکارنے لگتا ہے۔ ادھر خشکی پر اُترے اور وہ یاد غائب۔ پھر وہی خواہشات، وہی جذبات، بچانے والے کو بالکل بھول گئے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کو قرآن کہتا ہے "وہ شرک کرنے لگتے ہیں"۔ اب جو اس پر مصر ہوں کہ شرک تو بس بت پوجنا، کسی کو خدا کا شریک ٹھہرانا، غیر اللہ سے حاجات طلب کرنا ہی ہے تو وہ بتائیں کہ کشتی سے اُتر کر کیا کبھی کسی مسلمان کشتی سوار نے بت پوجے یا کسی کو خدا کا شریک قرار دیا ہے؟ اب تو لفظ شرک بھی قرآن میں دکھا دیا گیا ہے۔

یہ امر تو واضح ہو جاتا ہے کہ جب کوئی شخص رسول کریمؐ کو خدا کا پیغمبر جان لے گا اور خدا کے احکام کی تعمیل کا عہد کرے گا تو اس کو ایسے اعمال تعلیم کئے جائیں گے جن کے بجا لانے سے اس کے نفس میں نجاستِ باطنی بتدریج کم ہوتی چلی جائے گی جتنا شرکِ باطنی کم ہوتا جائے گا اور جتنی نجاستِ شرکِ خفی قلب سے خارج ہوتی جائے گی اتنا ہی ایمانِ حقیقی دل میں داخل ہوتا رہے گا جیسا کہ ربّ العزّت کا ارشاد ہے:۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ الحجرات

(اعراب کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ کہہ دو کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے اور ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اگر تم اللہ اور رسول کی اطاعت کروگے تمہارے اعمال (کے بدلے) میں کچھ کمی نہ کرے گا۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور رحیم ہے)

اس آیہ و حی ہدایہ سے ظاہر ہوگیا کہ متعدد معبودوں کو چھوڑ کر ایک خدا کو مان لینے، کلمہ پڑھکر رسول کی رسالت کا اقرار کر لینے سے ایمان ظاہری تو مل جاتا ہے مگر ایمانِ حقیقی خدا اور رسولؐ کے احکام کی پیروی کرنے سے بتدریج قلب میں داخل ہوتا ہے اسی وقت وجودِ باری اور عالمِ غیب کا یقینِ قلبی حاصل ہوتا ہے۔ ایمانِ حقیقی کی یہی علامت اگلی آیت میں ظاہر کی گئی ہے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ الحجرات

(سوائے ان کے کوئی مومن نہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر۔ پھر امکانِ شک باقی نہ رہا اور کوشش کی (جہاد کیا) انھوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں (نفسوں) سے۔ سچے وہی (مومن) ہیں)

اس آیت سے ظاہر ہوگیا کہ ایمانِ حقیقی کی علامت یہ ہے کہ وجود باری اور غیب کا ایسا یقینِ قلبی حاصل ہوجائے کہ پھر کوئی وسوسہ یا شک پیدا نہ ہو سکے۔ کسی مخالف پروپیگنڈے سے متاثر ہونے کا امکان نہ رہے۔ اسی باب میں آگے یہ ظاہر ہوجائے گا کہ کتابیں پڑھنے یا بیانات سننے سے جو یقین حاصل ہوتا ہے وہ یقینِ قلبی اور یقینِ صادق نہیں ہوتا بلکہ اس کو یقینِ قلبی سمجھ لینا فریبِ نفس ہے۔ نفسِ امارہ کا سب سے بڑا عیب خود فریبی ہی ہے۔

دُنیا کے تمام ماہرینِ علم النفس اس کو تسلیم کرتے ہیں اور مشاہدات و تجربات سے ثابت ہو گیا ہے کہ یہ خود اپنے ہی کو دھوکا دیتا رہتا ہے! اس لئے غیر محسوس عالم کے متعلق اس کے کچھ مان لینے سے فریب نہیں کھانا چاہیئے ورنہ وقت گزر جانے پر حسرت و ندامت سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

اَب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کے باعث وجودِ باری اور غیب کا یقین قلبی، ایمانِ حقیقی حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے کلام پاک کی تلاوت کریں۔ قرآنِ کریم میں بہت سے مقامات پر آیا ہے "فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ" (وہ غافل ہیں۔ وہ شعور نہیں رکھتے۔ وہ بے شعور ہیں)۔ اور اسی غفلت کی بابت حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "اَلنَّاسُ نِيَامٌ اِذَا مَاتُوْا اِنْتَبَهُوْا" (لوگ سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تب جاگیں گے) یہ حدیث سورہ تکاثر کی پہلی آیت کا گویا ترجمہ ہے۔

"اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ① التکاثر۔ (تم کو تو ہوس نے ہی غافل رکھا۔ یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملے)۔ اَب حل طلب امر یہ ہے کہ غفلت، لاشعوری، الہٰکم۔ ان کلمات کا مفہوم کیا ہے۔ حدیث و آیہ مذکورہ کے متعلق قرآن فہمی کے بیشتر مدعی یہی سمجھتے ہیں کہ جو لوگ اس وقت تک کافر و مُشرک ہیں یہ سارے غیر مسلم، حق سے غافل ہیں۔ موت کے وقت ان کو پتہ چلے گا کہ دینِ اسلام ہی حق ہے اور ہم اس سے روگرداں ہی رہے اور یہی معنی و مفہوم عوام کو سُنایا اور سمجھایا جاتا ہے۔ سُننے والوں کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ آیت کا صحیح مفہوم ہمیں معلوم ہو گیا۔ اگر غفلت اور لاشعوری و شعور کے معنی لُغت میں دیکھیں تو کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ ذرا ٹیس، درد، چبھن کے معنی کوئی صاحب لُغت سے نکال کر دکھا دیں۔ یہ تو احساساتِ نفسی ہیں۔ ان کے معانی و مفاہیم تو نفس ہی میں ملیں گے۔ لہٰذا غفلت، شعور و لاشعوری کے مفاہیم کے لئے بھی مطالعہ نفس ہی لازم ہے۔

غفلت، لاشعوری

جسمِ انسان میں تمام افعال اضطراری مثلاً قلب کی حرکت، دَورانِ خون، معدہ، جگر، آنتوں کا کام، گردوں اور پھیپھڑوں کا کام وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام افعال نفس ہی

کے کام ہیں۔ نفس ہی ان کو انجام دیتا ہے مگر ان میں سے کسی کا اس کو احساس نہیں ہوتا۔ باب اوّل میں یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ جب یہ کسی شے کا نام سنتا ہے تو اپنے تصاویر کے خزانوں کو اُلٹ پلٹ کر اسی شے کی تصویر نکال کر اس سے ملا کر سمجھتا ہے۔ اگر کسی ذائقہ کا ذکر ہو تو احساسِ کیفیات کے جمع شدہ ذخیروں میں سے اسی کیفیت کو نکال کر اپنے اوپر طاری کر کے سمجھتا ہے اور اگر درد وغیرہ یا کسی احساس کا ذکر ہو تو اسی احساس کی کیفیت نکال کر اس سے سمجھتا ہے۔ کسی مقرر کی تقریر سنتے ہوئے ہر لفظ کے لئے اسی کی تصویر یا کیفیت حس یا احساس اپنے باطنی خزانوں سے نکال کر ملاتا چلا جاتا ہے اور ہر دم و ہر لحظہ یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس کو خود بھی خبر نہیں ہوتی کہ میں کچھ کر بھی رہا ہوں۔ جب کوئی اور شخص توجہ دلاتا ہے اس وقت البتہ پتہ چلتا ہے، جیسا کہ باب اوّل میں مذکور ہو چکا ہے۔

اگر کوئی شخص ایک مرکز کی طرف توجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور خیال کو یکسو کرنا چاہتا ہے تو بے شمار خیالات کا ہجوم ہو جاتا ہے جس کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوا ہو گا جو نماز میں توجہ یکسو کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی شخص نماز میں یکسوئی توجہ کی کوشش کرتا ہے تو پہلے پہل تو خیالات کا ہجوم ہوتا رہے گا مگر مسلسل کوشش کرتے رہنے سے ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ محسوس ہو گا جیسے سینے کے اندر یا قلب پر ایک فلم چل رہی ہے جس میں کبھی تو گزشتہ حالات و واقعات کی تصاویر ہوتی ہیں یا موجودہ یا آئندہ زمانے کے متعلق تجاویز کے فوٹو یا نقوش ہوتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفسِ امّارہ ہر دم و ہر لحظہ اپنے کیفیات و احساسات کے خزانوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ ان کو ہر وقت اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ غرضیکہ ہر دم و ہر لحظہ مصروف رہتے ہوئے بھی اس کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ میں کیا کر رہا ہوں اور یہ سیکنڈ کے ہزارویں حصّہ میں بھی کبھی بیکار نہیں بیٹھتا۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ۔ اسی کے لئے ارشاد ہے "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ" (یعنی نفسِ انسان تو ہر دم و لحظہ کسی نہ کسی کام میں ہے)

"فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (۱۴) المومنون۔ (بڑی برکت والا ہے اللہ جو سب سے اچھا خالق ہے)۔

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۴) التین (ہم نے انسان کو خلق کیا خوب ترین اندازے پر)۔

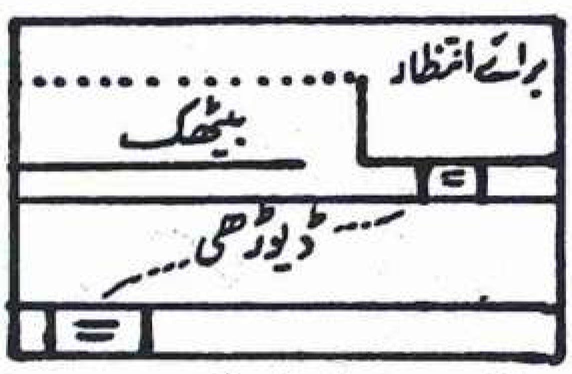
اب تو یہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ نفس کی غفلت و لاشعوری "یا الناس نیام"

میں سوئے ہونے سے کیا مراد ہے۔

یہ مثالیں تو نفسِ انسان کی اپنے باطن سے غفلت کی تھیں۔ اب ذرا عالمِ ظاہری اور محسوس دُنیا سے اس کی غفلت کی چند پُرلطف مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

(۱) ایک کھیت کے ایک طرف شارع عام تھا۔ اس لئے وہاں سڑک کے متوازی خاردار تار کا جنگلا لگا ہُوا تھا۔ ایک شخص سڑک پر جنگلے کے برابر چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہاتھ اُٹھاتا اور تار پر رکھتا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ خار پر ہاتھ پڑ گیا اب ہوش آیا اور اب خبر ہوئی کہ میں غیر ارادی طور پر تار پر ہاتھ رکھتا ہوا جا رہا تھا۔

(۲) لکھنؤ میں ایک صاحب کوئی مسئلہ دریافت کرنے ایک مفتی صاحب کے مکان پر گئے۔



بیرونی نشست کے لئے مکان کے باہر ایک بیٹھک تھی جس کے پیچھے ڈیوڑھی تھی جس کا نقشہ بھی قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کر دیا ہے مفتی صاحب زنانہ مکان میں تھے۔ آنے والے صاحب نے اندر اطلاع کرائی اور مفتی صاحب کے انتظار میں ڈیوڑھی کے بیرونی دروازے پر کھڑے ہو گئے پُرانے زمانہ کی زنجیر کی کنڈی کواڑ میں لگی ہوئی تھی اور اُتر نگے (چوکھٹ کے اوپر کی لکڑی) میں کنڈا لگا ہُوا تھا مفتی صاحب کے تشریف لانے میں تاخیر ہوئی۔ یہ صاحب دروازے پر کھڑے انتظار کرتے رہے۔ جب مُفتی صاحب اندرونی دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہوئے اور سائل کی نظر ان پر پڑی تو بہت بے چین ہوئے اور بایاں ہاتھ ہلا ہلا کر کہتے رہے۔ اے قبلہ! آداب بجالاتا ہوں لے سرکار آداب قبول ہو۔ اُونہہ، اُونہہ،۔ اَب قبلہ نے دیکھا کہ حضرت داہنے ہاتھ کی اُنگلی چوکھٹ کے کنڈے میں پھنسائے کھڑے ہیں اور نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر نہیں نکلتی اور برابر کراہ رہے ہیں غرضکہ مفتی صاحب نے بہ دِقت تمام ان کی اُنگلی کنڈے سے نکالی۔

(۳) میرے ایک عزیز چند ہمراہیوں کے ساتھ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ فاصلہ صرف بیس میل کا تھا۔ درمیان میں دو اسٹیشن پڑتے تھے، تیسرے پر اترنا تھا۔ جب دو اسٹیشن گزر گئے اور صرف چند میل کا سفر باقی رہ گیا تو ان کے ہمراہیوں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے

اور اُونہ اُونہ کر رہے ہیں! اب ہمراہی متوجہ ہو گئے۔ ایک ہمراہی نے دریافت کیا، کیا بات ہے تو کہنے لگے۔ اُونہ کچھ نہیں، اُونہ کچھ نہیں۔ اُونہ اُونہ۔ یہ حال دیکھ کر ایک ہمراہی تفتیشِ حال کے لئے قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ سیٹ کے ایک سوراخ میں حضرت اُنگلی پھنسائے بیٹھے ہیں اور اسٹیشن صرف ایک ڈیڑھ میل رہ گیا ہے، سب کو بڑی تشویش ہوئی۔ بالآخر دو ہمراہیوں نے بدقّت تمام کھینچ تان کر اُنگلی سوراخ سے نکلوائی جو اس کشمکش میں زخمی بھی ہو گئی۔ اتنے میں اسٹیشن بھی آ گیا۔ اگر اور کچھ تاخیر ہو جاتی تو ٹرین جو وہاں صرف چند منٹ ہی ٹھہرتی تھی روانہ ہو جاتی۔

(۴) مرزا غالب مرحوم کے لطائف میں بھی ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ایک صاحب مرزا غالب مرحوم سے ملاقات کے لئے آئے۔ بیٹھے بیٹھے قلمدان سے قلم اُٹھا لیا اس سے شغل کرنے لگے۔ مرزا صاحب نے ملازم کو آواز دی کہ ایک مُٹھیا بہت جلد بازار سے لے آؤ۔ وہ فوراً بازار گیا اور مٹھیا[ل] لا کر دے دی۔ مرزا صاحب نے نہایت پُر تکلف انداز سے ملاقاتی صاحب کو پیش کی اور کہا کہ حضرت لیجئے اس سے کھیلئے، میرے قلمدان سے کھیلنے کی ضرورت نہیں۔

(۵) اسی طرح ایک اور ملاقاتی دستی چھڑی کی نوک سے فرشِ زمین کرید رہے تھے اور باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ مرزا صاحب نے ملازم کو آواز دی "بیلچہ لاؤ"۔ بیلچہ آ گیا تو مرزا صاحب نے ان حضرت سے کہا۔ "اے حضرت! لیجئے اس سے کھودیئے"۔

ان تمام تمثیلوں سے قارئین پر غفلت ولاشعوری کا مفہوم واضح ہو گیا ہو گا۔ دُنیا کے تمام مصائب و آلام، بیماریاں، بے وقت اموات، حادثات میں ہلاکت اور آخرت کے عذابِ ابدی کا باعث یہی لاشعوری ہے۔ اگر نفس اس غفلت سے پورے طور پر چھٹکارا پا سکے تو سرورِ دائمی اور راحتِ ابدی کے دروازے اس پر کھل جائیں۔ دُنیا کے کام بھی صحیح ہونے لگیں اور نعیمِ اخروی کا بھی مستحق ہو جائے۔

ل شیر خوار بچوں کے کھیلنے کے لئے لکڑی کا ایک کھلونا ہوتا ہے جس کو مٹھیا کہتے ہیں۔ تقریباً آدھا انچ موٹی ڈنڈی کے دونوں سروں پر دو چھوٹے گولے ہوتے ہیں۔ درمیان سے پکڑ کر بچہ گولوں کو چوسا کرتا ہے۔ اس کی شکل یہ ہے

سُبحان اللہ۔ کیسا ماہر فطرت تھا وہ فاطر سمٰوٰت والارض کا محبوب جس نے ہمیں تیرہ سو سال پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ نفسِ انسان غفلت و لاشعوری کی تاریکی میں ڈوبا ہوا ہلاکت و تباہی کی طرف ہم کو لے جا رہا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے "اَلنَّاسُ نِیَامٌ اِذَا مَاتُوا اِنْتَبَھُوا" (لوگ سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تب جاگیں گے) مفکرینِ مغرب کہیں بارہ سو برس بعد اس سے واقفیت حاصل کر سکے اور گزشتہ صدی میں کہنے لگے تھے (HUMAN MIND IS IN A SUBCONSCIOUS STATE FOR THE EXTERIOR WORLD BUT TOTALLY UNCONSCIOUS OF ITS INTERIOR)

نفسِ انسان خارجی دُنیا کے لئے نیم شعوری حالت میں ہے مگر اپنے باطن کیلئے مطلقاً لاشعور ہے۔

مشی فی النوم (SOMNAMBULISM) ایک مرض ہوتا ہے جس میں آدمی سوتے میں چلتا پھرتا ہے۔ بہت سے کام بھی کرتا ہے مگر جب ہوش آتا ہے تو اس کو دورۂ مرض کی حالت میں کئے ہوئے کام کچھ بھی یاد نہیں ہوتے ہم کو لازم ہے کہ رسولِ ایزدی کے فرمان کی روشنی میں ذرا اپنے مذہبی عقائد اور اعمال پر نظر ڈالیں۔ یہ خواب میں بجالائے ہوئے اعمال اور بے ہوشی اور کامل لاشعوری میں خدا کے وجود کا اقرار، جب موت کے وقت خواب سے بیدار ہوں گے تو کیا کام آئے گا۔ یہ خواب کے تمام اعمال وعقائد موت کے وقت کالعدم ہو جائیں گے۔ خدا کے عذاب سے ڈرو اور نفس کو جگانے کی طرف متوجہ ہو جاؤ تاکہ دُنیا میں آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہ سکو اور نعیم اخروی کے بھی مستحق ہو جاؤ۔ کامل غفلت و لاشعوری میں خدا کو مان لینا ماننا نہیں ہے۔ یہ تو نفسِ امارہ کا فریب ہے کہ جو کچھ سُنتے رہنے یا کتابیں پڑھنے سے اس پر تصاویر و نقوش بن جاتے ہیں اس کو بے حد پیارے ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان پر جان تک قربان کر دیتا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ شیطان کے فریب سے بچ کر اپنے پیارے مالک کی طرف رجوع ہو جائیں۔

غرضکہ نفسِ انسان کی نجاساتِ باطنی میں سے غفلت و لاشعوری ہی سب سے بڑی نجاست ہے۔ بلکہ یہی تمام نجاسات کی بُنیاد ہے۔ یہی آفاتِ ارضی و سماوی میں بربادی کا سبب ہے۔ اگر یہ پوری طرح دُور ہو جائے تو انسان سے کوئی غلطی نہ ہوگی، کوئی فعلِ مکروہ یا مفر صادر نہ ہوگا۔ ممکن ہے بعض حضرات خیال کریں کہ یہ اس بندۂ حقیر کی تعلّی ہے اور اسی کا قیاس ہے حالانکہ

یہ میرا خیال و قیاس نہیں بلکہ خدا و رسولؐ کا فرمان ہے۔ حضورؐ سرورِ دو عالم محبوبِ ربِّ اکرم کا فرمان ہے "کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ" (ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے)۔ اور جناب ربُّ العزّت فرماتا ہے:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰) الروم

(اور قائم کرلے اپنے نفس کو دین کے لئے یکسو ہو کر وہ فطرت ہے اللہ کی جس پر لوگوں کو خلق یا فطر کیا ہے اللہ کی خلقت میں تبدیلی نہیں یہی سیدھا یا مضبوط دین ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے)۔

جب ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے تو اگر وہ لاشعوری کے حجابوں میں ڈوبی ہوئی نہ ہو تو کیسے ممکن ہے کہ ذرا سی برائی بھی اس سے صادر ہو سکے۔ کیا اسلام کی فطرت پاک و پاکیزہ نہیں؟ اور جناب باری تعالیٰ اس کو اللہ کی فطرت ظاہر فرماتا ہے تو معاذ اللہ کیا اس کی فطرت بھی ناپاک ہو سکتی ہے؟ ایسا خیال آنا بھی شیطان کا ساتھی بنا دے گا۔ پھر یہ بھی ارشاد ہے کہ وہ فطرت بدل نہیں سکتی! اسی فطرت کے عین مطابق عمل کرنے کا حکم صادر فرماتا ہے (فَاَقِمْ وَجْهَكَ) اپنے نفس کو قائم کرلے (لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا) دین کے لئے یکسو ہو کر۔ وہ کونسا دین ہے جس کی اطاعتِ کامل کا حکم دیا جا رہا ہے؟ وہ فطرتِ اللہ ہے جو اس نے لوگوں میں ڈالی ہوئی ہے۔ یعنی نفسِ انسان میں القا کی ہوئی ہے اسی فطرت کی پوری اطاعت اصل اور مضبوط دین ہے۔ یہی حقیقی اسلام ہے۔ یہی خدا کا دین ہے اور اس کے بعد یہ بھی فرما دیا "لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے" یعنی کثرت ان لوگوں کی ہے جو اپنی اس پاک و پاکیزہ فطرت کو جو ان کے اندر موجود ہے جس کو ہر بچہ بھی جانتا ہے، جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ بالکل غافل ہیں۔

کیا کوئی مسلمان ایسا ہو سکتا ہے جو کہہ سکے کہ فطرتِ اللہ سے بھی گناہ صادر ہو سکتا ہے؟ پھر یہ کیسے ممکن ہے اللہ تعالیٰ ایسی فطرت کی متابعت کا حکم دے جس سے غلطی سرزد ہونا ممکن ہو؟۔ اب تو شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ اگر نفس کی غفلت و لاشعوری کامل طور

پر رفع ہو جائے تو اس سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔

ہو سکتا ہے کسی شخص کے دل میں وساوس پیدا ہوں کہ انسان تو خطا کا پُتلا ہے جیسا کہ عربی مقولہ ہے "اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْیَانِ" (انسان تو خطا اور بھول سے مرکب ہے) یہ غلطی سے کیسے بچ سکتا ہے۔ بھلا بچّہ کیا جانے دین کیا ہے، اسلام کیسا ہے؟ ایک صاحب سے ایک روز اس کا ذکر آگیا تو کہنے لگے کہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ بچّے نے پیشاب کیا اس کو ہاتھوں سے زمین پر پھیلا دیا۔ اور پاخانہ کیا تو اس کو زمین پر لیپ دیا۔ میں نے کہا چونکہ آپ کو فقہ میں پہلے کتاب الطہارت پڑھائی گئی جس کا پہلا باب ہے نجاسات، اور نجاسات میں اوّل بول و براز ہیں تو ان سے باہر خیال کہاں جا سکتا ہے اس پر بات ہنسی میں پڑ گئی۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ نفسِ انسان میں جو فطرتِ اسلام موجود ہے اس کی وضاحت کے لئے تو ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے مگر چند نکات یہاں ظاہر کرنے ضروری ہیں:

اگر آپ کسی بچّے سے خواہ کہیں پیدا ہوا ہو دریافت کریں "تو اچھا یا فلاں"، ہر بچّہ یہی کہے گا "میں اچھا" آپ ہر چیز کے لئے دریافت کئے جائیں وہ ہر شے کے مقابل یہی کہے گا "میں اچھا"۔ فاطرِ فطرت نے اسے پڑھا کر اور سکھا کر بھیجا ہے کہ میری تمام مخلوق میں تو سب سے اچھا ہے لہٰذا یہ فطری خواہش ہے کہ سب سے اچھا بنے اور اچھا رہے۔ یہی تو عین اسلام ہے کہ سب سے اچھا بننے کی کوشش کرو۔ "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ﴿۱۳﴾ الحجرات (جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو وہی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم ہے)۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ فطری خواہش غفلت و لاشعوری کے حجاب میں دبی رہتی ہے۔ جب کوئی بُرا کہتا ہے اس وقت نشتر لگتا ہے تو اُبھر آتی ہے حالانکہ بطنِ مادر سے لے کر آیا ہے۔ لاشعوری میں بھی اچھا کہلانے اور اچھا سمجھا جانے کی صورت میں باقی رہتی ہے۔ اگر شعور ہو اور غفلت نہ ہو تو بچّہ کبھی کوئی بُرا کام نہ کرے گا۔ اس پر معترض کہہ سکتا ہے بھلا بچّہ کیا جانے کیا کام اچھا ہے کیا بُرا۔ بندہ عرض کرے گا کہ ایسا خیال تو ایک غیر مسلم ہی کو ہو سکتا ہے۔ ایک مسلمان کے ذہن میں جو قرآن کریم کو خدا کا کلام جانتا ہے اور خدا کو اصدق الصادقین مانتا ہے ایسا خیال آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ سورۃ الشمس میں ارشاد باری ہے "وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا ﴿۷﴾ فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا

وَ تَقۡوٰهَا ﴿۸﴾ الشمس۔ (قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے پورا کیا پس الہام کر دیں اس پر ساری بُرائیاں اور بھلائیاں اس کی)۔ پس جب خدا کا فرمان ہے کہ ہر نفس پر بُرائیاں اور بھلائیاں الہام کر دی ہیں تو ایک مسلمان سے کیسے ممکن ہے کہ خدا کے کلام کو جھٹلائے؟ البتہ اگر سمجھنے کے لئے آیت کی تفسیر معلوم کرنا چاہے تو درُست ہے۔

دیکھئے ہر بچّہ پیار کا شائق ہوتا ہے کیا یہ طلبِ رحمت نہیں؟ دو تین سال کا بچّہ دو تین ماہ کے بچّے کو پیار کرتا ہے۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ہر بچّہ جانتا ہے کہ پیار کرنا اچھا ہے۔ وہ اپنے کھلونوں اور گڑیوں کو بھی پیار کرتا ہے۔ کیا یہ شفقت علی الخلق نہیں؟ ہر بچّہ خواہ کہیں پیدا ہوا ہے دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر متاثر ہوتا ہے۔ کسی کو روتا دیکھ کر رونے لگتا ہے۔ رونے والے کو پیار کرنے لگتا ہے۔ اس کو تسکین دینا چاہتا ہے اس طرح وہ فرمانِ رسولِ کریمؐ کی تفسیر کرتا ہے۔ "اَلۡاِسۡلَامُ هُوَ الطَّاعَةُ لِاَمۡرِ اللّٰهِ وَ الشَّفَقَةُ عَلٰى خَلۡقِ اللّٰهِ"۔ (اسلام کیا ہے وہ اللہ کے احکام کی اطاعت اور اس کی مخلوق پر شفقت کرنا ہے)۔ دیکھا آپ نے ہر بچّہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔

اور بھی دیکھیں ہر بچّے کے نفس میں یہ خواہش موجود ہے کہ میں جو چاہوں فوراً ہو جائے، تو کیا خالق نے اسے پڑھا سکھا کر نہیں بھیجا ہے کہ تیری منزل یہی ہے کہ جو تو چاہے فوراً ہو جائے۔ یہی منزل تو جنّت ہے "لَهُمۡ فِيۡهَا مَا يَشَآءُوۡنَ" ﴿۱۶﴾ الفرقان (وہاں ان کے لئے وہ جو چاہیں موجود) اس منزل کے حصول کی کوشش کرنا ہی اصل مقصود ہے۔ اگر کوشش کرے گا تو اس منزل پر پہنچ جائے گا کہ جو خواہش ہو گی وہ فوراً پوری ہو جائے گی۔ کیا یہ فطرتِ اسلام نہیں؟

اور یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ ہر بچّہ جب کچھ چاہتا ہے اور وہ نہیں ہوتا یعنی جب اس کو کوئی خواہش ہوتی ہے اور فوراً پوری نہیں ہوتی تو روتا ہے، بے چین ہوتا ہے اور ماں باپ یا مربّی اس کو پورا کر دیتے ہیں تو اس کو خیال ہو جاتا ہے کہ یہی میری ہر خواہش کے پورا کرنے کا ذریعہ اور ہر ضرورت کے مہیّا کرنے کا وسیلہ ہیں۔ اور یہ بھی یقین کر لیتا ہے کہ یہ ہر شے پر قادر ہیں لہٰذا ان سے اس کو محبّت ہو جاتی ہے جو ایسی صادق ہوتی ہے کہ اگر اپنے محبوب سے جدا ہو جائے تو اس کا دل ہر وقت اس کو ڈھونڈتا ہے۔ دل پر

ذرا کان لگاؤ اور اس کے محبوب کا، جس سے ہلا ہوا ہے، ذرا نام تو لو محسوس ہوگا کہ بچّے کا دل تڑپ رہا ہے۔ یعنی بچّہ قرآن کی تفسیر دکھا رہا ہے۔ ایمان حقیقی کی علامت بتلا رہا ہے۔ ارشاد باری ہے "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ" (۱۶۵) البقرۃ (اور وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ کی محبت میں بڑے شدید ہوتے ہیں)۔ "حُبّ شدید" یہ تو کلمات ہیں، ان کے معنی لغت کی کتابوں میں جو تمام کتب خانوں کی زینت ہیں تلاش کرنے سے بھی نہیں مل سکتے۔

لہٰذا یہ بچّے جو خدا کی ننھی منّی کتابیں ہیں دُنیا کے غافل و بے ہوش نوجوانوں اور بوڑھوں کو اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ کی تفسیر عملی طور پر دکھا رہے ہیں کہ اپنے محبوب کا جو آن سے جدا ہو گیا ہے ذکر یا نام سُن کر ان کے دل کیسے تڑپنے لگتے ہیں۔ وہ تو اس آیت کی تفسیر دکھلاتے ہیں۔ "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ" (۲) الانفال (سوائے ان کے کوئی مومن ہے ہی نہیں جب بھی انہیں اللہ کی یاد دلائی جائے تو ان کے دل تڑپ جائیں)۔ بچّہ اس کی تفسیر دکھاتا ہے کہ محبوب کا نام سُنتے ہی اس سے ملنے کو دل تڑپنے لگتا ہے۔ اس کے دیدار کے لئے حسرت بھری نظریں چاروں طرف گھومتی ہیں۔ مگر افسوس کہ ہمیں دین سکھانے والوں نے بچپن سے ہی یہ سبق پڑھا دیا کہ جیسے ہم مومن ہیں ایسے ہی تم بھی مومن ہو جاؤ۔ قرآن میں جو یہ مومن کی علامت بتائی ہے اس کی طرف توجّہ نہ کرو۔ دین ہم سے سیکھو مومنِ کامل ہم ہیں۔ خدا کا یہ فرمان لائق اعتنا نہیں کہیں بچّوں کے بہکانے میں نہ آ جانا۔ بھلا بچّہ کیا جانے دین کیا ہوتا ہے۔ اگر کبھی وہ تمہیں "اَشَدُّ حُبًّا" کی تفسیر دکھائے تو خیال کر لینا یہ تو بالکل ناداں ہے، بھلا اس نے قرآن کہاں پڑھا ہے۔ ابھی تو اس نے باتیں کرنا بھی پوری طرح نہیں سیکھا۔ بس یہی دین ہے اور یہی ایمان ہے کہ خدا کو زبانی مان لو مگر اس کے فرمان کو صحیح نہ جانو۔ ایسا ہی ہم نے مان لیا اور سچے مومن ہو گئے۔

دُنیا والو تمہیں خدا کی قسم بتاؤ کہ جب خدا کے فرمان کو صحیح نہ سمجھا جائے اور ساری دُنیا کی آبادی اس کی تصدیق نہ کر رہی ہو تو پھر دُنیا پر تباہی کیوں نہ آئے۔ کیوں ہر ملک میں فساد اور خونریزی نہ ہو۔ کیوں زلزلے تباہی نہ مچائیں۔ دُنیا کا کوئی ملک اس وقت ایسا نہیں جہاں امن و سکون ہو۔ یہ تو خدا کا عذاب ہے۔ فاعتبروا یا اولی الالباب۔

مسلمانو! پیارے بھائیو! آؤ ہم سب مل کر رب کے کلام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں یہ سنت اللہ ہے، قدرت کا قانون ہے کہ ہر اُمّت کو ایک وقتِ معیّن کی مہلت ملتی ہے جب وہ ختم ہو جاتی ہے تو عذاب نازل ہوتا ہے۔ ہمیں تو تیرہ سو سال کی مہلت ملی تاکہ ہم خدا کی اس کتابِ فطرت کو جو اس نے ہمارے سینوں میں امانت رکھ دی ہے پڑھ سکیں اور اس پر عمل کر سکیں۔ اور اس نے جو ہمیں سکھا پڑھا کر پیدا کیا ہے اس سبق کو یاد کریں اور اسی کے مطابق کام بھی کریں۔ اس نے تو اپنے کلام میں بتلا دیا ہے:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ الاحزاب

(بے شک ہم نے پیش کی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر۔ پس انھوں نے اس کا بار اُٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور اُٹھا لیا اس کو انسان نے بے شک وہ ظالم اور نادان تھا)

بھلا آسمانوں اور زمین کی، پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں کی یہ تاب کہاں تھی کہ خدا کی کتابِ فطرت کا بوجھ اُٹھا سکتے۔ انسان ہی ایسا نادان تھا کہ اتنی عظیم امانت کا بار اُٹھانے کا ذمّہ لے لیا اور وہ اس کے سینے میں رکھ دی گئی۔ ؎

" آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند " (حافظ)

غرضکہ ہر بچّہ اس امانت کو لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے اور بزرگوں کے سامنے کھول کر پیش کرتا ہے تاکہ بھولا ہوا سبق یاد دلائے۔ مگر یہ انسان تو ایسا ظالم و جاہل ہے کہ اس کی ہنسی اُڑاتا ہے۔ افسوس کہ اس کتاب کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی جو مہلت ہمیں ملی تھی ختم ہونے والی ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ سمجھیں، اس کتاب کو پڑھیں اور بارگاہِ ایزدی سے اس پر عمل کرنے کی توفیق طلب کریں۔ اس کی نصرت و تائید کی بھیک مانگیں ورنہ عذابِ عظیم قریب ہے خدائے قہار کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ جب توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے تو حسرت و ندامت کچھ فائدہ نہ دے گی۔ مہلت ختم ہونے پر اس آیت کا نفاذ ہوگا:۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ الاعراف۔

(جب ان کی اجل آجائے گی (مہلت ختم ہوجائے گی) تو ایک ساعت بھی نہ آگے ہٹ سکیں گے نہ پیچھے)۔

پھر کیا ہوگا، وہ بھی دیکھ لو! سورۂ احزاب کی آخری آیت:

لِّيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ ﴿٧٣﴾

(تاکہ اللہ عذاب کرے منافق مردوں اور منافق عورتوں پر اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں پر)۔

تمام ان لوگوں پر جو مومنیت کے دعویدار اور جنت کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے فریبِ نفس میں مبتلا ہیں عذاب نازل ہوگا۔ کثرت ان ہی لوگوں کی ہے جو بغیر اس علامتِ حب اللہ کے جوہر بخدا انہیں دکھاتا ہے خدا کے مقابل دعویٰ ایمان کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔ دلوں کا حال جاننے والے عالمِ غیب کے سامنے کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں۔ گویا انھوں نے یہ آیت دیکھی یا سُنی ہی نہیں: "أَتُعَلِّمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ" ﴿١٦﴾ الحجرات۔ (اے کیا تم اللہ کے آگے اپنا دین جتاتے ہو؟)۔ اللہ کے سامنے مومنیت کی ڈینگ مارتے ہو تو وہ تو علیم بذات الصدور ہے۔ وہ تو دیکھ رہا ہے تمہارے دلوں میں علامت ایمان موجود نہیں۔ ایسے مدعیانِ ایمان اور مُشرکوں پر عذاب شدید نازل ہوگا۔ دُنیا اب ہلاکت و تباہی کے غار کے کنارے کھڑی ہے۔ عذاب قریب ہو چکا ہے۔ ہوائی جہازوں میں فضا کی بلندیوں میں آگیں لگیں گی، کاریں کھڈوں اور دریاؤں میں گریں گی، ٹرینوں میں تصادم ہوں گے، کاریں اور بسیں ٹکرائیں گی، شدید سیلاب آئیں گے، نہایت سخت سائیکلون تباہی مچائیں گے، زلزلے سخت و شدید ظاہر ہونگے، قحط کی بلائیں نازل ہوں گی، آسمان سے گولے برسیں گے، خُون کے اور آگ کے طوفان ہوں گے، دُنیا کی دو ثلث سے زیادہ آبادی تباہ ہوجائے گی۔

پیارے بھائیو! آؤ، قوم حضرتِ یونسؑ کی طرح توبہ و استغفار کریں۔ بارگاہِ ربُ العزت سے دفعِ عذاب کی التجا کریں۔ لے رے میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تو تم سے کہیں زیادہ مُجرم ہوں۔ تم جو بغاوتیں کرتے رہے تو تم نے تو رب کی کتاب جو تمہارے سینوں میں لکھی ہوئی تھی پڑھی ہی نہ تھی۔ میں تو ایسا بدبخت ہوں کہ اس کی ایک آدھ سطر پڑھ لینے کے بعد بھی بغاوت کرتا رہا۔ آؤ اس عظمت و جلال کی بارگاہ میں بہ گریہ و زاری تڑپتے دلوں سے التجا کریں:۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ !

مسلمانو! پیارے بھائیو! اب قرآن کے بعض حقائق سائنس کے ذریعے سے بھی دنیا پر واضح ہو رہے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اتمامِ حجت کا وقت ہے اور اتمامِ حجت کے بعد عذاب قریب ہو جاتا ہے۔ قرآن یوں تو ہمارے ہاتھوں میں تھا مگر اس کے مفاہیم صاحبانِ معرفت اولیاء اللہ کے سینوں میں تھے جیسا کہ ارشادِ باری ہے :-

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ (۴۹) العنکبوت

(بلکہ وہ تو کھلی نشانیاں ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم دیا گیا)۔

اس آیۂ ہدایہ میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ "اُتُو الْعِلْمَ" میں علم سے کیا مراد ہے۔ دوسری یہ کہ یہ کیوں کہا گیا کہ ان کے سینوں میں ہیں۔ تو علم کے متعلق تو ارشاداتِ نبوی سے واضح ہے جیسا کہ حضورؐ کا فرمان ہے : اوّل جو چیز اللہ نے خلق کی وہ میرا نور ہے۔ دوسری حدیث میں ہے : اوّل جو چیز اللہ نے خلق کی وہ علم ہے۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ علم سے مراد نور ہی ہے۔ اس کی تائید دیگر احادیث سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے : "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ وَّمُؤْمِنَةٍ" (علم کا طلب کرنا ہر مومن و مومنہ پر فرض ہے)۔ پھر حضورؐ نے یہ بھی ظاہر فرما دیا کہ یہاں علم سے کیا مراد ہے۔ اس کے لئے ارشاد فرمایا ہے "اَلْعِلْمُ نُوْرٌ يَّقْذِفُهُ اللّٰهُ فِيْ قَلْبِ مَنْ يَّشَآءُ" (علم وہ نور ہے جو اللہ ڈالتا ہے جس کے دل میں وہ چاہے) اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ علم سے مراد نور ہی ہے۔ یہ کسبی علم نہیں جو اُستاد شاگرد کے ذہن میں ڈالتا ہے۔ بلکہ یہ وہ نورِ ایمان ہے جو ہر مسلمان مرد و عورت کو صدق دل سے طلب کرنے پر بارگاہِ ربُ العزت سے عطا ہو سکتا ہے۔ یہ کسبی نہیں بلکہ دہبی اور عطاءِ ربُ العزت ہے اسی لئے حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ علم کا حاصل کرنا فرض ہے اس لئے کہ اس کا حاصل کرنا تو بندے کے اختیار میں نہیں۔ بندے پر تو صرف طلب واجب ہے جو صدق دل سے اپنے مالک سے نورِ ایمان طلب کرے گا تو طالب کی اہلیت کے مطابق اس کا رب چاہے گا اور جتنا بھی وہ چاہے گا عطا فرمائے گا۔ طلبِ صادق ہی سے

بندہ مستحق کی نجات ہو جائے گی۔

جن خوش نصیبوں کو وہ نور عطا کر دیا جاتا ہے وہ اس نور کی روشنی میں خدا کی اس کتاب کو جو بندوں کے سینوں میں امانت رکھی ہوئی ہے پڑھ سکتے ہیں۔ پھر ان کو علم دین کسب سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب دوسرے امر کی بھی کچھ وضاحت ہوگئی کہ یہ کیوں کہا گیا کہ ان لوگوں کے سینوں میں ہے تو کتابِ فطرت تو سینوں ہی میں امانت رکھی گئی ہے جن کو نور عطا ہو جاتا ہے اس کے مطالب ان کے شعور میں آجاتے ہیں۔ اس کی مزید توضیح کے لئے اس پر غور کریں کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ اسلام دین فطرت ہے، خدا نے بتلا دیا کہ اس فطرت کی مطابق عمل کرنا جو نفس میں ڈالی ہوتی ہے اصل دین ہے! اور کتاب فطرت ہر شخص کے سینہ میں امانت رکھی ہوئی ہے تو فطرت کا تعلق نہ تو ظن سے ہے نہ قیاس سے۔ جیسے ہمارے جسم میں سوئی چبھتی ہے تو تکلیف ہوتی ہے! اس میں ظن کیا کرے گا اور قیاس کیا کام آئے گا؟ اگر اس پر کوئی سوچنے اور بحث کرنے لگے کہ تکلیف کیوں ہوتی ہے کیسے ہوتی ہے، کس طرح ہوتی ہے، تو یہ فعل شیطان ہی ہو جائے گا۔ ہماری کوئی امید پوری ہوتی ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ ضائع ہو جانے پر صدمہ ہوتا ہے۔ اب اس میں ظن یا قیاس کی کیا ضرورت ہے؟ پس فطرت کی کتاب اقدس کو چھوڑ کر جو شخص قرآن کے مطالب ظن و قیاس سے سمجھنے کی کوشش کرے گا وہ قرآن کا مفہوم کیسے سمجھ سکتا ہے جب کہ قرآن نے اپنی تعریف خود ہی بتلا دی ہے کہ قرآن کیا ہے۔ ارشاد ربُّ العزت ہے:۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ یونس

(اور نہیں یہ قرآن کہ افترا کیا جاسکے غیر اللہ سے لیکن وہ تو تصدیق کرنے والا ہے اس کا جو اس سے پہلے ہے (یعنی صحف انبیاء سابق) اور تفصیل ہے اس کتاب کی جس میں کوئی شک نہیں جو سارے جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے)۔

حل طلب امر یہ ہے کہ وہ خدا کی کتاب کونسی ہے جس میں کوئی شک نہیں؟ اگر مدعیان قرآن فہمی سے دریافت کریں گے کہ یہ کونسی کتاب ہے تو اکثر تو یہ کہہ دیں گے کہ وہ لوحِ محفوظ

ہے جو ایک بہت بڑی اور اتنی لانبی تختی ہے جو مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے اور عرش پر رکھی ہے۔ اس پر اللہ پاک نے قیامت تک ہونے والے حالات لکھوائے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ ان خلافِ عقل تاویلات سے خدا کا دین قصے کہانیاں بن گیا۔ اب تو مدارس کے طالب علم بھی جانتے ہیں کہ مشرق و مغرب تو نسبتی سمتیں ہیں جن کی حقیقت کچھ نہیں۔ اس کتاب کی حقیقت اور اس کا مفہوم کلام اللہ ہی میں مل سکتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِينَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ﴿١٢﴾ انفطار (عَمَّ)

(اور تحقیق کہ تم پر محافظ یا نگراں ہیں۔ بزرگ لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں اس کو جو کچھ بھی تم کرتے ہو)۔

متشابہات کو محکمات جاننے والوں کے خیال میں اس آیت سے یہ تصوّر آتا ہے کہ دو فرشتے بشکلِ انسان جن کے کاندھوں پر اُڑنے کے لئے پَر لگے ہوئے ہیں ہر شخص پر متعین ہیں ایک داہنے کاندھے پر دوسرا بائیں کاندھے پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں کاغذ کے رم ہیں اور ہر دم و لحظہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ جو کام بھی اچھا یا بُرا بندہ کرتا ہے، جو بات وہ کہتا ہے لکھتے جاتے ہیں اور یہ ہی انسان کا اعمال نامہ ہے۔ اب قصے کہانیوں کا زمانہ نہیں رہا۔ اب ضرورت ہے کہ حقائق کی طرف توجہ کریں۔

حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتلا دیا ہے کہ فرشتے نوری مخلوق ہیں وہ نورانی قوتیں ہیں جو شعاعِ نوری کے ذریعے ہمارے نفس پر نقش بناتی رہتی ہیں۔ وہ ہر شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ گزارشاتِ سابق میں ناظرین پر واضح ہو چکا ہے کہ حواسِ خمسہ کے ذریعے جو احساسات پیدائش سے اس وقت تک ہوئے ہیں ان سب کے نقش نفس پر موجود ہیں۔ ہر بات جو کہی یا سُنی، ہر ذائقہ جو چکھا، ہر خوشبو یا بدبو جو سونگھی، ہر کیفیت جو گزری حتّٰی کہ ہر خیال جو آیا، سب کے ذخیرے نفس میں موجود ہیں۔ یہی ہمارا نامۂ اعمال ہے اور یہی تو خدا کی وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کا شک و شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ غور کریں اور بتلائیں کیا اس کتاب میں کوئی شک ہو سکتا ہے؟ اس کتاب کے لئے ارشاد ہے:۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

(۲۹) الجاثیہ

(یہ ہے ہماری کتاب جو تم پر حق ہی حق بولے گی ہم تو لکھتے رہتے تھے جو کچھ بھی تم کرتے رہتے تھے)۔

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ نفسِ انسان کی کیفیات کا بیان قرآن میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا تمام متشابہ آیات کیفیاتِ نفسی کی تفصیل ہیں۔ اگر اس امر میں کہ نفسِ انسان ہی خدا کی وہ کتاب ہے جس کی تفصیل قرآن ہے کسی کو شک ہو تو یہ آیت دیکھیں :-

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۴) بنی اسرائیل

(اپنی کتاب پڑھ لے آج تو اپنے نفس سے ہی۔ اپنے اوپر حساب لینے کے لئے کافی ہے)۔

یہاں تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ کتاب نفسِ انسان ہی ہے اور قرآن کریم میں کیفیاتِ نفس ہی کا بیان ہے۔ چونکہ کیفیاتِ نفس کا احساس سینہ کے اندر ہی ہوتا ہے لہٰذا یہ کہا گیا ہے کہ قرآن ان لوگوں کے سینے میں ہے جن کو علم دیا گیا۔

عرصہ دراز گزرا کہ ایک معترض نے میرے سامنے کسی سے کہا کہ جملہ فرق اسلامیہ میں جتنی تفسیریں قرآن کی لکھی گئی ہیں ان میں چند آیات محکمات کی تفصیلوں کو چھوڑ کر باقی تمام قرآن کی تفسیر و تشریح میں جو کچھ لکھا گیا ہے اگر بہ نظرِ غائر دیکھیں تو اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو غیر قرآن ہیں۔ غور طلب امر ہے اور اس کا دیکھنا ضروری ہے کہ کسی مفسر نے کہیں یہ ظاہر کیا ہے کہ محکم و متشابہ کے مابین مابہ الامتیاز کیا ہے؟ کیا کسی مفسر نے کسی آیت کے متعلق کہیں ظاہر کیا ہے کہ یہ آیت فلاں کیفیتِ نفس بیان کرتی ہے؟ یہ اظہار شاید کہیں نہ مل سکے۔

اب اصل مقصد کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ ذکر تو یہ تھا کہ ہر بچے کے نفس میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں جو چاہوں وہ فوراً ہو جائے اور اس کی بہت سی خواہشات مربیوں کے ذریعہ پوری ہوتی ہیں تو وہ اُن کو ہی اپنی ہر خواہش کی تسکین کا ذریعہ اور ہر شے پر قادر جان لیتا ہے مگر جب کچھ ہوش آتا ہے تو یہ دیکھتا ہے کہ بہت سے امور میں یہ عاجز ہیں اس وقت اس کے نفس میں غیر محسوس طلب پیدا ہوتی ہے کہ کوئی ایسی ہستی یا قوت مجھے مل جائے یا میری ہو جائے جو ہر شے پر قادر ہو، جس کے ذریعے سے میں جو چاہوں فوراً ہو سکے۔ پس جب اپنے بزرگوں کو جن کو پہلے

ہر شے پر قادر جانتا تھا کسی غیر مرئی ذات سے حاجات طلب کرتے دُعائیں مانگتے دیکھا ہے "یا اللہ رحم کر"۔ "اے پرم ایشور"۔ "اے پرم آتما"۔ "یا علی مشکلکشا"۔ "یا پیران پیر دستگیر"۔ "او گاڈ"۔ "او لارڈ کرائسٹ"، وغیرہ، تو اس کی قوّتِ ادراک کیونکہ بہت تیز ہوتی ہے لہٰذا اس کے ذہن میں یہ بات فوراً راسخ ہو جاتی ہے کہ یہی وہ ہیں جو ہر شے پر قادر ہیں۔ ان ہی کے ذریعہ سے ہر خواہش کی تسکین ہو سکتی ہے۔ یہی وہ ہیں جن کے ذریعے جو چاہوں فوراً ہو جائے گا۔ بس وہ لاشعوری میں ان اسماء کو یاد کر لیتا ہے۔ اس کو یہ نام بے حد محبوب ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ تکلیف کے وقت ان ہی ناموں کی طرف توجّہ کرنے اور ان کو پکارنے لگتا ہے اور یہ خیال اس کے ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ میری ہر خواہش کی تسکین کرنے والا جو ہر شے اور ہر اَمر پر قادر ہے مجھے "مل گیا"۔ اور یہی سب سے بڑی غلطی اس بیچارے لاشعور سے ہو جاتی ہے جس کا سبب اس کی غفلت تامہ ہے۔ وہ تو سویا ہوا ہے افسوس کہ "مل گیا"، سمجھ کر اس کی فطری طلب کی تسکین ہو جاتی ہے اس حال میں تلاش کی خواہش باقی رہنا محال ہے۔ اگر طلب باقی رہتی اور اس کو پا لینے کی تڑپ پیدا ہوتی تو ایک وقت ایسا آ جاتا کہ وہ مل بھی جاتا۔

بعض قارئین حیران تو ضرور ہوں گے کہ نفسِ انسان کو بھلا کیا معلوم اور وہ کیسے جانے "ہر شے پر قادر" کی تلاش کیسے کرے۔ بغیر بتلائے تو جان ہی نہیں سکتا۔ ان حضرات کو فرمانِ رسولؐ کی طرف توجہ دلاتا ہوں: "ہر بچّہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے" اور قولِ رسولؐ وحیِ الٰہی ہے۔ پھر خود جناب ربّ العزّت نے بھی فرمایا ہے کہ "نفس پر ساری بُرائیاں اور بھلائیاں الہام کر دی ہیں" (سورۃ الشمس)۔ ارشادِ رسولؐ بھی موجود ہے اور کلام باری تعالیٰ سے بھی ظاہر ہے کہ نفس سب کچھ جانتا ہے۔ لہٰذا لازمی اَمر ہے کہ یہ جو سب سے بڑی بھلائی اور نیکی اور تقویٰ کی جان ہے یعنی "ہر شے پر قادر" کی تلاش کا طریقہ بھی نفس پر الہام کیا ہوا ہو اور ہر بچّہ جانتا ہو اور یقیناً ہر بچّہ جانتا ہے کہ اس کی طلب کیسے کرے۔ اب اس طلب کا صرف ایک واقعہ سُن لیں۔

میں ایک فرم کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ دفتر کا کمرہ لبِ سڑک تھا۔ کمرے کے آگے آٹھ نو فٹ پلیٹ فارم تھا۔ دفتر کے کمرے کے پیچھے ایک دوا خانہ تھا۔ ایک روز ایک صاحب اپنی سات آٹھ سالہ لڑکی کے ہمراہ آئے اور دفتر کے سامنے پلیٹ فارم پر لڑکی کو کھڑا کر کے

کہاکہ ذرا دواخانہ سے دوا لے آؤں تم یہیں کھڑی رہنا، عقبی دواخانے میں چلے گئے۔ وہاں ان کو کچھ زیادہ تاخیر ہوگئی تو لڑکی انتظار کرتے کرتے بے چین ہوکر رونے لگی یہاں تک کہ جب اضطرار بہت زیادہ بڑھ گیا تو "ہائے بابا" پکارتی زمین پر لوٹنے لگی۔ اس وقت دفتر کے کئی آدمی دوڑ پڑے اور نتیجہ یہ ہوا کہ چند منٹ میں "اس کا بابا" اس کو مل گیا۔ اب بتلائیے کیا کوئی بچہ دُنیا میں ایسا ہے جو یہ جانتا نہ ہو کہ "بابا" کی طلب کیسے کروں؟ مرزا غالب مرحوم بھی فرما گئے ہیں:

روتے روتے غم فرقت میں فنا ہوجانا　　　ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا

پھر فنا ہونے کا نتیجہ بھی بیان کردیا ہے:

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا　　　عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا

مطلب یہ ہے کہ قطرہ اگر زمین پر یا ریت پر گرے معدوم ہوجائے گا۔ اور اگر دریا میں گرے تو محض انفرادی شکل وصورت باقی نہیں رہتی مگر اس کو بقائے دائمی مل جاتی ہے۔ اور اس بقا کا ذریعہ صرف درد اور دل کی تڑپ ہے۔ جیسے بچہ تڑپ کر "ہائے بابا" کہتا ہے۔ یہی تڑپ ہے جو غفلت ولاشعوری دُور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ غالب نے تو اشارتاً بیان کیا مگر علامہ اقبال مرحوم تو پوری نظم فلسفۂ غم پر لکھ گئے ہیں، خدا ان پر رحمتیں نازل کرے۔

غالب اور اقبال کا ذکر تو جملۂ معترضہ تھا۔ اب سُنیے اس بچی کی تڑپ اور اس کے "بابا" کا مل جانا دیکھ کر کیا گزری۔ بہت دیر تک روتا رہا۔ نفسِ امّارہ پر نفرین کرتا رہا کہ او کمبخت خبیث! محبوب کی تلاش کا طریقہ تیرے رب نے تجھے سکھا کر پیدا کیا ہے۔ ارے بدبخت! بھول گیا ہے تو اس بچی سے سیکھ لے۔ یہ تجھے "فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ" (اسے پورے خلوص سے پکارو) کی تفسیر عملی طور سے دکھا رہی ہے۔ کیا تو نے سورۂ عنکبوت کی یہ آیت نہیں پڑھی ہے جس کا مطلب ہے کہ "جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو خالص اعتقاد سے پکارتے ہیں۔ پھر جب ہم ان کو نجات دے کر خشکی پر لے آتے ہیں تو شرک کرنے لگتے ہیں"۔ اے نفسِ خبیث دیکھ تیرا خالق، تیرا مالک،

تیرا حقیقی بابا تجھے تیرے باطن کا آئینہ دکھا رہا ہے کہ جب ڈوبنے کا خطرہ سامنے ہوتا ہے یا سخت مشکل یا مصیبت آن پڑتی ہے تو اس وقت تُو تہ دل سے خلوص کے ساتھ پکارتا ہے لیکن جُونہی وہ خطرہ ٹلا یا مشکل حل ہوئی تو فوراً بغاوت و سرکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور ایسا بھول جاتا ہے گویا پکارا ہی نہ تھا۔ ایک اور آیت بھی دیکھ! تیرا رب فرماتا ہے:۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَاۗءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾ حٰمٓ السجدة

(اور جب ہم انسان کو نعمت دیتے ہیں تو کروٹ لے لیتا ہے اور ہماری طرف سے مُنہ پھیر لیتا ہے اور جب تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی لمبی دُعائیں کرنے لگتا ہے)۔

اے بے غیرت! تجھے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ راحت و آرام میں جس سے منہ پھیرا تے رہا مصیبت کے وقت اسی سے لمبی لمبی دُعائیں کرنے لگتا ہے۔ کیا تجھے مالک کا ذرا سا بھی خوف نہیں۔ وہ تو فرماتا ہے سُن اور کان کھول کر سُن "لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا" ﴿۱۷۹﴾ الاعراف۔ (ان کے کان ہیں ان سے سُنتے نہیں) کا مصداق نہ بن۔ دیکھ اور آنکھیں کھول کر دیکھ تیرا رب سورہ مجادلہ رکوع ۳ میں فرماتا ہے:۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ المجادلہ

(ان پر شیطان غالب آ گیا پس ان کو اللہ کی یاد بھلا دی۔ وہی تو شیطان کے گروہ ہیں۔ آگاہ ہو کہ شیطان کے گروہ ہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں)۔

اے بندہ شیطان تجھے ذرا بھی خوف نہیں؟ دیکھ تیرا رب کہہ رہا ہے کہ یادِ خدا سے غافل رہنے والے شیطان کے گروہ میں شامل ہیں۔ اے خدا کے غضب سے ڈر! ایکسیڈنٹ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ شیطان ہی تو ہلاکت میں ڈالنے والا ہے اس کے گروہ میں شامل ہو کر تیرا حشر کیا ہونا ہے۔ مگر تُو ڈرے تو جب کہ مالک کے وجود کا تجھے یقین ہو۔ اگر یقین ہوتا تو "اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" ﴿۶۰﴾ المومن۔ (مجھے پکارو میں قبول کروں گا) پر ایمان ہوتا اور اس کو خلوص سے پکارتا۔ اگر تو اپنے فاسق و فاجر ہونے سے ڈرتا ہے اور نا اُمید سا ہو گیا ہے تو اس

ارحم الراحمین پالنے والے کے فرمان کو دیکھ! وہ فرماتا ہے:۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ الزمر

(اے حبیب!) کہہ دو اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کئے ہیں اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اللہ تو سارے گناہ ہی بخش دیتا ہے۔ بے شک وہ تو بڑا بخشنے والا اور رحمت نازل کرنے والا یا رحم کرنے والا ہے)۔

مایوس نہ ہو! اب ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں۔ اگر تو شیطان کا پجاری بھی بن چکا ہو تو بھی کچھ نہیں بگڑے گا۔ تیرا پیارا رب تو وعدہ کر رہا ہے۔ اس کا وعدہ سچا ہے وہ تو اصدق الصادقین ہے۔ وہ تو کہتا ہے ڈر مت میں سارے کے سارے گناہ بخش دوں گا، میں تو بڑا غفور و رحیم ہوں؛ میری رحمت تو بے پایاں ہے تو مجھے پکار تو سہی "یَا غَافِرَ لِمَنِ اسْتَغْفَرَہٗ۔ یَا رَاحِمَ لِمَنِ اسْتَرْحَمَہٗ" (اے بخشنے والے اس کے جو بخشش چاہے۔ اے رحم کرنے والے اس پر جو رحمت طلب کرے)۔

اب اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یہ امر تو قارئین پر پوری طرح واضح ہو چکا کہ نفس کی غفلت و لاشعوری ہی وہ نجاست ہے جس کے باعث یہ اپنے لئے دُنیا و آخرت کی ہلاکت کے اسباب مہیا کرتا رہتا ہے اور رسول ؐ کی بعثت و نزولِ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ نفسِ انسان کو اس نجاست سے پاک کر کے ہلاکت سے بچایا جا سکے پس جو شخص ان آیاتِ محکمات کے احکام پر عمل کرتا ہے، جو کہ غفلت دفع کرنے کے لئے ہیں، اس کے نفس سے غفلت کم ہوتی ہے تو اس پر اعلیٰ کیفیاتِ نفس وارد ہوتی ہیں اور اس کو ان کا ادراک ہوتا ہے اور عالمِ غیب کا احساس ہوتا ہے جن آیاتِ متشابہات میں ان کیفیات کا بیان ہے جو اس پر وارد ہوئیں یا ان کا ادراک ہوا اس وقت اس کا مفہوم سمجھ سکے گا اور وہ اس کے لیے محکم ہو جائیں گی۔ اور وہ لوگ جن کو ان کا ادراک کبھی نہ ہوا ہو سمجھ ہی نہیں سکتے اُن کے لئے تو وہ آیات متشابہ ہی رہیں گی۔ پس جو شخص یہ کہے کہ نفسِ انسان کی اعلیٰ کیفیات کا بیان قرآن میں نہیں ہے تو کیا وہ خدا و رسول ؐ کی تصدیق کرنے والا ہے یا قرآن و باری تعالیٰ اور محبوبِ کردگار کی تکذیب کرنے والا ہے؟

اَللّٰھُمَّ احفظنا من شرور انفسنا بحق اولیاۓ ک وانبیاۓ ک وصلّی علٰی حبیبک ومنزل وحیک وسلّم علیہ ۔

اَب تو اس کا سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ کونسی آیات متشابہات ہیں جب عام اِنسانوں میں سے اس شخص کی، جو حصولِ تزکیہ کی راہ پر چلتا ہے، اعلیٰ کیفیاتِ نفسی کا بیان عوام کے لئے متشابہ اور ناقابلِ فہم ہوتا ہے تو پھر انبیاء ورسل علیہم السّلام کی، جو پاک و پاکیزہ و مزکّٰی ہی پیدا ہوتے ہیں، کیفیاتِ نفسی کا بیان تو لامحالہ متشابہ ہوگا۔ اس لئے کہ ان کو مالک کا حکم ہے کہ عام اِنسانوں جیسے بشر بن کر رہیں، اُن ہی کی طرح زندگی گذاریں۔ پھر ان پاک و پاکیزہ ہستیوں کو اپنے جیسے دُنیا پرستوں کی کیفیاتِ نفسی پر قیاس کر لینے والوں پر عذاب کیوں نہ نازل ہوگا؟ انبیاء ورسل کی زندگی کے حالات کا متشابہ ہونا بہ تفصیل باب پنجم میں آئے گا۔ ان کے علاوہ تمام وہ آیات واحادیث جن میں غیب کا بیان ہے جن کا ادراک یا احساس ہمیں ہوا ہی نہیں تمام کی تمام متشابہ ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اقسام کی آیات واحادیث متشابہ ہیں:۔

(۱) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں جنابِ ربّ العالمین کی صفات کا بیان ہے متشابہ ہوں گی۔

(۲) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں فرشتوں کے متعلق بیان ہو متشابہ ہوں گی۔

(۳) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں نور کے متعلق بیان ہو متشابہ ہوں گی۔

(۴) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں شیطان کے متعلق بیان ہے متشابہ ہوں گی۔

(۵) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں خلقتِ ارض وسماوات کے متعلق بیان ہے متشابہ ہونگی۔

(۶) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں حقیقتِ آدم کے متعلق بیان ہے متشابہ ہوں گی۔

(۷) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں جنّت اور اسکی نعمات کے متعلق بیان ہے متشابہ ہوں گی۔

(۸) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں جہنّم اور اس کے عذاب کے متعلق بیان ہے متشابہ ہوں گی۔

(۹) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں موت، عذابِ قبر اور برزخ کے متعلق بیان ہے متشابہ ہوں گی۔

(۱۰) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں حشر و نشر واعراف کے متعلق بیان ہے متشابہ ہوں گی۔

(۱۱) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں قیامت کے حالات کے متعلق بیان ہو متشابہ ہوں گی۔

(۱۲) ایسی تمام آیات واحادیث جن میں قیامت کے حساب کتاب، میزان وصراط وغیرہ کے متعلق بیان ہو

متشابہ ہوں گی۔

غرضکہ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ باب اوّل میں جتنی اقسام محکم آیات اور محکم احادیث کی بیان کردی گئی ہیں ان کے سوا جو کچھ بھی قرآن کریم اور احادیث میں بیان ہوا ہے وہ تمام کے تمام بیانات اور سارے کا سارا کلام متشابہ ہے اور ان کا حقیقی مفہوم سوائے متکلم کوئی نہیں جانتا البتہ اس کے وہ بندے جو راسخون فی العلم ہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی راہِ شعور پر گامزن ہو اور قرآنِ کریم کے تعلیم کردہ حصولِ تزکیہ کے راستے پر چلے اور مالک سے طلب کرتا ہے تو رب کے وہ بندے جو راسخون فی العلم ہیں اس کو اس کی اہلیت کے مطابق بعض آیات متشابہات کا مفہوم بتا دیتے ہیں اور وہ بھی بعض آیات متشابہات کا مفہوم سمجھنے کا اہل ہو جائے گا۔ اَب جو کیفیت اس پر وارد ہوتی جائے گی اس کے متعلق جس حدیث یا آیت میں بیان کیا گیا ہو گا اس کو سمجھ سکے گا۔

متشابہات کا بیان سُن کر ایک شخص نے اعتراض کیا کہ کلام پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿١٧﴾ القمر" اور ہم نے قرآن کو ذکر کے لئے آسان کر دیا ہے، پس ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا!" خدا تو کہتا ہے قرآن کو آسان کر دیا ہے اور اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سمجھنا بہت مُشکل ہے بلکہ متشابہات کو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اس کا جواب یہ تھا کہ یہ تو ایک وسوسۂ شیطانی ہے۔ اس لئے کہ "ذکر" کے معنی ہیں "نصیحت" یا "یاد"، جیسے رب کے اسمائے حُسنیٰ میں سے کسی نام سے اسے پکارتے رہنا، یا دل میں اس کی یاد رہنا۔ ان کے سوائے ذکر کے اور معنی نہیں۔ یہاں اس آیت میں موقع کے لحاظ سے "ذکر" کے معنی نصیحت ہی ہو سکتے ہیں تو نصیحت حاصل کرنے کے لئے تو قرآن اتنا سہل ہے کہ ایک بچّہ بھی اس سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے مگر متشابہات کی حقیقت بغیر تزکیۂ نفس ممکن نہیں کہ معلوم ہو سکے۔

صرف ایک مثال ہی دیکھ لیں۔ جن آیات و احادیث میں شیطان رجیم کا ذکر ہے وہ تمام متشابہات ہیں۔ ان سے نصیحت حاصل کرنا اتنا سہل ہے کہ ایک معمولی سمجھ والا بے پڑھا لکھا آدمی بھی ان سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ کس قدر آسان ہے کہ ان کو سُن کر ہم ڈریں۔

خدائے قہار کے عذاب سے خائف ہوں کہ ہزاروں لاکھوں سال تک خدا کی عبادت کرنے والا ایک نافرمانی سے مردود و ملعون ہوگیا تو ہم خالقِ کائنات کی نافرمانی کی جرأت نہ کریں۔ اب خدا کے واسطے ذرا سوچیں، رسولؐ کے واسطے ذرا بتائیں آج تک ہم میں سے کتنوں نے ان آیات سے نصیحت حاصل کی ہے؟ بجائے حصولِ نصیحت ان آیات کو قصہ سمجھ کر پڑھتے اور سُنتے رہے۔ افسوس! خدا ہمارے حال پر رحم کرے اور توفیقِ خیر عطا فرمائے۔

ایک بُزرگوار نے مذکورہ بالا متشابہات کا بیان سُن کر فرمایا کہ یہ بات غلط ہے کہ کوئی متشابہ کا مفہوم سمجھ سکے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک حدیث منقول ہے کہ حضورؐ سرورِ دوعالم نے فرمایا ہے "متشابہات کا مطلب سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا"۔ میں نے کہا کہ یہ تو درست ہے مگر اس حدیث میں یہ کہاں ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے کسی کو بتلاتا بھی نہیں۔ اگر سوائے اللہ کے ان کا مفہوم کوئی نہیں جانتا تو ان کا نازل کرنا عبث ہو جائے گا۔ جناب باری تعالیٰ نے کتنی جگہ فرمایا ہے کہ کیا تم گمان کرتے ہو ہم نے تم کو عبث و بے فائدہ پیدا کیا؟ جناب باری تعالیٰ سے جب کوئی فعل عبث صادر نہیں ہو سکتا تو پھر وہ ایسا کلام کیسے نازل کر سکتا ہے جس کو سوائے اس کی اپنی ذات کے کوئی سمجھ ہی نہ سکے؟ اس کا تو نازل کرنا عبث و بے سود ہوگا۔ یہ سُن کر وہ حضرت خاموش ہو گئے۔

بعض حضرات کو یہ وسوسہ ہوتا رہتا تھا جو کبھی کبھی ان کی زبان پر بھی آجاتا کہ جب ہم کلامِ پاک کی تلاوت کرتے ہیں تو سورۂ آلِ عمران میں یہ آیت دیکھتے ہیں "هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ" (وہ وہی ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی۔ اس میں بعض آیات محکم ہیں وہ ہی اصل کتاب ہیں اور باقی تمام متشابہ ہیں۔ تا آخر) اور سورہ زمر میں ہے "اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا۔ الخ" (اللہ نے نازل کیا بہترین کلام متشابہ کتاب۔ تا آخر)۔ مگر سورۂ ہود میں ہے "الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ۔ الخ" (الف لام را۔ کتاب جس کی آیات محکم کی گئیں پھر ان کی تفصیل کی گئی)۔ ان تینوں آیتوں کو یکجا کرتے ہیں تو ظاہراً اختلاف نظر آتا ہے۔ مگر ایسا ہونا ممکن نہیں کہ اللہ کے کلام میں اختلاف ہو۔ وہ

تو فرماتا ہے" لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾" النساء
(اگر یہ غیراللہ کے پاس سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف پاتے)۔

یہ وسوسہ تو ہو سکتا ہے اور تینوں آیتوں کے ملانے سے ایسا خیال آنا ممکن ہے حالانکہ اس وسوسہ کا معقول و تسلی بخش جواب ان آیتوں ہی میں موجود ہے۔ پہلی آیت میں ہے" مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ "۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں بہت تھوڑی آیات محکم ہیں۔ اور" هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ " یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ہی تھوڑی سی آیاتِ محکم ہی اصل کتاب ہیں۔ دوسری آیت میں ہے" كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا "۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام قرآن ہی متشابہ ہے۔ ان دونوں آیتوں میں اُس شخص کو اختلاف معلوم ہوگا جو غور و فکر نہیں کرتا جو اپنی زبان کے روزمرّہ کے محاوروں پر بھی نظر نہیں رکھتا۔

دیکھئے ہر زبان میں ہر جگہ کثرت پر اطلاق ہوتا ہے۔ اگر کہیں بیس مرد اور چار عورتیں ہوں، تو ان پر سلام کرتے وقت مذکر کا صیغہ استعمال کریں گے اور سلام کرنے والا کہے گا" السلام علیکم" (تم سب مردوں پر سلام ہو) برخلاف اس کے اگر کہیں بیس عورتیں اور چار مرد ہوں تو سلام کرنے والا مؤنث کا صیغہ استعمال کرے گا اور کہے گا:" السّلام علیکنّ" (تم سب عورتوں پر سلام ہو)۔ پس جب تمام کتاب سوائے چند آیات متشابہ ہے تو" كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا " فرمانا بالکل حق ہے۔

اب رہی یہ آیت" الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ ﴿۱﴾" ہود (الف لام۔ راہ کتاب جس کی آیتیں محکم کی گئیں پھر ان کی تفصیل کی گئی)، تو یہ بھی حق ہے اس لئے تو سورہ آل عمران کی آیت" هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۷﴾" میں صاف بتا دیا گیا ہے کہ قرآن میں جو تھوڑی سی آیتیں محکم ہیں وہ ہی اصل کتاب ہیں اسی اصل کتاب کو سورہ ھود کی مذکورہ بالا آیت میں صرف کتاب کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ اصل کتاب تو صرف محکم آیات ہیں جن کا تعلق دین اور تزکیہ نفس سے ہے۔ پھر ارشاد ہے" ثُمَّ فُصِّلَتْ "، یعنی وہ تھوڑی آیات جو محکم ہیں، جو اصل کتاب ہیں، ان کی تفصیل بھی یہاں کی گئی ہے۔

آیاتِ محکمات کی تفصیل میں سے صرف ایک ہی ہدیہ قارئین ہے۔ دیکھئے کلام پاک میں کتنی ہی جگہ آیا ہے" وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ " (اور اللہ کا ذکر

بکثرت کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ) یہ آیہ محکم ہے مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کثیر سے کیا مراد ہے۔ سورہ جمعہ میں اس کی کچھ تفصیل کر دی گئی ہے:۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ⑩ الجمعة

(اور جب نماز (جمعہ) ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر بہ کثرت کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ)۔

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ بعد نماز اپنے دُنیا کے کاموں میں مصروف ہو جاؤ اور کاروبار میں مصروف ہوتے ہوتے بھی اللہ کی یاد نہ بھلاؤ بلکہ اس کا ذکر برابر کرتے رہو۔ مگر اس سے بھی یہ معلوم نہ ہوا کہ ذکر کیسے کریں، کس طرح کریں؟ تو یہ بھی واضح طور پر بتا دیا کہ ذکر کس طرح کیا جائے:۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۲۰۵ الاعراف

(اور اپنے رَبّ کا ذکر کرتا رہ اپنے دل میں تضرع اور خوف کے ساتھ۔ بغیر قول ظاہر کئے (یعنی بغیر آواز نکالے) صبح و شام اور غافلوں میں سے نہ ہو جانا)۔

اس طرح صاف صاف بتا دیا کہ زور زور سے اللہ ھُو کے نعرے لگانا نہیں ہے۔ ھُو حق، ھو حق کا شور مچانا نہیں ہے بلکہ دل ہی دل میں اس کی یاد تازہ کرتا رہ، بغیر آواز نکالے اگر آواز نکلے بھی تو اتنی ہی کہ خود سُن سکے۔ اظہارِ ذکر تو وہی کرے گا جس کو خلق اللہ کو دکھانا مقصود ہو اور یہ ہی ریا ہو جائے گا۔

اس آیت سے بعض حضرات یہ مُراد لیتے ہیں کہ صبح اور شام کو بعدِ نماز ایک تسبیح پڑھ لینا ہی ذکرِ کثیر کر لینا ہے۔ مگر مالک نے یہ کہہ کر کہ "اس کی یاد سے غافل نہ ہونا" ان کی زبانیں بند کر دی ہیں۔ اگر یہ تاویل کرنے والے اسی پر مُصر رہیں کہ صبح و شام کی نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھ لینا ہی مُراد ہے تو سورۂ جمعہ کی آیت میں جو کاروبار میں مصروف ہوتے ہوتے رَبّ کی یاد بکثرت کرتے رہنے کا حکم ہے وہاں کونسی نماز کی تسبیح مُراد ہو سکتی ہے؟ ایسے صاف و صریح بیان کے بعد تو انکار کی گنجائش

نہیں رہتی۔ اور کچھ یہ کہہ کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اگر قرآن میں بکثرت متشابہات ہوں جن کا مطلب کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر قرآن ہدایت کے لئے بے کار ہے۔ ایسے حضرات مدارس کے نو دس برس کے طالب علموں کی عقل سے سبق لیں۔ کوئی بچہ ریاضی یا دیگر علوم کی اونچے درجے کی کتابوں کو دیکھ کر، جب وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتیں، یہ نہیں کہتا کہ جب یہ سمجھ میں نہیں آتیں تو بے کار ہیں۔ ایسی کتاب جو بچے سے لے کر بوڑھے تک، جاہل سے لے کر بڑے بڑے فلاسفر تک، ایک مبتدی طالب علم سے لے کر عارف کامل تک، غرض ہر ایک کے لئے اپنے اندر ہدایت رکھتی ہے اور ہر کیفیتِ نفس کے لئے ہر ایک کی اہلیت کے مطابق سبق دینے والی ہے تو بے کار و فضول کیسے ہو سکتی ہے؟

متشابہات کا تو عمل سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ عمل کے لئے تو محکمات ہیں۔ ان پر جو عمل کرے گا اس کے نفس میں قوتِ ادراک پیدا ہوگی، شعور حاصل ہوگا۔ جتنا شعور بڑھتا جائے گا اتنی ہی متشابہات اس کے لئے محکم ہوتی جائیں گی۔ پس ہر مسلمان کو لازم ہے کہ جب کوئی بہکانے کی کوشش کرے تو پڑھے:۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾ عمّ (الناس)

چند معاندینِ اسلام اور مسلمان نما دہریوں سے اس بندۂ حقیر کا سابقہ پڑتا رہا ہے۔ بعض آیاتِ متشابہات کے متعلق ان کے اعتراضات اور مفصل جوابات قارئین کی آگاہی کے لئے درج ذیل ہیں:۔

سوالات

﴿۱﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ ..... الخ ﴿۱۸﴾ الحج

(کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ (وہ ہے) کہ اسی کو سجدہ کرتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے۔ تا آخر)

دہریت کے ایک پروپیگنڈا کرنے والے نے یہ آیت دکھا کر کہا۔ کیا آپ نے کبھی سورج، چاند، ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ اچھا یہ تو آسمان پر ہیں۔ زمین کی چیزوں کو تو آپ دیکھتے رہتے ہیں۔ کیا آپ نے کسی درخت یا گائے بھینس کو کبھی سجدہ کرتے دیکھا ہے وغیرہ وغیرہ؟

(۲) کلام اللہ کی کتنی ہی آیات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قسط پر قائم ہے یعنی عادل ہے اور بہت سی آیات میں ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے۔ عدل تو یہ ہے کہ مجرم کو سزا دی جائے۔ اگر معاف کر دیا جائے تو عدل نہیں ہو سکتا۔ عدل و رحم تو متضاد صفات ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے یہ کہ مجرموں سے تمام گناہوں کی معافی کا وعدہ کر کے جرائم پر جرأت دلانا ہے (یہ ایک آریہ سماجی مبلغ کا سوال تھا۔ اس نے آواگون کی بحث بھی چھیڑی)۔

(۳) "وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ ......" اس پر ایک دہریہ نے اعتراض کیا کہ جب معلوم تھا یہ ایمان نہ لائیں گے تو ان کو دعوتِ ایمان دینا ایک عبث کام تھا۔

(۴) میزان الاعمال کے متعلق:۔ اعمال تولنے کی چیز نہیں۔ پھر کیسے تولے جائیں گے؟ پھر تولنے کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو کسی شے کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ پھر ایک ترازو پر بے شمار انسانوں کے اعمال کیسے تولے جائیں گے وغیرہ۔

(۵) نامۂ اعمال کے متعلق۔

(۶) قیامت میں حساب کیسے ہوگا؟ کیا ایک ایک آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائیگا وغیرہ۔

(۷) لوحِ محفوظ کیا ہے؟ اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک تختی ایسی بنا رکھی ہے جس پر کچھ لکھوا دیتے ہیں۔ پھر کچھ عرصے بعد اسے محو کرا کر کچھ اور لکھوا دیتے ہیں۔ یہ لوح محو و اثبات کہلاتی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ سے ایسا کام صادر ہو سکتا ہے؟؟

(۸) صراط: بال سے زیادہ باریک، تلوار کی دھار سے زیادہ تیز پُل ہے جو جہنم پر رکھا جائے گا۔ جس کا ایک سرا زمین پر لگا ہوگا اور جہنم سے گزرتا ہوا جا کر دوسرا سرا جنت میں لگا ہوگا۔ تو جنت تو ساتویں آسمان پر اور جہنم ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ پھر یہ پُل کیسے رکھا جائیگا وغیرہ؟

(۹) قیامت میں اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھول کر دکھائیں گے (يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ)۔

تو کیا اللہ تعالیٰ تہمد باندھے آئیں گے یا پاجامہ پہنے ؟ وغیرہ۔

(۱۰) "سِتَّةِ اَیَّامٍ"۔ یعنی زمین و آسمان چھ دن میں خلق ہوئے۔

(۱۱) کلام اللہ میں کئی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضور رسولِ عربی سے معجزہ طلب کیا گیا ہے تو کہا ہے کہ معجزات تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ میں صرف ایک ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں۔

(۱۲) قرآن خدا کا کلام کس طرح ہو سکتا ہے ؟

(۱۳) قرآن سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اور تمام جن و انس مل کر بھی اس کی مثل نہیں لا سکتے۔

نوٹ :۔ مندرجہ ذیل آیت آیہ سجدہ ہے۔ گو سجدہ واجب نہیں لیکن احترام تو واجب ہے اس کو آواز سے پڑھیں گے تو سجدہ کرنا لازم ہوگا۔ لہٰذا دل ہی دل میں پڑھیں کہ آواز نہ نکلے۔

ارشاد رب العزّت ہے :۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۱۸﴾ الحج

(کیا تو نہیں دیکھتا تحقیق کہ اللہ (وہ ہے کہ) اسی کو سجدہ کرتے ہیں جو بھی آسمانوں یا زمین میں ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بہت سے آدمیوں میں سے اور بہت سوں پر عذاب ٹھہر چکا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کرے اسے کوئی عزت دینے والا نہ : تحقیق کہ اللہ کرتا ہے جو کچھ کہ وہ چاہتا ہے)۔

آیہ سجدہ دکھا کر یہ کہنے والے کا سوال کہ کیا آپ نے کبھی سورج، چاند، ستاروں کو متھا ٹیکتے دیکھا ہے ؟ اچھا ان کے لئے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو آسمان پر ہیں مگر زمین کی چیزیں تو آپ کے پاس ہی ہیں۔ اگر آپ نے کسی درخت کو، کسی گائے بھینس کو متھا ٹیکتے ہوئے دیکھا ہے تو ہمیں بھی دکھا دیجئے۔ کیا مضحکہ خیز باتیں نہیں ؟

مَیں نے کہا : دیکھو مرزا غالب مرحوم کہتے ہیں :۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔۔۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اب اس قول کے بعد غالب کے کلام میں جہاں کہیں عشق مجازی، شراب و کباب کا ذکر ہو اس کو ظاہری معنوں میں کوئی سمجھ لے تو سوائے اس کے کہ اس کو احمق کہا جائے اور کیا کہیں گے۔

بعض لوگ جب سجدہ کا مفہوم ہی نہیں جانتے تو اپنے قیاس سے جو وحیِ شیطانی ہے اس مقدس کتاب پر اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں۔ سجدہ سے مُراد ہے اطاعتِ کامل۔ احکامِ الٰہی کی پُوری پُوری اطاعت جس میں ذرا سی بھی کمی نہ ہو۔ اس پر معترض کہنے لگے کہ پہلے تو ہم سُنتے تھے کہ انبیاء و رُسل پر احکام نازل ہوتے ہیں مگر آج معلوم ہوا کہ درختوں اور گائے بیل پر بھی اللہ تعالیٰ احکام نازل کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کتاب پُکار پُکار کر کہہ رہی ہے:۔

"مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۷) یونس

(نہیں ہے یہ قرآن کہ غیر اللہ کا بنایا ہوا ہو لیکن تصدیق کرنے والا ہے اس کا جو اس سے پہلے ہے (صحف انبیاء) اور تفصیل ہے اس کتاب کی جس میں کوئی شک ہی نہیں جو ربّ العالمین کی طرف سے ہے) اور جس کتاب کی یہ قرآن تفصیل ہے جس میں کوئی شک نہیں وہ کتاب بھی بتادی

"هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹) الجاثیہ

(یہ ہماری کتاب ہے جو تم پر حق ہی حق بولے گی۔ ہم تو لکھتے رہتے تھے جو کچھ تم کرتے رہتے تھے)۔ اَب یہ غور کرو کہ یہ کونسی کتاب ہے۔ ذرا اپنے نفس میں جھانک کر دیکھو۔ پیدائش سے لے کر اس وقت تک جو کچھ دیکھا، سُنا، چکھا، سونگھا، چھُوا، کیا وہ سَب کچھ اس کے اندر لکھا ہُوا نہیں ہے۔ ہر حرکت و سکون، ہر قول و فعل کے نقوش اس کے اندر محفوظ ہیں۔ اس کی تحریر میں کسی طرح کا شک و شُبہ ہونا ممکن نہیں یہ ہی نفس ہے۔ یہی وہ ربّ کی کتاب ہے جس کی تفصیل قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ قرآن نے بتادیا کہ وہ فطرتِ نفس وکیفیاتِ نفس کا بیان ہے اس کے باوجود اگر کوئی شخص تمثیلوں و استعاروں کے الفاظ کے ظاہری معنی مُراد لے کر قیاسی بحثیں کرنے لگے تو یہ دُرست نہ ہوگا۔ کہنے لگے اچھا بتائیے اَب میں بالکل خاموشی سے سُنوں گا اور درمیان میں بالکل دخل نہ دوں گا۔ میں کچھ دیر خاموش رہا۔ جب ذرا سکون ہُوا تو گفتگو کا سلسلہ جاری ہوا:۔

دیکھو! ماتھا ٹیکنا جو سجدے کے معنی تم نے سمجھ رکھے ہیں وہ مجازی سجدہ ہے۔ سجدۂ حقیقی تو عین مطابقِ فطرت عمل کرنا ہے کہ قوانینِ فطرت سے سرمو تجاوز نہ کرے۔ کیا تم نے سورج چاند یا کسی ستارے کو ایک معینہ گردش سے ایک سیکنڈ بھی تجاوز کرتے دیکھا ہے۔ کیا کسی درخت کو کسی قانونِ فطری کی خلاف ورزی کرتے دیکھا ہے۔ کیا کسی گائے بھینس کو گوشت کھاتے اور کسی درندے کو اناج کھاتے دیکھا ہے۔ اگر کبھی دیکھا ہو تو بتاؤ۔ دیکھو تمام مخلوق میں کوئی ایسا نہیں جو اپنی فطرت سے سرمو بھی تجاوز کرتا ہو مگر افسوس ہم ہی ایسے ہیں کہ اپنی پاک و پاکیزہ فطرت سے جو ہمارے اندر امانت رکھی ہوئی ہے غافل ہیں اور اس سے بغاوت کرتے رہتے ہیں۔ ہر بچہ جب اس سے دریافت کرتے ہیں کہ تو اچھا یا فلاں تو یہی کہتا ہے "میں اچھا"۔ ہائے ہماری بدنصیبی کہ پیدا کرنے والے نے تو سکھا پڑھا کر بھیجا ہے کہ تو میری مخلوق میں سب سے اچھا ہے۔ اچھا بننے اور اچھا رہنے کی کوشش کرتے رہنا۔ مگر ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ اچھا کہلانے اور اچھا سمجھا جانے کی فکر میں مست رہتے ہیں۔ تب ہی تو رب نے کہا ہے" اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ" (نہیں ہیں وہ مگر مثل ڈھوروں کی بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ)۔ جناب ربّ العزت نے تو پاک و پاکیزہ فطرت ہمارے اندر رکھی تھی جس کی خبر بھی دے دی ہے۔ دیکھو سورہ روم۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۰) الروم

(اپنے نفس کو قائم کرلے دین کے لئے یکسو ہو کر۔ وہ اللہ کی فطرت ہے جس پر لوگوں کو خلق کیا۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہی سیدھا یا مضبوط دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

آپ نے دیکھا اس کتاب کا معجزہ، ہماری کیسی قلعی کھول کر رکھ دی ہے کہ یہ انسان نما حیوان چوپاؤں سے بھی بدتر ہیں۔ کوئی جانور اپنی فطرت کے خلافِ عمل نہیں کرتا۔ ہر چرندہ، پرندہ، درندہ، اپنی فطرت کو جو خالق نے اس کے اندر ڈال دی ہے خوب جانتا ہے مگر یہ حیوانوں سے بدتر مخلوق جس کو خالق نے اپنی نیابت و خلافت کے لئے خلق کیا،

تاکہ زمین پر اس کی تمام مخلوق پر حکومت کرے، جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ ہوگئی۔ اس نے اپنی پاک و پاکیزہ فطرت کو بھلا دیا اور اس سے بالکل غافل ہے حالانکہ اس کو بتا دیا تھا "سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" (ہم نے وہ تمام مخلوق جو زمین میں ہے تمہارے لئے مسخر کی ہے)۔ اس پر بھی اس نے توجہ نہ کی اور اپنی منزل نہ سمجھی۔ رب فرماتا ہے "النَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ" (پودے اور درخت تو سجدے میں رہتے ہیں)۔ مگر یہ بدبخت جس کو فطرت پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ہر دم سرکشی میں مصروف ہے۔ اور دیکھو اس آیت میں لفظ "کثیر" دو جگہ آیا ہے پہلا جزو "كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ" یعنی بہت سے لوگوں میں سے بھی سجدہ کرتے ہیں اور اپنی پاک و پاکیزہ فطرت کے مطابق عمل کرتے ہیں، اس سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے۔ یہاں کثیر سے بے شمار مراد نہیں بلکہ کثیر کا اطلاق قرآن کریم نے اسّی (۸۰) پر بھی کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے "لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ﴿۲۵﴾ التوبۃ اے مسلمانو! اللہ نے تمہاری مدد کثیر مقامات پر کی ہے)۔ اور یہ مواقع یعنی کفار و مشرکین سے لڑائیاں اسّی ہیں۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ کثیر کہتے ہوئے بھی دنیا کی آبادی میں شاذ کا ہی اظہار ہوتا ہے۔ اور دوسرے جزو میں "وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ" اور کثیر تعداد ایسی ہے کہ وہ مستحقِ عذاب ہوگئے)۔ یہاں کثیر سے مراد بے شمار ہے۔

اگلے جملے کو دیکھئے "وَمَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُكْرِمٍ" (جس کو اللہ ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں)۔ اس سے بھلا تم کیا سمجھ سکتے ہو۔ دیکھو، عزت سے مراد ہے فطرت پر غلبہ اور ذلت سے مراد فطرت سے مغلوب ہونا مطلب یہ ہے جسے اللہ فطرت پر غلبہ عطا نہیں فرماتا وہ حیوانات، نباتات، جمادات کی طرح قوانینِ فطرت سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے کوئی ایسا نہیں جو اس کو قوانینِ فطرت کے مضرات سے بچا سکے۔

عدل، توبہ، استغفار، تناسخ

ایک آریہ سماجی مبلغ اسلام اور قرآن پر الٹے سیدھے اعتراض کرکے کچھ احباب کو

نوٹ: آیہ سجدہ کی مزید تفصیل کتاب جامع الانوار کے جزو سوم انوارالاسلام میں عبادت اور عبدیت کے بیان میں واضح کی گئی ہے۔ شائقین وہاں مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

تنگ کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ایک روز میرے پاس آئے اور اس مبلغ کی شکایت کی کہ اس نے تنگ کر رکھا ہے، بڑا پریشان کرتا ہے۔ میں نے کہا کسی دن میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ ایک دن وہ پنڈت جی کو لئے میرے پاس آگئے۔ جب پنڈت جی آرام سے بیٹھ گئے تو میں نے ان سے کہا، ان لوگوں کو آپ کیوں تنگ کرتے ہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو مجھ سے کہیئے۔ تو پنڈت جی بولے۔ دیکھئے یہ آپ کے کلام اللہ کی آیت ہے:۔ "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ﴿۱۸﴾ العمران

(اللہ تعالیٰ نے آشکارا فرمادیا کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے اور ملائکہ وصاحبانِ علم نے بھی گواہی دی۔ وہ عدل پر قائم ہے)۔

میں نے کہا بیشک یہ کلام پاک کی ہی آیت ہے۔ کہنے لگے اب دوسری آیت دیکھئے:۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ الزمر

(کہہ دو اے میرے بندو جنھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہونا تحقیق کہ اللہ تو سارے گناہ بخش دیتا ہے اور تحقیق کہ وہ تو بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

میں نے کہا درست یہ بھی کلام اللہ کی آیت ہے۔ کہنے لگے: دیکھئے عدل کے معنی ہیں انصاف کرنا اور عدل وانصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دی جائے اور نیکوکار کو اس کی نیکیوں کا انعام دیا جائے۔ یہی عدالت ہے مگر پہلی آیت میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ (اللہ) عدل پر قائم ہے اور دوسری آیت میں کہا جا رہا ہے کہ اے میرے مجرم بندو میری رحمت سے مایوس نہ ہونا اللہ تو سارے گناہ، تمام جرائم معاف کر دیتا ہے۔ وہ تو بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے، تو جناب! ایک قاتل کے ساتھ رحم کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ جرائم پر جرأت دلانے کے لئے سزا معاف کرنا اور سزا نہ دینا بلکہ جرم معاف کر دینا، یہ کہاں کا انصاف ہے۔ جرائم پر جرأت دلانے کے لئے سزا معاف کرنا ہی کیا کم تھا کہ سارے جرائم کی بخشش کا وعدہ کر کے مجرموں کی ہمت کو اور بڑھا دیا کہ خوب جرائم کئے جاؤ، اللہ تو

سارے گناہ معاف کر دے گا، تو جناب! رحم وعدل تو دو متضاد صفات ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی وقت میں عادل بھی ہوں اور رحیم بھی؟ اگر عدل کریں تو رحم نہیں کر سکتے اور اگر رحم کریں تو عادل نہیں ہوسکتے۔ آپ کے پاس اس کا کوئی معقول جواب ہو تو دیجئے۔ لا طائل تاویلیں نہ ہوں، پنڈت جی نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا۔

مَیں نے کہا: جی! ذرا دیر لگے گی۔ پہلے مجھے آپ کو آپ کے اندر کا آئینہ دکھانا پڑیگا۔ اگر آپ صبر سے سننا چاہیں تو بتلاؤں ورنہ تو تُو مَیں مَیں کی بحثوں سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ کہنے لگے آپ سنائیں مَیں صبر وسکون سے سنوں گا۔ مَیں نے ان کو کچھ کیفیاتِ نفس کی تمثیلیں جو اس کتاب کے ابتدائی حصے میں بیان کی گئی ہیں سُنا سُنا کر احساس دلایا۔ مثلاً قنور، کھٹا، دَرد وغیرہ اور ان سے تسلیم کروالیا کہ نفسِ انسان بالکل غفلت کی حالت میں ہے۔ اور اس پر لاشعوری کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ پھر مَیں نے کہا، آپ تو اس امر کے قائل ہیں کہ پرم الیشور ہر ایک کے ہردے (دل) میں ہے۔ پھر یہ کبھی آپ نے نہ سوچا ہوگا اور نہ کسی سے سُنا ہوگا کہ آخر وہ نور چمکتا کیوں نہیں؟ آج میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ یہ غفلت اور لاشعوری کے حجاب اس کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں ہمارے آپکے درمیان کچھ زیادہ اختلاف نہیں۔ آپ کہتے ہیں پرم الیشور ہر ایک کے ہردے میں ہے اور قرآن کہتا ہے کہ اس کے نور کی شعاعیں جو اس کی اوّل مخلوق ہے ہر شخص کے اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہیں " وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ"، مطلب دونوں کے ایک جیسے ہی ہیں۔ غرض کچھ بھی ہو اس نور کو یہ غفلت ولاشعوری کے پردے ہر ایک کے ہردے پر اثر انداز ہونے سے روکے ہوئے ہیں۔ اگر یہ غفلت کے پردے دُور ہوجائیں تو اس کے دَرشن ہوجائیں اور نروان (نجات) مل جائے۔ آپ نا معلوم جرم عذاب و ثواب اوگن (گناہ) و ست گن (نیکی) سے کیا مُراد تصوّر کیے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اوگن (گناہ) سے غفلت بڑھتی ہے اور ست گن سے گھٹتی ہے۔ انگریزی کا ایک مقولہ آپ نے سُنا ہوگا جو نیچر کے متعلق ہے:۔

(NATURE IS LIKE A WATCHFUL ENEMY THAT NEVER

LEAVES ANY FAULT UNPUNISHED))

(نیچر ایک گھات میں بیٹھے ہوئے دشمن کی طرح ہے جو کسی قصور کو بغیر سزا دیئے نہیں چھوڑتی)
اور قرآن کہتا ہے۔

"اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" (۱۴) الفجر ——— (تیرا رب یعنی رب کے قوانین ہر وقت تیری گھات میں ہیں)۔ نیز ارشاد ہے۔" فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۸) الزلزلہ (جو ذرّہ برابر نیکی کرے اس کی جزا دیکھتا ہے اور جو ذرّہ برابر بدی کرے اس کی سزا دیکھتا ہے)۔ اَب بھی آپ اس کا مطلب سمجھے کہ نہیں مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی ذرّہ برابر نیکی کرتا ہے فوراً اس کا انعام مل جاتا ہے کہ اس کے نفس پر غفلت کم ہو جاتی ہے اور جو وہ برابر بدی کرتا ہے فوراً اس کی سزا مل جاتی ہے کہ اس کے نفس پر غفلت بڑھ جاتی ہے اور لاشعوری کے حجاب اور زیادہ دبیز ہو جاتے ہیں۔ کہیے پنڈت جی! آپ نے دیکھی عدالت! یہ ہے "قَآئِمًا بِالْقِسْطِ" کا مطلب۔ اور آپ کا عقیدہ ہے کہ جزا و سزا دوسرے جنم میں ملے گی۔ لیجئے معاملہ ختم ہوا۔ پنڈت جی ذرا گھبرا گئے۔ کہنے لگے، ابھی غفور و رحیم کا جواب نہیں ہوا کہ وہ عادل و رحیم ایک ہی ساتھ کس طرح ہو سکتا ہے؟

مَیں نے کہا: آپ کے ذہن میں مذہب کی تعریف یہ معلوم ہوتی ہے کہ کچھ عقائد ذہنی کو حق سمجھ لینا اور ان عقائد سے متعلقہ رواسم کو صحیح سمجھ کر ان پر عمل کرنا حالانکہ مذہب حقیقۃً تو غفلت و لاشعوری کا دُور کرنا ہے جس کی دوا سوائے درد اور دل کی تڑپ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ دل میں تڑپ اور دھڑکن کچھ دیر تک تو خوف سے قائم رہ سکتی ہے۔ شوق سے کچھ زیادہ ٹھہرتی ہے مگر حسرت و درد اس کی سب میں اعلیٰ دوا ہے۔ عدل تو آپ دیکھ چکے اور مان بھی چکے۔ اب بتلائیں کہ ایک شخص جس نے بہت اوگن کیے ہیں شرمندہ ہوتا ہے اس کو اپنے جرائم پر افسوس ہوتا ہے اور بڑی حسرت ہوتی ہے کہ ہائے افسوس مَیں نے یہ بُرے کام نہ کیے ہوتے، ہائے مَیں نے یہ کیا کیا۔ دل اس کا تڑپتا ہے، تو عدالت کے معنے تو یہ ہیں اور یہی قانونِ فطرت ہے کہ اس کی غفلت و لاشعوری کم ہو۔ اب بتلائیے کہ اللہ تعالیٰ کو

کیا یہ چاہیئے کہ اس کی غفلت کم نہ ہونے دے؟ بولتے! اب تو پنڈت جی کھو گئے جب کئی مرتبہ دریافت کیا تو کہنے لگے نہیں یہ نہیں چاہیئے۔ میں نے کہا تو پھر عین عدالت یہی ہے کہ غفلت کم ہونے دے۔ اور اسی کو مغفرت اور رحمت کہتے ہیں کہ گناہوں سے جو غفلت و لاشعوری کی سیاہی دل پر چڑھ گئی ہے وہ دُور کر دی جائے۔

آپ کا یہ اعتراض کہ وہ عادل اور رحیم ایک ساتھ کیسے ہو سکتا ہے، اس تصور پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے جیسے کینہ پرور ہیں کہ ایک دفعہ کسی سے غلطی ہو گئی تو پھر اس کا گھر تک کھدوا دیں اور اُن کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہو۔ آپ نے اس آیت سے جو مطلب نکالا ہے کہ جرأت دلاتا ہے حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ اگر ایک مجرم سے یہ کہہ دیا جائے کہ تمہارے گناہ معاف ہو ہی نہیں سکتے، تمہیں نروان مل ہی نہیں سکتا تو پھر وہ نیکی کرے گا ہی کیوں؟ اس کا نفس تو یہی کہے گا کہ اب اس دُنیا میں ہی خوب مزے لُوٹ لو، عیش کرو، لُوٹ مچاؤ۔ نروان تو اب مل ہی نہیں سکتا۔ کہیے وعدہ معافی جرائم سے بچائے گا یا مایوس کر دے گا؟ اب کہیے ایک مجرم گنہگار جب توبہ کرے اور اس کا دل تڑپتا ہے تو غفلت کم ہو گی یا نہیں؟ یہی مغفرت و رحمت ہے اور یہی عین عدالت ہے۔ اب بھی آپ سمجھے کہ وہ عادل بھی ہے اور غفور و رحیم بھی ہے۔ دونوں صفات جُدا جُدا نہیں بلکہ مغفرت و رحمت عین عدل ہے۔ افسوس کہ آریہ سماج کے بانی گیانی نہ تھے۔ اگر گیانی ہوتے تو یہ راز بھی ان کو معلوم ہوتا اور "ستیارتھ پرکاش" میں اسلام پر یہ اعتراض نہ کرتے جو آپ پیش کر رہے ہیں۔

پنڈت جی آئے تو تھے بڑے جوش میں مگر اب ڈھیلے پڑ گئے اور بہت نرمی سے پوچھا کہ آواگون کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ آج کل تو امریکہ میں ہپناٹزم کے ذریعے جو مشاہدات ہوئے ہیں اور امریکہ اور لندن کے بعض رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا آواگون کا عقیدہ ہی صحیح ہے اور اس کے خلاف جو عقیدہ بھی ہو باطل ہے۔

میں نے کہا: پنڈت جی! پہلے ہم ایک بات کا فیصلہ کر لیں پھر اس کے متعلق بات چیت ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ کیا دُوسری دُنیا کی جو عالمِ غیب ہے ہمیں اس دُنیا میں حقیقتیں معلوم ہو

سکتی ہیں ؟ کیا ہم عالم نور کو دیکھ سکتے ؟ کیا اس مادّی دُنیا میں رُوح اور غیب کی حقیقت کو معلوم کرسکتے ہیں ؟ تبلائیے ! پنڈت جی نے کہا نہیں ۔ یہ ممکن نہیں، مَیں نے کہا، پھر آپ تلاشِ حقیقت میں جتنا وقت صرف کرتے ہیں وہ ضائع ہوتا ہے ۔اگر وہی وقت آپ نروان حاصل کرنے کی کوشش میں صرف کیا ہوتا تو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور حاصل ہو جاتا ۔ اچھا اب ایک اور بات تبلائیں ۔ ایک یونیورسٹی میں جو طالب علم تین سال ناکام ہوتا ہے اس کو یونیورسٹی سے نکال دیا جاتا ہے اور ایک یونیورسٹی ایسی ہے کہ وہاں ناکام ہونے والے طالب علموں کو خواہ کتنے ہی سال فیل ہوتے رہیں نکالا نہیں جاتا ۔ اَب ایک طالب علم کو پہلی یونیورسٹی میں تیسرا سال ہے وہ حصول کامیابی کے لئے زیادہ محنت کرے گا یا دوسری یونیورسٹی والا جس کو نکالے جانے کا اندیشہ نہیں ؟ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے لئے بے شمار مواقع ہیں ۔ کہئے اس معاملہ میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ پنڈت جی بولے ! یہ تو صاف بات ہے کہ جس کا آخری سال ہے اور آئندہ توسیع کی اُمید نہیں وہ ہی زیادہ محنت کرے گا میں نے کہا آپ نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا ۔ اس پر پنڈت جی حیران ہو گئے ۔ جی ! مَیں نے کیا دے دیا ؟ بندہ نے کہا : حقیقت خواہ کچھ بھی ہو خود آپ کے بیان سے واضح ہو گیا کہ عوام کے لئے یہ عقیدہ کہ یہ ہی ہمارا آخری جنم ہے جو کچھ نروان (نجات) حاصل کرنے کے لئے کرنا ہے کر لو اور موقع نہیں ملے گا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو تبلایا جائے کہ کئی جنم میں نروان حاصل کرنے کے موقعے ہیں ۔ جس سے یہ کہا جائے کہ بس ایک ہی جنم ہے جو کچھ کرنا ہے کرلے وہ زیادہ کوشش کرے گا یا وہ جس کو زیادہ مواقع کی اُمید ہو ؟ اَب پنڈت جی خاموش تھے ۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ اَب یہ فرمادیں کہ کیا ایک جنم میں کسی کو نروان نہیں مل سکتا ؟ ایک شخص جو عمر بھر ست گُن (اعمالِ خیر) کرتا ہے کیا یہ انصاف نہیں ہے کہ اس کو نروان مل جائے ؟ کہنے لگے کیوں نہیں ۔ ہو سکتا ہے کوئی نروان حاصل کرلے ۔ مَیں نے کہا لیجئے آپ کا آواگون آدھا تو ہو ہی گیا ۔ بات صاف ہو گئی کہ دُوسرا جنم سب کے لئے ضروری نہیں ہے ۔ اور یہ بھی آپ تسلیم کر چکے ہیں کہ عوام کے لئے ایک جنم کا عقیدہ مُفید ہے ۔ اب ذرا آپنے

سوامی جی کو دیکھئے کہ وہ ایک انادی (قدیم) کے تین انادی بنا گئے۔ مادّہ[۱] ۔ روح[۲] اور خدا[۳]۔ آج دُنیا پر ظاہر ہو گیا کہ مادّہ فانی ہے۔ حادث ہے قدیم نہیں۔ آپ کا بُنیادی عقیدہ ہی باطل ہو گیا۔ اسی طرح "ستیارتھ پرکاش" کے چودھویں کھنڈ (باب) میں بھی جو اعتراضات سوامی جی نے اسلام پر کئے ہیں ایسے ہی فضول اور لغو ہیں جیسا کہ یہ تھا۔ اگر وہ گیانی ہوتے تو ان کو حقائق کا علم ہوتا اور ایسے اعتراضات نہ لکھ جاتے، پھر تو پنڈت جی بہت شرمندہ ہوئے اور اُن مسلمانوں کو ان کے شر سے نجات مل گئی۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

ایک نوجوان انگریزی ترجمہ کی حمائل لئے تشریف لائے۔ کھول کر سامنے رکھی اور اس آیت کی طرف توجّہ دلائی:۔

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ البقرۃ

(تحقیق وہ لوگ جو کافر ہوئے مساوی ہے ان کے لئے خواہ تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے ایمان نہیں لائیں گے)۔

پھر کہنے لگے، دیکھئے لیڈر میں فطری اثر و نفوذ ہوتا ہے وہ اپنی قوّتِ ارادی سے مجمع کو متاثر کر لیتا ہے لیکن رسول اللہ نے مُشرکین مکّہ میں اسلام کی تبلیغ کی اور تیرہ سال تک برابر کوشش کرتے رہے مگر ان کو متاثر نہ کر سکے تو یہ اچھا عذر پیش کر دیا کہ کافر ایمان نہ لائیں گے، کیا اللہ میاں پہلے سے نہ جانتے تھے؟ اگر جانتے تھے تو رسولؐ کو بھیجا ہی کس لئے تھا؟

مَیں نے کہا: اس آیت میں جو تم نے "اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کا مفہوم سمجھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ کُفر کے ایک معنی "روگردانی کرنا" ہیں یعنی مُنہ پھرانا۔ جس سے مُراد ہے توجّہ نہ کرنا پس جو شخص کسی بات کی طرف توجّہ نہ کرے، یا سُنے ہی نہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ بات مان جائے؟ یہ تو قانونِ فطرت ہے کہ وُہی شخص کوئی بات مانے گا جو توجّہ سے سُنے گا۔ دیکھو غلط مفہوم لینے سے ہی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس پر انھوں نے اگلی آیت

کی طرف اشارہ کیا:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷ البقرۃ

(اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر کردی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے)۔

کہنے لگے یہ کہاں کا انصاف ہے کہ خود ہی دلوں پر مُہر کردیں کہ کچھ سمجھ نہ سکیں، کانوں پر مُہر کردیں کہ سُن ہی نہ سکیں۔ آنکھوں پر پردے ڈال دیں کہ دیکھ بھی نہ سکیں اور پھر خود ہی ان بے چارے مجبوروں پر عذاب بھی کریں؟

مَیں نے کہا: دیکھو غالبؔ کہتے ہیں ؎

ہر چند ہو مُشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مطلب یہ ہے کہ حقائق و معارف ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے بادہ و ساغر کے رنگ میں بیان کرنے پڑتے ہیں۔ پس اگر کوئی شخص مرزا مرحوم کے ایسے اشعار سے جن میں عشقِ مجازی، شراب و کباب کا ذکر ہو یہ سمجھ لے کہ ان کا تعلق عیّاشی سے ہے تو کیا یہ اس کی حماقت نہ ہوگی؟ دیکھو قرآن نے اپنی تعریف بتلا دی ہے کہ قرآن کیا ہے۔ "تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ" (یہ اس کتاب کی تفصیل ہے جس میں شک و شبہ نہیں) بتلاؤ! تم یہاں کتاب سے کیا سمجھے۔؟

کہنے لگے "الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ" (الف۔ لام۔ میم۔ وہ ایسی کتاب ہے جس میں شک نہیں)۔ اس آیہ میں علماء اسلام "کِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ" سے قرآن ہی مراد لیتے ہیں۔ مَیں نے کہا: سُبحان اللہ! ایسی عقل و دانش کے ساتھ اس مقدّس کتاب پر اعتراض کرنے کی جرأت کرتے ہو۔ اس آیت سے یہ مفہوم سمجھے ہو کہ یہ قرآن اسی قرآن کی تفصیل ہے؟ پہلے کتاب کے معنی سمجھو! دیکھو ربّ العزّت فرماتا ہے:۔ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝۱۱ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝۱۲ الانفطار

(تم پر محافظ ہیں بزرگ لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے رہتے ہو)۔

پھر ارشاد ہے:۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۹﴾ الجاثیہ

(یہ ہماری کتاب ہے جو تم پر حق ہی بولے گی ہم تو لکھتے رہتے تھے جو کچھ بھی تم کرتے رہتے تھے)۔

اَب تو سمجھ میں آجانا چاہیئے کہ خدا کی یہ کتاب نفسِ اِنسان ہے جس پر ہر قول و فعل، ہر حرکت و سکون نقش ہے۔ پیدائش سے لے کر اس وقت تک تم نے ہر وہ چیز جو دیکھی اس کی تصویر، ہر وہ خوشبو جو سونگھی، ہر وہ بات جو کہی۔ ہر ذائقہ جو چکھا۔ ہر بات جو سُنی، ہر کیفِ اذیت و سرور حِس کا احساس ہوا سب کے نقوش اس کے اندر موجود ہیں اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے کِتٰبٌ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۔ قرآن میں جو کچھ بھی ہے وہ نفسِ اِنسان کی کیفیات کی تفصیل ہے لہٰذا ان کیفیات کو نفس میں ہی تلاش کرو۔ الفاظ کے ظاہری معنی مراد نہ لو۔ اس آیت میں نفسِ انسانی کی فطرت کا ایک قانون بیان کیا گیا ہے کہ جب اس کو کوئی خواہش شدید ہوتی ہے، کسی شے کے حصول کا شوق ہوتا ہے یا اس کے ذہن میں کوئی خیال پختہ ہو جاتا ہے کہ یُوں کروں گا اور وُوں کروں گا، پس ایسا ہو جائے گا، تو پھر وہ نہ کسی کی بات سُنتا ہے نہ دوسروں کو ناکام ہوتے دیکھ کر مُتاثر ہوتا ہے نہ کسی کے سمجھانے سے سمجھتا ہے اس طرح گویا کانوں اور دل پر مہر ہو جاتی ہے۔ آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور نتیجہ میں نقصان عظیم ہوتا ہے (پوری تفصیل باب سوم میں آئے گی)۔

یہ تو فطرتِ نفس کا راز ہے کہ جب کوئی خیال ذہن میں قائم ہو جائے تو پھر نہ کچھ سُن سکتا ہے، نہ آنکھ سے دیکھنے پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ قلب سمجھ سکتا ہے۔ پس "وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ اس سے مُراد ہے حقیقت سے روگردانی کرنے والے جو حقائق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بھلا جب "وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کا یہ مطلب ذہن میں قائم ہو کہ مکّہ کے وہ لوگ جو ایمان نہ لائے تھے یہ ان کا ذکر ہے تو قرآن کا مفہوم کیا سمجھ میں آئے۔ تیرہ سو برس سے جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ سب ایسی ہی ہیں کہ گاؤ زبان کے معنی گائے کی جیب۔ پھر گئو ماتا کی جیب کی تشریحوں سے کتب خانے بھر گئے۔ بھلا دم الاخوین سے دو بھائیوں کا خون مُراد لے کر جو بحثیں کی جائیں گی وہ علم ہو گا یا جہل؟ وہ شیطان کی طرف لے جائے گا یا رحمٰن کی طرف توجّہ دلائے گا؟ اَب تو آئینہ آپ کے سامنے ہے قرآن کیفیاتِ نفس بیان

کرتا ہے اور کیفیاتِ نفس بغیر تمثیلی قصوں کے سمجھ میں آ ہی نہیں سکتیں۔ اسی لئے قرآن نے قصوں کی صورت میں ہم بدبختوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے جانا آہا یہ حضرت یوسفؑ کا قصہ ہے' یہ حضرت یونسؑ کا قصہ ہے۔ مگر وائے بدقسمتی یہ نہ دیکھا کہ قرآن تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے:۔ "یَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" (۲۵) الانعام۔ (کافر کہتے ہیں اور کہتے رہیں گے۔ یہ تو پرانے لوگوں کے قصے ہیں)۔ اللہ اکبر، ہم نے قرآن کی کیا بے وقعتی کی ہے وائے ہماری بدنصیبی ہم نے نور کو نار بنالیا۔ ہدایت کو ضلالت سے بدل ڈالا۔ خدائے تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے ہمیں صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرے اور "میرے مذہب کی محبت" کے ڈنڈے سے جو ابلیس ملعون ہمیں گدھوں کی طرح ہلاکت و تباہی کی طرف ہنکائے لئے جا رہا ہے' اپنے حبیب کے صدقے نجات دلائے اور حق کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

وزنِ اعمال۔ میزان

ایک کمیونزم کا پروپیگنڈا کرنے والے صاحب مندرجہ ذیل آیات ایک پرچے پر لکھ کر لائے اور میرے سامنے پیش کیا:

(۱) وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ ج فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۸) الاعراف

(اور اس دن تولا جانا حق ہے پس جن کی تول بھاری ہوگی وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے)۔

(۲) وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا ط وَكَفٰی بِنَا حٰسِبِیْنَ (۴۷) انبیاء

(اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازوئیں رکھیں گے پس کسی نفس پر ذرا سا ظلم بھی نہ کیا جائے گا اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (عمل) ہوگا ہم اُسے لائیں گے اور حساب کے لئے ہم کافی ہیں)۔

(۳) فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۰۲) المومنون

(پس وہ جس کے پلے بھاری ہوں گے پس وہی تو فلاح پانے والے ہیں۔

۴ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ القارعۃ
(پس جس کے اعمال کے نیکی کے پلے بھاری ہوں گے پس وہی شخص تو خاطر خواہ عیش میں ہوگا)۔
اور کہنے لگے کہ تمام فرقہ اسلامیہ کے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قیامت میں ترازو کے قائم ہونے اور اس پر اعمال تولے جانے پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو ایسا عقیدہ نہ رکھے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ مَیں نے تمام فرقہ اسلامیہ کے تراجم دیکھے ہیں۔ علماء شیعہ کا مصدقہ مولوی فرمان علی کا ترجمہ بھی دیکھا۔ آیت نمبر ۴ کا ترجمہ وہاں یہ ہے "تو جس کے نیک اعمال کے پلے بھاری ہونگے وہ من بھائے عیش میں ہوگا۔" غرضکہ مطلب سب جگہ ایک ہی ہے۔ سب کا یہی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈنڈی ترازو لے کر اعمال تولنے بیٹھیں گے۔ تول تو وہ کرتا ہے جو صحیح اندازہ نہ کر سکے اور اعمال کا تولا جانا مضحکہ خیز ہے بھلا عمل بھی وزن کرنے کی چیز ہے؟ ایسی مضحکہ خیز باتیں اس زمانۂ علم و دانش میں کون ذی فہم قبول کر سکتا ہے؟

مَیں نے کہا کہ یہ تمام آیات متشابہات ہیں۔ ان کے الفاظ کے ظاہری معنی مُراد نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ الفاظ کے ظاہری مفاہیم مُراد لیں گے اور اس کو حقیقت سمجھ لیں گے۔ وہ گمراہ ہو گئے۔ قرآن نے ظاہر کر دیا ہے کہ متشابہ کے پیچھے وہ لوگ پڑتے ہیں جن کے دلوں میں کجی اور گمراہی ہے۔ اتنا تو تم بھی سمجھ سکتے ہو کہ جب تم کہتے ہو پہلے تولو بعد میں بولو، تو کیا تم ڈنڈی ترازو لے کر بیٹھتے ہو؟ بتلاؤ! کہنے لگے نہیں۔ مَیں نے کہا کہ پھر اس جملہ کا مفہوم اب تم خود ہی بتلا دو۔ کہنے لگے۔ اس سے مُراد ہے کہ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو اس کی بُرائی اور بھلائی پر غور کر لو۔ دونوں کا دل میں موازنہ کر لو۔ مَیں نے کہا بس وزن سے یہی مُراد ہے۔ اب رہ گیا میزانوں کا معاملہ تو یہ مترجمین صاحبان اگر غافل نہ ہوتے تو ترجمہ میں میزانیں یا زیادہ سے زیادہ ترازوئیں لکھ دیتے۔ لو اب میزان یا ترازو کے معنی بھی سمجھ لو۔ عربی کا قاعدہ ہے کہ تمام صیغے ف۔ ع۔ ل پر وزن کئے جاتے ہیں مثلاً نَصَرَ کہا جاتا ہے کہ فَعَلَ کے وزن پر ہے۔ سَمِعَ فَعِلَ کے وَزن پر ہے۔ قُتِلَ بر وَزن فُعِلَ۔ اپنی زبان میں ہی دیکھ لو مثلاً حُور، دُور، نُور، طور وغیرہ ان میں سے آپ ایک لفظ لیں گے اور اسی کو بنا بنا کر دُوسرے الفاظ کو اس پر وَزن کریں گے اور کہیں گے: نُور، طُور۔ یہ دونوں حُور کے

وزن پر ہیں۔ تو گویا وزن سے یہاں مُراد ہے کہ عدد میں حرف برابر۔ حرکات ایک جیسے۔ اب تو واضح ہو گیا کہ میزان اعمال سے اعمال کا نمونہ مُراد ہے نہ کہ ڈنڈی ترازو۔

اَب آپ دریافت کریں گے کہ "ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ" سے کیا مُراد ہے؟ ترازوئیں بھاری ہوں گی کا کیا مَطلب ہے؟ تو سُنیئے! اکثر احادیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ ترازوؤں سے انبیاؑ و اوصیاؑ علیہم السّلام مراد ہیں کہ وہی اعمال کے نمونے ہیں۔

ان سب کو نظر انداز بھی کر دیں تو ایک حدیث تو ایسی ہے کہ تمام فرق اسلامیہ میں نقل کی گئی ہے اور وہ یہ ہے "اِنِّیْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلِ بَيْتِيْ"، (تحقیق کہ میں تم میں دو ثقل چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں)۔ اَب تو آیت کا مفہوم صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ جس نے کتاب خدا کے احکام کی پیروی کی تھی اور عترتِ رسولؐ کے اعمال کی نقل کرنے کی کوشش کرتا رہا یعنی خلقِ خدا کی بھلائی اور بہتری کے لئے ایثار کرتا رہا۔ اس کو رضائے الٰہی نصیب ہو گی۔

آیئے دُعا کریں: یا ارحم الراحمین ہمارے حال پر رحم فرما، ہمارے اعمال تیری اس ترازو پر تُلنے کے قابل کہاں ہو سکتے ہیں جب تک تُو اپنے محبوب کے صدقے ہمیں توفیق خیر عطا نہ کرے اور شرِ شیطان و شرِ نفس سے محفوظ نہ رکھے۔ يَا رَحْمٰنُ يَا رَحِيْمُ۔ رَبِّ عَامِلْنَا بِفَضْلِكَ وَلَا تُعَامِلْنَا بِعَدْلِكَ يَا كَرِيْمُ۔

اعمال نامہ

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ الانفطار

اور تحقیق کہ تمہارے اوپر محافظ ہیں۔ بزرگ لکھنے والے وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾ قٓ

(جب لیتے رہتے ہیں دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے ہوئے نہیں بولتا (انسان) کوئی بات مگر یہ کہ اس کے پاس نگہبان تیار رہتا ہے)۔

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ۚ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ﴿٨٠﴾ الزخرف

(کیا یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کے پوشیدہ بھیدوں اور سرگوشیوں کو نہیں سنتے۔ ہاں ہمارے رسول (فرشتے) ان کے پاس ہیں وہ لکھتے رہتے ہیں)۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ﴿٥٢﴾ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿٥٣﴾ القمر

(اور ہر ایک بات یا کام جو کچھ اُنہوں نے کیا ہے کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ ہر چھوٹا بڑا کام لکھا ہوا ہے)۔

ایک دہریہ نے اسلام پر کچھ اعتراضات پیش کئے جس کے منجملہ ایک کراماً کاتبین کے متعلق تھا۔ کہنے لگا کہ میں نے تمام فرق اسلامیہ کے علماء کرام کے اقوال دیکھے ہیں سب کا متفقہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کے کاندھوں پر دو فرشتے ایک داہنی طرف دوسرا بائیں طرف بیٹھا ہے (غالباً ٹانگیں لٹکائے) جن کے ہاتھوں میں اعمال نامے ہیں۔ وہ لکھے چلے جاتے ہیں پھر بعض علمائے کرام یہ بھی کہتے ہیں کہ دن کے فرشتے اور ہیں اور رات کے اور۔ ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے اور وہ رپورٹ اللہ میاں کے صدر دفتر میں پہنچا دی جاتی ہے۔ ایک مولوی صاحب وعظ فرمارہے تھے کہ قیامت میں ہمارا اعمال نامہ گلے میں لٹکا دیا جائے گا اور اس کے ثبوت میں یہ آیت تلاوت فرمائی:-

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ﴿١٣﴾ بنی اسرائیل

(اور ہر انسان کا طائر (نامۂ اعمال) اس کے گلے لگا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لئے کتاب نکالیں گے اور وہ اسے کھلا پائے گا)۔

ابھی یہ فرمارہے تھے کہ گلے میں اعمال نامہ لٹکا ہوگا۔ پھر کہنے لگے نیکوں کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور بدکاروں کا بائیں ہاتھ میں۔ پھر کہنے لگے گنہگاروں کا اعمال نامہ

پس پشت دیا جائے گا۔ میں حیران تھا کہ کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ۔ یہ کیسا اختلاف ہے؟ اور کیسی مضحکہ خیز باتیں ہیں؟؟ —

میں نے ان سے کہا کہ وہ بیچارے معذور ہیں۔ قرآن کریم نے بتلا دیا تھا کہ اس میں بہت تھوڑی آیات محکم ہیں اور باقی تمام متشابہ، اور متشابہ کے پیچھے وہ پڑیں گے جو گمراہ ہیں۔ ان بے چارے لفظ پرستوں کو محکم و متشابہ میں تمیز تو ہے ہی نہیں۔ متشابہ آیات کے الفاظ کے ظاہری مفہوم کو حقیقت سمجھ کر ہوائی پل باندھ لیتے ہیں۔ خیالی قلعے بناتے ہیں اور گمراہ تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تو انہیں اس وقت معلوم ہوگا جب ان کا نامۂ اعمال ان کے سامنے آئے گا۔ جیسا کہ قرآن نے آگاہ کر دیا ہے:۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ الکھف

(اور کتاب رکھی جائے گی اس وقت تو مجرموں کو دیکھے گا کہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو اس میں ہے اور کہتے ہوں گے افسوس ہے ہم پر یہ کیسی کتاب ہے کہ نہیں چھوڑا اس سے کوئی چھوٹا اور نہ بڑا کام مگر یہ کہ اس نے اس کو گھیر لیا ہے اور جو کچھ کیا تھا موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا)

یہ معاملہ کہ دو فرشتے دائیں بائیں اعمال لکھے جا رہے ہیں، اس میں کئی باتیں تشریح طلب ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ وہ اعمالنامہ یا کتاب کونسی ہے اور کہاں ہے؟ دوسرے یہ کہ کراماً کاتبین (بزرگ لکھنے والے) کون ہیں؟ تیسرے یہ کہ یمین و شمال سے کیا مطلب ہے؟ تو سنو!

(۱) غور کرو وہ کونسی کتاب ہے، جس میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا حرکت و سکون یا قول و فعل ایسا نہیں جو لکھا ہوا موجود نہ ہو۔ اس کے لئے ذرا اپنے اندر جھانک کر دیکھو کہ پیدائش سے لے کر آج تک جتنی چیزیں حالات و واقعات دیکھے ہیں، کیا ان کی تصاویر تمہارے نفس میں موجود نہیں ہیں؟ کوئی حرکت و سکون جو تم نے کیا، کوئی بات جو کہی یا سنی، ذائقہ جو چکھا،

کوئی خوشبو یا بدبو جو سونگھی، کوئی حس جو چھونے سے ہوا غرض کونسی چیز ہے جس کے نقش آپ کے نفس پر موجود نہیں ہیں؟ یہ ہی وہ کتاب ہے جس کے لئے کہا گیا ہے کہ یہ کیسی کتاب ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا حرکت و سکون ایسا نہیں جس کو یہ احصا کئے ہوتے نہ ہو۔ کوئی بات ایسی نہیں جو بولی ہو اور اس میں نہ ہو۔ یہی ہمارا نفس خدا کی کتاب ہے۔ یہی ہمارا نامۂ اعمال ہے۔

(۲) فرشتوں کے متعلق تو آپ نے سُنا ہوگا کہ وہ نوری مخلوق ہیں۔ وہ وہی نوری قوتیں یا قوائے ملکوتی ہیں جن کے ذریعے سے یہ نقوش بنتے رہتے ہیں۔ یہ ہی بزرگ لکھنے والے ہیں۔ ان میں یہ قوتیں ہیں کہ ہر شکل میں ظاہر بھی ہو سکتے ہیں۔

(۳) "عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ" (دائیں بائیں بیٹھے ہوئے) آپ جانتے ہیں، بولتے بھی ہیں۔ یمین بمعنی سعادت، نیکی؛ لہٰذا یمین سے مراد ہے نیک، اور شمال اس کے مخالف یعنی بد۔ جسم انسان میں ایک نفسِ امّارہ ہے جو بدی کی طرف راغب ہے یہ گیس کا جسم ہے۔ دوسرا نفسِ قدسیہ ہے، یہ نوری جسم ہے جو نیکی کا حکم کرتا ہے۔ نیکی کی خواہشات اس کی طرف سے ہوتی ہیں لہٰذا ہر نیک بات، نیک عمل کا نقش اس پر بنتا ہے۔ اور ہر بُری بات بُرے کام کا نقش نفسِ امّارہ پر بنتا ہے اسی لئے آیت میں کہا گیا ہے۔ "اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ"، (جب لیتے رہتے ہیں دو لینے والے)۔ وہ نقش لینے یا قبول کرنے والے بھی دو ہیں۔ ایک یمین یعنی سعید ہے دوسرا شمال یعنی شقی ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ جب لکھتے ہیں دو لکھنے والے۔ پھر اسی کو طائر کہا گیا ہے کہ ہر شخص کا طائر اس کے گلے میں ڈال دیا ہے۔ طائر کے دو پر ہوتے ہیں۔ یہ دونوں نفوس قیدِ جسم سے آزاد ہو کر فضا میں ان دونوں پروں سے اُڑتے ہیں۔ ان کو سطحِ زمین پر پاؤں پاؤں چلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُمّید ہے اس گفتگو سے آپ کی پوری تسلّی ہو گئی ہوگی۔

حساب کتاب

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ⑦ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ⑧
وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ⑨ انشقاق

(اور جس کا اعمالنامہ اسے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا پس اس سے آسانی کے ساتھ حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے اہل کی طرف لوٹے گا)

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۙ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾ الغاشیہ

(بے شک ان کی بازگشت ہماری طرف ہی ہے پھر ان کا حساب ہمارے ذمے ہے)۔

فی زمانہ کفر وارتداد کی تلواریں تو کُند ہو چکی ہیں۔ ان سے تو اب کوئی ڈرتا نہیں۔ ہر شخص کو اپنے خیال کے اظہار کی آزادی ہے جو کچھ اس کے مُنہ میں آئے کہتا ہے۔ ایک شخص میرے سامنے کہہ رہا تھا کہ قیامت کے حساب کتاب کا معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جس مولوی سے پوچھو وہ اپنی ہی کہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہر شخص اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا اس کا حساب اللہ ہی لے گا۔ کوئی کہتا ہے اللہ تعالیٰ خود انبیاء کا حساب لیں گے اور اُمتوں کا حساب انبیاء کے سپرد ہوگا۔ ہر نبی اپنی اُمّت کا حساب لے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ حساب صرف مسلمانوں کا لیا جائے گا مشرکین کا حساب نہیں لیا جائے گا وہ بغیر حساب کے ہی جہنّم میں ڈال دیئے جائیں گے جیسا کہ ارشاد ہے "فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ" ﴿۳۹﴾ الرحمان (آج سوال نہ کیا جائے گا کسی انسان سے یا جن سے اس کے گناہوں کا)۔ ایک شخص نے کہا کہ شیعہ حضرات کا دعویٰ ہے کہ ہم نے علم قرآن اہل بیت سے لیا ہے۔ ان کی کتاب "العقائد" بھی دیکھو۔ چنانچہ عقائد شیخ صدوق دیکھی وہاں بھی ایسی ہی مضحکہ خیز روایات نظر آئیں۔ اس میں ایک یہ بات بھی دیکھی کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے حساب سے اس دُنیا کے وقت کے حساب سے آدھی گھڑی میں فراغت حاصل کر لیں گے۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ یہ تو شیخ صدوق نے اللہ تعالیٰ کا معجزہ دکھایا ہے کہ نا قابل شمار مخلوق کے حساب سے آدھے گھنٹے میں فارغ ہو جائیں گے۔ گویا ان کے اللہ تعالیٰ وقت کے پابند ہیں۔ یہ تو مضحکہ خیز باتیں ہیں۔

مجھ سے خاموش نہ رہا گیا۔ مَیں نے کہا: دیکھو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ (ہم نے جہنّم کے لئے بہت سے جن اور انسان پیدا کئے) لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ﴿۱۷۹﴾ الاعراف (انکے دل ہیں ان سے سمجھتے نہیں)

لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ (ان کے کان ہیں ان سے سُنتے نہیں)۔ پس جس کے پاس سمجھنے والا دل ہوگا وہ سمجھ سکے گا کہ یہ سب متشابہات ہیں اور ان کے پیچھے پڑنا گمراہوں کا کام ہے۔ ان آیات سے جو مفہوم الفاظ ظاہری سے سمجھ میں آئے وہ حقیقت نہیں ہو سکتا۔ جو اس کو حقیقت سمجھ لے گا گمراہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس کے کاموں کا مخلوق پر قیاس کرنا شرک ہے۔ کاموں میں مصروفیت اور کام کرنے کے بعد فراغت حاصل کرنا آدمی کا کام ہے۔ جو خدا کے لئے ایسا خیال کرے مُشرک ہے اور یہ تمام جو کچھ تم نے حساب کتاب کے متعلق سُنا محض نادانوں کے قیاسات ہیں۔

جس کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہوں اور وہ باوجود آنکھیں ہونے کے اندھا ہی ہو اور ان سے نہ دیکھ سکے، اس کے لئے قرآن کہتا ہے: مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (جو اس دُنیا میں اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا)۔ اب میں آپ کو دکھاتا ہوں کہ حساب کتاب کیسے ہوگا۔ ارشاد ربُ العزت ہے:۔

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾ القیٰمۃ

(اس دن آگاہ کر دیا جائے گا انسان اس سے جو کچھ اُس نے آگے پیچھے کیا ہے بلکہ انسان تو اپنے نفس پر خود ہی گواہ ہے۔ اگرچہ وہ عُذر کرتا رہے)۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ بنی اسرائیل

(اپنی کتاب پڑھ لے آج تو اپنے نفس کے محاسبہ کے لئے خود ہی کافی ہے)۔

پھر یہ کہ وہ کونسی کتاب ہے جس کے پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟ ہر چند اس آیت میں بالکل واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ نفسِ انسان ہے پھر بھی ایک آیت اور دکھاتا چلوں:

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ الجاثیہ

(اور تو ہر اُمت کو گھٹنوں کے بل دیکھے گا۔ ہر اُمت بُلائی جائے گی اس کتاب کی طرف

اس دن بدلہ دیا جائے گا اس کا جو تم کرتے رہتے تھے۔ یہ ہماری کتاب ہے جو تم پر حق بولے گی۔ ہم تو لکھتے رہتے تھے جو کچھ تم کرتے رہتے تھے)۔

اب تو بالکل واضح ہو گیا کہ ہر شخص کو اس کے نفس کی طرف توجہ کرنے کا حکم ہو گا۔ اس وقت غفلت ولاشعوری تو بالکل ہو گی نہیں نفس پر جو نقوش ہیں واضح وآشکار ہوں گے جو سیکنڈ کے ہزارویں بلکہ لاکھویں حصہ میں پڑھ سکے گا۔ بس حساب ہو گیا۔ یہ ہے حساب کتاب کی حقیقت۔

لوحِ محو و اثبات۔ لوحِ محفوظ۔ قلم

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾ البروج

(بلکہ یہ تو بزرگی والا قرآن ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے)۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿٣﴾ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿٤﴾ العلق

(پڑھو تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے سکھایا)۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿٣٩﴾ الرعد

(مٹا دیتا ہے اللہ جسے چاہے اور ثبت کر دیتا ہے اور اس کے پاس اصل کتاب ہے (لوحِ محفوظ)

لوحِ محفوظ کے متعلق علمائے اسلام کے مختلف اقوال ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ نیلے رنگ کی بڑی تختی ہے جو عرش پر ہے جس کا ایک کنارہ مشرق میں تو دوسرا مغرب میں ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ہونے والے واقعات وحالات تحریر کروا رکھے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک کتاب ہے جس میں قیامت تک کے حالات درج ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بہت بڑی تختی ہے جس کا ایک سرا عرش پر دوسرا میکائیل کی پیشانی سے لگا ہوا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ میکائیل فرشتے کی پیشانی سے چھو جاتی ہے اور اس پر وحی لکھی جاتی ہے، وہ اس کو جبرئیل امین کو دکھاتے ہیں، جبرئیل اس کو پڑھ کر حسبِ حکم جس کے پاس لے جانا ہوتا ہے پہنچاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ لوح وقلم دو فرشتے ہیں ایک سے اللہ تعالیٰ نے تختی کا اور دوسرے سے قلم کا کام لیا ہے۔

افسوس کہ جن کے پاس نہ دیکھنے والی آنکھیں ہوں اُن کو یہ احادیث کیسے نظر آئیں؟

• اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ اللَّوْحَ ،، (سب سے پہلے جو اللہ نے پیدا کیا وہ لوح ہے)۔

"اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْقَلَمُ" (اوّل جو چیز خدا نے بنائی وہ قلم ہے)۔ "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ" (سب سے پہلے جو اللہ نے پیدا کیا وہ میرا نور ہے)۔ یہ تو اسی ایک نور کے نام ہیں جو اوّل مخلوق ہے اور اسی میں تمام علم ماکان وما یکون مخفی ہے۔

علمائے کرام کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ایک تختی اللہ تعالیٰ نے عرش پر رکھی ہوئی ہے۔ اس پر کچھ لکھوا دیتے ہیں۔ پھر اس کو مٹا کر کچھ اور لکھنے کا حکم دیتے ہیں وہ لکھ دیا جاتا ہے' اس کو لوحِ محو واثبات کہتے ہیں۔ افسوس کہ اس بارگاہِ عظمت وجلال کو جاہلوں نے قصہ خوانوں کی چوپال بنا ڈالا۔ کیسی کیسی خلافِ عقل ومضحکہ خیز باتیں اُس علیم وحکیم وعلی الاعلیٰ سے منسوب کرتے ہیں؟ یہ تو اُصولِ فطرت بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی طلب جب ایک منزلِ کمال کو پہنچتی ہے تو اس کا ایک اثر اس کے لاشعور میں مرتب ہو جاتا ہے جو وقت آنے پر ظاہر ہوگا۔ اگر اس درمیان میں اس کی طلب بدل جائے تو وہ اثر بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ بس یہ ہے لوحِ محو واثبات۔

صراط

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ المریم

(اور نہیں ہے کوئی تم میں سے ایسا جو اس پر (جہنّم پر) وارد نہ ہو۔ اس اَمر کا پورا کرنا تیرے رَب کے لئے لازمی اور حتمی ہے)۔

اس آیہ وَ اِنْ مِّنْكُمْ میں جہنّم کے پل کا کوئی ذکر نہیں اور کلام پاک میں کہیں بھی "جَسْرِ الْجَهَنَّمُ"، جہنّم کے پل کا تذکرہ موجود نہیں۔ مگر ہمارے علمائے کرام اس آیت سے جہنّم کا پُل مُراد لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صراط جہنّم کے اوپر ایک پُل ہوگا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوگا۔ اللہ پاک جب اعمال تول چکیں گے اور حساب کتاب سے بھی فراغت حاصل کرلیں گے تو تمام اہلِ محشر کو اس پُل پر دوڑائیں گے' لوگوں کو صراط پر سے گزرنا ہوگا۔ نیچے جہنّم کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے۔ پس نیکوکار' صاحبانِ ایمان برق رفتاری سے اس پُل پر سے گزر جائیں گے اور جنّت میں پہنچ جائیں گے۔

بدکاروں کے پیر کٹ جائیں گے اور وہ سب جہنم میں گر جائیں گے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ عید الضحیٰ کو جو جانور قربان کئے جاتے ہیں وہ سب وہاں مل جائیں گے اور قربانی کرنے والے ان پر سوار ہو کر پل صراط سے گزر جائیں گے۔ اس طرح اگر پیر کٹیں گے بھی تو جانوروں کے کٹیں گے قربانی کرنے والوں کے پیر محفوظ رہیں گے۔

علماء کرام کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جنت ساتویں آسمان کے اوپر اور جہنم ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ پس جب ان لفظ پرست علماء کو یہ خیال آیا کہ جنت اوپر ہے اور جہنم نیچے ہے لہٰذا پل صراط جہنم پر کس طرح رکھا جائے گا اس کو تو لٹکانا پڑے گا۔ پھر کیا تھا انہوں نے عجیب و غریب تاویل نکالی تاکہ عوام کالانعام کو بہکایا جاسکے اور وہ یہ ہے کہ خداوند عالم قیامت میں آسمانوں کو لپیٹ لے گا۔ اس کے بعد جنت و عرش کو زمین کے قریب اُتار دے گا پھر زمین سے جنت تک پل صراط رکھ دیا جائے گا۔ مثل مشہور ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ تاویل کنندہ کو یہ یاد ہی نہ رہا کہ زمین تو تباہ ہو چکی ہوگی۔ پھر زمین سے عرش تک پل کیسے رکھا جائے گا؟

اصل یہ ہے کہ رب العزت کا ارشاد ہے "ہم نے جہنم کے لئے بہت سے جن و انسان پیدا کئے ہیں۔ ان کے دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں۔ آنکھیں ہیں ان سے دیکھتے نہیں"۔ پھر نہ دیکھنے والی آنکھیں یہ کیسے دیکھ سکتیں کہ باری تعالیٰ نے فرمادیا ہے قرآن میں بہت تھوڑی آیات محکم ہیں، باقی تمام قرآن متشابہ ہے۔ اور متشابہ کے پیچھے وہ لوگ پڑتے ہیں جن کے دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں یعنی جو گمراہ ہیں، بے عقل ہیں، لاشعور ہیں۔ محکمات پر عمل کر کے معرفت و شعور تو حاصل نہیں کرتے متشابہات کی تشریحوں اور تفسیروں میں منہمک رہتے ہیں۔

علماء میں سے جن لوگوں نے ذرا سا بھی شعور حاصل کر لیا اور راہِ معرفت پر گامزن ہوئے وہ یہ کہتے ہیں کہ صراط سے مراد وہ دینی راستہ ہے جو سیدھا اور خوشنودی خدا تک پہنچانے والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صراط سے وہ راستہ مراد ہے جس میں افراط و تفریط نہ ہو اور یہی دین حق کا راستہ ہے۔ کسی کا قول ہے کہ صراط سے مراد معرفت خداوندی حاصل کرنے کا راستہ ہے۔ ایک قول یہ بھی دیکھا کہ صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے جو خدا کی محبت تک پہنچائے

اور ہوا وہوس کی پیروی کرنے سے روکے۔

مگر جنھوں نے اپنے قیاس کی بنا پر غیب اور بارگاہ احدیت کی مادی تمثیلوں اور تشبیہوں کی تصاویر اور مجسمے اپنے ذہن میں بنائے ہوئے ہیں وہ حقائق معارف پر مشتمل اقوال نقل کرنے کے بعد ان کی تاویلیں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہاں قول تو یہ بھی ہے مگر ہماری قیاسی تصویریں ہی صحیح ہیں۔

قارئین پر جنھوں نے اس باب کا بغور مطالعہ کیا ہے یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ نفس انسان کی غفلت ولاشعوری ہی شرک باطنی کا باعث ہے جو وجود باری کا یقین قلبی حاصل کرنے میں حارج ہے۔ اور جو کام بھی لاشعوری میں غیر ارادی طور پر تسکین خواہشات کے لئے ہوتا ہے وہ غفلت کو بڑھاتا ہے، اور خدا کے راستے سے دور کرتا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے "مَا اَشْرَکْتُ بِاللّٰہِ طَرْفَةَ عَیْنٍ" (میں نے اللہ کے ساتھ شرک کرنے میں پلک بھی نہیں جھپکائی)۔ اس کا مفہوم ہے کہ ہمارے جسم میں جتنے افعال اضطراری ہوتے رہتے ہیں ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس پر انسان کو اختیار ہو سکے صرف ایک پلک جھپکانا ہی ایسا کام ہے جو غیر ارادی طور پر بھی ہو سکتا ہے اور ارادہ سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جو کام ادائے فرض فطری کے لئے ارادتاً کیا جائے عبادت حقیقی ہے مگر جو خواہش نفس سے غیر ارادی طور پر صادر ہو وہ شرک خفی ہے۔ مثلاً ہمارے روز مرّہ کے کاموں میں ایک کھانا کھانا ہی ہے۔ جتنی غذا بقاء حیات کے لئے ضروری ہے جو پورے طور پر ہضم ہو سکے اس کا کھانا عبادت ہے۔ اگر ذائقہ کی لذت سے نفس مغلوب ہو جائے اور ایک لقمہ بھی زائد کھا لیا تو یہ شرک خفی میں شامل ہے اس سے نجاست لاشعوری زیادہ ہوتی ہے جو رب کی بڑی نعمت اطمینان قلب حاصل کرنے میں حارج ہونے والی ہے۔ جب تک وجود باری کا یقین قلبی حاصل نہیں ہوتا اطمینان قلب بھی نہیں ملتا اور اضطرار ہی میں زندگی گزرتی ہے۔ اسی کیفیت کو جہنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ راستہ جہنم پر بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے کہ نہیں؟ درست کہ اس راستہ پر چلنا آدمی

کے لئے قریب قریب ناممکن ہے مگر یہ بندے کا کام نہیں۔اس پر تو ربِّ اکرم ہی چلاتا ہے۔بندے کا کام تو فقط طلب ہے کہ صدقِ دل سے بھیک مانگتا رہے۔"رَبَّنَا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (اے میرے پیارے پالنے والے مجھے اپنے راستہ پر چلالے) یا اپنی طرف بُلالے۔بغیر تیری نصرت وتائید تو ہم تیری طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے۔"اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ"(ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں کہ تو ہی ہماری مدد کر) اپنی تائید نازل فرما تاکہ ہم تیری بندگی کرسکیں اور بندگیٔ نفس سے محفوظ رہ سکیں۔غرض کہ جس بندے کو اس زندگی میں صراط پر چلنے کی طلب ہی ہوگی خواہ وہ اس پر چل نہ سکا ہو تو جناب ارحم الرّحمین جس کی رحمت بہانہ ڈھونڈتی ہے اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے گا۔وہ تو کہتا ہے"اے میرے گنہگار بندو مایوس نہ ہونا میں تو سارے گناہ بخش دیتا ہوں میں تو بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ۔

کشف ساق

یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ

(۴۲) القلم (جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور سجدے کے لئے بلائے جائیں گے پس نہ کرسکیں گے)۔

۱۹۴۲ء میں ایک دہریہ نے یہ اعتراض پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ پنڈلی کیسے کھولیں گے کیا وہ پاجامہ پہنے ہوں گے یا صرف تہمد باندھے ہوں گے؟ ایک مترجم کلام اللہ دکھایا جس کے حاشیہ پر لکھا تھا کہ قیامت میں تمام مذاہب کے لوگ اپنے اپنے معبودوں کے ساتھ جہنّم میں چلے جائیں گے۔صرف مسلمان کھڑے رہ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ آئیں گے اور کہیں گے کہ میں تمہارا خدا ہوں۔وہ کہیں گے کہ ہم تو نہیں پہچانتے۔پھر اللہ تعالیٰ اس صورت میں ظاہر ہوں گے جس کو وہ پہچانتے ہوں گے اور پنڈلی کھول کر دکھائیں گے اور سجدے کے لئے بلائے جائیں گے تو دُنیا میں جو خلوص

سے سجدہ نہ کرتے تھے ان کی پیٹھ سخت ہو جائے گی وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ پھر کہنے لگے کہ یہ آپ کے اللہ تعالیٰ کیسے ہیں ذرا ہمیں بھی سمجھا دیں!

ہندوستان میں ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں آریہ سماج اور مسلمانوں کے درمیان مناظروں کا خاصا زور تھا اس دوران یہ آیت بھی زیر بحث آئی تھی۔ میرے ہم سن احباب جو دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے ان کی صحبتوں میں بھی اس کا تذکرہ آیا۔ اس کی بہت سی تاویلیں سُنیں مگر تسکین نہ ہو سکی۔ خیر ایک خار دل میں رہ گیا اور کچھ عرصہ گزرنے پر اس بات کو رفتہ رفتہ بھول گیا۔ مَیں فکرِ معاش میں بارہ بارہ گھنٹے کام میں مصروف رہنے والا مزدور، کتابیں دیکھنے کی فرصت کہاں۔ مگر اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں، مَیں لاہور میں مقیم تھا۔ قریب ہی ایک پینشنر دفتری صاحب رہتے تھے۔ تنہا تھے۔ اُن کو کتب بینی کا بڑا شوق تھا۔ ایک بڑا کتب خانہ جمع کیا ہوا تھا۔ ایک شام ان سے ملنے گیا تو وہ ایک تفسیر کا مطالعہ کر رہے تھے۔ سورہ ن والقلم ہی کھُلی ہوئی تھی۔ مجھے فوراً ۱۹۱۰ء یاد آ گیا، مَیں نے کہا ذرا میں بھی دیکھوں اس آیت کے حاشیہ پر لکھا تھا: "حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربِ قیامت میں ایک نور ظاہر ہوگا۔ کشف ساق سے اُس کا ظہور مُراد ہے"۔ مَیں نے شکر ادا کیا کہ مولانا نے یہ خلش دور کر دی۔

چنانچہ ۱۹۴۴ء میں اِس دہریہ کو کشف ساق کا مطلب بتایا جس سے وہ خاموش ہو گیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

سِتَّةِ اَيَّام (چھ دن)

هُوَالَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ط (۴) الحدید

(وہ وہی ذاتِ اقدس ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں خلق کیا۔ پھر عرش پر غالب ہوا)۔

ایک متشکک نے جس کے دل میں وساوس پیدا ہوتے رہتے تھے کہا کہ کہیں تو قرآن کہتا ہے

"اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" (۸۲) یٰس (اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی شے کا ارادہ کیا تو کہہ دیتا ہے ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے) اور کہیں جگہ قرآن کریم میں یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ ان کو ہو جاؤ کہہ کر نہیں پیدا کیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی؟

مَیں نے کہا کہ قرآن میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ "اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ" میں رب العزت نے عالم امر کے متعلق فرمایا ہے نا کہ مادی عالم خلق کے لئے۔ دیکھو عالم دو ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے: "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" (۵۴) الاعراف (آگاہ ہو جاؤ اسی کے لئے خلق اور اسی کے لئے امر ہے)۔ عالم خلق سے مادی مخلوقات مراد ہیں اور عالم امر سے نوری مخلوق مراد ہے۔ یہاں "اَمْرُهٗ" (اس کے امر) سے وہ نور مراد ہے جو اول مخلوق ہے۔ جب کسی بندے کو وہ رب الانوار نور عطا فرماتا ہے تو حضرت عیسٰیؑ کے مانند اس کو صفات خالقیت عطا کر دیتا ہے۔ اس کو اس دنیا ہی میں جنت مل جاتی ہے کہ باذن اللہ جو چاہے وہ ہو جاتے۔ حضرت عیسٰیؑ کے لئے ارشاد ہے:-

اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴۹) آل عمران

(حضرت عیسٰیؑ کہتے ہیں) میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے واسطے مٹی سے ایک پرندے کی شکل خلق کروں گا۔ پھر اس میں پھونکوں گا (روح) پس وہ اللہ کے حکم سے پرندہ ہو جائے گا)۔

اور اللہ تعالیٰ حضرت عیسٰیؑ کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ اے عیسٰی ابن مریم ہماری نعمتوں کو یاد کرو۔ ان نعمات میں سے ایک یہ بھی ہے:-

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِىْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِىْ۔ الخ (۱۱۰) المائدہ۔

(اور جب تو خلق کرتا تھا پرندہ جیسی صورت میرے حکم سے پس پھونکتا تھا اس میں۔ پس میرے حکم سے وہ پرندہ ہو جاتا تھا)۔

ربّ الارباب جو نورالانوار ہے جب کسی بندے کے دل کو اس نور سے منور فرمادیتا ہے اور اس منزل پر پہنچا دیتا ہے "وَمَا يَشَآءُوْنَ إِلَّا مَا يَشَآءَ اللّٰهُ" (اور تم کچھ نہیں چاہتے مگر جو خدا چاہے) تو وہ باذن اللہ جو بھی چاہیں وہ اسی وقت ہو جائے گا۔ یہ ہی جنّت کی پست منزل ہے جس کے لئے ارشاد ہے: "لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ" (۱۶) الفرقان

حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

" میری اُمّت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کی طرح ہیں"۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سے علماء ہیں؟ کیا یہ علماء جو علوم قیاسی پڑھ کر عالم دین بن جاتے ہیں انبیاء بنی اسرائیل کی مثل ہو سکتے ہیں؟ بھلا کہاں وہ معجزنما انبیاء اور کہاں یہ کتابیں پڑھنے والا فقیہہ!!

ان علماء کا پتہ بھی ارشاداتِ نبوی میں ہی مِل سکتا ہے۔ دیکھئے حضورؐ کا ارشاد ہے "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِيْ" (سب سے پہلے جو اللہ نے خلق کیا وہ میرا نور ہے)۔ دوسرا ارشاد ہے "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الرُّوْح" (سب سے پہلے جو اللہ نے خلق کیا وہ رُوح ہے)۔ ایک اور حدیث ہے "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْعِلْم" (سب سے پہلے جو اللہ نے پیدا کیا وہ علم ہے)۔ ان احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلی مخلوق ایک نور ہے۔ اسی کا نام رُوح ہے اور وہی علم ہے۔ اَب کلام اللہ میں دیکھیں ارشاد ہے "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ" (تم سے رُوح کے متعلّق سوال کرتے ہیں۔ تم کہہ دو رُوح میرے رَب کے اَمر سے ہے) یعنی روح عالم اَمری نور سے ہے۔ لہٰذا یہی نورِ روح ہے، اسی کے لئے ارشاد ہے "اَلْعِلْمُ نُوْرٌ يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِيْ قَلْبِ مَنْ يَّشَآءُ" (علم تو وہ نور ہے جو اللہ ڈالتا ہے جس کے دل میں وہ چاہتا ہے)۔ اب تو واضح ہو گیا علماء اُمّتی سے مُراد وہ اولیاء اللہ اور صاحبانِ معرفت ہیں جن کے دل کو جناب رَبّ العزّت اس نور کی شعاعوں سے منوّر فرمادیتا ہے۔ یہ نورہی اَمراللہ ہے اور اس نور کی یہ شان ہے کہ جب کسی شے کا باذن اللہ ارادہ کرتا ہے وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

اب رہا چھ دن کا معاملہ تو یہ تمام آیات متشابہات ہیں۔ ان کے الفاظ سے جو ظاہری مفہوم سمجھ میں آتا ہے اس کو حقیقت نہیں سمجھنا چاہیئے۔ جناب باری تعالیٰ نے اپنے قانون بنائے ہوئے ہیں۔ تمام کائنات میں ان کے تحت عمل و ردِ عمل ہوتا رہتا ہے۔ یہی اس کے کام کہلاتے ہیں۔ یہاں چھ دن سے ہم کیا سمجھ سکتے ہیں؟ بجز محبوبِ خدا، منزلِ وحیِ کبریا کسی کی یہ مجال نہیں کہ یہ کہہ سکے کہ اس آیہ کا یہ مفہوم ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا یہ مفہوم بھی ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ ممکن ہے اس میں تفکر کرنے سے اللہ بقدر ظرف ہدایت فرمادے۔

دیکھئے! سورۃ النباء میں ارشاد ہے "وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا" (۱۱) النبأ (ہم نے دن کو کاروبار کا وقت قرار دیا)۔ تو زمین پر کاروبار کا وقت خلقتِ آدم سے لے کر زمین کے اختتام تک کا وقت ہے۔ ہوسکتا ہے اس کا یہ بھی مفہوم ہو کہ زمین پہ کاروبار کے جاری رہنے کے زمانہ سے چھ گنا وقت اس نظامِ شمسی کی خلقت پہ صرف ہوا ہو (یعنی گیس کے اجتماع سے قیامت تک کا وقت)' اور ہوسکتا ہے کہ دیگر عوالم کے لئے بھی یہی قانون ہو۔ حقیقت تو کوئی نہیں بتلاسکتا" فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ" (۱۴) المومنون

چھ دن کی پوری تفصیل انشاء اللہ باب چہارم میں آئے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزات کیوں نہ دکھلائے؟

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰۹) الانعام

(وہ بہ تاکید اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں اگر ان کے پاس کوئی معجزہ آئے تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ تم کہہ دو معجزات تو خدا ہی کے پاس ہیں اور تمہیں کیا معلوم کہ جب معجزہ بھی آئے گا تو ایمان نہ لائیں گے)۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۰) العنکبوت

(کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوتیں۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں)۔

یہ دو آیات پیش کر کے عیسائی علماء ہمیشہ سے اسلام کے خلاف جھوٹا اور غلط پروپیگنڈا کرتے رہے ہیں کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا جبکہ تمام انبیاء معجزات دکھلاتے رہے۔ درست ہے کہ تمام انبیاءِ سابقین معجزات دکھلاتے رہے مگر ان کا تعلق سطح زمین ہی سے تھا۔ سید الانبیاء نے ایسا معجزہ دکھلایا جس کا تعلق آسمان سے تھا کہ چاند کو ایک انگلی کے اشارے سے دو ٹکڑے کر دیا۔ یہ آیت دیکھئے:۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ② وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ③ القمر

(ساعت قریب آئی اور چاند شق ہو گیا (لوگ) جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور کہنے لگتے ہیں یہ تو بڑا زبردست جادو ہے۔ انہوں نے جھٹلایا اور اپنے ہوائے نفس کی پیروی کی۔ ہر کام کا وقت مقرر ہے)۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ حج کے زمانے میں چودھویں شب کو ایک یہودی کچھ مشرکین کے ساتھ حضرت رسول اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا تم اپنی نبوت کا کوئی صریح معجزہ دکھاؤ۔ آپ نے پوچھا تو کیا چاہتا ہے۔ کہنے لگا کہ اس چاند کے دو ٹکڑے کر دو تو جانوں۔ حضرتؐ نے دعا کی اور ایک انگلی کا اشارہ کیا۔ چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور تھوڑی دیر تک ایسا ہی رہا پھر مل گیا۔ یہ دیکھ کر ابو جہل اور مشرکین کہنے لگے محمدؐ نے نظر بندی کر دی ہے۔ یہاں سے جو لوگ باہر گئے ہوئے ہیں وہ آجائیں تو ان سے پوچھیں۔ جب لوگ واپس آئے اور ان سے بھی تصدیق ہو گئی تو ابو جہل بولا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ساری دنیا کی نظر بندی کر دی ہے۔ غیروں کی کیا شکایت جب بعض علماء بھی کہتے ہیں کہ چاند قیامت میں دو ٹکڑے ہو گا۔ حالانکہ قیامت سے شق ہونے کا کوئی تعلق نہیں اس وقت تو یہ دو نہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ بعض متشککین کہتے ہیں اگر ایسا معجزہ ہوتا تو تاریخ میں اس کا ذکر ہوتا اور دوسرے ممالک

کے لوگ بھی دیکھتے۔ حالانکہ تاریخ فرشتہ میں یہ ذکر بھی موجود ہے کہ ہندوستان میں ایک راجہ اور اس کے درباریوں نے اسی ہی ساعت میں چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ سخت متحیر تھے۔

پس جس طرح مشرکین مکہ نے اعتراض کیا اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہوئے اس کی تکذیب کی اسی طرح عیسائی علماء بھی تکذیب کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں، میں نے ایک انگریز پادری کی لکھی ہوئی کتاب (LIFE OF MOHAMMED) حیات محمدؐ دیکھی۔ اس میں جب معجزہ شق القمر کا ذکر شروع کیا تو لکھتا ہے (THE LEGEND RUNS THUS) کہ خیالی کہانی اس طرح ہے، آپ تصور کر سکتے ہیں کہ میرا کیا حال ہوا ہو گا۔ اس کتاب میں اس نے جگہ جگہ رسولؐ کی تکذیب و توہین کی ہے۔ میرے جسم میں رعشہ پڑ جاتا تھا تو کتاب بند کر کے رکھ دیتا تھا۔ سکون ہونے کے بعد پھر دیکھتا اور آگے پڑھتا اس لئے کہ یہ دیکھنا ضروری تھا کہ اس نے کیا لکھا ہے۔ اسی طرح دو دو تین تین صفحے کر کے مطالعہ کرتا رہا۔ ایک ہفتہ گزر گیا کہ واقعہ مباہلہ کا ذکر آ گیا۔ وہاں اس کو لکھنا پڑا کہ پنجتن پاک کے مقابل عیسائی علماء عاجز آ گئے، یہ لکھ کر اس نے اپنا خیال ظاہر کیا اور لکھا کہ عیسائی علماء نے بہت اچھا کیا کہ مباہلہ نہ کیا۔ یہ بھی لکھا کہ محمدؐ نے حق و باطل کے فیصلہ کا یہ ایک عجیب طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس تحریر کو پڑھ کر میرے آنسو جاری ہو گئے اور دل سے آواز آئی کہ قربان ان پنجتن پاک پر کہ تیرہ سو برس بعد بھی ایسے بدترین دشمن کے قلم سے حق لکھوا دیا۔

ہاں پیارے بھائیو! محمدؐ کے نام پر قربانی کے لئے تیار رہنے والو! ان عیسائی پادریوں کو پکار کر کہہ دو کہ تم جو معجزہ شق القمر کا انکار کر کے اسے جھوٹی کہانی بتلاتے ہو اور کہتے ہو کہ انبیاء سالقین نے تو معجزے دکھائے اور محمدؐ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا تو سن لو! ایسے ادنیٰ معجزے محمدؐ کی شایانِ شان نہ تھے جن کو تم انبیاء کے معجزے کہتے ہو وہ نبوت کا لازمہ تو ضرور ہیں مگر دلیل نبوت نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ مافوق العادت افعال تو نفس کے قوائے باطنی کی ترقی کر لینے پر بھی دکھلائے جا سکتے ہیں۔ یہ تو روحانیت کی بھی دلیل نہیں ہے۔ ایسے شعبدے اور کرشمے دکھانے کی طاقت کا تو، اوراد و وظائف کے مسلسل تکرار، کسی علوی یا سفلی عمل پر قابو پا لینے، قوتِ تخیل و تصور کو ترقی دے لینے، استدراج و نظر بندی سے بھی اظہار کیا

جاسکتا ہے۔ ایک ہپناٹائزر بھی لوگوں کو ایسے شعبدے دکھا سکتا ہے کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کام واقع ہو رہا ہے حالانکہ اصل میں وہ واقعہ نہیں ہو رہا ہوتا۔

۱۹۳۹ء میں جنگِ عظیم شروع ہونے سے کچھ ہفتے قبل ملتان میں ایک شخص امرتسر کا آ گیا۔ وہ ہپناٹزم کا عامل تھا۔ اس نے بہت سے عجیب کام دکھائے مثلاً دو آدمیوں کے ہاتھوں میں نہایت تیز چاقو دے دیئے اور ایک موٹے رسّے کو ان سے کٹوایا۔ سب نے دیکھا کہ رسّے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے۔ ان ٹکڑوں کو اس نے ایک خالی بوری میں ڈال دیا اور پھر صحیح وسالم رسّہ اس سے باہر نکال کر سب کو دکھلا دیا۔ شعبدے ختم ہونے کے بعد جو ہم نے اس سے دریافت کیا کہ اس کی حقیقت کیا ہے تو اس نے کہا: آپ لوگوں نے اصل میں رسّہ کاٹا ہی نہ تھا۔ وہ تو میرے تخیّل کی قوت تھی کہ آپ رسّے کو کٹتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

ہر اہلِ عقل وفہم یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسے کرشمے دکھانا تو روحانیت اور معرفت کی دلیل بھی نہیں، نہ کہ نبوّت کی۔ البتہ لازمۂ نبوّت ضرور ہے کہ نبی میں ایسی مافوق العادت چیزیں دکھانے کی قوت ہوتی ہے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ ایسے شعبدے دکھاتے پھریں۔ وہ تو فرماتے ہیں کہ میری اُمّت کے علمِ حقیقی کے عالم یعنی حاملانِ نور، صاحبانِ معرفت بنی اسرائیل کے انبیاء کی مثل ہیں۔ محمدؐ کے غلاموں کی شان کو یہ پادری صاحبان کیا سمجھ سکتے ہیں اُس کے غلاموں کی جوتیاں اُٹھانے والوں، اُس کے غلاموں کی چوکھٹ چومنے والوں کو ہی دیکھ لیں! کرامات تو جادو، نظر بندی، نفس کی باطنی قوتوں اور شیطانی طاقتوں سے بھی دکھائے جاسکتے ہیں مگر ایسے دکھانے والے زندگی ہی میں دکھا سکتے ہیں مرنے کے بعد ان کی کرامتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ محمدؐ کے غلاموں کی کفش پا سر پر رکھنے والوں کے مزاروں پر آکر دیکھ لیں کہ سیکڑوں برس ان کو دفن ہوئے گزر گئے مگر آج بھی وہاں ایک نہ ایک مخصوص کرامت کا اظہار ہو رہا ہے جو ان کی روحانیت کی کھلی دلیل ہے۔ ہند و پاکستان میں ایسے مزار موجود ہیں کہ ان پر کرامات کو انگریز حکام نے بھی تسلیم کیا ہے۔ یہ ہیں اولیاء اللہ محمدؐ عربی کے غلاموں کے ادنیٰ خادم۔

کیسے سمجھا جائے کہ قرآن خدا کا کلام ہے

ایک گھر کے بھیدی مسلمان نما دہریہ نے کہا کہ آپ نے قرآن کو خدا کا کلام صرف اس لئے مان لیا ہے کہ آپ کے آباء، آپ کا ماحول، آپ کے علماء اس کو خدا کا کلام کہتے تھے۔ بچپن سے سُنتے سُنتے ذہن میں نقش ہوگیا اور آپ نے لاشعوری میں غیر ارادی طور پر اس کو خدا کا کلام سمجھ لیا ہے حالانکہ اس کو کلام اللہ مان لینے پر ایک فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے عقلی دلیل تلاش کریں۔ بغیر واضح دلیل کے باپ دادا سے سُنے سُنائے عقائد کے، جو لاشعوری میں غیر ارادی طور پر ذہن نشین ہو جاتے ہیں، حق تسلیم کر لینے کو خود یہ قرآن ہی سُنّتِ مشرکین قرار دیتا ہے جیسا کہ قرآن میں کتنی جگہ مشرکین کا قول موجود ہے:
"وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا" (۱۰۴) المائدہ۔ (ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی دین پر پایا)۔ ان آیات کو دیکھنے کے بعد آپ کو لازم تھا کہ اس کے لئے برہان تلاش کرتے مگر ایسا نہیں کیا بلکہ باپ دادا کے عقائد کو بے چون و چرا حق سمجھ لیا۔ لہٰذا آپ لوگ اپنے اس قرآن کے کہنے کے مطابق سنّت مشرکین پر عامل ہیں۔

جواب: تمام دنیا میں کوئی فرد خواہ کسی قوم و نسل، کسی مذہب و ملّت سے تعلّق رکھتا ہو نیچر (فطرت) کو حق تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ فطرت ہی حق ہے۔ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جس میں چوں چرا کی گنجائش نہیں۔ یہی سُنّت اللہ ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتی، کبھی بدل نہیں سکتی جیسا کہ ارشاد ہے "لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا" (۶۲) الاحزاب (اللہ کی سُنّت کو تم کبھی بدلا ہوا نہ پاؤ گے)۔ اب آپ قوانینِ فطرت ہی پر نظر رکھیے اور بتلایئے کہ جب آپ غلّہ سے بھری سلی ہوئی بوری خریدنا چاہتے ہیں تو کس طرح جانچتے ہیں کہ بوری کے اندر کیسا غلّہ ہے؟ ذرا تفصیل سے بتلایئے!

کہنے لگے، کہ ایک نوکدار گاؤدم خول والے سرے کا سوجا ہوتا ہے۔ اس کو چار پانچ یا زیادہ سے زیادہ چھ سات جگہ بوری میں گھسا کر باہر نکال لیتے ہیں۔ ہر مرتبہ اس میں تھوڑا سا غلّہ باہر نکلتا ہے۔ اس طرح غلّہ کی حالت اور اس کی قسم کا ٹھیک پتہ چل جاتا ہے۔

میں نے کہا یہی فطری طریقہ ہمارے آپ کے درمیان اس کتاب کے جانچنے کا بھی متفق علیہ طریقہ ہونا چاہیئے کہ متفرق مقامات سے چھ سات آیتیں لے لیں اوران کو فطرت کی کسوٹی پر جانچ لیں۔ تمام کتاب کا جانچنا تو ممکن ہی نہیں۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ آیات حقیقتاً کلام الٰہی ہیں تو ثابت ہو جائے گا کہ پوری کتاب ہی کلام اللہ ہے! اس پر وہ حیران ہوئے اور کہنے لگے یہ آپ کیسے ثابت کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا دیکھئے ابھی ثابت ہو جائے گا۔

اچھا دیکھئے ایک بچہ خواہ وہ چرندہ ہو کہ پرندہ، دریائی جانور کا ہو یا صحرائی کا جو کچھ وہ جانتا ہے پیدا ہوتا ہے اور بغیر کسی سے سیکھے جانتا ہے یا یہ کہ پیدا ہونے کے بعد بغیر کسی کے سکھلائے پڑھائے جو علم اس کے شعور میں آتا ہے وہ کس کا ڈالا ہوا ہے؟ آپ خدا کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں یہ تو آپ کو کہنا پڑے گا کہ وہ اس کے خالق کا سکھایا ہوا ہے یعنی وہ خالق کا کلام ہے۔ آپ خواہ اس کو نیچر کہیں۔ کہنے لگے ہاں یہ درست ہے۔

میں نے کہا بس اِدھر اُدھر سے چھ سات آیات لے کر دیکھ لیں اور غور کر لیں کہ ہر بچہ خواہ کسی قوم و نسل کا ہو، کسی مذہب و ملت میں پیدا ہوا ہو ان آیات کا مفہوم جانتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہر بچہ اس کو بغیر کسی کے سکھائے پڑھائے جانتا ہے تو یقیناً وہ خالق کا پڑھایا ہوا علم اور اس کا کلام ہے۔ مندرجہ ذیل مثالوں پر غور فرمایئے:۔

(۱) ہر بچہ روتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ پھر مسکرانے اور ہنسنے بھی لگتا ہے۔ کیا یہ رونا ہنسنا وہ کسی سے سیکھتا ہے؟ نہیں بلکہ وہ تو یہ سبق پڑھا ہوا آیا ہے۔ اب کلام اللہ میں نظر کریں "وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى" (۴۳) النجم۔ (اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور رلاتا ہے)۔

(۲) ہر بچہ کی خواہش ہوتی ہے جو میں چاہوں فوراً ہو جائے۔ وہ بڑا جلد باز ہوتا ہے۔ اب قرآن دیکھیں۔ "وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا" (۱۱) الاسراء (انسان بڑا جلد باز ہے)۔

(۳) بچہ کو جس وقت سے انانیت کا شعور ہوتا ہے اور وہ جان لیتا ہے کہ میں بھی اس دنیا کی سب چیزوں سے جدا ایک وجود ہوں تو خواہش بقا شعور میں آتی ہے اور وہ چاہتا ہے

میں ہمیشہ باقی رہوں۔ لہٰذا ہلاکت اور فنا ہونے سے ڈرتا ہے۔ اس کی فطرت اس کو بتلاتی ہے کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالنا۔ کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ ہلاکت سے ڈرنا اس کو کوئی اور سکھلاتا یا بتلاتا ہے۔ نہیں، وہ تو خود ہی جانتا ہے۔ یہ تو وہ پڑھ کر آیا ہے لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّہْلُکَۃِ (۱۹۵) البقرۃ (اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔

(۴) ہر شخص بغیر اس کے کہ کوئی اس کو بتلائے یہ جانتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی بات کی طرف توجہ نہ کرے تو وہ کوئی بات مان ہی نہیں سکتا۔ کہیئے، کیا آپ کو یہ بات کسی سے سیکھنے کی ضرورت ہوئی؟ بولے، نہیں۔ یہ نفسِ انسان خود ہی جانتا ہے۔ میں نے کہا اب قرآن دیکھیے: "اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ ءَاَنْذَرْتَہُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ" (۶) البقرۃ۔ (جو لوگ روگرداں ہیں (یعنی توجہ نہیں کرتے) ان کے لئے برابر ہے خواہ تم ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہ لائیں گے (یعنی کوئی بات نہ مانیں گے)۔

(۵) ہر شخص خواہ کسی ملک کا، کسی نسل کا ہو یہ جانتا ہے یا نہیں کہ آباء و اجداد کے خیالات و عقائد لاشعوری میں غیر ارادی طور پر ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور جس فضا میں وہ تربیت پاتا ہے اس کے رسم و رواج وغیرہ اس کو محبوب ہو جاتے ہیں، ان پر وہ تنقید نہیں کر سکتا۔ ان کے خلاف کچھ سننا بھی گوارا نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ ان ہی کی پیروی کرتا ہے اور یہ اس کو کوئی پڑھاتا سکھاتا نہیں۔ اب قرآن دیکھ لیجیے "وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا کَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ" (۷۴) الشعراء۔ (ہم نے اپنے آباء کو اسی طرح کرتے پایا)۔ "بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا" (۱۷۰) البقرۃ۔ (بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے آباء کو پایا)۔ اسی مضمون کی بہت سی آیات قرآن میں موجود ہیں۔

(۶) آپ جانتے ہیں بغیر اس کے کہ کسی نے آپ کو سکھایا پڑھایا ہو جب نفس میں کوئی خواہش شدید پیدا ہوتی ہے یا کوئی خیال ذہن میں قائم ہو جاتا ہے کہ یوں کروں گا اور یوں کروں گا تو ایسا ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں انسان نہ کسی کی فہمائش کا اثر لیتا ہے اور نہ ہی کسی کی بات سنتا ہے۔ وہ دوسروں کو ناکام ہوتے دیکھ کر بھی ایسا ہی رہتا ہے گویا اس نے دیکھا ہی نہیں۔ ایک تخیلِ ذہنی سے اس طرح اس کے کانوں پر مُہر ہو جاتی ہے

کہ کسی کی بات ہی نہیں سنتا۔ دل پر مہر ہو جاتی ہے کہ کچھ نہیں سمجھتا اور آنکھوں پہ پردہ پڑ جاتا ہے کہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتا۔ یہ آپ بغیر کسی کے سکھائے جانتے ہیں یا نہیں؟ بولے ہاں جانتا ہوں۔ میں نے کہا اب قرآن دیکھئے "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" (۷) البقرة۔ (اللہ نے مُہر کردی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے)۔

(۷) آپ جانتے ہیں، دُنیا کا ہر فرد جانتا ہے اور بغیر کسی کے سکھائے پڑھائے جانتا ہے کہ اگر وہ کسی کو بُرا کہے یا کسی سے بدسلوکی کرے تو وہ ایسے کاموں سے دوسروں کو منع نہیں کرسکتا۔ خود تو گالیاں دے اور دوسروں سے کہے بھائیو گالی نہیں دینی چاہیئے۔ یہ بہت بُرا کام ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ بے عقلی کا کام ہوگا۔ لوگ اس کا مضحکہ اُڑائیں گے کہ خود جو کام کرتا ہے اسی سے دوسروں کو روکنا چاہتا ہے۔ یہ کیسا بے عقل ہے۔ اب قرآن دیکھئے: "اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ" (۴۴) البقرة۔ (کیا تم دوسروں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھلائے ہوئے ہو اور تم کتاب (فطرت) کا مطالعہ بھی کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے)۔

(۸) دُنیا کا ہر فرد جانتا ہے اور بغیر کسی سے سیکھے پڑھے جانتا ہے کہ اس کے نفس میں مال و دولت سامان عیش و عشرت کی ایسی طلب ہوتی ہے کہ کسی طرح بھی اسکی تسکین نہیں ہوتی۔ جتنا مال و دولت بڑھتا جاتا ہے ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے حتّٰی کہ موت تک بھی سیری نہیں ہوتی۔ اب آپ قرآن دیکھئے: "اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" (۱-۲) التکاثر۔ (تمہیں تو بڑھوتری کی چاہ نے ہی غفلت میں رکھا یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملے)۔ ہوس کسی طرح پوری نہ ہوئی اور ہوس ہی ہوس میں زندگی ختم ہوگئی۔

کہاں تک دکھایا جائے۔ کیا یہی کافی نہیں؟ آپ تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ کتاب فطرت ہے اور فاطرِ فطرت کا کلام ہے۔ آپ نیچر کو خالق سمجھتے ہیں تو یہ نیچر کا کلام ہے۔

ہم خدا کو خالق جانتے ہیں اس کو خدا کا کلام مانتے ہیں۔ یہ سن کر شرمندہ ہوئے۔

قرآن سب سے بڑا معجزہ ہے

قرآن کا ایک دعویٰ تھا کہ تمام جن و انس مل کر بھی اس قرآن کی مثل کتاب نہیں لا سکتے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ بنی اسرائیل

(کہہ دو کہ اگر سارے انسان اور جنات جمع ہو جائیں اس پر کہ وہ اس قرآن کی مثل لا دیں تو وہ نہ لا سکیں گے اس کی مثل۔ اگرچہ ان میں سے بعض بعض کی مدد کریں)۔

اس کے بعد اس میں تخفیف کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم دس سورے ہی ایسے بنا لاؤ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ ہود

(کیا یہ کہتے ہیں اس نے اپنی طرف سے بنا لیا ہے۔ تم کہہ دو کہ تم لوگ ایسے دس سورے ہی اپنی طرف سے بنا لاؤ جو اس کی مثل ہوں اور بُلا لو جس کو بھی بُلا سکو (مدد کے لئے) اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو)۔

اس کے بعد مزید تخفیف کہ دس سورے تو کیا لاؤ گے تم ایسا ایک سورہ ہی بنا لو۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ البقرۃ

(اگر تم لوگ شک میں ہو اس میں جو نازل کیا ہم نے اپنے بندے پر پس تم ایک ہی سورہ اس کی مثل لے آؤ۔ اور خدا کے غیر جو تمہارے گواہ ہوں ان کو بھی لے آؤ۔ اگر تم سچے ہو)۔

اس کے بعد پھر اور مزید تخفیف کر دی جاتی ہے کہ بھلا تم ایک سورہ تو کیا لاؤ گے۔ تم ایسا ایک فقرہ ہی لے آؤ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾ الطور

(کیا وہ کہتے ہیں اس نے خود بنالیا ہے بلکہ یہ ایمان نہیں لاتے تو پھر ایسی ایک بات یہ بھی بنالادیں اگر یہ سچے ہیں)۔

آیاتِ مذکورہ بالا میں پہلے کہا کہ تم اس کی مثل نہیں لاسکتے۔ پھر کہا گیا ہے کہ دس سورے ہی ایسے لے آؤ۔ اس کے بعد کہا کہ ایک سورہ ہی ایسا بنالاؤ۔ پھر دعوت دی چلو ایک بات یا ایک فقرہ ہی اس کی مثل لے آؤ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا اہل عالم کے لئے یہ ممکن ہے یا نہیں؟

ایک شخص نے جس کو وساوس نے گھیر رکھا تھا، ایک روز کہا کہ بھائی صاحب جب میں نے ایک عالم صاحب سے دریافت کیا اس امر کا ثبوت کیا ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، تو انھوں نے فرمایا، اس کی فصاحت و بلاغت اس کی دلیل ہے۔ آج تک اس کی مثل کوئی کلام نہ بنا سکا حالانکہ قرآن چودہ سو برس سے یہ دعویٰ کر رہا ہے اگر تم کو اسکے اللہ کا کلام ہونے میں شک ہو تو اس کی مثل ایک سورہ ہی بنالاؤ۔ اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ تمام دنیا ایسا فصیح و بلیغ کلام پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اس بات کے سننے سے وساوس کچھ اور بڑھ گئے کہ یہ تو کوئی مضبوط دلیل نہ ہوئی۔ اس لئے کہ ہر ملک میں بہت سے فصحا ایسے گزرے ہیں کہ ان کے کلام و تصانیف کی مثل ان کے بعد آج تک کوئی نہ لکھ سکا۔ میں کیا کروں ہر چند چاہتا ہوں یہ خیالات نہ آئیں مگر یہ تصور خبیث باز نہیں آتا۔ وساوس دل میں ڈالتا رہتا ہے۔ اس عذاب سے اللہ مجھے نجات دلائے۔

میں نے کہا، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ وساوس بھی ایک حد تک درست ہیں۔ ٹھیک ہے محض فصاحت میں لاجواب ہونا اس کے معجزہ ہونے کی دلیل نہیں قرآن کا معجزہ ہونا ان شاء اللہ العزیز آپ خود دیکھ لیں گے۔ قرآن نے صرف یہی نہیں کہا کہ تم ایک سورہ ہی اس کی مثل لے آؤ بلکہ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ تم اس کی مثل ایک جملہ ہی لے آؤ۔ اس کے متعلق ایک دہریہ نے بڑا سخت اعتراض پیش کیا تھا پہلے میں وہ تحریر آپ کو سناتا ہوں۔ لیجئے سنئیے!

"آپ کے رسول عاقل و دوربین تو ضرور تھے اس کے تو ہم قائل ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ بنی ہاشم افصح العرب ہیں اور میں ان میں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔ عرب کو متحد کر کے

ایک طاقتور قوم بنانے کا منصوبہ بغیر اس کے کامیاب نہیں ہو سکتا تھا جب تک مافوق الفطرت طاقت سے تعلق ظاہر نہ کیا جائے۔ لہٰذا یہ دعویٰ کر دیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ جانتے تھے کہ اگر ناکام رہے تب بھی اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا اور اگر کامیاب ہو گئے تو دیگر اقوام کے میل جول سے زبان فصاحت سے ضرور گر جائے گی۔ چنانچہ اس کلام کی مثل و نظیر لانا کسی وقت بھی ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس خیال پر بنا کر کے یہ بھی دعویٰ کر دیا کہ اگر تم کو اس کے خدا کا کلام ہونے میں شک ہو تو ایک سورہ ہی اس کی مثل بنا لاؤ۔ اور تم کیا اگر تمام انس وجن بھی مل کر کوشش کریں گے ہرگز اس کی مثل نہ لا سکیں گے۔ پس اگر فصاحت میں بے مثل و بے نظیر ہونا ہی خدا کا کلام ہونے کی دلیل ہو تو ہر ملک میں ایسے فصحا گزرے ہیں کہ آج تک ان کے بعد کوئی شخص ان کے کلام کی مثل و نظیر نہ لا سکا۔ مثلاً انگریزی میں شیکسپیئر، مرثیہ میں انیس، غزل میں میر، تو کیا یہ سب خدا کا کلام کہے جا سکتے ہیں؟ پس اگر فصاحت میں بے مثل و بے نظیر ہونا ہی خدا کا کلام ہونے کی دلیل ہے تو کیا اگر یہ لوگ بھی اپنے کلام کو خدا کا کلام ہونے کا دعویٰ کرتے تو آپ تسلیم کر لیتے؟ ۔ یہ بھی عجیب عقیدہ ہے کہ آپ کے اللہ میاں منہ بھی رکھتے ہیں جس سے کلام ہوتا ہے؟"

اس اعتراض کی وجہ سے کافی غور و خوض کرنا پڑا۔ بارگاہِ رب العزت میں سرِ نیاز جھکا کر عرض کی کہ مولا مدد کر! تائید ایزدی سے اس کا جواب مل گیا۔ اگر مخالف کی طرف سے ایسا اعتراض نہ ہوا ہوتا تو کلام اقدس کی یہ عظمت آشکار نہ ہوتی۔ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

(اگر خدا چاہے تو دشمن بھی بھلائی کا سبب ہو جاتا ہے)۔ لیجیے سورۂ بقر کے تیسرے رکوع کی ایک آیت دیکھتے ہیں:-

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ البقرۃ

راور ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل بجالائے خوشخبری سنادو کہ ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ جب بھی ان کو کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا کہیں گے یہی تو وہ ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا تھا حالانکہ وہ ظاہراً مشابہ ہوگا اور ان کے لئے اس میں پاک و پاکیزہ بیویاں ہیں۔ اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے)۔

یہ ایک آیت ہے اِس کو بچّے کو سُنائیں کہ جنت میں باغ ہیں، نہریں ہیں، ہر قسم کے پھل ہیں۔ دیکھنے میں ایک جیسے بھی ہوں تو ان کے ذائقے کئی کئی طرح کے ہوں گے اور بڑی خوبصورت عورتیں بچّوں کو گودی میں کھلانے والی ہوں گی۔ دیکھئے بچّے پر اس کا اثر ہوتا ہے یا نہیں۔؟

یہی آیت اور یہی اس کے معنی جوان کو سُنائیں۔ وہاں نہایت حسین سیاہ چشم کئی کئی بیویاں ایک ایک شخص کو ملیں گی اور وہاں ہمیشہ ہمیشہ جوانی برقرار رہے گی۔ دیکھئے جوان متاثر ہوتا ہے یا نہیں۔؟

اب اسی آیت کو ایک واقفِ اسرار جس کو کچھ علم حقیقی مل گیا ہے، پڑھتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ باغوں اور نہروں سے اشجارِ نوری اور علم کی نہریں مراد ہیں۔ وہاں اشجارِ نوری سے علم کے پھل ملیں گے۔ پاک و پاکیزہ ساتھی حاملانِ نور ہمراہ ہوں گے۔ اس کا دل لرزتا ہے اور اس منزل کے حصول کا شوق اُسے زیادہ ہو جاتا ہے۔

یہ ایک آیت تین مختلف کیفیاتِ نفسی کے لئے ہر کیفیت کے مطابق علیحدہ مفہوم رکھتی ہے۔ ایسی بے شمار آیات کلام پاک میں موجود ہیں جو مختلف کیفیات نفسی کے لئے ہر کیفیت کے مطابق جداگانہ مفہوم رکھتی ہیں اس کے اظہار کے لئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔ یہاں صرف ایک آیت ہی پیش کر دینا کافی ہوگا جو نہایت مختصر ہے اور بہت کثیر مفاہیم پر دلالت کرتی ہے:۔

" اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ "۔ یہ سورۃ فاتحہ کی ایک چھوٹی سی آیت ہے اور اس میں صرف تین کلمے ہیں۔ ان تین الفاظ کا اعجاز دیکھئے کہ کس قدر مختلف مطالب پر دلالت کرتے ہیں۔

تبیئے، پہلے ان تین الفاظ کے مفاہیم و معانی دیکھیں۔" اِھدِنَا (ہدایت کر ہم کو)۔ ہدایت کے دو معنی ہیں (۱) راستہ دکھانا (۲) مقصد تک پہنچانا۔ راستہ دکھانے کی بھی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی، راستہ بتادیا یعنی نشاندہی کردیا کہ یہ راستہ فلاں مقام تک جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ساتھ چل کر راستہ دکھانا جس سے مُراد ہے" راہ پر چلانا"۔ اَب ایک کلمہ "اِھدِنَا" کے تین مفہوم ہوئے (i) راستہ بتادے ہمیں (ii) راستے پر چلا ہم کو (iii) جہاں جانا چاہتے ہیں وہاں ہم کو پہنچادے۔ ان میں سے پہلی اور دوسری صورت کی ہدایت تو انبیاء و مرسلین ہادیانِ دین کا کام ہے مگر تیسری صورت مقصودِ منتہٰی تک پہنچانا یہ ہدایت خدا کی طرف ہی سے ہوسکتی ہے، اور جو ہدایت خدا کی طرف سے ہو اس کے لئے کلام پاک میں ارشادِ باری ہے۔ "وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۝ (۳۷) الزمر ـــ (اور جس کو اللہ ہدایت کرے یعنی مقصد تک پہنچادے اسے پھر کوئی گمراہ کرنے والا نہیں)۔ یعنی جس کو اللہ مقصود تک پہنچادے پھر اس منزل سے کوئی اسکو ہٹا نہیں سکتا بلکہ اس کو استقرار حاصل ہو جائے گا اور وہ اسی منزلت پر قائم رہے گا۔

اس طرح ایک کلمہ "اِھدِنَا" کے چار معنی ہو جاتے ہیں۔ (۱) راستہ بتادے ہمیں (۲) راستہ پر چلا ہمیں (۳) منزلِ مقصود تک ہمیں پہنچادے (۴) اس منزل پہ ہمیں قائم رکھ۔

اَب ان دو کلمات" صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کو ملا کر دیکھئے کہ انکے کتنے مطالب ہوتے ہیں:۔

① دُنیا میں ایک جگہ سے دُوسری جگہ جانے کا راستہ جو سیدھا ہو، جس میں گھوم پھیر نہ ہو۔ اچھی طرح سمجھ میں آسکے۔

② خطِ مستقیم دو نقطوں کے درمیان چھوٹے سے چھوٹا فاصلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا مفہوم ہوا چھوٹے سے چھوٹا راستہ جس سے جلد سے جلد منزلِ مقصود پر پہنچ سکیں۔

③ صراطِ مستقیم سے وہ راہ مراد ہے جو معتدل ہو۔ عدلِ کُلّی پر قائم ہو۔ یعنی انسان کے اعمال میں افراط و تفریط نہ ہو۔ ہر کام ادائے فریضۂ فطری کے لئے ہو۔ لاشعوری میں غیر ارادی طور پر کوئی حرکت و سکون صادر نہ ہو۔ یہ بھی صراطِ مستقیم کا ایک مفہوم ہے۔

④ جو شخص کسی صفت میں کمال حاصل کر لیتا ہے وہ اس صفت سے کبھی نامزد بھی ہوجاتا

ہے۔ مثلاً ایک شخص جو انتہا کا نیک ہو اس کو بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو مجسم نیکی ہے۔ بہت ایثار کرنے والے کو کہتے ہیں کہ وہ تو مجسم ایثار ہے۔ اسی طرح خدا کے وہ اولیاء کامل جو صاحبانِ معرفتِ کامل ہوتے ہیں ان سے ذرا سی بھی بے اعتدالی نہیں ہوتی۔ وہ اعتدال مجسم ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ خود ہی صراط مستقیم کہلانے کے مستحق ہوجاتے ہیں۔

مختلف کیفیاتِ نفسی کے لئے بھی اس آیت کے مطالب ملاحظہ فرمائیں:۔

ا۔ ایک شخص سنتا ہے کہ فلاں شہر نہایت پر فضا اور صحت افزا ہے۔ وہاں کاروبار، مزدوری، ملازمت وغیرہ کی بہتات ہے۔ اس کو وہاں جانے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور بارگاہِ احدیت میں دعا کرتا ہے:

① "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" اے رب میں جہاں جانا چاہتا ہوں وہاں پہنچنے کا صحیح راستہ مجھے معلوم ہوجائے۔ دعا کرتا رہتا ہے، لوگوں سے راستہ کی تفصیل معلوم کرتا ہے جب اس سفر کی پوری تفصیل معلوم ہوجاتی ہے تو خواہش ہوتی ہے کہ راستے پر پڑ جاؤں سفر شروع کرسکوں۔ تو کہتا ہے:

② "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" ربا مجھے راستہ پر پہنچادے یعنی اتنی توفیق عطا فرما اور اسباب مہیا کردے کہ سفر شروع کرسکوں۔

جب سفر شروع کیا راستے پر پڑ لیا تو صعوباتِ سفر سے گھبرا کر بارگاہ ربّ العزت میں دعا کرتا ہے۔

③ "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" اے رب مجھے راستہ پر چلاتا رہ، اتنی قوت و طاقت عطا فرما کہ اس راستہ پر چلتا رہوں اور یہ سفر جاری رکھوں۔

جتنا راستہ طے ہوتا جاتا ہے منزل کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔ اور مالک سے عرض کرتا ہے:

④ "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" پیارے مولا مجھے منزلِ مقصود تک پہنچادے۔

جب منزل پر پہنچ جاتا ہے اور مقصد میں کامیابی ہوجاتی ہے تو اس بارونق، آرام دہ، صحت افزا مقام پر مستقل قیام کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ یہیں زندگی گزار دوں

تو بارگاہِ رب العزت میں عرض کرتا ہے:

⑤ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" پیارے مالک مجھے اسی مقام پر قائم و برقرار رکھنا تاکہ میں یہاں مستقل قیام کر سکوں۔

یہ تو ہوئے دنیا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک چلنے کے لئے ہر کیفیتِ نفسی کیلئے علیحدہ علیحدہ اسی کیفیت کی مناسبت سے پانچ مطالب۔

۲ ۔ ایک شخص کو اپنے آبائی مذہب کی حقانیت پر شک ہو جاتا ہے۔ وہ مالک سے استدعا کرتا ہے:

① "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" ربا مجھے سیدھے راستہ کی ہدایت کر یعنی مجھے پتہ چل جائے کہ کونسا مذہب حق ہے۔

تلاش کرتا ہے، مختلف مذاہب کی کتب کا مطالعہ کرتا ہے۔ دلائل و براہین سے اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ فلاں مذہب حق ہے۔ اس کو اضطرار ہوتا ہے، عقل و نفس میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ آبائی مذہب کی محبت جوش مارتی ہے۔ نفس کہتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے اتنے بڑے بڑے جید علماء عقلاء و فلاسفر حق کو نہ پہچانتے تھے؟ اس حالتِ اضطرار میں دعا کرتا ہے:

② "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" مجھے سیدھے راستہ پر پہنچا دے۔ یعنی مجھے توفیق عطا فرما کہ میرا نفس حق کو قبول کر لے۔ میں تیرے سیدھے راستے پر پہنچ سکوں اور مذہب حق قبول کر سکوں۔

چنانچہ وہ جس مذہب کو حق سمجھتا ہے اس کو قبول کر لیتا ہے۔ جب سیدھے راستے پر پہنچ جاتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس پر چل سکوں یعنی مذہب کے بتلائے ہوئے اعمال بجا لا سکوں تو بارگاہِ ایزدی میں عرض کرتا ہے

③ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" اے رب مجھے حق راہ پر چلا۔ یعنی توفیق و تائید عطا فرما کہ مذہبِ حق کے احکام بجا لا سکوں۔ ان پر پوری طرح عمل کر سکوں۔

جب احکام مذہب پر عمل کرنے لگا اور کچھ سکون ہوا تو اندیشہ ہوا کہیں ان شکوک و وساوس سے جو سابقہ مذہب والے اس کے ذہن میں نئے مذہب کے خلاف ڈالنا چاہتے

ہیں اور ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، مشکوک نہ ہو جاؤں تو عرض کرتا ہے:

④ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اے مولا مجھے راہِ حق پر قائم رکھ، یعنی اے میرے مالک جو وساوس و شکوک لوگ میرے دل میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ان سے مجھے محفوظ رکھ کہ میرے دل پر ان کا اثر نہ ہو تاکہ میں راہِ حق پر قائم رہوں۔

جب پورا اطمینان ہو جاتا ہے اور شکوک و وساوس سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اعمالِ خیر بجا لاتا ہے تو مذہب کے مقصد کے حصول کی طلب ہوتی ہے۔ اب حبُ اللہ، معیت اللہ کا طالب ہوتا ہے، معرفت طلب کرتا ہے تو بارگاہِ احدیت میں عرض کرتا ہے:

⑤ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اے رب مجھے مذہب کے مقصد تک پہنچا اور اپنی معرفت اور معیت عطا فرما۔

۳۔ اب طالبین کے لئے دیکھیں: آپ پوچھیں گے کہ طالبین کون ہوتے ہیں؟ طالب اس کو کہتے ہیں جو بمصداق فرمانِ باری "وَيَهْدِيْ إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ" (اللہ اپنی طرف اسی کو ہدایت کرتا ہے جس کو رغبت ہو یا طلب ہو) یعنی مالک کی بارگاہ تک پہنچنے کی طلب ہو۔ پس جس کو اس کا علم ہو کہ صراط مستقیم سے اعتدالِ کلّی مراد ہے یعنی انسان اپنے ہر جذبہ اور خواہش کو اس کے مقصدِ اصلی کے لئے استعمال کرے، قوانینِ فطرت کے عین مطابق عمل کرے ان سے سرِ مو تجاوز نہ کرے یہاں تک کوئی حرکت و سکون غیر ارادی طور پر غفلت و لاشعوری میں صادر نہ ہو تو اس کو اس کی طلب پیدا ہو جاتی ہے اور بارگاہِ ایزدی میں استدعا کرتا ہے:

① "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اے رب مجھے صراط مستقیم دکھا دے یعنی یہ احساس عطا فرما کہ میں اپنے حرکات و سکنات میں تمیز کر سکوں کہ یہ حرکت غیر ارادی اور غیر ضروری تھی، فریضۂ فطری کی ادائیگی نہ تھی، اور یہ حرکت ضروری اور فریضۂ فطری کی ادائیگی کے لئے ہوئی۔

جب برسوں کی ریاضت سے اس کا احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ حرکت میری غیر ارادی تھی اور یہ حرکت ضروری اور فریضۂ فطری تھی تو اس احساس کے بعد اب دُعا کرتا ہے:

(۲) "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اے رب مجھے صراط مستقیم پر چلا یعنی اس امر کی توفیق عطا کر کہ ان غیر ارادی اور لاشعوری حرکات سے نفس امّارہ کو باز رکھ سکوں۔

پھر اس اہلیت کے پیدا ہو جانے پر کہ نفسِ امّارہ کو افعالِ غیر ارادی اور اعمالِ لاشعوری سے روکنے لگے تو چاہتا ہے کہ یہ کیفیت برقرار رہے۔ کہیں پھر غفلت طاری نہ ہو جائے تو دُعا کرتا ہے:

(۳) اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ"۔ اے رب مجھے اس ارادہ پر قائم رکھ۔ اپنی نصرت و تائید سے اس پر چلتے رہنے کی قوّت عطا فرما

اس منزل پر پہنچ کر وہ صرف طالب ہی نہیں رہتا بلکہ سالک ہو جاتا ہے یعنی راہِ حق پر چلنے والا بن جاتا ہے تو طلب ہوتی ہے کہ معرفت حاصل ہو۔ اس وقت عالم نور کے مشاہدے کی طلب ہوتی ہے اور بارگاہِ ربُ العزّت میں عرض کرتا ہے:

(۴) "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" ربّا مجھے مقصد تک پہنچا۔ یعنی عالمِ نور، عالمِ غیب کا ادراک عطا فرما!

عالمِ غیب کا جب ادراک ہو جاتا ہے اور عالمِ نُور کا مشاہدہ کر لیتا ہے، چشمِ بصیرت وا ہو جاتی ہیں تب معرفت کی ابتدائی منزل میں داخل ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کیفیت کو استقرار ہو جائے، یہ قائم رہ سکے تو عرض کرتا ہے:

(۵) "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ"، ربّا مجھے راہِ راست پر قائم رکھ! اس کیفیت کو استقرار عطا فرما کہ یہ زائل نہ ہو جائے!!۔

اس سے بلند تر منزل عارفین کی ہے۔ اگر اس کو بھی لکھا جائے تو پانچ مدارج اس کے بھی ہوں گے! اس طرح بیس مدارج ہو جائیں گے مگر ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کیا یہ پندرہ مدارج ہی کافی نہیں ہیں؟ کیا یہی معجزہ کچھ کم ہے کہ تین مختصر الفاظ کا ایک کلمہ اور پندرہ مختلف کیفیاتِ نفسی کے لئے ہر درجہ کیفیت پر حاوی؟ ہر کیفیت کیلئے اسی کی مناسبت کے مطابق علیحدہ علیحدہ مفہوم۔

قارئین! تمام وضاحت میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی تعلّی یا فضول تاویل شامل نہیں ہے۔

مسلمانو! پیارے بھائیو! تمام دُنیا کے عقلاء، فلاسفروں اور علماء سے کہہ دو، یورپ و امریکہ کو چیلنج دے دو، چین و جاپان والوں کو پکارو، افریقہ اور آسٹریلیا والوں سے کہو کہ وہ اپنے اپنے علماء اور فلاسفروں کو جمع کرکے قرآن کے اس دعوے کے مقابلے میں اگر جواب لا سکتے ہیں تو لائیں!! فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ (ایک فقرہ ہی اس کی مثل لے آویں) ایک فقرہ اور پندرہ مفاہیم کی مثل کہاں سے لا سکتے ہیں؟ ان سے کہو کہ یہ سب باہم مل کر ایک فقرہ ہی ایسا لائیں جو دو درجوں کے طالبانِ علم کے لئے ہر درجہ کے طلبہ کی اہلیت کے مطابق دو جداگانہ مفہوم پر مشتمل ہو۔

دیکھا آپ نے یہ ہے خدا کے کلام کا معجزہ۔ تمام انبیاء سابقین کے معجزات وقتی تھے، گزر گئے۔ سید الانبیاء والمرسلین کا یہ معجزہ زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا اور پکارتا رہے گا۔ "فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ" اس کی مثل ایک فقرہ ہی لے آویں!!

فَسُبْحَانَ اللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ تَبَارَكَ اللهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ وَصَلَّى اللهُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ ٥

بابِ سوم

احساسِ غیب

(۱) نفسِ انسان کے لئے غیر محسوس کی طرف توجّہ کرنا محال ہے
پھر اس کی توجہ کیسے دلائی جائے؟

(۲) فطرتِ نفس فلسفہ مذہب۔ میرے مذہب کا جذبہ

(۳) امیر علی ٹھگ کے بیان کا انتساب

(۴) یقین۔ ایقان۔ یوقنون

(۵) مدارج یقین

(۶) شعورِ باطن

(۷) جہنّم اور اس کا عذاب

(۸) دہریوں کے اعتراضات اور ان کے جوابات

(۹) جہنّم کے متعلق دہریوں و مشککین کے اعتراضات

احساسِ غیب

یہ امر تو ابوابِ سابق میں واضح ہو چکا ہے کہ نفسِ انسان کو محسوسات کے سوائے کسی شئے کا احساس نہیں ہو سکتا۔ اور مذہب کا تعلق تمام کا تمام عالمِ غیب سے ہے جو مطلقاً غیر محسوس ہے اور فطرتِ نفس یہ ہے کہ اس کی توجہ، مہیّج خارجی سے متاثر ہونے کے بعد محض محسوس کی طرف ہی ہوتی ہے۔ جب غیر محسوس کی طرف اس کا توجہ کرنا محال ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر نفسِ انسان کو اس عالمِ غیر محسوس یا مذہب کی طرف کیسے بُلایا جائے اور اس غیر مرئی عالم کی طرف کیسے راغب کیا جائے؟ اس کے لئے قرآنِ حکیم کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔ اگر قرآنِ حکیم کی تلاوت اُسی طریقہ سے کریں جیسا کہ رب کا فرمان ہے تو اس کے اندر پوری پوری ہدایت ملے گی۔ وہ تو حکم دیتا ہے:۔

.... وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾ المزمل (اور قرآن کو آہستہ آہستہ (یعنی ٹھہر ٹھہر کر) پڑھو)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ البقرۃ

(اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی، تلاوت کرتے ہیں اس کی جو حق ہے تلاوت کرنے کا۔ وہی اس پر ایمان لاتے ہیں، اور جو اس سے روگرداں ہیں وہ ہی نقصان اُٹھانے والے ہیں)۔

پھر وہ یہ بھی ارشاد فرماتا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ محمد

(پس کیا وہ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوتے ہیں)۔

قرآن نے بتلا دیا کہ اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ تدبر کرتے جاؤ۔ غور کرو سوچو۔ قرآن ہی قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔ ایک کلمہ جو ایک آیت میں ہو اس کو دوسری آیات میں بھی دیکھیں کہ وہاں وہ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح بہت کچھ ہدایت حاصل ہو سکتی ہے۔ پس جو اس طرح

حق تلاوت ادا کریں گے صرف وہی اس سے فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ پس وہی اس سے نورِ ایمان پا سکیں گے "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ" اور جو لوگ اس سے روگرداں رہیں گے ان کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اس میں غور و فکر کیوں نہیں کر سکتے۔ صاف بتلا دیا ہے کہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔ کہیں ارشاد ہے "لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا" (ان کی آنکھیں ہیں ان سے دیکھتے نہیں)۔ "لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا" (ان کے کان ہیں ان سے سنتے نہیں) "لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا" (ان کے دل ہیں ان سے سمجھتے نہیں)۔ روگرداں رہنے والوں یعنی توجہ نہ کرنے والوں کی کیفیتِ نفس یہ بیان کی گئی ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۷﴾ البقرة

(اللہ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے)۔

اب ہمیں لازم ہے کہ غور کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ کون سے قفل ہیں جو دلوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ کونسی آنکھیں ہیں جو بصارت کے باوجود نہیں دیکھتیں۔ کون سے کان ہیں جو قوتِ سماعت کے باوجود سنتے نہیں، اور یہ کیسی مہریں ہیں جو دلوں پر اور کانوں پر لگی ہوئی ہیں، اور یہ کیسے پردے ہیں جو آنکھوں پر پڑے ہوئے ہیں؟ اس کا جواب اگر کہیں مل سکتا ہے تو حسبِ فرمانِ ایزدی "وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" ﴿۲۱﴾ الذاریٰت (خود تمہارے نفسوں میں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں) خود اپنے نفسوں ہی میں ملے گا۔ لہٰذا فطرتِ نفس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ربّ الارباب کی نشانیاں اسی کے اندر ہیں۔

فطرتِ نفس

تقریباً تین سال کے سن میں بچّہ کو جذبۂ انانیت کا شعور ہوتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس دنیا کی ہر شے سے جدا میں بھی اپنا علیحدہ وجود رکھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی خواہشِ بقا

شعور میں آتی ہے۔ وہ ہمیشہ باقی رہنا چاہتا ہے اور فنا ہونے سے ڈرتا ہے۔ نفس کی تمام خواہشات و جذبات کی بنیاد جذبۂ انانیت اور خواہش بقا پر ہے۔ جن کاموں یا چیزوں سے اس کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ ان کو بقا کے لئے معاون سمجھتا ہے لہٰذا وہ محبوب ہو جاتے ہیں اور جن سے ناگواری کا احساس ہوتا ہے ان کو موصل الی الفنا جان کر ان سے نفرت کرتا ہے۔ چونکہ ہر خواہش و جذبہ کی تسکین سے سرور حاصل ہوتا ہے اس لئے خواہشات و جذبات کی تسکین ہی کو اپنی بقا کا ذریعہ جانتا ہے اور خواہش و جذبہ کی تسکین نہ ہونے پر اضطرار ہوتا ہے اور اس کو موصل الی الفنا سمجھتا ہے۔ غرضیکہ تمام وہ اشخاص و اشیاء جن کو تسکین جذبات کا ذریعہ جان کر اپنی بقا کا باعث سمجھتا ہے وہ اس کو محبوب ہو جاتے ہیں۔ کلام پاک میں ان اشیاء و اشخاص کا کتنی ہی آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ .... تا آخر آیت (۱۴) العمران

(زینت دی گئی لوگوں کے لئے محبت خواہشات کی، عورتوں کی، بیٹوں کی، ڈھیر کئے ہوئے سونے اور چاندی کی، اور نشان کئے ہوئے گھوڑوں کی، اور مویشیوں اور کھیتوں کی (تا آخر آیت)۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ..... (تا آخر آیت) (۲۴) التوبۃ

(کہہ دو اگر تمہارے باپ دادا، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، اور تمہارا کنبہ قبیلہ اور وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں اور وہ تجارت جس میں نقصان سے ڈرتے ہو اور وہ مکان جن میں رہنا تمہیں پسند ہے، اللہ اور اس کے رسول سے تمہیں زیادہ پیارے ہیں ..... (تا آخر آیت)

باب دوم میں واضح ہو چکا ہے کہ بچہ اپنی تربیت کرنے والوں کو اپنی ہر خواہش و جذبہ

کی تسکین کا ذریعہ اور ہر شے پر قادر سمجھتا ہے۔ لہٰذا وہ بہت محبوب ہوتے ہیں۔ مگر جب مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر شے پہ قادر نہیں بلکہ بہت سے امور میں عاجز ہیں۔ پھر ان کو بعض ناموں کا ورد کرتے، ان سے حلِ مشکلات کی دُعا کرتے دیکھتا ہے تو خیال کر لیتا ہے کہ یہی وہ ہیں جو ہر شے پہ قادر ہیں۔ ان ہی کے ذریعے سے ہر خواہش وجذبہ کی تسکین ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ نام محبوب تر ہو جاتے ہیں۔ یہیں سے احساسِ مذہب کی بُنیاد قائم ہوتی ہے۔

اگر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ان اسماء کی محبت نہیں بلکہ اپنی خواہشِ بقا کی محبت ہے اِس کو تو بس اُپنا "میں" پیارا ہے۔ صرف "انا" کی محبت ہے۔ لہٰذا جس چیز کا تعلق اس کی "انا" سے ہوگا بہت پیاری ہوگی۔ جو بھی "میرا"۔ "میری" ہوگی وہ محبوب ہوگی۔ میری ماں، میرا باپ، میرا بھائی، میری بہن، میرا کنبہ، میرا قبیلہ، میری قوم، میرا ملک وغیرہ بشرطیکہ اس کی "میں" کے مقابل نہ آئے، اس کی "انا" کے خلاف نہ ہو۔ ان ہی میں سے "میرا مذہب" بھی ہے۔ یہ تو اس کو بہت ہی محبوب ہوتا ہے۔ اس "میرے مذہب" کی محبت کے اسباب لکھے جائیں تو بہت طول ہو جائے گا۔ ناظرین کے لئے بس چار اسباب پر اکتفا کرتا ہوں:

(۱) بچے کو چونکہ اپنی تربیت کرنے والوں سے بہت محبت ہوتی ہے لہٰذا ان کا ہر کام، ہر بات محبوب ہوتی ہے۔ اسی طرح اِن کے عقائدِ مذہبی کا بھی جو، لاشعوری میں غیرارادی طور پر، ذہن نشین ہو جاتے ہیں محبوب ہو جانا فطری اور لازمی امر ہے۔ ان پر عمر کے کسی حصہ میں بھی تنقیدی نظر ڈالنا یا ان کی صحت وعدمِ صحت پر غور کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔

(۲) جو رسم ورواج بچپن سے دیکھتا رہتا ہے۔ جو چیزیں، راستے، مکانات، سڑکیں وغیرہ اس کی نظر میں اکثر وبیشتر آتی رہتی ہیں۔ ان سب کی تصاویر نفس پہ بنتی رہتی ہیں چُنانچہ یہ محبوب ہو جاتی ہیں۔ اپنے وطن، اپنے گاؤں، قصبہ یا شہر کی محبت کا ایک راز یہ بھی ہے۔ ایامِ جہالت میں جب کیفیاتِ نفس کا مجھے کچھ علم نہ تھا اور میں بغرضِ حصولِ معاش وطن سے باہر گیا ہوا تھا تو دیارِ غیر میں وہاں کے مناظر، گلیاں وغیرہ دیکھ کر

وطن کی گلیاں، مزرعیں، مکانات یاد آجاتے تھے۔ چند سال بعد جب وطن لوٹا تو شہر کی سڑکوں گلیوں مکانات پر نظر پڑتے ہی بے اختیار جی چاہا کہ ان سے لپٹ کر رودوں۔ ذوق علیہ الرحمۃ بھی اس کیفیت کا اظہار فرما گئے ہیں ؎

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بہت قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

میرا ایک بچہ جو ایک ماہ کا تھا اپنی والدہ کے ساتھ اپنے نانا کے گھر گیا۔ وہاں جاکر بے چین ہوگیا اور دن بھر روتا رہا۔ رات کو گھر آکر جب اس مسہری پر لٹایا جس پر وہ لیٹا کرتا تھا۔ اس کے اوپر فرشی پنکھا لگا ہوا تھا تو خوش ہوا اور مسکرانے لگا۔ پنکھے کو بہت غور سے تکتا رہا۔ اس کی والدہ نے مجھ سے کہا۔ نہ معلوم کیا بات ہے یہ دن بھر روتا رہا۔ یہاں آتے ہی خوش ہوگیا۔ اس زمانہ میں مجھے کیفیاتِ نفس کا اتنا شعور تو ہوگیا تھا کہ اس راز کو سمجھ سکوں میں نے کہا جو چیزیں بچہ دیکھتا رہتا ہے ان کی تصویریں اس کے نفس پر مبنی رہتی ہیں وہ اس کو محبوب ہو جاتی ہیں۔ یہ کمرہ، یہ پنکھا، دروازے، الماریاں جن کو روزانہ دیکھتا رہتا تھا ان کے دیکھنے کا عادی ہوگیا تھا لہٰذا ان سے دوستی ہوگئی ہے۔ یہ سب اس کو وہاں نظر نہ آئے اس لئے روتا تھا۔ یہاں آکر ان کو جو دیکھا تو دوست مل گئے، خوش ہوگیا۔

(۳) اپنے تربیت کرنے والے والوں، اپنے بزرگوں کو صادق القول اور ہر شے کا علم رکھنے والا جانتا ہے۔ اس کو یہ خیال ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا جو باتیں اس مادی دنیا یا غیر مرئی اشیاء کے متعلق وہ کہتے ہیں یا ایسی باتیں، بیانات، واقعات یا قصے جن کی تصدیق یا تکذیب حواس ظاہری سے نہ ہوسکتی ہو، جب ان سے سنتا ہے تو غیر ارادی و لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں نقش ہوجاتے ہیں اور ان عقائد ذہنی کے خلاف وہ کچھ سننا گوارا نہیں کرتا۔ ان پر تنقیدی نظر ڈالنا تو درکنار تنقید کرنے والے سے بھی نفرت کرنے لگتا ہے۔ ایسے عقائد کی ایک پُر لطف مثال پیشِ خدمت ہے:۔

ایک وکیل صاحب جنھوں نے ۱۹۰۸ء سے قبل اردو میں وکالت کا امتحان پاس کیا تھا عدالت منصفی میں وکالت کرتے تھے۔ اس واقعہ کے وقت ان کا سن تقریباً چالیس سال ہوگا کہ ایک روز

نماز مغرب کی جماعت میں پہلی صف میں شریک تھے۔ یہ حقیر بھی ان کی داہنی جانب تھا۔ نماز ختم ہوئی تھی کہ چاند گرہن ہونے لگا۔ گرہن دیکھ کر وکیل صاحب امام صاحب سے کہنے لگے "مولانا چاند پر تو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی؟" پیش امام اچھے عالم تھے کہنے لگے "تکلیف کیسی؟" وکیل صاحب بولے "کہ وہ بُرج میں جوتا جاتا ہے اور بیچارہ بڑی مشکل سے نکلتا ہے"۔ تعلیم یافتہ حضرات مسکرائے۔ تب مولانا نے سمجھایا کہ چاند اپنی روشنی سے نہیں بلکہ سورج کی روشنی سے چمکتا ہے جیسے آپ کی زمین دن میں روشن ہو جاتی ہے جب دوران گردش ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں ہماری زمین سورج اور چاند کے درمیان حائل ہو جاتی ہے تو زمین کا سایہ چاند کے جس حصہ پر پڑتا ہے وہ حصہ تاریک ہو جاتا ہے بس یہ گہن ہے۔ زمین کے اس سایہ کو جو سورج کی مخالف سمت میں مخروطی شکل میں ہے "قافِ ارض" کہتے ہیں۔ یہ ہی کوہ وہ قاف ہے جس کے متعلق کہانیوں میں کہا جاتا ہے کہ اس میں جنّات و پریاں رہتی ہیں۔

وکیل صاحب نے کہیں بچپن میں جاہل عورتوں سے سُن لیا ہوگا کہ چاند بُرج میں آ جاتا ہے تو لگے گہن لگ جاتا ہے۔ اور اس پر بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ بات چالیس سال کی عمر تک بھی ان کا عقیدہ ذہنی بنی رہی۔ اسی طرح اپنے آباء و اجداد اور اعزّہ سے سُنے ہوئے عقائدِ مذہبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور یہی "میرا مذہب" بن جاتے ہیں لہذا بہت محبوب ہوتے ہیں۔

(۴) چوتھا سبب جو نہایت خاص اور تمام اسباب میں سب سے زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ ان پیشوایان دین یا بزرگوں کو جن کے نام بچپن سے سنتا رہا ہے اپنی ہر خواہش و جذبہ کی تسکین کا ذریعہ اور ہر شے پر قادر جان کر اپنی بقا کا سبب سمجھتا ہے۔ اسی لئے ان سے بے حد محبت ہو جاتی ہے۔ دُنیا کی تمام اشیاء و افراد، ماں باپ، عزیز و اقارب، مال و اسباب، جائداد وغیرہ سب اسی لئے اس کو محبوب ہوتے ہیں کہ ان کو خواہشات و جذبات کی تسکین کا ذریعہ اور نتیجہ میں اپنی بقا کا باعث جانتا ہے۔ مگر جب اضطرار لاحق ہوتا ہے مثلاً بیماری میں یا کسی نقصان سے روحانی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس وقت نہ مال کام آتا ہے نہ اولاد، نہ اعزّہ کچھ مدد کر سکتے ہیں نہ قوم و قبیلہ۔ اضطرار میں دُنیا کی تمام چیزیں جو اس کے خیال میں

باعثِ بقا ہونے کے سبب محبوب تھیں۔ دفعِ اضطرار کے لئے بے سود ثابت ہوتی ہیں اور تمام دُنیا میں کوئی شخص یا کوئی شے اس کو سکون نہیں دے سکتی۔ ایسی حالت میں اضطرار دفع کرکے یا کم کرکے اس کو سکون دینے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:۔

ایک سرکاری ملازم دورانِ ملازمت بہت کفایت سے خرچ کرتا رہا۔ اس طرح اس نے کچھ سرمایہ پس انداز کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پنشن کے بعد کوئی کاروبار کرے گا تاکہ بفراغت گزر اوقات ہو سکے۔ مگر جب پنشن لے کر گھر آیا تو سرمایہ کے ساتھ اسباب خانہ داری بھی چوری ہو گیا۔ اب ذرا تصوّر کیجئے کہ اس کو کیسا اضطرار لاحق ہوگا۔ لائقِ غور امر ہے کہ اس اضطراری کیفیت میں اس کو کیا چیز سکون دے سکتی ہے۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو نشہ آور اشیاء کا استعمال کرایا جائے تاکہ نشہ کی حالت میں اس نقصان کو بھولا رہے۔ دُوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا کوئی دوست یا پیر صاحب اس سے کہیں کہ تم کو ایسا عمل بتاتا ہوں جو نہایت کامیاب ہے کئی دفعہ تجربہ ہو چکا ہے۔ چالیس دن کے اندر اندر چُرایا گیا مال مل جائے گا۔ یا کوئی خیر خواہ اس سے کہے کہ بھائی میں نے آج تک کسی پر ظاہر نہیں کیا کہ میں چاندی بنانا جانتا ہوں لیکن تمہاری مُصیبت ایسی ہے کہ تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔ پریشان نہ ہو میں تم کو چاندی بنانا سکھا دوں گا۔ کہیے اضطرار میں فوراً سکون ہو جائے گا کہ نہیں؟

اس مثال سے یہ امر تو واضح ہو گیا ہے کہ جب ایسا اضطرار لاحق ہو کہ دُنیا کی تمام محبُوب اشیاء میں سے کوئی شے بھی تسکین نہ دے سکے تو اس وقت دو صورتیں ہی ایسی ہیں جو باعثِ تسکین ہو سکتی ہیں:۔

(۱) مضطر کی توجّہ اس کے باطن کی طرف سے ہٹائی جائے۔ یا کسی خارجی مرکز کی طرف منعطف کرائی جائے۔

(۲) آئندہ کی خارجی بہبودی کی توقع اُمید دلائی جائے۔ ایسی بشارت سے اضطرار میں سکون ہونا لازمی ہے۔

اَب غور کریں کہ "میرا مذہب" کیا یہ دونوں چیزیں یکجا ہی پیش نہیں کر دیتا؟ ضرور پیش کرتا ہے۔ یعنی آبائی مذہب کے پیشوایانِ دین یا معبودوں کے نام جو وہ بچپن سے سُنتا رہا ہے اور ذہن نشین ہیں مایوسی و اضطرار میں اس کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں اور دُنیا و آخرت میں ان ہی سے اُمیدِ فلاح وابستہ ہوتی ہے۔ اَب سوچیں! کہ "میرا مذہب" جو اُس وقت دفعِ اضطرار کا باعث ہوتا ہے جبکہ دُنیاوی اسباب اور تمام محبُوب اشیاء و افراد، جن کو باعثِ بقا جانتا تھا، کچھ فائدہ نہ دے سکیں کتنا محبُوب ہوگا؟؟ یہی سبب ہے کہ مذہب کے لئے جان تک قربان کرنے سے گریز نہیں کرتا۔

ممکن ہے کسی شخص کو یہ خیال پیدا ہو کہ جب "میرا مذہب" اس قدر عزیز ہوتا ہے تو بعض اشخاص اَپنا آبائی مذہب ترک کر کے دُوسرا مذہب کیسے قبول کر لیتے ہیں؟ تو اُس کا سَبب یہ ہے کہ جب کوئی شخص آبائی مذہب پر ایسے اعتراضات وارد کرتا ہے جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اعتراضات واقعی دُرست ہیں تو اضطرار پیدا ہوتا ہے اور اپنے مذہب کے علماء کے پاس جاتا ہے۔ ان سے مسائل کے حَل کا طالب ہوتا ہے۔ علماء اکثر اس کو "لایعنی تاویلیں سُنا کر اس قسم کی ہدایات کرتے ہیں:" میاں مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔ ہمارے اتنے بڑے فلاسفر، ایسے مہاتما، پنڈت، جن سے دُنیا کے عقلاء فیض حاصل کرتے رہے وہ ہی سمجھ سکتے تھے۔ تمہاری عقل ایسی کہاں ہے جو ان باریک باتوں کو سمجھ سکو۔ کسی کی باتیں نہ سُنو۔ مذہب کے بارے میں سکوت لازم ہے۔ اگر ایسے گمراہ کرنے والوں کی باتیں سنو گے تو شیطان کے پھندے میں پھنس جاؤ گے۔ ان جھگڑوں میں کبھی نہیں پڑنا چاہیئے۔ ان سے خیالات خراب ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔" پس اگر وہ کم سِن یا نوجوان یا دُنیا پرست، کم فہم ہے تو عبث تاویلوں اور گمراہ کُن فضول گفتگو سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اسکی ایک مثال سُنیئے!۔

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں جب انگریزوں نے ٹھگوں کا قلع قمع کیا تو ان میں سے بہت سے گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں ایک امیر علی ٹھگ بھی تھا۔ عدالت میں اس کا بیان نہایت عجیب ہے اس کے اقتباسات انگریزی حکومت کے زمانہ میں اسکولوں کی بعض دَرسی کتب میں بھی شامل تھے۔ کتابوں میں اس واقعہ کی سُرخی تھی۔

امیر علی ٹھگ کے بیان کا اقتباس

"مجھے اپنا بچپن صرف اتنا یاد ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ پالکی میں ماں کی گود میں سویا ہوا تھا کہ رات میں دفعتاً شور و غل اٹھا۔ ہائے ہائے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ میری آنکھ کھلی تو پالکی کے باہر کوئی مجھے گود میں لئے تھا۔ میں بالکل سہم گیا۔ پھر مجھے خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ جب ہوش آیا تو ایک مکان میں ایک عورت کی گود میں تھا۔ بہت رویا چلایا ماں باپ کو پکارتا تھا اور رو رو کر سو جاتا تھا۔ وہ عورت و مرد مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ بہلانے کی کوشش کرتے۔ رفتہ رفتہ میں ان سے مانوس ہو گیا۔ جب انھوں نے مجھ سے نام پوچھا تو میں نے "امیر علی" بتایا۔ غرضکہ وہاں میری پرورش ہوتی رہی۔

جب میری عمر آٹھ نو سال کی ہوئی تو مسجد میں ملا جی کے پاس تعلیم کے لئے بٹھا دیا گیا۔ تقریباً ایک یا ڈیڑھ سال تعلیم حاصل کرتے گزرا ہو گا کہ ایک روز میں نے اپنے مفروضہ باپ سے کہا "بابا ہم لوگ جو آدمیوں کو لوٹتے ہیں، ان کو مار ڈالتے ہیں یہ کام تو بہت برا ہے۔ کسی آدمی کو مال لینے کے لئے مار ڈالنا کتنا برا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم مسلمان ہیں پھر بھوانی مائی کی پوجا کیوں کرتے ہیں۔ بھوانی مائی کو ماننے والے تو ہندو ہوتے ہیں۔"

یہ سن کر میرے فرضی باپ نے کہا۔ بیٹا! تم ابھی بچے ہو ان باریک باتوں کو نہیں سمجھ سکتے اور مجھ کو ملاجی کے پاس جانے سے منع کر دیا۔ چھ سات ماہ بعد میں نے ایک روز پھر وہی سوال کئے۔ باپ نے پھر ٹالنا چاہا مگر جب میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے " لو اگر تم سمجھنا ہی چاہتے ہو تو سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ دیکھو خدا ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ سارے کام کرنے والا وہی ہے۔ وہ ہی مارتا ہے، وہ ہی جلاتا ہے، وہ ہی پیدا کرتا ہے، وہ ہی فنا کرتا ہے۔ وہ بیمار ڈالتا ہے، وہ ہی اچھا کرتا ہے، وہی رزق دیتا ہے، وہ ہی بھوکوں مارتا ہے۔ غرضکہ یہ سارے کام اسی کے ہیں مگر کیا ان میں سے کوئی کام خدا خود کرتا ہے؟ کیا اس کا کوئی کام بغیر واسطے اور وسیلے کے ہوتا ہے؟ نہیں! بلکہ اس کی صفات کا

مظہر انسان ہے۔ خدا کے تمام کام انسان کے وسیلے سے ہی انجام پاتے ہیں۔ خدا کی ہر ایک قوت کا، اس کی ہر ایک صفت کا مظہر انسان ہی ہے۔ وہ رازق ہے تو غلہ اور پھل وغیرہ پیدا کرنے کا کام انسان ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ وہ خالق ہے تو اس کا کام بھی مخلوق کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ وہ شفا دینے والا ہے تو یہ کام بھی انسان ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اب یہ بات انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ جس صفت کا مظہر بننا پسند کرے اسی کو اختیار کر لے۔ وہ قہار بھی ہے اور مارنا فنا کرنا بھی اس کی ایک صفت ہے۔ اس صفت کا مظہر بھی انسان ہی کو ہونا چاہیئے اور ہم نے اس کی اس صفتِ قہاریت کا مظہر بننا پسند کر لیا ہے۔ خدا اپنے جن بندوں کو فنا کرنا چاہتا ہے ہم اس کے واسطے وسیلہ بن جاتے ہیں۔ اب سوچو اور بتاؤ اس میں کونسی قباحت ہے؟

اب رہی دوسری بات کہ ہم بھوانی مائی کی پوجا کیوں کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خدا کی صفتِ قہاریت کا نام ہندوؤں کی زبان میں "بھوانی" ہے۔ وہ لوگ تو خدا کی ہر صفت کا مجسمہ بنا کر اس کی پوجا کرتے ہیں مگر ہم اس مجسمہ کی پوجا تو نہیں کرتے بلکہ "بھوانی مائی" یعنی خدا کی صفتِ قہاریت کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر ہم اس کو ہندی نام بھوانی مائی کہہ کر ہی اس کی پرستش کریں تو وہ خدا ہی کی تو پرستش ہوئی۔ اس میں غیر خدا کی پوجا تو شامل نہیں ہو جاتی۔ یہ نظام تو عین حکمت اور عدل و انصاف پر قائم ہے"۔ امیر علی کا بیان ہے کہ یہ سُن کر میرے دل کو تسکین ہو گئی۔

یہ تو بچّے کی یا ایسے شخص کی مثال ہے جس کو طفل تسلیوں سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ مگر جس کا دل دُنیا پرستی میں غرق نہیں ہوتا اور ذرا بھی عقل و فہم سے کام لینے والا ہوتا ہے اور اس کے دل میں حق کی محبت بھی ہوتی ہے تو اس کو ایسی باتوں سے تسکین نہیں ہوتی۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارے یہ عقائد و اعمال صحیح نہیں ہیں۔ مگر نفس کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ان کو باطل تسلیم کرے۔ ایسے وقت عقل و نفس میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ شدید اضطراب لاحق ہوتا ہے۔ ہر دم دل ڈرتا ہے۔ ہائے "میرا مذہب چلا"!

نفس کہتا ہے: نہیں جی کوئی بات ضرور ہے، بھلا ہمارے اتنے بڑے بڑے

مہاگیانی پنڈت، اتنے بڑے بڑے علماء و فلاسفر نہ سمجھتے تھے۔ کیا وہ حق پر نہ تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، عقل کہتی ہے: تاریکیوں میں پلا ہوا جس نے روشنی دیکھی ہی نہ ہو اس کے متعلق کیا جانے۔ مگر جب روشنی سامنے آجائے تو انکار نہیں ہو سکتا اس کو تاریکی نہیں سمجھا جا سکتا، غرضیکہ نہ رات کو چین نہ دن کو سکون، سینہ میں آگ سی لگی رہتی ہے۔ آخر عقل فیصلہ کر دیتی ہے کہ حق حق ہے اور باطل باطل۔ ہمارے مہاگیانی پنڈتوں نہ ہمارے علماء کرام کے پاس بھی ان باتوں کا کوئی معقول جواب نہیں۔ پس جب عقل کا فیصلہ قبول کر لیتا ہے تب کہیں جا کر سکون نصیب ہوتا ہے۔

اب دوسری خرابی یہ پیش آتی ہے کہ جس شخص نے اس کے آبائی مذہب کے عقائد کو باطل ثابت کیا تھا اس سے ایسا مرعوب ہو جاتا ہے کہ بے چون وچرا اس کے ہر قول و فعل پر ایمان لے آتا ہے۔ قوتِ تنقید سلب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ شخص جو بھی خیالات و عقائد پیش کرتا ہے یہ بے چون وچرا، بے سوچے سمجھے ان کو حق جان کر قبول کر لیتا ہے۔ اب یہ نیا مذہب اس کا "میرا مذہب" ہو جاتا ہے۔ اور بہ مصداق "کُلُّ جَدِیْدٌ لَذِیْذٌ" (ہر نئی چیز بہت پُرلطف اور مزے دار ہوتی ہے) بڑے جوش و خروش سے اس کی پیروی و اشاعت میں منہمک ہو جاتا ہے۔

صاحبانِ فہم اگر ذرا بھی غور کریں تو ظاہر ہو جائے گا کہ یہ "میرا مذہب" محض تسکین جذبات کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ پیشوایانِ دین یا معبودوں کی محبت تو نہیں ہوتی بلکہ یہ تو اپنے مرکزِ توجہ فی الاضطرار کی محبت ہوتی ہے کہ حالتِ اضطرار میں یہ نام اس کی توجہ کا مرکز بن کر باعثِ تسکین ہو جاتے ہیں۔ ذرا اس پر بھی غور کریں کہ یہ "میرا مذہب" ہوتا کیا ہے؟ دنیا میں جتنے بھی مذاہب رائج ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیروانِ مذاہب عالم کے ذہنوں میں مذہب کا یہی تخیل ہے کہ بعض عقائدِ ذہنی کو صحیح تسلیم کر لینا اور ان کے متعلقہ رسوم و عبادات کو صحیح سمجھ لینا (خواہ عمل کریں یا نہ کریں) اور پیشوایانِ مذہب کے بتائے ہوئے طور طریق پر چلنا ہی "مذہب" ہے۔ پس اگر اسلام بھی ایسا ہی ہو تو حق و باطل کے درمیان کیا امتیاز ہو سکتا ہے؟ وہ عقائدِ ذہنی اور رسم و رواج جو آباء اور ماحول کے اثر سے غیر ارادی اور لاشعوری طور پر ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں۔ وہ سب تو بالکل ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے

کہ ایک "مشی فی النوم" کے مریض کے اقوال و افعال، جس کا ذکر باب دوم میں گزر چکا ہے کہ مرض کے دورے کی حالت میں آدمی سوتے میں چلتا پھرتا ہے، باتیں کرتا ہے، کام کرتا ہے مگر جب ہوش آتا ہے تو اس کو دورے کی حالت میں کئے ہوئے اعمال یا اقوال وغیرہ کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ پھر جب یہ امر بھی واضح ہو چکا ہے کہ ہمارے نفوس پر بھی ایسی ہی غفلت کی کیفیت طاری ہے جیسی "مشی فی النوم" کے مریض کی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی اگر یہ سمجھ بیٹھیں کہ ہم نے خدا کو مان لیا ہے تو ہلاکت ابدی سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ ہمارا رب جو ہم پر رؤف و رحیم ہے، اپنے حبیب کے صدقے سے ہم پر رحم کرے اور موت سے قبل ہی تھوڑا بہت ہوش عطا فرما دے تاکہ حسبِ فرمان رسول کریم "اِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوا" (جب مر جائیں گے تو جاگیں گے) مرنے پر ہوش میں آکر گرفتار عذاب ہونے سے محفوظ رہیں۔ جناب ارحم الراحمین موت سے پہلے ہی ہماری غفلت و لاشعوری کم کر دے تاکہ اس کے وجود کا یقینِ قلبی حاصل کر کے مریں۔

نفسِ انسان غفلت و لاشعوری میں اپنے ماحول کے مروجہ سُنے سُنائے عقائد کے غیر ارادی طور پر ذہن نشین ہو جانے کو سمجھ لیتا ہے کہ یقین حاصل ہو گیا۔ اسی کو آبائی مذہب کی پیروی کہتے ہیں اور یہی آبا۔پرستی کہلاتی ہے۔ اس پیروی مذہب آبا کے متعلق اگر قرآن کریم کا بغور مطالعہ کریں تو ہمارے سر شرم سے جھک جائیں۔ اس کے متعلق تو قرآن کریم میں بہت سی آیات ہیں جن میں آبائی مذہب کی پیروی کو سنتِ مشرکین ظاہر کیا گیا ہے۔ ہر نبی و رسول کے ذکر میں ایسی آیات موجود ہیں کہ جب بھی کسی نبی یا رسول نے لوگوں سے دریافت کیا ہے کہ تم ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو کیا یہ تمہاری بات سنتے ہیں۔ کیا یہ تم کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں تو یہی جواب ملا ہے "وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُونَ" (ہم نے اپنے باپ دادا کو یہی کرتے پایا)۔ "وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا (ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی پر پایا)۔ "وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا" (۱۷۰) البقرۃ (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا)۔ یہ آیات ہر چند کہ کفار و مشرکین کے ذکر میں ہیں۔ مگر ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو کفار و مشرکین کے یہ خصائل ہم کو اپنے اندر

نظر آتے ہیں۔ ذرا سوچیں، اگر ایک غیر مسلم ہم سے پوچھے "کیا تم مسلمان ہو؟"، تو کہیں گے الحمد للہ ہم مسلم ہیں۔ پھر وہ کہے "کیا قرآن کو مانتے ہو؟"، تو جواب دیں گے۔ واہ بھلا قرآن شریف کو کیسے نہ مانیں گے وہ تو اللہ پاک کا کلام ہے۔ پھر وہ دریافت کرے "اچھا تو یہ تمہارے رسم ورواج، جرائم، یہ رشوتیں، اغوا، بے ایمانیاں وغیرہ کیسی ہیں؟ کیا قرآن یہ ہی تعلیم دیتا ہے؟" تو اب کیا جواب دیں؟ ظاہر ہے کہ ہم نے اس لفظ "ماننے" کی کیا گت بنا ڈالی ہے۔ صرف ایک تمثیل (جو کتاب جامع الانوار جزء دوم "خدا کو مانو" میں بھی آچکی ہے) دیکھیں:-

کراچی سے ایک سرکاری افسر ایک سال کے لئے امریکہ بھیجا جاتا ہے۔ اپنی کوٹھی ملازمین کے سپرد کر جاتا ہے۔ ملازمین کے جمعدار کو ہر ماہ کی تنخواہوں کے لئے چیک دے جاتا ہے کہ بنک سے رقم نکال کر سب کو تنخواہیں تقسیم کر دیا کرے۔ سال کے آخر میں وہ جمعدار کے نام خط لکھتا ہے۔ "میں "پی آئی اے" سے اگلے ماہ کی دس تاریخ صبح سات بجے کراچی پہنچوں گا۔ ڈرائیور کار لے کر ہوائی اڈے پر آجائے۔ میرے ہمراہ تین احباب بھی ہوں گے اور ان کی مہمانداری کا معقول انتظام ہونا لازم ہے۔" وقت اور تاریخ معین پر جب افسر صاحب ہوائی جہاز سے اتر کر اپنی کار تلاش کرتے ہیں تو وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ مجبوراً ٹیکسی لے کر کوٹھی پہنچتے ہیں۔ جمعدار کو بلا کر دریافت کرتے ہیں۔ "کیا میرا خط تم کو نہیں ملا؟" وہ کہتا ہے سرکار وہ تو مل گیا تھا۔ افسر کہتا ہے "پھر کیا تم نے اس کو میرا خط نہ سمجھا تھا؟"۔ تو وہ عرض کرتا ہے۔ "حضور میں نے تو پہچان لیا تھا کہ حضور کا ہی خط ہے۔ اس میں تو میرے دل میں شک و شبہ ہوا ہی نہیں۔ دل نے مان لیا تھا، اس پر تو میرا ایمان ہے۔ روزانہ خط پڑھا کرتا تھا اور اسے بڑے احترام سے رکھا ہوا ہے۔"

کیوں بھائیو! کیا خدا کے کلام کو بھی ہم اسی طرح مانتے ہیں؟ کیا اس پر ایسا ہی ایمان رکھتے ہیں؟ اور اتنا ایمان بھی صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ ہمیں ارث میں باپ دادا سے ملا ہے۔ یہ تو مذہب آباء کی محبت اور پیروی کے سبب سے ہے، ورنہ قرآن تو عمل کے لئے ہے نا کہ بیماروں کو ہوا دینے اور طوطے کی طرح پڑھ کر صرف بوسے لے کر

اُونچی جگہ رکھ دینے کے لئے۔ اگر کوئی غیر مُسلم پوچھتا ہے" کیا تم قرآن پر عمل کرتے ہو؟ تو جواب دیتے ہیں۔" بھلا سارے قرآن پر کون عمل کرسکتا ہے! یہ تو انبیاء و اولیاء کا کام ہے"۔ مگر قرآن کہتا ہے" اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ "۔ (کیا تم کتاب کے بعض حصّہ پر تو ایمان لاتے ہو اور بعض سے کُفر کرتے ہو)۔" فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ" (۸۵) البقرہ۔ (پس سوائے اسکے ان لوگوں کی جو تم میں سے ایسا کریں گے کوئی سزا نہیں کہ زندگانیٔ دُنیا میں رُسوائی ہو اور دن قیامت کے سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے)۔

غرضکہ قرآن تو ہماری حجت ماننے کو تیار نہیں۔ وہ تو برابر ان خیالات و رسوم کی بے سمجھے پیروی کرنے کو سُنّتِ مشرکین ہی قرار دیتا ہے۔ چند آیات اوپر نقل ہوچکیں اَب ایک اور بھی دیکھ لیں۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۲) الزخرف

(بلکہ وہ بولے ہم نے اپنے آباء کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم ان ہی کے آثار پر چلتے ہیں)۔

اس مقام پر بعض معترضین کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو کفّار و مشرکین کا ذکر ہے کہ وہ تقلید آباء میں باطل کی پیروی کرتے تھے اور عقل سے ذرا بھی کام نہ لیتے تھے۔ کوئی شخص بھی نہ سوچتا تھا کہ یہ پتّھر کے مجسّمے جو نہ بولتے ہیں نہ سُنتے ہیں اور اپنے اوپر سے مکھّی بھی نہیں اُڑا سکتے ہیں، ہمیں کیا فائدہ دے سکتے ہیں۔ ہم تو حق پر ہیں۔ دینِ اسلام حق ہے۔ ہمارے آباء دینِ حق پر تھے۔ ان کی پیروی حق کی پیروی کرنا کلام اللہ میں ممدوح قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ ربّ العزّت ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَىْءٍ ؕ ...... (۲۱) الطور

(اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی۔ ہم نے ان کی اولاد کو ان سے ملا دیا اور ہم نے ان کے اعمال کے بدلے میں کسی شے کی کمی نہ کی)۔

یہ ایراد ظاہراً تو بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ مگر اللہ کا کلام حق ہے وہ حق کو ظاہر کر ہی دیتا ہے۔ اس آیت میں ہے " اُن کی اولاد نے ایمان میں یا ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ "بِاِسْلَامٍ" نہیں فرمایا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ "اسلام میں ان کی پیروی کی"۔ معترض کہہ سکتا ہے کہ ایمان و اسلام تو ایک ہی ہیں۔ ایمان لانے کے بعد ہی تو مسلمان ہوتا ہے اس کی تفصیل تو باب دوم میں گزر چکی۔ سورہ حجرات کے دوسرے رکوع کی آیت نمبر ۱۴ اور ۱۵ نقل کی جا چکی ہیں۔ آیت (۱۴) میں ہے "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا (تا آخر)" (اعراب کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ کہہ دو تم ایمان ہرگز نہیں لائے لیکن یہ کہو اسلام لائے اور ایمان تو ہرگز تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اگر تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو گے تو تمہارے اعمال کے بدلے میں کوئی کمی نہ کی جائے گی اور اللہ تو غفور الرحیم ہے)۔

اگلی آیت میں ایمان کی تعریف بھی بتا دی گئی ہے کہ حقیقی مومن کسے کہتے ہیں اور ایمانِ حقیقی کس کو کہتے ہیں:۔

(۱۵) "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ۔۔۔ (تا آخر) ترجمہ: (سوائے ان کے کوئی مومن نہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر امکانِ شک باقی نہ رہا اور انھوں نے اپنے مالوں اور نفسوں سے راہِ خدا میں جہاد کیا (ریاضت کی) بس وُہی تو سچے ہیں)۔

اس آیہ وافی ہدایہ میں ایمانِ حقیقی کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ ایسا یقین ہو جائے جس کے بعد شک نہ ہو سکے۔ اور یہ راہِ خدا میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنے سے یعنی خواہشات و جذبات سے نفس کو روکنے یا ٹوکتے رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ گو یہاں لفظ یقین استعمال نہیں ہوا مگر امکانِ شک نہ رہنا ہی تو یقین ہے۔ اگر کسی کو اب بھی اطمینان نہ ہو تو ایمان کی تعریف میں لفظ یقین بھی دیکھ لیں۔ ارشادِ باری ہے:۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ (۴) البقرۃ

(وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو تم پر نازل کیا گیا اور اس پر جو تم سے پہلے نازل کیا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں)۔

اَب تو کوئی مُسلمان زبان سے کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ جب ان کا رب فرما رہا ہے کہ وہ ایسے مومن ہیں کہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ایمانِ ظاہری سے اسلام میں تو داخل ہو جاتا ہے لیکن ایمانِ حقیقی صرف غیب کا یقین حاصل ہونے پر ہی ملتا ہے۔ باپ دادا، عزیز و اقارب اور ماحول سے اسلام ظاہری تو حاصل ہو جاتا ہے مگر یقین اور نورِ ایمان طلب صادق در یا نتِ نفس سے ملتا ہے۔ وہ تو عطائے ربّ العزت ہے۔ اور اسی کو ملے گا جسے طلب ہو گی۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے "یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ" (۳۵) النور۔ (اللہ اپنے نور تک پہنچا دیتا ہے جس کو چاہے)۔ "وَيَهْدِیْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ" (۱۳) الشوریٰ۔ (اور ہدایت کرتا ہے اپنی طرف اس کو جو رغبت کرے یا طلب جس کو ہو)۔

اِن آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نورِ ایمان و یقین اسی کو عطا فرماتا ہے جو اس کی بارگاہ سے طلب کرے۔ ہم روزانہ پانچ وقت نماز میں کتنی ہی مرتبہ عرض کرتے ہیں "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (ہمیں سیدھا راستہ دکھا دے)۔ مگر کیا ہم میں سے کوئی ایک بھی صدقِ دل سے صراطِ مستقیم کی طلب کرتا ہے؟ اگر صدقِ دل سے مانگتے تو ایک نہ ایک دن ضرور مل جاتا۔ اُس کا تو وعدہ ہے "اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ" (۶۰) المومن (تم مجھ سے طلب کرو میں قبول کروں گا) اور اس کا وعدہ سچا ہے، وہ تو اصدق الصادقین ہے۔ اگر اس سے ایمانِ حقیقی اور نورِ یقین طلب کرتے رہیں تو لازمی ہے کہ اُس کے وجود کا یقین اس کی بارگاہ سے عطا ہو جائے۔

ممکن ہے کسی شخص کا نفس ان حقائق کو قبول کرنے سے احتراز کرے اور وہ کہے: "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمیں رَب کے وجود کا یقین نہ ہو۔ ہم خدا اور رسول ﷺ کے نام پر جان قربان کرنے کو تیار ہیں۔ اگر یقین نہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن ہے"۔ اس خوش فہمی کے لئے اس پر غور کریں کہ ہم میں سے ہر شخص کو موت کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ دوسروں کو مرتے دیکھتے ہیں، سُنتے ہیں، مُردے کو چھوتے ہیں دفن کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود کیا ہمیں موت کا یقین حاصل ہے؟ جب موت کا کوئی وقت معیّن نہیں اور وہ کسی وقت بھی آسکتی ہے تو اگر یقین ہو تو وہ کیفیت بھی طاری رہے جو کشتی میں سوار ہونے کی حالت میں طوفان آجانے

پر طاری ہو جاتی ہے۔ پس جب موت کا یقین نہیں، جس کا احساس حواسِ خمسۂ ظاہری سے ہوتا رہتا ہے، تو خدا کے وجود اور غیب کا یقین کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ اس کا احساس کبھی ہوا ہی نہیں۔ لہٰذا ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ تخیل کہ ہمیں یقین حاصل ہے محض فریبِ نفس ہے۔ اس کا سب سے بڑا عیب خود فریبی (SELF DECEPTION) ہے اور یہ اپنے ہی کو فریب دیتا رہتا ہے۔

اب یقین کی کچھ تفصیل ہدیۂ قارئین ہے۔ اس کو بغور مطالعہ فرمائیں تو نفس کے فریب کا راز منکشف ہو جائے گا۔

یقین، ایقان، یوقنون

آیئے ہم پہلے اس پر غور کرتے ہیں کہ یقین کس کو کہتے ہیں اور اس لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ کسی خبر، کسی شئے کے وجود کے متعلق ایسا علم حاصل ہو جانا جس میں شک نہ ہو سکے ایسے علم کو ہم یقین کہتے ہیں۔ اب یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ نفسِ انسان کو یقین کیسے حاصل ہوتا ہے۔ نفس کی فطرت ہے کہ اس پر تکرار سے اثر ہوتا ہے۔ جب ایک طالبِ علم کوئی دوسری زبان سیکھتا ہے تو ایک لفظ کے معنی کئی بار دہراتا ہے۔ کسی کو دس مرتبہ، کسی کو بارہ یا پندرہ مرتبہ دُہرانے سے حفظ ہو جاتا ہے۔ اسی سائیکالوجی کے تحت اشتہارات اخباروں میں شائع کرائے جاتے ہیں، گزرگاہوں پر چسپاں کیئے جاتے ہیں۔ جب کسی اشتہار کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہیں تو نظر اس پر سے گزر جاتی ہے مگر چند مرتبہ! در برابر دیکھتے رہنے سے اشتہار دینے والی جماعت یا کمپنی کا نام ذہن میں نقش ہو جاتا ہے چونکہ کیفیاتِ نفس بغیر تمثیل ذہن پر اثر انداز نہیں ہوتیں لہٰذا تمثیل کی ضرورت ہے:۔

۱۔ جب آپ کوئی خبر سنتے ہیں اور وہ کسی ایسے فرد یا شے سے متعلق ہوتی ہے جس سے "میرا یا میری" کا تعلق نہیں ہے تو کوئی خاص توجہ نہیں ہوگی۔ لیکن ایک اور شخص آجاتا ہے اور وہ بھی وہی خبر سناتا ہے تو اس وقت نفس پر کچھ اثر ہوگا۔ اگر متعدد اشخاص وہی خبر سنائیں تو چند بار بہ تکرار سننے سے یقین ہو جائے گا اور ایسا یقین کہ اگر کوئی اس کو صحیح تسلیم کرنے سے

انکار کرے تو اس سے جھگڑنے کو تیار ہو جائیں گے۔ مگر کچھ دیر بعد ایک شخص آکر اس کے خلاف بیان کرے اور ظاہر کرے کہ خبر غلط ہے تو فوراً شک ہو جائے گا۔ کیا اسے یقین کہیں گے؟ اس کو یقین نہیں کہہ سکتے جس کے بعد شک واقع ہو جائے۔

دوسری تمثیل لکھنے سے قبل قارئین کو اس طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ جس طرح پانی اُوپر سے نیچے کی طرف بہتا ہے اسی طرح حرارت بھی زیادہ گرم شے سے کم گرم کی طرف جاتی ہے اگر تین گلاس لے کر ایک میں نل کا پانی دوسرے میں گرم اور تیسرے میں برف کا پانی ڈالیں پھر کچھ دیر گرم پانی میں ہاتھ ڈالے رہیں۔ پھر نل کے پانی میں ڈالیں تو وہ سرد محسوس ہوگا اس لئے کہ ہاتھ میں سے گرمی نل کے پانی میں جائے گی۔ پھر اگر برف کے پانی میں کچھ دیر ہاتھ ڈالے رہنے کے بعد نل کے پانی میں ہاتھ ڈالیں تو گرمی نل کے پانی سے ہاتھ میں آئے گی تو وہ گرم محسوس ہوگا۔ اب سنیئے:

۲۔ فرض کریں کہ ایک مریض کو ایک سو دو درجہ بخار ہے۔ آپ اس کی چارپائی سے کچھ فاصلہ پر بیٹھے ہیں، ملازم آتا ہے اور مریض کے قریب تپائی یا میز پر ایلومونیم کے گلاس میں پانی رکھ کر چلا جاتا ہے مریض جب گلاس کو چھوتا ہے تو کہتا ہے "اُف! یہ تو بہت سرد ہے!" جب وہ تین چار مرتبہ کہے گا تو کیا آپ کو یقین نہ ہو جائے گا کہ پانی واقعی سرد ہے؟ لیکن ملازم آکر کہتا ہے میں نے تو نل کا پانی دیا ہے یہ تو ٹھنڈا نہیں ہو سکتا۔ یہ سنتے ہی آپ کو شک ہو جائے گا۔ یہ کیسا یقین تھا، اسے تو یقین نہیں کہہ سکتے جس کے بعد شک ہو سکے؟ یہ تو ناپختہ یقین ہے۔ چونکہ ہمارے پاس ایسے کمزور یقین کے لئے کوئی دوسرا لفظ موجود نہیں لہٰذا اس کو بھی ہم یقین ہی کہتے ہیں۔ عالمِ غیب اور خدا کے وجود کا بھی ہمیں ایسا ہی یقین ہے۔ پس اگر کوئی دہریت کا پروپیگنڈا کرنے والا کچھ عرصہ ساتھ رہے اور عدم وجودِ باری کے دلائل سناتا رہے تو ضرور شک ہونے لگے گا۔ لہٰذا اس یقین کو یقینِ ذہنی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ وہ حقیقی یقین نہیں ہو سکتا جسے یقینِ قلبی کہتے ہیں اور جس کے بعد امکانِ شک باقی نہیں رہتا۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) ایک مکان آسیب زدہ مشہور ہے۔ آپ نے سنا ایک شخص وہاں رات میں گیا اور کچھ ایسا سامان یا منظر دیکھا کہ خوف کھا گیا اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔ پھر کسی دوسرے شخص کے متعلق

بھی اپنے کسی معتبر سے سُنا کہ وہ بھی ڈر گیا اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اب خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتائیں کہ اگر آپ رات کے وقت اس مکان میں تنہا جائیں تو قلب کی حرکت پر کچھ اثر ہو گا یا نہیں؟ ہو گا اور ضرور ہو گا، ایک خفیف سا اضطرار ضرور طاری ہو گا۔

(۲) کوئی بڑا افسر جس سے پہلے تعارف نہیں ہوا اور اس سے کسی قسم کی قطعاً بے تکلفی نہیں ہے مثلاً گورنر صاحب دورے پر تشریف لاتے ہیں اور انسپکٹر پولیس آپ کو بلانے آتا ہے کہتا ہے: "آپ کو گورنر صاحب نے بُلایا ہے"۔ سچ بتائیں کچھ دل پر اثر ہو گا کہ نہیں؟ عجیب پیچ و تاب ہو گا۔ نہ معلوم مجھے کیوں بُلایا ہے؟ خیر آپ جاتے ہیں اور گورنر صاحب کے کمرے کے باہر بُلائے جانے کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ برائے خدا بتلائیں کہ قلب پر کچھ رُعب کا اثر ہو گا یا نہیں؟ ضرور ہو گا۔ کم سے کم خفیف اضطرار تو ضرور طاری ہو گا۔ قلب کی حرکت پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر پڑے گا۔

وجودِ باری کے یقین کا دعویٰ کرنے والوں کو یہ آیت یاد رکھنی چاہیئے "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ" (۲) الانفال۔ (سوائے ان کے کوئی مومن نہیں کہ جب اللہ کی یاد دلائی جاتے اُن کے دل کانپنے لگیں) یہ کیفیت قلب پر محبت یا رُعب سے طاری ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا کو نہ کبھی چھُوا، نہ دیکھا تو یقینِ قلبی کیسے حاصل ہو؟ ایمانِ حقیقی اور یقینِ قلبی اسی کیفیت کے نام ہیں اور یہ کسب سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو جناب ارحم الراحمین کی رحمت ہے جو طلب کرنے والے کو اس کی بارگاہ سے عطا فرمائی جاتی ہے۔ بندے پر نورِ ایمان و یقین کی طلب لازم ہے۔ باب سابق میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سرورِ دو عالم کا فرمان ہے "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُؤْمِنٍ وَّمُؤْمِنَۃٍ"، (ہر مومن مرد و عورت پر علم کی طلب واجب ہے) اور یہ بھی فرمادیا کہ علم سے کیا مُراد ہے۔ "اَلْعِلْمُ نُوْرٌ یَّقْذِفُہُ اللّٰہُ فِیْ قَلْبِ مَنْ یَّشَآءُ" (علم وہ نور ہے جو اللہ ڈالتا ہے جس کے دل میں وہ چاہے) پس جو صدقِ دل سے طلب کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے دل میں نورِ ایمان و یقین القا فرما دے گا۔ اس یقین کے درجے بھی بہت ہیں۔ بعض ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

مدارجِ یقین

یقین کے مدارج تو بہت ہیں مگر ہمارے پاس اصطلاحیں صرف تین کیفیتوں کے لئے ہی ہیں۔

① ملازم میز پر چائے کی پیالی رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور یہ بہت گرم ہے۔ ہم نے جان لیا تیز گرم ہے۔ یہ علم الیقین ہے۔

② میز کے قریب آئے۔ پیالی پر نظر پڑی۔ بھاپ اٹھتی دیکھی۔ جان لیا کہ تیز گرم ہے۔ یہ عین الیقین ہے۔

③ پیالی کو ہاتھ سے چھوا یا ہونٹ سے لگایا۔ گرمی کا احساس ہوا۔ یقین ہو گیا تیز گرم ہے۔ یہ حق الیقین ہے۔

ایمان حقیقی اور وجود باری کے یقین قلبی کا دعویٰ کرنے والے سورہ حجرات کی دونوں آیات پھر دیکھ لیں جو اسی بیان میں نقل ہو چکی ہیں کہ اعراب کے دعوائے ایمان کی باری تعالیٰ نے تکذیب فرما دی اور یقین کی علامت بھی بتلا دی کہ یقین وہ ہے جس کے بعد شک کا امکان باقی نہ رہے اور یہ بھی ظاہر فرما دیا کہ یہ کیفیت جہاد بالنفس سے حاصل ہوتی ہے۔

ان آیات کے بعد مدعیان ایمان و یقین کے لئے ارشاد ہے:

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑯ الحجرات

(کہہ دو کیا تم اللہ کو اپنا دین جتاتے ہو اور اللہ تو جانتا ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ تو ہر شے سے واقف ہے)۔

اگر ہمیں دعوائے ایمان ہے تو رب کا کلام دیکھیں۔ وہ تو ایمان والوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:۔

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ⑬⑨ آل عمران

(ہمت نہ ہارو اور غم نہ کھاؤ۔ تم ہی غالب رہو گے۔ اگر تم مومن ہو)

خدارا کچھ تو سوچئے، ذرا تو سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ رب بھی ہمارا سچا، اس کا کلام بھی حق، ہم مومن بھی ٹھہرے، اگر واقعی ہم مومن ہیں تو پھر اہل مغرب کے آگے ہمارے سر کیوں جھکے ہوئے ہیں؟ جب مومن تھے تو دنیا کے سر علم اسلام کے آگے جھک گئے تھے۔ ذرا خلافت راشدہ کے زمانہ پر نظر ڈالئے، کیا قیصر و کسریٰ کی گردنیں مسلمانوں کے آگے جھک نہیں گئی تھیں؟ افسوس!

ہم ایسے مومن اور کیسے مسلمان ہیں کہ مومن ہونے کا دعویٰ کرکے مومنیت کی ڈینگ مار کر خدا کو اصدق الصادقین مانتے ہوئے اس کے کلام کی تکذیب کرتے ہیں۔ ہائے ہماری مسلمانی۔ وائے ہماری مومنیت! جنابِ ربّ العزّت اپنے حبیب کے صدقے سے ہمیں طلبِ نورِ ایمان کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!!

ممکن ہے بعض قارئین کو یہ خیال ہو جائے کہ جب منزلِ ایمانِ حقیقی اتنی بلند ہے کہ ہماری رسائی سے باہر ہے تو اس مذہب سے ہم کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ پیارا رب تو ارحم الراحمین ہے۔ اس کی رحمت اُس کے غضب سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس نے تو اپنے حبیب سے فرمادیا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ الزمر

(اے حبیب) کہہ دو اے میرے بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ اللہ تو سارے گناہ بخش دیتا ہے بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

وہ تو اپنی مخلوق پر بڑا مہربان ہے اس کی رحمت تو بخشش کا بہانہ تلاش کرتی ہے۔ موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے بندہ اس کی طرف دل سے توجہ ہی نہ کرے تو وہ کیا کرے۔ اس نے تو فرمادیا ہے "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" (دین میں زبردستی نہیں)۔ بندہ کو چاہیے اس کی توفیق و نصرت طلب کرتا رہے۔ اگر نورِ ایمان کی طلب صادق بھی پیدا ہو جائے تو نجات کا باعث ہو جائے گی۔

اب اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ نفسِ انسان کی فطرت ہے، جیسا کہ باب دوم میں بیان ہو چکا ہے، کہ یہ اپنی خواہشات و جذبات کی تسکین میں بندۂ ہوا و ہوس بنا رہتا ہے اور اسی کو قرآنِ کریم شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ ہر چند کہ انسان کی دنیاوی زندگی کا دار و مدار انہی خواہشات و جذبات پر ہے۔ مگر بے سوچے سمجھے ان کی پیروی کرنا ہی انسان کے مصائب و آلام و ہلاکت کا باعث بھی ہو جاتا ہے۔ روز مرّہ ایسے واقعات ہوتے

رہتے ہیں اور ہم دیکھتے ہوئے بھی سبق حاصل نہیں کرتے۔۔ ۱مارچ ۱۹۶۷ء کے اخبار جنگ میں ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:۔

ایک نوجوان تاجر اپنی بیوی کے ساتھ کار میں سوار گاڑی اُڑائے لئے جا رہا تھا (نفسِ امّارہ اکڑ رہا تھا کہ ہم فرّاٹے بھرتے جا رہے ہیں) نفسِ امّارہ سگریٹ پینے کا حکم دیتا ہے۔ نوجوان فوری تعمیل کرتا ہے۔ بغیر کار روکے یا رفتار کم کئے نفسِ امّارہ کا حکم بجالانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ تعمیلِ حکم میں ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر نہ ہو۔ بیوی غریب جو پاس بیٹھی ہے خبردار کرتی ہے کہ گاڑی روک کر سگریٹ جلاؤ۔ مگر نفسِ امّارہ کے حکم کے آگے کسی کا مشورہ کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ ایک تیلی جلائی اس سے سگریٹ نہ سُلگا، تو دوسری ماچس جلانے کی کوشش کی کہ کار نرسری کے قریب بجلی کے کھمبے سے ٹکرائی۔ نفس کا حکم ماننے والا نوجوان تاجر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا مگر بیوی صاف بچ گئی۔

اسی طرح کے واقعات روز مرہ ہوتے رہتے ہیں۔ باتیں ہو رہی ہیں کہ تلخ کلامی ہوگئی۔ چاقو نکالا مخاطب کو ہلاک کر دیا۔ گرفتار ہوئے پھانسی کی سزا پائی۔ اگر ضرب شدید لگادی تو جیل بھگت رہے ہیں۔ یہ سب ہوا پرستی کے نتائج ہیں۔ اگر نفس کی غفلت کم ہو جائے تو دُنیا میں مادّی نقصانات سے بھی محفوظ رہ سکیں اور نعیم اخروی سے بھی سرفراز ہوں۔ یہ غفلت ہی اس کی تباہی و ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ ہمارے مالک نے، جو ہم پر نہایت مہربان ہے، اس کا علاج بتادیا ہے۔ اس کا فرمان ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿٤٠﴾ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿٤١﴾ النزعات

(اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو اس کا ٹھکانا جنت ہے)۔

غفلت کا یہ بہترین علاج ہے کہ اس کی ہر خواہش پر اس کو ٹوکتے رہیں ہر حرکت سے پہلے اس سے یہ سوال کرلیں کہ یہ کیوں چاہتا ہے؟ صرف ٹوکتے رہنے سے ہی بہت سے مُضر اور بے فائدہ کاموں سے بچ جائیں گے۔ اس کی (۲) دو عملی مثالیں بھی ملاحظہ فرمائیں جن سے اسکی

اور وضاحت ہو جائے گی:۔

۱۔ یہ بندۂ حقیر ایک ملازمت پر تھا۔ وہاں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں میرے چند شاگرد بھی میرے ہمراہ رہتے تھے میرے ایک قریبی عزیز بھی چند روز کے لئے وہاں تشریف لے آئے۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو کہنے لگے: "بھائی صاحب میں جب گھر سے چلا سمجھے صاحب تو آپ کے فلاں دوست نے سمجھے صاحب دریافت کیا سمجھے صاحب کیا آپ بھائی صاحب کے پاس سمجھے صاحب تشریف لئے جا رہے ہیں سمجھے صاحب"۔ غرضکہ ان کے ہر فقرے میں ایک دو مرتبہ "سمجھے صاحب" کی تکرار ضرور ہوتی تھی، یہ ان کا تکیہ کلام ہو گیا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا اور سوچنے لگا یہ عادت کیسے چھڑائی جا سکتی ہے! اسی فکر میں تھا کہ کلام پاک کی تلاوت کرنے بیٹھا اور یہ آیت سامنے آئی۔ "وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ"۔ مالک کا شکر ادا کیا کہ اس نے مرض کا علاج بتا دیا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ جب ہمارے یہ بھائی صاحب آپ حضرات میں سے کسی سے گفتگو کریں اور دوران گفتگو "سمجھے صاحب" کہیں تو مخاطب فوراً کہے "نہیں سمجھے صاحب"۔ اس وقت سے یہ سلسلہ جاری ہو گیا دو روز تک تو عزیز محترم کو مخاطب کے "نہیں سمجھے صاحب" کہنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ تیسرے دن کچھ احساس ہونے لگا تو کہا کہ "میں نے تو سمجھے صاحب نہیں کہا"! دو روز برابر انکار ہی کرتے رہے۔ کہیں پانچویں دن یہ نوبت آئی کہ عزیز محترم کو اپنے "سمجھے صاحب" کہنے کا احساس ہونے لگا اور مخاطب کے "نہیں سمجھے صاحب" کہنے پر اعتراف کرنے لگے کہ "ہاں کہا"۔ غرض کہ اس کے تین دن بعد یہ تکیہ کلام ختم ہو گیا اور بحمداللہ صاف گفتگو کرنے لگے۔

۲۔ فارسی کی ایک درسی کتاب نظر سے گزری جس میں ایران کا ایک یہ واقعہ درج تھا۔ ایک شخص کو غصہ بہت آتا تھا۔ جوش غضب میں ہمیشہ ایسے کام کر بیٹھتا تھا جن کی وجہ سے بعد کو بہت تکلیف اور پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ بعض اوقات بڑا سخت نقصان ہو جاتا تھا۔ ایک روز کسی شدید نقصان سے پریشان ہو کر اپنے ایک دوست کے سامنے اپنے غصہ کا رونا رو دیا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس اس کی عجیب و غریب دوا ہے۔

غصّہ کا مخصوص اور حیرت انگیز علاج ہے۔ یہ کہہ کر وہ زنان خانہ میں گئے اور ایک بوتل دَوا سے بھری لے آئے اور کہا کہ اس بوتل کو ہر وقت اپنے پاس رکھو۔ جس وقت غصّہ آئے فوراً اس میں سے ایک گھونٹ پی لیا کرو۔ غصّہ ور صاحب بوتل لے کر چلے گئے اور دَوا کا استعمال شروع کر دیا۔ پندرہ سولہ دن میں دَوا ختم ہوگئی تو دوست کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ "بھائی آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ میرا غصّہ تو قریب قریب ختم ہی ہوگیا ہے اَب یہ بتاؤ کہ اس کی قیمت کیا ہے۔ ایک بوتل اور دے دو اور دونوں کی قیمت لے لو۔" دوست نے کہا "بھائی یہ تو سادہ پانی تھا یہ کیا فائدہ کر سکتا تھا۔ فائدہ تو اس وقفہ سے ہوا جو غصّہ آنے اور اس پر عمل کرنے کے دَرمیان حائل ہُوا۔

قُربان اس فاطرِ فطرت کے جس نے ہمیں نفس کے جذبات کا کیسا مُفید علاج بتا دیا کہ ہر خواہش وجذبہ پر اس کو ٹوکتے رہو۔ اس سے یہ مُراد تو نہیں کہ خواہش کی تسکین نہ کرو۔ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارا خالق تو یہ چاہتا ہے کہ ہر خواہش وجذبہ پر اس کو ٹوک دیں تاکہ اس کو کچھ ہوش آجائے اور اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کرنے سے بچ جائے۔ غفلت کم کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ آدمی تو جذبات کے ہاتھوں بالکل مجبور ہے جب بھی کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو یہ انجام کار سوچ ہی نہیں سکتا۔ مگر مالک کے بتلائے ہوئے علاج پر تو اس کو اختیار ہے۔ علاج نہ کرے گا تو اس کی سزا دُنیا میں بھی بھگتے گا اور آخرت میں بھی۔ یہی غفلت تو وہ نجاست ہے جس کے باعث یقینِ وجودِ باری ہمیں میسّر نہیں ہوتا اور ہم ہوا پرستی میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی کو قرآن نے شرکِ خفی قرار دیا ہے۔ "کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ میں " لَآ اِلٰہَ" کا مطلب قرآن وحدیث میں یہی بتایا گیا ہے کہ ہوائے ہوس کی بے چون وچرا تعمیل کر کے ہویٰ کو معبود نہ بنائیں۔

لائق غور اَمر ہے کہ خدا اور رسول ؐ نے ہمیں ہلاکت سے بچانے کے لئے جو طریقے اور علاج بتائے ہیں ہم میں سے کتنوں نے ان سے فائدہ اُٹھایا؟ ہم تو محروم ہی رہے اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے سامنے غلط مفاہیم پیش کئے جاتے ہیں مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ ہی دیکھ لیں۔ اکثر مترجمین نے " نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى" کا ترجمہ کیا ہے " اپنے

نفس کو بُری خواہشوں سے روکا۔" قارئین مندرجہ ذیل دو آیات دیکھ کر خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ ترجمہ صحیح ہے یا نہیں:۔

(۱) اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ البقرۃ

(جب کبھی آیا تمہارے پاس کوئی رسول ایسی چیز کے ساتھ کہ خواہش نہ کرتے تھے تمہارے نفس تو تم نے سرکشی کی کسی گروہ کو تم نے جھٹلایا اور کسی کو تم قتل کرتے رہے)۔

(۲) كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ المآئدہ

(جب کبھی آیا ان کے پاس کوئی رسول ایسی چیز کے ساتھ کہ خواہش نہ کرتے تھے نفس ان کے تو کسی گروہ کو جھٹلایا اور کسی گروہ کو وہ قتل کرتے رہے)۔

اِن آیات میں اگر "لَا تَهْوٰٓى" کا ترجمہ "بُری خواہش نہ کرتے تھے" کر دیا جائے تو تمام مفہوم ہی مہمل ہو جاتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

ہمارے اکثر قارئین تو سمجھ گئے ہوں گے کہ دلوں پر یہ کون سے قفل ہیں؟ کانوں پر کونسی مہریں ہیں اور آنکھوں پر کون سے پردے ہیں جن کے باعث حق نظر نہیں آتا؟ نہ حق سُن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ جن حضرات کی توجہ ادھر ہوئی ہو ان کے لئے مزید وضاحت کی ضرورت ہے لہٰذا چند سطور برائے افہام و تفہیم ہدیۂ قارئین کی جاتی ہیں:۔

ایک روز ایک فہیم دہریہ سلمان انگریزی ترجمہ کی حمائل لئے ہوئے آئے اور کھول کر میرے سامنے رکھ دی اور اس آیت کی طرف توجہ دلائی:۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۷﴾ بقرۃ

(اللہ نے مُہر کر دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے)۔

پھر کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی فرماتے ہیں کہ ہم نے کافروں کے دلوں پر مہر کر دی ہے، کانوں پر بھی مُہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی دلوں پر مُہر لگا دی کہ بُرا بھلا کچھ سمجھ ہی نہ سکیں اور حق و باطل میں تمیز نہ کر سکیں، کانوں

پر مُہر کر دی کہ حق سُن نہ سکیں اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تاکہ حق ان کو نظر ہی نہ آئے تو پھر رسولؐ کو کس لئے بھیجا اور ان غریبوں کا کیا قصور؟ آپ ہی تو راہِ ہدایت بند کریں اور پھر ان پر عذاب بھی کریں یہ تو بڑا ظلم ہے اور آپ کہتے ہیں کہ وہ عادل ہے۔

مَیں نے کہا پہلے ایک واقعہ سُن لیں پھر ایسا معقول جواب دیا جائے گا کہ تسکین ہو جائے گی۔ سُنیئے! میں ۱۹۴۴ء میں مشرقی پنجاب میں ایک مقام پر مہمان تھا۔ اس عمارت کے ایک کمرے میں تقریباً ڈھائی فٹ بلندی پر کئی کھڑکیاں تھیں جن میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ کھڑکیوں کے نیچے کمرے کے باہر تقریباً پانچ فٹ چوڑا پلیٹ فارم تھا جس پر فرش کر کے ہم بیٹھا کرتے تھے۔ وہیں مُلاقاتی آکر بیٹھتے۔ مہمان خانہ کی نگرانی وانصرام ایک نوجوان کے سپرد تھا۔ ایک روز وہ جناب میرے پاس بیٹھے تھے۔ دورانِ گفتگو کہنے لگے "ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" الخ، پوری آیت پڑھی اور کہا کہ اللہ نے دلوں پر کانوں پر مُہر کر دی۔ آنکھوں پر پردہ ڈال دیا یہ کہاں کا انصاف ہے۔ خود ہی مہر کریں اور خُود ہی عذاب کریں؟ سمجھ میں نہیں آتا"۔ مَیں نے کہا مجھے افسوس ہے کہ اس وقت آپ کے سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں اس لئے کہ اس آیت کی تو عملی تفسیر کی ضرورت ہے۔ محض نظریات و الفاظ سے اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اگر کسی دن اس کی عملی تفسیر سامنے آگئی تو آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ انتظار کیجئے۔ یہ سُن کر ان کو بہت کوفت ہوئی اور اُٹھ کر چلے گئے۔

مالک کا کرم دیکھیئے۔ اس گفتگو کے بعد تیسرا یا چوتھا دن تھا۔ مَیں وہیں ایک کھڑکی کے نیچے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کھڑکی کے اوپر ایک وال بریکٹ لگا تھا جس میں بجلی کا بلب تھا۔ مَیں نے دیکھا مہمان خانہ کے مہتمم صاحب تین نوجوانوں کو ساتھ لئے تشریف لا رہے ہیں۔ غالباً کسی شادی کے اہتمام میں مصروف تھے۔ قریب آکر کہنے لگے کہ اس وال بریکٹ میں سے بلب اُتارنا ہے۔ مَیں نے کہا آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں مَیں اُتارے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر مَیں سلاخ پکڑ کر کھڑکی پر چڑھ گیا۔ دُوسرے ہاتھ سے بلب نکالنا چاہا تو ہولڈر گھومنے لگا۔ مَیں اُتر آیا اور ان سے کہا یہ بلب نہیں نکل سکتا۔ آپ پوڑھی لے آئیں تب

اُتر سکے گا۔ بغیر اس کے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ ہولڈر گھوم رہا ہے۔ کہنے لگے واہ مَیں اُتارلوں گا۔ مَیں نے کہا بسم اللہ! چنانچہ وہ بھی ایک سلاخ پکڑ کر چڑھے۔ بلب اُتارنے کی کوشش کر کے ناکام واپس اُترے۔ مَیں نے پھر کہا کہ بھائی صاحب جب ہولڈر گھومتا ہے تو بلب کیسے اُترے گا۔ یہاں ایک ہاتھ سے تو سلاخ پکڑنی ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے بلب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب تک دونوں ہاتھ خالی نہ ہوں تاکہ ایک سے ہولڈر پکڑا جاسکے اور دوسرے ہاتھ سے بلب کو دبا کر گھوما کر نکالا جائے تب تک کامیابی نہیں ہوگی۔ ہمراہی نوجوانوں میں سے ایک صاحب کہنے لگے میں اُتار لاؤں گا میں نے کہا، بسم اللہ، چنانچہ وہ بھی سلاخ پکڑ کر چڑھے اور ناکام لوٹے۔ اب دوسرے ساتھی کو جوش آیا کہنے لگے تم لوگوں سے ذرا سا بلب نہیں اُترتا، دیکھو میں نکال لاتا ہوں۔ وہ بھی ناکام ہوئے۔ مگر تیسرے ساتھی اب بھی نہ سمجھے اور شیخی مارتے ہوئے کھڑکی پر چڑھے اور شرمندہ و ناکام لوٹے۔ غرضکہ اب ان میں سے ایک صاحب گئے اور ایک پوڑھی لے کر آئے جس پر چڑھ کر بلب اُتار لیا گیا۔

یہ حضرات اب بلب لے کر روانہ ہونے لگے تو مَیں نے مہتمم صاحب سے کہا، جناب تھوڑی دیر کو بیٹھ جائیے اور اپنے اس سوال کا، جو چند روز قبل آپ نے کیا تھا، جواب سُن لیجئے۔ آپ نے اس آیت کی تفسیر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی! تو وہ حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگے۔ بولے، مَیں نہیں سمجھا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مَیں نے کہا آپ حضرات نے کئی اشخاص کو بلب اُتارنے میں ناکام ہوتے دیکھا۔ مگر آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ایسا ہی ہوا گویا کہ دیکھا ہی نہ تھا۔ مَیں نے دو مرتبہ کہا کہ جب ہولڈر گھومتا ہے تو بلب کیسے نکلے گا۔ ایک مرتبہ تفصیل سے کہا کہ جب ہولڈر گھوم رہا ہے تو بغیر دونوں ہاتھ لگائے بلب نہیں نکل سکتا۔ کیا آپ لوگوں کے آٹھ کانوں میں سے کسی ایک نے سُنا؟ سُنا تو ضرور مگر نہ سننے کے برابر اور باوجود اس کے کہ مَیں نے ناکامی کا سبب تفصیل سے بیان کیا۔ کیا آپ کے چار قلوب میں سے کسی ایک نے بھی سمجھا؟ نہیں، بالکل نہیں۔ اب آیت کی تفسیر آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ یہ قانونِ فطرت ہے کہ جب کوئی خیال ذہن نشین ہو گیا ہو، کہ

یوں کروں گا تو یوں ہو جائے گا۔ پھر نہ کان سُنتے ہیں، نہ آنکھیں دیکھتی ہیں، اور نہ دل سمجھتا ہے یہاں تک کہ ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے اِس کی وجہ سے بعض اوقات شدید نقصانات ہو جاتے ہیں یہی عذابِ عظیم ہے۔

یہ واقعہ سُنا کر میں نے نیم دہریہ صاحب سے کہا کہ اب بھی آپ سمجھے کہ یہ کتاب فطرت ہے اور فطرتِ نفس بیان کر رہی ہے۔ یہ خواہشات و جذبات و تخیل کی مہریں ہیں جو عقلوں پر اور کانوں پر لگ جاتی ہیں۔ اور یہی وہ پردے ہیں جو آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں۔ یہ سُن کر کہنے لگے پھر یہ کیوں کہا گیا کہ اللہ نے مہر کر دی؟ ۔ میں نے کہا غور کرو اور نیک نیتی سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ دیکھو ہر ملک میں ایک قانون ساز جماعت ہوتی ہے۔ اور عموماً وہی اس ملک کی حکومت کہلاتی ہے۔ اس حکومت کے وضع کردہ قوانین کے تحت تمام ملک میں عملدرآمد ہوتا رہتا ہے۔ پولیس چور کو گرفتار کرتی ہے، مجسٹریٹ سزا کا حکم سُناتا ہے، جیلر سزا بھگتواتا ہے، یہ سب کس کے کام کہلاتے ہیں۔ کیا یہ تمام حکومت کے کام نہیں ہیں؟ جتنے کام بھی کسی قانون کے تحت ہوتے رہتے ہیں وہ اصل میں مقنن ہی کے کام ہوتے ہیں۔ اسی کی مثل جو کام تمام کائنات میں خدا کے قانون یعنی اصولِ فطرت کے تحت جاری و ساری ہیں، وہ سب خدا کے کام ہیں۔ جنابِ ربّ العزت کا ارشاد ہے "وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی" (وہ وہی ہے جس نے اندازہ مقرر کیا اور ہدایت کر دی)۔ انگریزی ترجمہ یوسف علی کا دیکھو،

(HE ORDAINED LAWS AND DIRECTED ACCORDINGLY)

(یعنی اس نے قانون بنائے اور ان کے مُطابق (ہر شئے) کو ہدایت کر دی) قرآن نے مہر کرنے کا سبب اور اس کی علّت کو بھی واضح کر دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے "طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ" (۱۷) محمد (اللہ نے ان کے دلوں پر مُہر کر دی کیونکہ انھوں نے اپنے جذبات کی پیروی کی) آپ نے دیکھا کہ دلوں پر مہریں کیسے لگیں؟ صرف بے سوچے سمجھے جذبات کی پیروی کرنے سے ایں کرو وہ شرمندہ ہوئے اور قرآن کی حقانیت کا اعتراف کیا۔

یہاں تک صرف یہی بیان ہوا کہ قرآن کریم کی تلاوت کس طرح کریں جس سے حقائق نظر آئیں۔ مگر بنیادی سوال ابھی باقی ہے کہ غیبِ محسوس کی طرف نفس انسان کے لئے

توجہ کرنا محال ہے تو مذہب کی طرف جس کا تعلق مطلقاً غیب ہی سے ہے اس کو کس طرح توجہ دلائی جائے۔ تو وہ بھی حسب فرمانِ ایزدی "وَ فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" (ہماری نشانیاں) خود تمہارے نفسوں میں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں؟) اپنے نفسوں ہی میں ملے گا۔ خالق نے علم حقائق اس پر الہام کر دیا ہے مگر اس کی غفلت کے سبب شعور میں نہیں آتا۔ غفلت والاشعوری اور شعورِ ظاہری کی کچھ تفصیل ابواب سابق میں گزر چکی ہے۔ مگر وہ شعورِ ظاہری کا ذکر تھا لیکن شعورِ حقیقی شعور باطنی ہے۔ جو کچھ اس کے اندر ہوتا رہتا ہے اس کا احساس ہونے لگے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ شعورِ باطنی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

شعورِ باطنی

باب دوم میں تمثیلوں سے واضح ہو چکا ہے کہ کسی خارجی شے سے نفس کو پہلے حس ہوتا ہے۔ پھر اس کو جانتا ہے کہ یہ کیا ہے یعنی وقوف ہوتا ہے۔ اگر اس سے قلب پر ناگواری یا خوشگواری کا اثر ہو تو احساس ہوتا ہے۔ اس کے بعد کوئی ردِ عمل ہوتا ہے۔ ان سب کا مجموعہ شعور ہے۔ مگر یہ شعورِ ظاہری ہے۔ حقیقی شعور تو شعور باطنی ہے جس کی چند تمثیلیں ہدیۂ قارئین ہیں:۔

(۱)۔ دیکھئے، میں کہتا ہوں "امیرت"۔ "امیرت"۔ "امیرت"۔ اس کے سننے سے نفس کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔ بلکہ آواز کان کے پردے سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہے۔ اب سنیئے! یہ شمالی برما میں ایک پھل ہوتا ہے۔ اب پھر سے سنیئے "امیرت"۔ "امیرت"۔ اب سننے والے ذہن میں تصویر ابھرے گی۔ یہ ہوا شعور۔

(۲)۔ سنیئے! "قنور"۔ "قنور"۔ "قنور"۔ سننے والے کو کچھ بھی حس نہ ہوگا۔ اچھا اب سنیں، یہ پرانے زمانہ میں ایک قوم کا ہتھیار تھا۔ اب سنیں "قنور"، "قنور" اب کچھ اثر ضرور ہوگا۔ وہ پہلی سی کیفیت نہ ہوگی۔ اچھا اگر کہا جائے کہ یہ ایک قسم کی تلوار تھی۔ بالکل سیدھی کرچ کی طرح جس کے دونوں طرف دھار ہوتی تھی۔ اب سنیں "قنور"، "قنور" اب تو ذہن میں پوری تصویر ابھرتی ہے۔ ایک ذہنی وجود پیدا ہو گیا۔ اس کا شعور ہوا۔

(۲) سُنئے! "مرگدار"۔ "مرگدار"۔ "مرگدار"! اس کے بار بار سُننے سے بھی نفس کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔ آواز کان سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہے۔ اچھا اب سُنئے! یہ وسطی افریقہ میں ایک درخت ہوتا ہے، اب سنیں! "مرگدار"۔ "مرگدار"! اب درخت کی ایک غیر معین شکل ذہن میں آتی ہے۔ اور سُنیں! اس درخت کا تنا تقریباً آٹھ نوفٹ اونچا، زمین کے قریب بہت موٹا، کچھ دور اوپر تک بھالے کی طرح ڈھالدار ہوتا ہے۔ اب سُنیں! "مرگدار"۔ "مرگدار"۔ "مرگدار"! اب صرف تنے کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے۔ اب آگے سُنئے! اس کے تنے کا رنگ جمے ہوئے خون کی مانند سیاہی مائل سُرخ ہوتا ہے۔ اس کے گُدّھے، شاخیں، پتے بالکل برگد کے درخت جیسے ہوتے ہیں۔ گدّھوں اور شاخوں کا رنگ سیاہی مائل سُرخ اور پتّوں کا رنگ بالکل تازہ گوشت جیسا ہوتا ہے، اب سُنیں! "مرگدار"۔ "مرگدار"۔ "مرگدار"۔ اب تو پورے درخت کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے۔ اور سُنیں! اس درخت کے گُدّھوں سے برگد کی داڑھیوں کی مثل سُرخ رنگ کی داڑھیاں رسّیوں کی مانند لٹکی ہوتی ہیں۔ اب سُنئے! "مرگدار"۔ "مرگدار"۔ "مرگدار"۔ اب تو پوری تصویر ذہن میں ابھرتی ہے۔ تنا۔ گُدّھے۔ داڑھیاں۔ پتّے وغیرہ تمام کے تمام ایک دفعہ ہی ذہن میں آتے ہیں۔

۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں لاہور کے ایک اخبار میں جس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا اس درخت کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا لب لباب یہ ہے کہ امریکہ کے علم نباتات کے دو ماہر (BOTONIST) پودوں اور درختوں کی تحقیقات کی غرض سے افریقہ آئے تھے جنگل میں گھومتے پھرتے درختوں اور پودوں کے متعلق معلومات اپنی نوٹ بک میں درج کرتے پھر رہے تھے کہ ایک جھیل کے قریب پہنچے اس کے دوسرے کنارے پر ایک عجیب وغریب درخت نے ان کی توجہ جذب کی۔ اس کے پتّوں اور گُدّھوں کا رنگ گوشت کی مثل تھا۔ گدّھوں اور پتّوں کی شکل بالکل برگد کے پتّوں کی مثل تھی۔ برگد کی داڑھیوں کی مثل اس کے گُدّھوں سے بھی سُرخ رنگ کی داڑھیاں رسّیوں جیسی لٹک رہی تھیں۔ دونوں ماہر اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ جھیل کے گرد گھوم کر اس کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ اس کا تنا بہت موٹا تقریباً نوفٹ اونچا ہے۔ دونوں ماہرین میں سے ایک تو جھیل

کے کنارے اُگے ہوئے پودوں کو دیکھنے لگا۔ دوسرا درخت کے نیچے جاکر اس پر غور کرنے لگا۔ ناگہاں درخت کی داڑھیاں حرکت میں آئیں اور تیزی سے اس ماہر نباتات (BOTONIST) کو لپیٹ لیا۔ وہ چلایا مدد ! مدد ! جلدی آؤ اس درخت نے مجھے کھالیا۔ دوسرا ماہر نباتات دوڑا ہوا آیا اور خنجر سے داڑھیوں کو کاٹ کر اپنے ساتھی کو درخت کے سایہ سے نکالا جب اس کے حواس درست ہوئے تو دونوں نے باہم مشورہ کیا یہ کیسے دیکھا جائے کہ یہ درخت کیا عمل کرتا ہے اس کو دیکھنا ضروری ہے۔ اس کی تحقیق کئے بغیر واپس ہونا اپنے مقصد ہی کو فوت کرنا ہے۔ ایک نے کہا ہمارے ساتھ کتے تو ہیں ان میں سے ایک کی قربانی دینی ہوگی۔ بس ایک کتے کو درخت کے نیچے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں داڑھیاں حرکت میں آئیں اور کتے کو لپیٹ لیا۔ اس کو بل دے کر اس پر لپیٹتی گئیں اور اوپر اُٹھاتی رہیں یہاں تک کہ کتے کو ایک گدّھے پر رکھ لیا۔ کتا چیختا چلاتا رہا۔ داڑھیاں اس کی کھال اور گوشت میں پیوست ہوتی رہیں اور کتے کا گوشت پوست پانی بنتا رہا جس کو داڑھیاں چوستی رہیں۔ یہاں تک کہ چند گھنٹوں میں صرف ہڈیاں رہ گئیں۔ داڑھیوں نے ان کو چھوڑ دیا وہ نیچے گر گئیں، اور داڑھیاں پہلے کی طرح نیچے لٹک آئیں۔

اب سُنئے ! "مرگدار"۔ "مرگدار" "مرگدار"۔ کہیئے کچھ احساس ہوا ؟ اب تو درخت کی پوری تصویر مع کتے کی شکل اور تمام کہانی کا فوٹو برق رفتاری سے دفعتاً ذہن میں آجاتا ہے۔ اس مضمون میں درخت کا کوئی نام نہیں دیا تھا لہٰذا ایک فرضی نام بندہ حقیر نے تجویز کر لیا ہے۔ اب سُنیں "مرگدار"۔ "مرگدار"۔ "مرگدار" کہیئے نفس نے کچھ لطف حاصل کیا۔ اس کا پورا شعور حاصل ہوا ؟ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَلِیِّ الْحَکِیْم

ذرا غور کریں کہ پرستان، پریاں، قنور وغیرہ ایسے الفاظ سُننے سے نفس کچھ اثر قبول کرتا ہے۔ کچھ نہ کچھ حس ضرور ہوتا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک کا بھی وجود حقیقی موجود نہیں۔ سب فرضی اسماء ہیں۔ اس تمام بیان سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ خواہ کسی شے کی کچھ حقیقت ہو یا نہ ہو اگر مادّی یا حسّی تمثیلات سے توجہ دلائی جائے تو نفسِ انسان میں کچھ نہ کچھ احساس ضرور پیدا ہو جائیگا۔ پس عالمِ غیب جو عالمِ نوری، حقیقتوں

کی حقیقت، تمام موجودات کی علّت ہے، اس کی طرف اگر کسی حِسّی تمثیلات کے ذریعے سے توجہ دلائی جائے تو نفسِ انسان میں اس کا احساس ہو جانا لازمی ہے۔

یہ تمثیلیں تو اشیاءِ مادّی کی تھیں۔ اَب کیفیاتِ نفسی کی بھی دو ایک مثالیں سُن لیں۔ مرزا غالب مرحوم کے دو شعر عرض کرتا ہوں ؎

"گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئی اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے"

اس شعر سے کوئی شخص اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہے کہ محبوب کے دَر پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ دربان اس خیال سے کہ یہ بھیک مانگنے والے ہیں، خاموش تھا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں ان میں ہم بھی کھڑے تھے کہ ہم نے دَربان کے پیر پکڑ لئے۔ تب اس نے سمجھا کہ یہ تو اندر جانا چاہتے ہیں۔ یہ چاہنے والوں میں سے ہیں۔ بس پھر نہ پوچھئے جو بے عزّتی ہوئی۔ اس شعر سے وہی شخص یہ مفہوم اخذ کرے گا جس کو مرزا غالب مرحوم کے اس شعر کا پتہ نہ ہو ؎

ہر چند ہو مُشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اَب تو مرزا صاحب کے مندرجہ عُنوان شعر میں مُشاہدۂ حق تلاش کرنے کی ضرورت ہوگئی۔ غور کریں گے تو نظر آجائے گا کہ اس شعر میں مرزا صاحب نے ایک کیفیتِ نفس بیان کی ہے جس کی شرح حسبِ ذیل ہے:۔

پہلے فطرتِ نفس کا مُطالعہ کریں۔ نفسِ انسان کے تمام خواہشات و جذبات کی بُنیاد اس کی خواہشِ بقا پر ہے۔ اور تسکینِ خواہشات و جذبات کو اپنی بقا کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے اگر ان کی تسکین نہ ہوگی تو میں فنا ہو جاؤں گا۔ لہٰذا جن ہستیوں یا چیزوں کو اپنی خواہشات و جذبات کی تسکین کا ذریعہ جانتا ہے اس کو محبوب ہوتی ہیں۔ ابتدا میں بچہ اپنے مربیوں کو اپنی ہر خواہش و جذبہ کی تسکین کا ذریعہ اور ہر شے پر قادر سمجھتا ہے۔ لہٰذا وہ محبوب ہوتے ہیں مگر جب ان کو بھی اکثر اُمور میں عاجز پاتا ہے تو اس کے نفس میں ایسی ہستی کی طلب ہوتی ہے جو ہر شے پر قادر ہو۔ پس جب اپنے مربّیوں کو اپنے پیشوایانِ دین اور معبودوں سے طلبِ حاجات کرتے دیکھتا ہے تو سمجھ لیتا ہے۔ یہ ہیں جو ہر شے پر قادر ہیں لہٰذا وہ نام اس کو محبوب ہو جاتے ہیں اور تکلیف کے وقت ان کو خود بھی پُکارنے لگتا ہے۔ ان کو اپنی ہر خواہش و جذبہ کی

تسکین کر دینے پر پوری قدرت رکھنے والا جان کر اپنی بقاء کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ غور کرنے سے یہ راز افشا ہو جاتا ہے کہ یہ ان ہستیوں کی محبت تو نہیں بلکہ اپنی خواہشِ بقا کی محبت ہے۔ ہر مسلمان واقف ہے کہ خدا اور رسولؐ اسی وقت یاد آتے ہیں جب کوئی شدت در پیش ہو۔ لہٰذا تمام مذاہبِ عالم کے پیرو اپنے پیشوایانِ دین اور اپنے معبودوں کو اسی لئے چاہتے ہیں کہ مصیبت کے وقت ان سے حاجات طلب کریں اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ سب بھک منگے ہیں۔ اصل دین تو محبوب پر فنا ہونے کی خواہش یعنی حبِ شدید ہے۔ عاشق تو محبوب کے در پر جان و دل نذر کرنے جاتا ہے نہ کہ حاجت طلب کرنے۔ (فطرتِ نفس کا یہ بیان بہ تفصیل اسی باب میں گزر چکا ہے)۔

چنانچہ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ تمام ادیانِ عالم کے پیرو مالک کے در پر کھڑے تھے۔ ان ہی بھکاریوں میں ایک میں بھی تھا۔ مگر مجھے مالک کی حبِ شدید کی طلب پیدا ہوئی اور حب اللہ نفس کی غفلت و لاشعوری کم ہوئے بغیر میسر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا میری طلبِ صادق پر رحمت جوش میں آئی اور مجھ پر مصائب و آلام کا ہجوم ہو گیا۔ یہ اس کا کرم ہے اس لئے کہ درد و الم سے ہی غفلت کم ہوتی ہے۔ مرزا صاحب نے اس ہجومِ آلام کی مرقع کشی ایک فارسی شعر میں خوب کی ہے ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز   شکستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

اب مرزا غالب کا ایک شعر اور بھی سن لیں ؎

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اس شعر کا مطلب الفاظ کے ظاہری مفہوم سے سمجھنا ممکن نہیں۔ بھلا نبردِ عشق میں سب سے پہلے پاؤں کیسے زخمی ہو سکتے ہیں۔ جب کسی کو کسی محبوب سے شدید محبت ہو جاتی ہے تو وحشت سوار ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جنون کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وحشت میں صحرا نوردی کرتا ہے تو سنگ و خار پیروں میں چبھتے ہیں۔ اس وقت پیر زخمی ہو جاتے ہیں مگر مرزا صاحب کہہ رہے ہیں کہ نبردِ عشق میں سب سے پہلے پیر ہی زخمی ہو گئے۔ دراصل

اس شعر میں مرزا صاحب نے ایک کیفیتِ نفس بیان کی ہے۔

قارئین پر واضح ہو چکا ہے کہ "میرے مذہب" کے جذبہ کی تسکین کے لئے اپنا مذہب ہر شخص کو پیارا ہوتا ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہم اپنے آبائی مذہب کو جو ہمیں بہت محبوب تھا یہ سمجھے ہوئے تھے کہ مالک کی بارگاہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ یہی ہے مگر جب یہ معلوم ہوا کہ مذہبِ حقہ تو اس کا عشق اور اس کی محبتِ شدید ہے جس سے غفلت و لاشعوری دور ہوتی ہے اور عالمِ غیب کا ادراک ہوتا ہے۔ اس وقت عشقِ حقیقی کی طلب پیدا ہوئی تو یہ نظر آیا کہ یہاں تو مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو آگ کا سمندر ہے اس میں کودنا ہمارے بس کی بات نہیں تو گھبرا گئے اور خیال آیا کہ اپنا وہ سیدھا سادا مذہب ہی اچھا تھا، چلو وہیں لوٹ چلو۔ عشقِ صادق کی طلب کو چھوڑو۔ مگر وہ مذہب (یعنی کچھ عقائد ذہنی کو مان کر چند رسوم عبادت کو صحیح جان لینا) تو لامذہبیت نظر آنے لگا۔ وہ قلعہ تو مسمار ہو گیا۔ اب جائیں تو کہاں جائیں۔ مرزا صاحب اس ہی کیفیت کو بیان کر رہے ہیں کہ جب محبتِ شدید کی طلب پیدا ہوئی فوراً "آتشِ عشق" کا سمندر نظر آیا تو گھبرا کر اپنے خیالات کو مذہبِ سابق کی طرف لوٹانا چاہا مگر وہ تو لامذہبیت نظر آنے لگا۔ اب نہ آگ میں کودنے کی ہمت نہ واپس لوٹ جانے کی جگہ۔ اس طرح نبردِ عشق میں سب سے پہلے پیر ہی زخمی ہو گئے۔ یہ سب سے پہلی کیفیت ہے جو مالک کی محبتِ صادق کی طلب پیدا ہونے پر نفس پر طاری ہوتی ہے۔

اب ذرا اپنے شیر دل علامہ اقبال" کی ہمت کی داد دیجئے۔ غالب تو گھبرا گئے اور آتشِ عشق میں کودنے سے پس و پیش کرنے لگے مگر یہ شیر کہتا ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

قارئین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ عالمِ غیب کا احساس پیدا کرنے کے لئے، اس کی طرف نفس کو توجہ دلانے کے لئے ضروری ہے کہ عالمِ محسوس کی تمثیلیں بیان کی جائیں جس سے غیب کی طرف رغبت ہو۔ اور عالمِ غیب کا ادراک و شعور حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو۔ غفلت و لاشعوری دور کرنے کی طلب پیدا ہو جائے جو محبت اللہ اور ایمانِ حقیقی کی طرف راہ دکھانے میں معین ہو، اور نفسِ انسان قوائے باطنی اور شعورِ حقیقی میں ترقی

کرتا جائے یہاں تک کہ اس منزلِ شعور پر پہنچ جائے کہ یہی سُنی ہوئی تمثیلیں حقیقت بن جائیں۔ ممکن ہے کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ اپنے نفس کی کیفیت پر غور کرے کہ جب وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ کوئی لذیذ غذا یا پھل کھا رہا ہے تو کیا تمام وکمال اسی کیفیت لذّت کا احساس نہیں ہوتا جیسا کہ بیداری میں اس کے کھانے کے وقت طاری ہوتا ہے؟

شعورِ باطنی کے متعلق تو کچھ بیان ہو چکا۔ اب شعورِ باطنی کے مختلف منازل کی تمثیلیں ملاحظہ ہوں۔

منازل شعور باطنی

علم النفس کے جلسہ میں ایک مقرّر تقریر کر رہا ہے۔ سامعین کو مخاطب کر کے وہ کہتا ہے "مَیں آپ کی قوّتِ شعور کا آپ کو احساس دلانا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص کو اپنی غفلتِ نفس کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے ہر شخص آنکھیں بند کر کے اپنے باطن کی طرف توجّہ کرے اور دیکھے کہ اس کے اندر کیا ہو رہا ہے"۔ پھر وہ دریافت کرتا ہے: "کیا آپ حضرات تیار ہیں؟" سب طرف سے آوازیں آتی ہیں: "ہم تیار ہیں"۔ یہ سن کر کہتا ہے "سنیئے اور اپنے اندر غور کیجئے۔ سنیئے! بادام، بادام، بادام، بادام، بادام" جلسہ میں سننے والوں میں سے ہر شخص پر اس کی اہلیت نفس کے مطابق اثر ہوگا:۔

(۱) ۔ جس کے نفس پر غفلت بہت زیادہ ہوگی اس کے ذہن میں بادام کا صرف تصوّر آئے گا۔ تصویر ذہن میں اُبھرنے کا احساس نہ ہوگا۔

(۲) ۔ کسی کے ذہن میں بادام کی خارجی شکل کی تصویر آئے گی۔ مگر سینہ کے اندر اُبھرنے والی تصویر کا احساس نہ ہوگا۔

(۳) کسی کو بادام کے چھلکے توڑنے اور گری کا بھی تصوّر ہوگا۔ بادام کی تصویر کے ساتھ چھلکوں اور گری کی تصویر بھی ذہن میں آئے گی۔

(۴) کسی کو ان سب تصاویر کے علاوہ گری بھگو کر چھلکا اُتارنے اور گری کے دو

ٹکڑوں کا بھی احساس ہوگا۔

(۵) کسی کو ان تمام کے علاوہ بادام کے ذائقہ کا بھی خفیف احساس ہوگا۔

(۶) کوئی ایسا بھی ہوگا جس نے بادام کا شیرہ بنا کر پیا ہوگا۔اس کو ان تمام احساسات کے علاوہ اس ذائقہ کا بھی احساس ہوگا۔

(۷) ایک شخص جس نے شربت بادام بھی پیا ہوگا اس کو مذکورہ بالا احساسات کے علاوہ اس ذائقہ کا بھی احساس ہوگا۔

(۸) ممکن ہے کوئی ایسا بھی ہو کہ حلوے میں کاٹ کر ڈالے ہوئے بادام کا بھی تصوّر اور ان کا ذائقہ اس کے ذہن میں آئے اور اس کے ساتھ حلوے کے ذائقہ کا بھی خفیف احساس ہو۔

(۹) کسی کو ممکن ہے کہ ان تمام کے علاوہ میٹھے چاولوں میں ڈالے ہوئے بادام کھانے اور اس کھانے کے ذائقہ کا بھی احساس ہو۔

(۱۰) جس شخص کے نفس پر غفلت بہت کم ہوگی اس کو تو تمام عمر میں جس جس طریقے سے اور جس جس غذا میں شامل کئے ہوئے بادام کھائے ہوں گے سب کا تصوّر ایک دم ذہن میں آئے گا۔اور ان تمام کھانوں کے ذائقوں کا بھی خفیف احساس ہوگا۔

یہ آخری منزل ہی شعور باطن کا کمال ہے۔جتنی غفلت کم ہوتی جائے گی اور نفس ترقی کرتا جائے گا اتنا ہی شعور بھی بڑھتا جائے گا۔یہاں تک کہ اگر غفلت بالکل زائل ہو جائے تو شعور کامل بھی منزل تام پر پہنچ جائے۔حد یہ ہے کہ حواس خمسۂ ظاہری کے ذریعے سے یعنی کھانے پینے سے، دیکھنے سے، سُننے سے، بولنے سے، سونگھنے سے، کسی عمل یا حرکت و سکون سے تمام عمر میں جو حظ و سرور نفس کو حاصل ہوئے ہیں۔ ان کا خیال آتے ہی ان تمام کیفیتوں اور سرور کا احساس ہو جائے شعور کامل کی اعلیٰ ترین منزل یہی ہے !ور یہی جنّت کی پست ترین منزل بھی ہے کہ جتنے خوشنما مناظر باغ باغیچے، نہریں، پھلواریاں، آبشار جو دیکھے ہوں یا جن کی تصاویر دیکھی ہوں جن کی تمثیلیں سُنی ہوں تمام و کمال اسی حقیقی کیف و لُطف کے ساتھ سامنے آجائیں؛ جو ان کو

دیکھتے وقت طاری تھا۔اب غور کریں کہ اس پست ترین منزل جنّت میں کیا نہیں ہے؟ کیا باغات، پھلواریاں، نہریں نہیں ہیں۔کیا سونے چاندی کے محلات نہیں ہیں۔کیا دودھ اور شہد کی نہریں نہیں ہیں؟ کیا حوریں اور غلمان نہیں ہیں؟ کیا سیب، بہی، انگور اور ہر قسم کے پھل نہیں ہیں۔وہ کونسی نعمت ہے جو کبھی چکھی ہو یا جس کی لذّت حاصل کی ہو یا جس کا ذکر ہی سُنا ہو اس جنّت میں موجود نہیں؟ سُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔تَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

کیا کوئی دہریہ بھی اس جنّت کا انکار کر سکتا ہے؟ حالانکہ یہ تو جنّت کی پست ترین منزل ہے۔ حقیقت نہیں۔حقیقت تو بہت بلند ہے۔انسان کے وہم و گمان سے بالاتر ہے۔جنابِ ربّ العزّت نے اپنے کلام پاک میں نعیم جنّت کی مادّی تمثیلیں اسی لئے بیان فرمائی ہیں کہ اس کے بندے جو شعور کامل حاصل کرلیں۔ان کے لئے حقیقت کی مثل ہو جائیں جس سے وہ عیش و راحت دائمی حاصل کر سکیں۔ دیکھیں آیاتِ قرآنی:۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِیْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚ۬ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ (۱۵) محمد

(اس جنّت کی مثال جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے (ایسی ہے) اس میں غیر بودار پانی کی نہریں ہیں اور دودھ کی نہریں جس کا ذائقہ نہیں بدل سکتا۔اور شراب کی نہریں جس کے پینے والوں کو لذّت ہی ہے اور صاف و شفاف شہد کی نہریں ان کے لئے وہاں ہر قسم کے پھل اور (اصل شے) ان کے رب کی مغفرت ہے)۔

فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۙ (۲۸) وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۙ (۲۹) وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۙ (۳۰) وَّ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ۙ (۳۱) وَّ فَاكِهَةٍ كَثِیْرَةٍ ۙ (۳۲) لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ۙ (۳۳) وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ (۳۴) اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۙ (۳۵) فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۙ (۳۶) عُرُبًا اَتْرَابًا ۙ (۳۷) لِّاَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ؕ (۳۸) الواقعہ

(بے کانٹوں کی بیریوں میں اور لدے گچھے کیلوں میں اور لمبی لمبی چھاؤں میں اور جھرنے کے پانی اور میووں کی بہتات میں۔جو نہ ختم ہوں نہ ان کے لئے روک ٹوک اور

اُونچے اونچے فرشوں میں۔ ہم نے انھیں جدید خلقت میں خلق کیا کنواریاں اور ہم جولیاں بنایا (یہ سب کچھ کس کے لئے) اصحابِ یمین کے لئے ہوگا)۔

قارئین پر واضح ہوچکا ہے کہ نعیم جنّت کے ذکر کی آیات کی تلاوت کرنا نہایت مُفید ہے۔ ممکن ہے کسی وقت ان کا شعور حاصل ہوسکے۔ اسی لئے چاہتا تھا کہ کم از کم ساٹھ آیات تذکرۂ جنّت کی نقل کر دوں مگر اصل مقصد کا تسلسل اس سے قطع ہوتا ہے، وہ تمام آیات تو آپ قرآن کریم میں تلاوت کرتے رہتے ہیں۔

لیجئے بحمدُ للہ جنّت کی پست ترین منزل واضح ہوگئی۔ اس سے اعلیٰ منازل اِنشاءاللہ آئندہ ابواب میں ظاہر کئے جائیں گے۔ جنّت کی اس تفسیر پر بعض لفظ پرست ضرور معترض ہوں گے کہیں گے کہ یہ تو قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ یہ تو مادّی اور حسّی جنّت سے جس کا ذکر تمام قرآن اور بہ کثرت احادیث متواترہ میں وارد ہے صاف اِنکار اور کھلا کفر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ قرآن و حدیث سے کھلا انکار ہے یا لفظ پرستی خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف ہے؟

غور کیجئے کہ جناب باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ نے نعیم جنّت کی تمام تمثیلیں بیان فرمانے کے بعد یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾ السجدة

(کوئی نفس نہیں جانتا اس کو جو چھپا کر رکھا گیا ہے ان کی خنکیٔ چشم کا سامان اس کے بدلے میں جو وہ عمل کرتے رہے)۔

اس فرمانِ ایزدی سے واضح ہوجاتا ہے کہ جنّت کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے جو کچھ ہماری سمجھ میں آتے وہ حقیقت نہیں۔ وہ تو تمثیلیں ہیں۔ جیسا کہ سورۂ محمد میں ارشاد ہے "مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي (اس جنّت کی مثال ایسی ہے)۔ اب جہالت و تاریکی کا زمانہ نہیں رہا۔ یہ تو علم و حکمت، عقل و سائنس کا زمانہ ہے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص سمجھ سکتا ہے کہ غیر محسوس عالم کے لئے جو کچھ بھی الفاظ میں بیان ہوگا ان الفاظ کے ظاہری معنی

مُراد نہ ہوں گے اور وہ حقیقت نہیں ہو سکتی۔ عالم غیب کا تو ذکر ہی کیا انسان اپنے نفس کے احساسات کو بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اگر کیفیاتِ نفس کا بیان کیا جائے گا تو الفاظ کے ظاہری معنی مُراد نہ ہوں گے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ احادیث میں مادّی اور حسّی جنّت کا بیان کیا گیا ہے افسوس ہے کہ ان کو یہ حدیث قدسی نظر نہیں آئی۔

بخاری اور مسلم میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی نعمتیں تیار کی ہیں جو نہ آنکھوں نے دیکھیں اور نہ کانوں نے سُنیں اور نہ کسی بشر کے دل پر ان کا خیال گزرا۔ (مَا عَیْنٌ رَأَتْ وَمَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَمَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ)۔ اس حدیث سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہماری سمجھ میں آئے وہ جنّت نہیں۔ وہ نعمات تو ہمارے وہم و گمان کی رسائی سے باہر ہیں۔

اگر معترضین کو اسی پر اصرار ہو کہ قرآن و حدیث کے الفاظ کے ظاہری مفاہیم پر ایمان لانا ضروریاتِ دین سے ہے۔ اس سے اعراض کرنا گمراہی ہے تو وہ سورہ یٰسین کی مندرجہ ذیل آیات کا مفہوم بتائیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ⑧ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ⑨ یٰسین

(ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں۔ وہ ٹھڈیوں تک ہیں۔ پس وہ گردنیں اُٹھائے ہوئے ہیں (سر جھکا نہیں سکتے) ہم نے ایک دیوار ان کے آگے قرار دی اور ایک دیوار ان کے پیچھے قرار دی اور پر سے ان کو ڈھانک دیا۔ پس وہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے)۔

اگر ان آیات میں الفاظ کے ظاہری معنی مُراد لئے جائیں اور ان کو حقیقت سمجھ لیا جائے تو معاذ اللہ اس کا کلام مہمل ہو جاتا ہے۔ یہ تو کیفیاتِ نفسی ہیں اور نفس کی غفلت اور لاشعوری کا بیان ہے۔ جنابِ ربّ العزّت نے اپنے بندوں کے اوصاف سورہ فرقان کے آخری رکوع میں بیان فرمائے ہیں کہ عباد الرحمٰن کن کن صفات سے متصف ہوتے ہیں۔ ان کے

منجملہ ایک وصف یہ بیان کیا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۷۳)

الفرقان‘ (وہ لوگ کہ ان کو جب ان کے رب کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے یا یاد دلائی جاتی ہے) تو وہ ان پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے)۔

اب لفظ پرستی پر اصرار کرنے والے بتائیں کہ یہاں اندھے بہرے ہو کر گرنے کا کیا مطلب ہے۔ سوائے اس کے اس کا کوئی اور مفہوم ہو ہی نہیں سکتا کہ الفاظ کے ظاہری مفاہیم کو حقیقت نہیں جان لیتے بلکہ عقل و فطرت کی روشنی میں چشمِ بصیرت کھول کر دیکھتے ہیں اور اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس آیت سے ظاہر ہو گیا کہ متشابہ آیات کے الفاظ کے ظاہری معنی کو حقیقت سمجھنے والے عباد الرحمٰن نہیں ہیں۔

اب تو قارئین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ یہ عقیدہ کہ قرآن و حدیث کے ظاہری مفاہیم پر ایمان لانا ضروریاتِ دین سے ہے اور اس میں تاویل کرنے والا گمراہ ہے۔ کلام اللہ کے خلاف ہے۔ بابِ اوّل و دوم میں واضح ہو چکا ہے کہ جنّت، دوزخ، برزخ، اعراف اور عالمِ غیب کے تمام متعلقات غیر محسوس عالم سے تعلق رکھتے ہیں ان کے متعلق جو کچھ بھی بیان ہو گا وہ متشابہ ہو گا اور تمثیلیں ہوں گی۔ حقیقت نہیں ہو سکتی۔ اور جناب باری تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ متشابہات کی پیروی وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے یعنی جو گمراہ ہیں۔ اور متشابہات کی پیروی یہی ہے کہ ان کو حقیقت اور واقعات سمجھ لیا جائے ورنہ وہ عمل کے لئے تو ہیں ہی نہیں کہ ان پر کوئی عمل کر کے پیروی کر سکے۔

جنّت کا بیان تو قریب ختم ہے۔ مزید اطمینان کے لئے چاہتا ہوں ایک آیت اور پیش کر دی جائے۔ ارشادِ باری ہے:۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (۲۱) الحدید

(دوڑو اپنے رب کی بخشش کی اور جنّت کی طرف جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی مثل ہے جو ان ہی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر

ایمان لاتے ہیں)۔

باب اوّل میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ محض ایک حسِ لمس کے ہزارہا احساسات میں سے ایک ظاہری چبھن کی کیفیات کا بھی احصا کرنا محال ہے تو پھر حواسِ خمسہ ظاہری اور باطنی سے جو حظ و سرور کے احساسات پیدائش سے آخر عمر تک ہوتے رہے ہیں جن کے خزانے نفس میں جمع ہیں اگر ان کو پھیلایا جائے تو کیا اس نظامِ شمسی کی وسعت ان کا احصا کر سکتی ہے؟ نہیں یہ تو ممکن ہی نہیں۔ جب منازلِ شعور کمال کو پہنچ جائیں تو احساسات کی کیفیات کا احصا ممکن نہیں۔

اس تمام تفصیل و تشریح کے بعد مکرّر عرض کر دینا ضروری ہے کہ جنّت کی تفسیر میں جو کچھ لفظوں میں بیان ہو سکتا ہے وہ حقیقت کے قریب تو ہو سکتا ہے مگر حقیقت نہیں ہو سکتا۔ اس پست ترین منزل سے اعلیٰ منازل بھی قرآن نے بیان کر دی ہیں۔ مثلاً فِيهَا مَا يَشَاءُونَ وَلَهُمْ فِيهَا مَا يَشْتَهُونَ (۱۶) الفرقان (وہاں وہ جو چاہیں موجود۔ وہاں ان کو جس کی خواہش ہو موجود)۔ مگر جنّت کی اعلیٰ ترین منزل جو حقیقت ہے اتنی بلند ہے کہ وہاں انسان کے عقل و فہم حتیٰ کہ وہم کی بھی رسائی ممکن نہیں کس کی مجال کہ اس منزل کا تصور بھی ذہن میں لا سکے۔ آئندہ ابواب میں کچھ مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی فسبحان اللہ عما یصفون۔

جہنّم اور اس کا عذاب

جہنّم اور اس کے عذاب کا تعلق بھی احساسِ غیب ہی سے ہے۔ شعور کی منازلِ کمال کا تذکرہ تو ہو چکا اب لاشعوری کی پست ترین منازل کا ذکر ہے۔ اگر کوئی نفس اس دنیاوی زندگی میں شعور حاصل کرنے کی طرف راغب نہ ہوا اور ایسے اعمال کرتا رہا جن سے غفلت زیادہ ہوتی رہتی ہے اور بغیر طلبِ مغفرت مر گیا تو موت کے بعد اس کو کسی طرح کا سرور میسّر نہ ہو سکے گا۔ سب سے پہلی آگ جو اس کو جلانے والی ہوگی وہ آتشِ حسرت ہے کہ وہ اس آگ میں جلتا رہے گا۔ جب کوئی شخص غفلت میں ایسا کام کر بیٹھتا ہے جس سے ایسا سخت نقصان ہو جاتا ہے جس کی تلافی محال ہو تو قلب و جگر میں آگ سی لگ جاتی ہے اور ہر دم تڑپتا رہتا ہے۔ یہ آگ ظاہری آنکھوں سے تو نظر نہیں آتی اگر باطنی آنکھیں کھل

جائیں اور جناب باری تعالیٰ نورِ بصیرت عطا فرمادے تو اس آگ کے شعلے نظر آنے لگیں۔ یہ جہنّم کی پست ترین منزل ہے سکونِ قلب کا فقدان، دل کی تڑپ اور اضطرار کا لاحق رہنا اس عالم کا جہنّم ہے۔ اسی کو جناب ربّ العزّت نے سورہ ق میں بیان فرمایا ہے:۔

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ (۳۰) ق

(جب ہم جہنّم (ہوسِ نفس) سے کہتے ہیں کیا تو بھر گئی تو وہ کہتی ہے کیا کچھ اور بھی زیادہ ہے)۔

موت کے بعد عالم برزخ میں جہنّم کی پست ترین منزل ایک آتشِ حسرت بھی ہے۔ جیسا کہ جناب ربُّ العزّت کا فرمان ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ (۱۶۵) إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ (۱۶۶) وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ (۱۶۷) البقرۃ

(اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو خدا کے سوا غیر اللہ کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبّت کرتے ہیں جیسی کہ خدا سے کرنی چاہیئے اور جو ایمان لائے ہیں وہ تو اللہ کی محبّت میں بڑے شدید ہیں۔ اور کاش یہ ظالم جان لیتے اس وقت کو جب عذاب دیکھیں گے (تو جانیں گے) کہ سب قوّت خدا ہی کو ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ جب وہ لوگ جن کی (دُنیا میں) پیروی کی گئی تھی پیروی کرنے والوں سے بیزاری ظاہر کریں گے اور عذاب کو دیکھیں گے اور ان سے نجات کے تمام اسباب قطع ہوجائیں گے اور پیروی کرنے والے کہیں گے کاش ہم کو لوٹ کر (دُنیا میں) جانا مل جائے تو ہم بھی ان سے ایسی ہی بیزاری کریں۔ جیسی ہم سے انھوں نے کی۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا اور وہ اس آگ سے کبھی نہ نکل سکیں گے)۔

یہ آیت جب سامنے آئی ربّ العزت کی قسم رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اللہ اکبر ہم کیسی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ باب دوم میں حُبّ شدید کی علامت کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ ہمارے مالک نے حُبِّ شدید کی یہ علامت بیان فرمائی ہے کہ جب خدا کی یاد دلائی جائے تو قلب پر رُعب طاری ہو جائے ''وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ'' (ان کے دل لرزیں)۔ آیہ مذکورہ بالا میں جو ارشاد ہے کہ غیر اللہ کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ پھر اس کی وضاحت فرمادی کہ شریک ٹھہرانے سے کیا مُراد ہے۔ کس طرح شریک ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبّت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیئے اور حُبِّ شدید کی علامت قلب کا لرزنا۔ پس اگر یہ کیفیتِ رعب غیر اللہ کے لئے طاری ہو تو شرکِ خفی میں مبتلا ہو کر ''يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ'' (ان سے ایسی محبّت کرتے ہیں جیسی اللہ سے) کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ کیفیت اللہ کے لئے تو ہمارے قلوب پر طاری نہیں ہوتی مگر بعض غیر اللہ کے لئے طاری ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنے نفس سے محاسبہ کر کے دیکھ سکتا ہے۔

اس آیت میں اندھی تقلید کی بھی مذمّت کی گئی ہے۔ معاملاتِ دینی میں تقلید اسی کی کرنی چاہیئے جو سُنّتِ رسول ؐ پر عامل ہو۔ سادہ زندگی گزارتا ہو۔ مال دُنیا کا لالچی نہ ہو۔ حضرت فاروق اعظم رضؓ نے پیروی سُنّتِ رسول ؐ کا عملی مظاہرہ ہمیں دکھا دیا ہے۔ جو قرآن و سُنّت کی پیروی کی زبانی تعلیم دیتے ہیں اور خود عامل نہیں۔ وہ تو اس آیت کے مصداق ہیں:۔

أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ..... الخ (۴۴) البقرة

(کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھلائے ہوئے ہو (تا آخر)

اندھی تقلید کا نتیجہ اس آیت میں دیکھ لیں کہ جن کی دُنیا میں اندھی تقلید کی گئی تھی آخرت میں وہ اپنی پیروی کرنے والوں سے بیزاری ظاہر کریں گے تو پیروی کرنے والے آتشِ حسرت میں جل رہے ہوں گے۔ اب اس آتشِ حسرت کے لئے ایک اور آیت بھی دیکھ لیں:۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ (۱) نِ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (۲) يَحْسَبُ

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ﴿٣﴾ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴿٤﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ
نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ﴿٥﴾ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ﴿٦﴾ الھمزۃ

(ویل ہے ہر عیب جو طعنہ دینے والے کے لئے جس نے مال جمع کیا اور اس کو شمار کرتا رہا۔ وہ گمان کرتا ہے اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا؟ ہرگز نہیں! وہ تو حطمہ میں ڈال دیا جائے گا اور تم کیا جانو وہ حطمہ (بھسم کرنے والی) کیا ہے۔ وہ اللہ کی بھڑکائی آگ ہے جو دلوں پر چھا جائے گی)۔

اس سورے میں ربّ العزّت نے مال جمع کرنے والوں کی غالباً موت کے وقت کی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ مرتے دم وہ ان کے سامنے ہوگا اور حسرت میں تڑپ رہے ہوں گے کہ ہائے افسوس یہ تمام عمر کا جمع کیا ہوا اب ہم چھوڑے چلے جا رہے ہیں۔ یہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آتشِ حسرت ہی ہو سکتی ہے جو دلوں پر چھا جائے گی۔ دل پر چھا جانے والی آگ آتشِ حسرت ہی ہو سکتی ہے اور یہ دُنیا کا جہنّم ہے۔ عالمِ برزخ کے جہنّم کے لئے بھی کچھ تحریر کرنا ضروری ہے۔

۱۹۱۳ء میں ایک کتاب "حیات بعد الموت" نظر سے گزری جو ایک انگریز خاتون کی تصنیف کردہ (LIFE AFTER DEATH) کا ترجمہ تھا۔ اس کتاب میں مصنّفہ نے اپنے بہت سے مشاہدات و تجربات دُرج کئے ہیں۔ جن سے منجملہ ایک یہ تھا کہ میرا ایک بھائی بہت شراب پیتا تھا۔ وہ چین جانے کے لئے جہاز پر سوار ہوا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے عالمِ بیداری میں دیکھا کہ میرا وہ بھائی میرے سامنے کھڑا ہے اور اس کے ہر بن مُو سے شعلے اور آگ کی چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ پھر وہ غائب ہو گیا۔ میں نے وقت اور تاریخ دُرج کر لی اور ہانگ کانگ ایک ٹیلیگرام دیا۔ کچھ عرصہ بعد جواب آیا کہ تمہارا بھائی بہ کثرت شراب پینے سے فوت ہو گیا۔ تاریخ اور وقت جو جواب میں دُرج تھا وہی تھا جس وقت وہ مجھے نظر آیا تھا۔

یہ جہنّم کی پست ترین کیفیت ہے جو عالمِ برزخ میں یعنی موت کے بعد سے قیامت تک کے وقفہ میں طاری رہے گی۔ العیاذ باللہ! اسی جہنّم کا بیان سورہ نوح کے آخری رکوع میں کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:-

مِمَّا خَطِيْئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۶﴾ نوح

(وہ اپنے گناہوں کی بدولت ڈبا دیے گئے۔ پھر جہنّم (یا آگ) میں ڈال دیے گئے تو انھوں نے خدا کے سوا کسی کو مددگار نہ پایا)

ابھی یہ اصل جہنّم نہیں ہے وہ تو قیامت کے بعد ہوگا۔ یہ تو صرف عالمِ برزخ کے جہنّم کا ذکر ہے۔ عذابِ جہنّم کی تفصیل لکھتے ہوئے خوف طاری ہو جاتا ہے۔

قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ نفسِ انسان جو کیفیت بھی سنتا ہے، خواہ وہ حظ و سرور کے متعلق ہو یا درد و الم کے، اس کا نقش اس پر بن جاتا ہے۔ پس اگر نفس سے غفلت دُور ہو جائے تو موت کے بعد حظ و سرور کی کیفیات حقیقت بن کر اس پر طاری رہیں گی اور اگر خدانخواستہ غفلت کم نہ ہوئی تو موت کے بعد عالمِ برزخ میں قیامت تک درد و الم اور عذاب کے متعلق سُنی ہوئی کیفیات حقیقت بن کر وقتاً فوقتاً وارد ہوتی رہیں گی۔ عالمِ برزخ ایک طویل خواب ہے جس سے قیامت ہی میں جاگیں گے۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ جب خواب میں کسی حظ و سرور یا درد و الم کی کیفیت دیکھتا ہے تو حالتِ خواب میں اس کا ایسا ہی اثر محسوس ہوتا ہے جیسا کہ جاگتے میں حقیقتاً وارد ہونے سے ہوتا ہے۔ میں خود اپنا ہی ایک مشاہدہ پیش کرتا ہوں:۔

"ایک شب خواب میں دیکھا کہ ایک لوہار کی بھٹی کے قریب کھڑا ہوں۔ لوہار نے لوہے کی دو سلاخیں بھٹی میں سے نکالیں جن کا ایک سرا سُرخ ہو گیا تھا اور وہ دونوں سرے میری کمر پر لگا دیے۔ اس سے اتنی سخت اذیت محسوس ہوئی کہ ایک چیخ ماری اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ پھر بہت دیر تک سوزش محسوس ہوتی رہی۔"

اسی طرح جہنّم کے عذاب کے متعلق جو کچھ بھی سُنے گا، فاسق کے لئے عالمِ برزخ میں حقیقت بن جائے گا اور حقیقت کی مثل ہی اذیت ناک کیفیات کا اس کو احساس ہوتا رہے گا۔ اسی سبب سے عذابِ جہنّم کے متعلق جو آیات ہیں ان کو لکھتے ہوئے قلم کو لرزہ

ہوتا ہے قلب کانپتا ہے۔ جناب ارحم الراحمین ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں شرِ نفس اور شرِ شیطان سے محفوظ رکھے۔

یہ جو کچھ بیان کیا گیا یہ تو دُنیا اور عالمِ برزخ کا جہنم ہے۔ قیامت کے بعد کے جہنم کا جب سامنا ہوگا اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ ہزارہا اقسام کے عذاب ہیں جن کا تصوّر محال ہے۔ تمام فضائے بسیط (UNIVERSE) میں ستاروں اور سیاروں کے ٹکڑے ٹکرا رہے ہوں گے، ان کے ایٹم پھٹ رہے ہوں گے اور کروڑوں درجہ کی حرارت میں اہلِ جہنم جلتے بھنتے چلا رہے ہوں گے، کوئی فریاد سننے والا نہ ہوگا۔ آئندہ ابواب میں اس کی کچھ مزید تفصیل آئے گی۔ رَبِ کریم اپنے فضل و کرم سے توفیقِ خیر عطا فرمائے اور اپنے عذاب سے اپنے دامنِ رحمت میں پناہ دے اور ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ۔

جنّت اور جہنم کی تفصیلات پر جو قرآن و حدیث میں بیان کی گئی ہیں متشککین اور دہریوں کی طرف سے اعتراضات ہوتے رہتے ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے اعتراضات مع تفصیلی جواب ہدیۂ قارئین کئے جائیں۔

سوالات:

(۱) ۔ اس زمانہ میں دُوربینوں کے ذریعے سے کائنات کے بہت سے حصّہ کے متعلق معلومات حاصل کر لی گئی ہیں مگر جنّت کا اب تک کہیں پتہ نہ چل سکا۔ نیز جب جنّت کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کے برابر ہے تو لمبائی کتنی ہوگی اور وہ کہاں سمائے گی؟

(۲) ۔ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ جنّت ساتویں آسمان کے اوپر ہے اور جہنّم ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ پھر اسی کتاب میں یہ بھی موجود ہے کہ جنّت و جہنّم کے درمیان ایک دیوار ہے جس کو اعراف کہتے ہیں اور یہ کہ جہنّم پر ایک پُل رکھا جائے گا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے اس پر سے ہر شخص کو گزر کر جنّت میں جانا ہوگا۔ ان بیانات پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

(الف) جب جنّت ساتویں آسمان پر اور دوزخ زمین کے نیچے ہے تو وہ دیوار جس کو

اعراف کہتے ہیں کس طرح بنے گی اور کیسے کھڑی ہوگی؟

(ب)۔ قرآن میں ہے "فِیْ جَنّٰتٍ یَتَسَآءَلُوْنَ" (۴۰) المدثر۔ (اہلِ جنت اہلِ جہنم سے سوال کرتے ہوں گے) "مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ" (۴۲) المدثر (تم کو کونسی چیز جہنم میں لے آئی) اور وہ جواب دے رہے ہوں گے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ ساتویں آسمان کے اوپر اور ساتویں زمین کے نیچے تک کیا ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون سٹ لگائے جائیں گے جن کا ذکر کہیں نہیں ملتا؟

(ج)۔ یہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کا عقیدہ جو ہزاروں سال پرانے فلسفۂ قدیم پر مبنی ہے جو مدت ہوئی باطل ثابت ہو چکا۔ اس پر جس مذہب کی بنیادیں قائم ہوں وہ تو احمقوں کا مذہب ہی ہو سکتا ہے۔ صاحبانِ علم و فہم تو اس کو مضحکہ خیز ڈھکوسلے ہی سمجھیں گے۔

(د)۔ جب اللہ تعالیٰ سب کے اعمال بھی تول چکیں گے، حساب کتاب بھی کر چکیں گے، پھر صراط پر دوڑا کر یہ نٹ کا تماشہ دیکھنے سے کیا فائدہ؟ یہ تو بنیوں کا جیسا کام ہے کہ بہی کھاتہ کا حساب کر کے پھر اس کو جانچنا ضروری ہوتا ہے کہ کہیں غلطی نہ رہ گئی ہو۔ اللہ میاں کو اعمال تولنے اور حساب کر لینے کے بعد بھی اپنے حساب پر شک رہ جائے گا جس کے لئے جہنم پر پل رکھ کر لوگوں کو دوڑا کر دیکھیں گے؟

(ر)۔ جب جہنم پر پل رکھا جائے گا جو ساتویں زمینوں کے نیچے ہے اور جنت ساتویں آسمانوں کے اوپر تو وہ پل تو لٹکا ہوگا اس پر چلیں گے کیسے؟

(س)۔ زمین و آسمان کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ قیامت میں تباہ ہو چکے ہوں گے پھر آسمانوں اور زمینوں کا تذکرہ مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے؟

(۳)۔ تمام علمائے اسلام حدوثِ عالم کے اثبات میں یہی کلیہ پیش کرتے رہے ہیں کہ ہر چیز جس میں تغیر ہو وہ حادث ہے (کُلُّ مُتَغَیِّرٍ حَادِثٌ) ایسی چیزیں جس میں تغیر واقع ہو نہ ہمیشہ سے ہو سکتی ہے اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتی ہے پھر نعیمِ جنت کے استعمال اور حورانِ جنت سے وصال بغیر تغیر کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ ہر امر میں دو حال ہو سکتے ہیں۔ پینے کا وقت اور نہ پینے کا، کھانے کا وقت اور نہ کھانے کا، وصال کا وقت اور جدائی۔ یہ تمام تغیر ہی تغیر ہے۔ پھر جنت کا ہمیشہ ہمیشہ

باقی رہنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے ؟

(۴)۔ جنّت میں جو پھل بیان کیے گئے ہیں وہ تو صرف عرب کے ہیں۔ آم، خوبانی، ناشپاتی بادام وغیرہ تو وہاں ہوں گے ہی نہیں۔ ان کو اہلِ جنّت سدا ترستے ہی رہیں گے ؟

(۵)۔ تمام علماء اسلام کا اس پر اتّفاق ہے کہ جنّت میں ایک ایک مرد کو کم از کم ستّر ستّر حوریں ملیں گی، تو مرد ایک وقت ایک حور کے ساتھ ہی بسر کر سکتا ہے۔ باقی غریب ایک کم ستّر ترستی ہی رہیں گی ؟

(۶)۔ مردوں کو تو بے شمار حوریں مل جائیں گی مگر عورتوں کے لئے کہیں ذکر نہیں کہ ایک ایک عورت کو کتنے غلمان ملیں گے ؟ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ عورتوں نے کیا قصور کیا ہے کہ مرد تو خوب عیش اڑائیں اور عورتیں محروم رہیں ؟

جوابات:

جنابِ ربُّ العزّت کا کلامِ اقدس تو ایسا پاک و پاکیزہ ہے کہ اس پر کسی کو اعتراض کرنے کی مجال ہی نہیں ہو سکتی۔ جتنے اعتراضات بھی کلام پاک پر دہریوں کی طرف سے ہوتے ہیں ان کا سبب صرف یہ ہے کہ خدا کا مقدس دین نادانوں کے ہاتھ پڑ گیا۔ انہوں نے اس کے مفاہیم کو اپنے قیاس کے سانچے میں ڈھال لیا اور اسی کے مطابق اس کی تشریحیں لکھ ڈالیں۔ اعتراضات تو ان قیاسی مفاہیم پر ہوتے ہیں۔ دیکھئے ارشادِ ربّ العزّت ہے:۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ الاعراف

(اور ہم نے بہت سے جن و انس کو جہنّم کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں ان سے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں ان سے دیکھتے نہیں، اور ان کے کان ہیں ان سے سنتے نہیں۔ وہ تو مثل ڈھوروں کے ہیں بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ گمراہ وہی تو ہیں جو غافل ہیں)۔

پس جن لوگوں کے پاس سمجھنے والے دل اور دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں ان کو آیاتِ کلامِ الٰہی کیسے نظر آسکتی ہیں۔ اور وہ ان کے مطالب کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ دیکھئے سورۂ فرقان کے آخری رکوع میں عباد الرحمٰن کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ آیات قرآن پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے یعنی الفاظ کے ظاہری مفاہیم کو حقیقت نہیں سمجھ لیتے۔ لہٰذا قرآن و حدیث کے ظاہری مفہوم جاننے والے عباد الرحمٰن نہیں ہو سکتے۔ وہ تو عباد الشیطٰن ہیں۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ .... الخ۔ (آخر) (۷) آل عمران

(وہ وہی ذاتِ اقدس ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی اس میں بعض آیات محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہ ہیں۔ پس وہ جن کے دلوں میں کجی ہے متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں...... (آخر آیت تک)۔

پس جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں نہیں، سمجھنے والے دل نہیں، جو عباد الرحمٰن نہیں ان کو یہ آیت کیسے نظر آتی۔ جن کے دلوں میں کجی اور گمراہی تھی۔ وہ متشابہ آیات کو حقیقت جان کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ خود بھی گمراہی میں رہے اور اپنے پیروؤں کو بھی تاریکی میں ڈالا۔ اس کتاب کے باب دوم میں متشابہ آیات کو واضح کر دیا گیا ہے اور صاف طور پر دکھلا دیا گیا ہے کہ جنّت کا ذکر جن آیات میں ہو گا وہ متشابہ ہوں گی۔ ارشاد باری ہے:۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۷) السجدہ

(پس کوئی نفس نہیں جان سکتا جو کچھ چھپا کر رکھا ہے ان کی خنکی چشم کا سامان اس کے بدلے میں جو کچھ وہ عمل کرتے تھے)۔

جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں نہ تھیں، سمجھنے والے دل نہ تھے وہ اس آیت کو کیسے دیکھ سکتے کہ جناب ربُّ العزّت نے بندوں کے اعمال کی جزا کے لئے جو نعمتیں جنّت میں مہیّا کی ہیں ان کا سمجھنا اور جان لینا کسی نفس کے لئے ممکن نہیں۔ لہٰذا جو ان تمثیلوں کو حقیقت سمجھ لیں وہ بندگانِ رحمٰن نہیں ہو سکتے۔ جنّت باغ کو کہتے ہیں اور پوشیدہ کو بھی۔

فرمانِ رسولؐ کردگار ہے کہ جنّت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ ''لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ فِیْ قَلْبِ بَشَرٍ'' (کسی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کان نے سنی نہیں اور کسی شخص کے دل میں ان کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا)۔ پس جس کے پاس سمجھنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھیں نہ ہوں جو بندۂ رحمٰن نہ ہو وہ تو رسولؐ کی تکذیب کرتے ہوئے نعیمِ جنّت کو مادّی نعمتیں ہی جانے گا۔ جنابِ باری کا ارشاد ہے:۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾

یونس۔ (اور نہیں ہے یہ قرآن جو غیر اللہ بنا لائے لیکن تصدیق کرنے والا اس کی جو اس کے پہلے (کتبِ انبیاءِ سابق) اور تفصیل ہے اس کتاب کی جس میں شک نہیں جو رب العالمین کی طرف سے ہے)۔

اس کتاب کے باب دوم میں واضح کر دیا گیا ہے کہ رب کی کتاب جس میں شک نہیں ہو سکتا وہ نفسِ انسان ہے کہ بچپن سے آخر عمر تک جو نقوش بھی اس پر بنتے ہیں، اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں لہٰذا ظاہر ہے کہ جنّت بھی نفسِ انسان کی کیفیات کی تفصیل ہے جیسا کہ اسی باب میں دکھلا دیا گیا ہے کہ نفسِ انسان کی قوّتِ شعور جب منزلِ کمال کو پہنچ جائے تو جس قدر بھی کیفیات حظ و سرور کا اس کو احساس ہوا ہوگا ایک خیال آتے ہی وہ تمام کیفیات حقیقت بن کر اس پر طاری ہو جائیں گی۔ یہی جنّت ہے۔ پس جو شخص جنّت کے ذکر کو تفصیل ''اَلْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ'' نہ جانے وہ خدا اور رسولؐ کی تکذیب کرنے والا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دیوان کے ایک شعر سے بھی قرآنِ پاک کی آیہ مذکورہ بالا ''تفصیل الکتٰب لَا رَيْبَ فِيْهِ'' کی تائید ہوتی ہے:

''اَتَزْعَمُ اَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ وَفِيْكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْاَكْبَرُ''

(اے انسان! کیا تو گمان کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا مجسمہ ہے۔ حالانکہ تیرے اندر عالمِ اکبر لپٹا ہوا ہے)۔

عالمِ اکبر سے کیا چیز باہر ہو سکتی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جنّت ہو یا جہنّم سب

تیرے اندر ہی ہیں۔ اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جنّت و جہنّم نفسِ انسان کی کیفیات ہی ہیں۔

جوابات سلسلہ وار

جواب، سوال نمبر ا:۔ یہ تو ایک مہمل اعتراض ہے جو تنقید برائے تنقید ہے۔ کیا موجودہ معلومات سے پہلے عقلاً جو معلوم نہ تھا انکار کرتے تھے؟ جیسے موجودہ آلات سے کائنات کے بہت سے عوالم معلوم ہوئے ہیں۔ کیا آئندہ مزید معلومات نہیں ہو سکتیں؟ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نے تمام کائنات معلوم کر لی ؟ اب آیندہ مزید معلومات ممکن نہیں۔ تاہم یہ تو الزامی جواب ہے۔ اب تفصیل دیکھیں۔ ارشاد باری ہے:۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ...... تا آخر آیت (۲۱) الحدید

(سبقت کرو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور جنّت کی طرف جس کا عرضِ آسمان و زمین کے عرض کی مانند ہے)۔

باب اوّل میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نفسِ انسان کے حسِّ لمس کے کروڑویں حصّہ کو بھی اگر پھیلایا جائے اور اس کی کیفیات کا احصا کرنا چاہیں تو وہم و گمان میں نہیں آسکتا۔ پس اگر ان تمام احساسات و کیفیات کا جو اس کو پیدائش سے آخر عمر تک محسوس ہوتی رہی ہیں احصا کرنا چاہیں تو کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔ نظامِ شمسی کی وسعت کا تصور ہو سکتا ہے مگر نفس کے احساسات کا تصوّر سے احصا کرنا محال ہے! ان کو اگر تجزیہ کر کے پھیلانا چاہیں تو زمین و آسمان کی وُسعت میں بھی نہیں سما سکتیں۔

جواب، سوال نمبر ۲ (الف)۔ سماء سے مُراد بلندی ہے۔ لہٰذا نفس کی ترقی کی اعلیٰ منزل جنّت ہے اور پست منزل جہنّم ہے جیسا کہ ارشاد ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ" (۴) (ہم نے انسان کو بہترین انداز پہ پیدا کیا) "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ" (۵) التین۔ (پھر اس کو (اس کے بُرے اعمال کے سبب) ہم نے پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیا)۔

(ب) جنّت و جہنّم کا تعلّق مکانیت سے نہیں۔ نفس جب منزلِ کمال پر پہنچتا ہے تو اس کی مقناطیسی شعاعیں لامحدود ہو جاتی ہیں اور تمام فاصلے اس کے لئے بے معنی و بے اثر ہو جاتے ہیں۔
(ج) یہ سات آسمان دقیانوسی فلسفہ کے آسمان نہیں ہیں بلکہ رَبُّ العزّت کا ارشاد ہے۔
وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ (۱۷) المومنون (ہم نے تمہارے اوپر سات راستے خلق کیے ہیں)۔
زمین کے مدار کے اوپر ایک چاند کا مدار، اور اس پر چھ سیاروں کے راستے یا مدار (ORBIT) ہیں اور ان سات سیّاروں کو ہم سات زمینیں بھی کہہ سکتے ہیں۔
(د) صراط واقعی بال سے باریک اور تلوار کی دُھار سے زیادہ تیز ہے اور جہنّم پر بھی رکھی ہوئی ہے۔ مگر وہ تو ہماری اس ہی زندگی میں موجود ہے اور اس پر سے گزر کر ہی جنّت میں پہنچ سکتے ہیں۔ صرف ایک مثال ہی سمجھانے کے لئے کافی ہے:۔
ہر شخص جانتا ہے کہ خدمتِ خلق اور مصیبت میں دوسروں کی مدد کرنا بہترین کارِ خیر ہے۔ حضور سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے "اَلْاِسْلَامُ هُوَ الطَّاعَة لامرِ اللہ والشفقته علی خلق اللہ" اسلام کیا ہے وہ احکامِ خدا کی اطاعت اور خلق اللہ پر شفقت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلقِ خدا کی مصیبت میں مدد کرنا بہترین کارِ خیر ہے۔ اَب ذرا اپنے نفس کی کیفیت کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ کسی کو اذیت میں دیکھ کر ہمارے نفس کو بھی کچھ نہ کچھ اذیت ہوتی ہے لہٰذا وہ "اپنی اذیت" رفع کرنے کو ہی کسی مصیبت زدہ کی مدد کرتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ بہترین کام بھی ہر چند کہ مُفید ہے مگر تسکینِ جذبات ہی ہوتا ہے خالصاً اللہ کے لئے نہیں ہوتا۔ البتہ اگر اس وقت مالک کی طرف توجّہ کرے اور اسی سے خلوص طلب کرے وہ کام عبادتِ حقیقی ہو جائے گا۔ کیا یہ بال سے باریک اور تلوار کی دَھار سے زیادہ تیز راستہ نہیں؟ اگر عمل لِلّٰہ ہوگا تو وہ اطمینانِ قلب تک پہنچائے گا ورنہ یہ نعمت میسّر نہ ہوگی۔
(ر) اَب یہ سوال باقی ہی نہیں رہتا۔
(س) اس کا جواب بھی تشریح میں آگیا۔ یہ تمام متشابہات ہیں۔ ان کو حقیقت سمجھنا جہالت ہوگا۔

جواب، سوال نمبر ۳۔ کیفیاتِ نفس اور احساساتِ لذّت میں تغیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
جواب، سوال نمبر ۴۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں عرب ہی کے پھل ہوں گے جب کہ قرآن نے کہہ دیا " لَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ " (ان کے لئے وہاں تمام پھل ہونگے)۔ جس پھل کا بھی نفس میں احساس موجود ہوگا اس کا موجود ہونا لازم ہے۔
جواب، سوال نمبر ۵، ۶۔ ہر چند کہ ان کے جواب کی ضرورت باقی نہیں رہی مگر اتمامِ حجت کے لئے کچھ کہنا ضروری ہے۔ دیکھئے:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ (۱۵) محمد

(اس جنت کی مثال جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے ایسی ہے کہ اس میں پانی کی نہریں ہیں جس میں بدبو نہیں اور دودھ کی نہریں جس کا ذائقہ نہیں بدلا اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کو لذت دے صاف و شفاف شہد کی نہریں اور ان کے لئے وہاں ہر قسم کے پھل اور ان کے ربّ کی مغفرت ہے)۔ جناب ربّ العزت نے ظاہر کر دیا کہ جنت کی مثال ایسی ہے۔ اسی طرح کتنی جگہ ارشاد ہے کہ اللہ اسی طرح لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے " وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ " (۲۵) ابراہیم۔ اس کھلے بیان کے بعد بھی تمثیلوں کو جو حقیقت سمجھ لیں وہ خدا اور رسولؐ کی تکذیب کرنے والے اور اس آیہ کے مصداق ہی ہو سکتے ہیں " إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۖ " (۴۴) الفرقان۔ (نہیں ہیں وہ ڈھور ڈنگروں کی مثل بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ)۔ وہ اپنے نفس پر تو غور کرتے نہیں جس میں ربّ فرماتا ہے ہم اپنی نشانیاں ان کے نفسوں میں دکھائیں گے۔ اس کی آیات سے منہ پھرائے ہوئے ہیں۔ اپنے قیاسی مفاہیم پر عقائد کی بنیادیں قائم کرتے ہیں اور اسی وحیِ شیطانی کے مطابق بھولے بھالے مسلمانوں کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔
نعیمِ جنت کی تمثیلیں بیان کرنے کا مقصد قارئین پر واضح ہو گیا ہے کہ اسی سے نفس میں

احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ تمام احساسات نفس کے خزانوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر شعور تام حاصل ہو جائے تو وہ حقیقی کیفیات ہی بن جائیں گی۔ سورۂ محمدؐ کی اس آیت میں تمثیلیں بیان کرنے کے بعد حقیقت کی ایک جھلک بھی دکھا دی گئی ہے کہ اس میں رب کی مغفرت ہے۔ بتائیے کہ گاؤزبان کے معنی گائے کی جیب اور دم الاخوین کے معنی دو بھائیوں کا خون سمجھ کر اس کی تفسیریں اور تشریحیں کرنے والے مغفرت کے معنی و مفہوم کیا سمجھ سکتے ہیں؟ ان کے خیال میں تو یہی ہو سکتا ہے کہ بندہ جب مالک کے سامنے گڑگڑاتا ہے، معافی مانگتا ہے تو مالک کہہ دیتا ہے۔ جا بخشا۔ تیری خطا معاف کر دی حقیقت یہ ہے کہ بچّہ ہر شے میں خواہ جان دار ہو یا بے جان اپنی کیفیاتِ نفس کی مثل کیفیات سن کر متأثر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی پتھر سے ٹھوکر لگنے سے بچّے کو اذیت پہنچے تو اس پر لکڑی یا لوہے کی کوئی چیز مار کر اس سے کہیں کہ لو پتھر رونے لگا تو بچّہ خوش ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ چڑیا کے بچّے رو رہے تھے ماں کو پکارتے رہے۔ بچّہ اس سے متأثر ہوتا ہے۔ اسی طرح عالمِ غیب سے جو لاشعور ہیں خواہ وہ سارا کتب خانہ ازبر کر کے قیاسی دین کے اعلم بھی بن جائیں تو خدا کو اپنی مثل ہی سمجھتے رہیں گے کہ جب گنہگار توبہ استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ گناہ معاف کر دیتا ہے۔ ہمارے قارئین تو اب سمجھ سکتے ہیں کہ مغفرت سے کیا مراد ہے۔ جن کاموں سے نفس کی لاشعوری بڑھتی ہے وہ گناہ ہیں۔ اور دل کے تڑپنے سے غفلت و لاشعوری دور ہوتی ہے اور عالمِ نور سے قرب حاصل ہوتا ہے۔ اس سے اطمینانِ قلب و سرور دائمی جسے وجدان کہتے ہیں، جو ربِ اکرم کی بڑی نعمت ہے، مل جاتا ہے۔ لہٰذا "مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ" سے یہی مراد ہے کہ وہاں یہ لاشعوری کی ہلاکت آفرین تاریکی نہ رہے گی۔ رحیم اپنے کرم سے اس کو دور کر دے گا تو ایسی نعمات حاصل ہوں گی جن کا تصور محال ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

جہنّم کے متعلّق دہریوں اور مشکّکین کے اعتراضات

(۱) خالق و مخلوق کا تعلّق اس سے ہزاروں گنا زیادہ ہے جتنا کہ باپ کا بیٹے سے ہوتا ہے۔ پس کیا یہ ممکن ہے کہ باپ اپنے چند سالہ بچّے کو جس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو جلتے ہوئے توے پر بٹھا کر اس کا چیخنا چلّانا سنتا رہے اور مچلنا تڑپنا دیکھتا رہے؟ بڑی حیرت و تعجب کا

مقام ہے کہ خالق کل مخلوق کا جو ارحم الراحمین ہے اپنے کم عقل ولاشعور بچوں کو آتشِ جہنم میں ڈال کر ابدالا باد ان کی فریاد سنتا رہے گا۔

(۲) ایک شخص ۳۰ یا ۴۰ سال دُنیا میں رہا۔ ۱۵، ۱۶ سال تک تو بُرے بھلے کی اس کو تمیز نہ ہوئی اَب باقی ۱۵ یا ۲۵ سال اس نے زندگی گزاری۔ اس میں گناہ کرنے کا وقت اگر شمار کیا جائے تو دس بارہ سال ہی بنیں گے۔ پھر اس کی سزا ابدالاباد تک جاری رہے گی یہ کہاں کا انصاف ہے؟ "وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ" اور وہ آگ سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔ کہیں کہا گیا ہے "هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ" (وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے)۔

(۳) سزا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ احساسِ اذیت اس کو تکرارِ جرم سے باز رکھے۔ ایک سزا موت ہوتی ہے اس کا ایک مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ قتل کا مرتکب نہ ہوسکے دوسرا یہ کہ دیکھنے اور سُننے والوں کو عبرت ہو اور قتل و فساد کے مرتکب نہ ہوسکیں۔ جہنم کی سزا دائمی کا کیا مقصد ہے جبکہ نہ وہ پھر لوٹ کر اس دُنیا میں آسکیں گے کہ ارتکابِ معاصی سے باز رہیں اور نہ کوئی ان کو گرفتارِ عذاب دیکھ سکتا ہے جو عبرت حاصل کرسکے؟ یہ عذاب تو عبث ہے اور خدا سے فعلِ عبث صادر نہیں ہوسکتا۔

(۴) ایک کمیونسٹ نے کہا قرآن میں ہے: "يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" (۳۰) ق (اور جس دن ہم جہنم سے کہیں گے کیا تو بھر گئی تو وہ کہتی رہے گی۔ کیا اور بھی کچھ ہے)۔ میں نے ایک کلام اللہ میں اس آیت کے حاشیہ میں دیکھا کہ جہنم میں ڈالتے رہیں گے اور وہ یہی کہتی رہے گی کیا اور بھی کچھ ہے میں نہیں بھری۔ میں نہیں بھری، کیا اور زیادہ بھی ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ اپنا پیر اس میں ڈال دیں گے تو وہ کہے گی بس بس بھر گئی بھر گئی۔ یہ آپ کے کیسے اللہ تعالیٰ ہیں؟؟

(۵) تمام علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ قیامت میں حساب کتاب کے بعد مجرم جہنم میں ڈالے جائیں گے مگر سورہ نوحؑ میں اس کے خلاف ہے: "مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ○" (وہ اپنی خطاؤں کے سبب غرق کر دیئے گئے اور جہنم میں یا آگ

میں داخل کر دیئے گئے)۔ یہاں تو قیامت سے پہلے جہنّم میں ڈال دیئے جانے کا ذکر ہے یہ کون سا جہنّم ہے؟

جوابات

(۱) جنابِ ربّ العزّت کا فرمان ہے "وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی" (وہ وہی ذاتِ اقدس ہے جس نے قوانین بنائے اور ان کے مطابق ہدایت کر دی) جنابِ ربّ العزّت نے جو قوانین بنائے، یعنی "نیچرل لاز" انہیں کے مطابق تمام کائنات میں عمل در دِّ عمل ہر دم و ہر لحظہ ہوتا رہا ہے، ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ خدائی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والا کسی طرح بھی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ ایک انگریزی مثل ہے۔

(NATURE IS LIKE A WATCHFUL ENEMY THAT NEVER LEAVES ANY FAULT UNPUNISHED)

یعنی نیچر گھات میں بیٹھے دشمن کی طرح ہے جو کسی قصور کو بغیر سزا نہیں چھوڑتی اور ارشادِ باری ہے: "اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝" (تیرا رب یعنی خدا کے قانون ہر وقت گھات میں ہیں)۔ نیز ارشاد ہے: "وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝" (بس جو ذرّہ برابر نیکی کرتا ہے اس کی جزا پاتا ہے)۔ "وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝" (اور جو ذرّہ برابر بدی کرتا ہے اس کی سزا پاتا ہے)۔ خدا کے بنائے ہوئے قانونِ فطری کی سزا یا جزا ملتی ہے۔ عملِ خیر سے لاشعوری کم ہوئی یہ جزا مل گئی۔ عملِ بد سے لاشعوری زیادہ ہوتی ہے۔ نتیجہ میں رحمتِ باری سے بُعد زیادہ ہو جاتا ہے۔ بس یہ سزا مل گئی جس کا آخری انجام حیات بعد از موت بھگتنا پڑے گا۔ جو شخص آگ میں ہاتھ ڈالے گا جلنے سے کیسے بچ سکتا ہے؟ ایک شخص درخت پر چڑھتا ہے۔ کمزور شاخ پر کھڑا ہو جاتا ہے وہ ٹوٹ جاتی ہے اور گر جاتا ہے، ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ کمزور شاخ پر کھڑا ہونے اور غلط اندازہ کرنے کی سزا ہے۔ جب ان قوانینِ فطری کی سزا سے جن کا تعلق مادّی دُنیا سے ہے کوئی نہیں بچ سکتا تو پھر ان قوانینِ فطری کی سزا سے جن کا تعلق روحانی دُنیا، عالمِ نور اور غیر مرئی عالم یعنی فطرتِ نفس سے ہے کوئی کیسے بچ سکتا ہے؟ جو شخص

اس زندگی میں حصولِ شعور کا طالب نہ ہوگا اور مالک سے نصرت و تائید طلب نہ کرے گا، لاشعوری کی ہلاکت آفریں تاریکی میں گھرا رہے گا وہ نتیجہ میں ابد الاباد تک آتشِ حسرت میں تپتا رہے گا۔ البتہ جس کو طلب ہوگی اور مالک سے بہ خلوص مانگے گا اس پر رحمتِ باری کا نزول ہوگا۔ وہ تو ارحم الرّاحمین ہے مگر صرف طالبین کے لئے۔ کتنی ہی دُعاؤں میں اس کی وضاحت کردی گئی ہے۔ "یَا رَاحِمَ لِمَنِ اسْتَرْحَمَهٗ" (اے رحم کرنے والے اس پر جو اس سے رحمت طلب کرے)۔ ارشاد باری ہے: "وَیَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ (۲۷) الرعد (وہ تو اسی کو مقصد تک پہنچاتا ہے جس کو اس کی رغبت ہو)۔ لہٰذا تمام امور کا دارومدار نفسِ انسانی کی طلب پر منحصر ہے۔

(۲) ایک شخص غلطی سے دوا کی بجائے آنکھ میں تیزاب ڈال لیتا ہے۔ آنکھ پھوٹ جاتی ہے۔ کیا پھر کبھی بھی اس کو وہ اپنی آنکھ میسر آسکتی ہے؟ یہ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی کی سزا دائمی ہوتی ہے۔ لہٰذا سزا عمر بھر بھگتنی پڑتی ہے۔

(۳) اس کا جواب سابقہ دو جوابوں میں آچکا۔ فطری قوانینِ قدرت کی خلاف ورزی کرنے والا سزا سے کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ اس کو اپنے قیاس اور وحی شیطانی پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔

(۴) جناب باری کا ارشاد ہے — "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۚ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (۲۸) الرعد (جو ایمان لائے ان کے دل ذکر اللہ سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ آگاہ ہو کہ اللہ کے ذکر سے قلوب کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے)۔ کیا دُنیاوی سلطنت سے اطمینان و سکونِ قلب حاصل ہو سکتا ہے؟ ایک بادشاہ بھی بیماری و مصائب و آلام میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کو بھی اضطرار لاحق رہتا ہے۔ بادشاہوں کے دشمن بھی بہت ہوتے ہیں جن کی طرف سے ہر وقت اندیشہ لگا رہتا ہے! اندرونِ مُلک بھی بغاوت کا خدشہ ہوتا ہے۔ غرض کہ سکون و اطمینانِ قلب سلطنتِ دُنیاوی سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ سکونِ قلب تو رب کی بہت بڑی نعمت ہے۔ مالک کا انعام ہے۔ جو اس سے صدقِ دل سے طلب کرتا ہے اسی کو عطا ہوتا ہے اور یہی دُنیاوی جنت کی پست ترین منزل ہے۔ پس اگر سکون و اطمینانِ قلب میسر نہ ہو تو اضطرار و پریشانی لاحق رہتی ہے۔ اسی کو مالک اپنا عذاب کہتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: "فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ط" (تم کو ان کے مال و اولاد دھوکہ میں نہ ڈالیں۔ اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ انہیں کے ذریعہ زندگانیٔ دنیا میں ان کو عذاب کرے) غرضکہ سکونِ قلبی کا نہ ہونا ہی ایک عذاب اور دنیا کا جہنّم ہے۔ اسی اضطراری اور غیر سکونی کیفیت کو "ہوس" کہتے ہیں۔ پس کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ جہنّم کبھی بھی بھر سکتا ہے؟ لا واللہ کبھی نہیں! جتنی خواہشات پوری ہوتی جائیں گی اتنی ہی ہوس زیادہ ہوتی رہے گی۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب عقلِ فطری ہوسِ نفس سے کہتی ہے آیا تو بھر گئی تو وہ یہی کہتی رہتی ہے کہ کچھ اور بھی ہے؟۔ یہ ایک کیفیتِ نفس بیان کی گئی ہے کہ اس کی ہوس کی کبھی سیری نہیں ہو سکتی۔

اَب رہا حاشیہ کا مضمون اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو وحیٔ شیطانی ہے ——
"اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیَآءِھِمْ" (۱۲۱) الانعام (بہ تحقیق کہ شیاطین اپنے دوستوں پر وحی کرتے ہیں)۔

(۵) جہنّم کے بیان میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ موت کے بعد شعور و ایمان حاصل نہ کرنے کا افسوس دلوں کو تڑپائے گا اور وہ آتشِ حسرت میں جلتے رہیں گے۔ جیسا کہ ربّ العزّت کا ارشاد ہے (ترجمہ) "اسی طرح اللہ ان کو ان کے اعمال حسرتیں بنا کر دکھائے گا اور وہ اس آگ یا جہنّم سے کبھی نکل نہ سکیں گے"۔ یہ جہنّم تو موت کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے اور قیامت تک اسی جہنّم میں پڑے رہنا ہوگا۔ عالمِ برزخ کا یہ جہنّم ہے۔ قیامت کے بعد جو جہنّم ہوگا اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ قیامت سے قبل تو نفوس اس زمین کی فضا میں ہی رہیں گے مگر جب قیامت واقع ہوگی اور نظامِ شمسی کے سورج چاند ستارے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ایٹمس (ATOMS) میں پھیل جائیں گے، تمام ایٹم پھٹ رہے ہوں گے اور یونیورس کی فضائیں کروڑوں ڈگری سینٹی گریڈ گیس سے بھر جائیں گی تو وہ نفوس جنہوں نے کمال اور نورِ ایمان حیاتِ دنیوی میں حاصل نہیں کیا تھا وہ اس یونیورسل جہنّم سے کبھی بھی نہ نکل سکیں گے کیونکہ ان نفوس میں اس لامحدود آگ سے نکلنے کی طاقت اور سکت ہی نہ ہوگی اور یوں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی کروڑوں ڈگری کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلستے رہیں گے۔ مگر اہلِ جنّت جو حاملانِ نور ہوں گے ان نفوس کو یہ آگ کوئی گزند نہ پہنچا سکے گی کیونکہ "نور" کے

مقابل "نار" کی کچھ حقیقت نہیں ہے. یہ نفوسِ قدسیہ اپنے نُور کی طاقت وقدرت سے اس لامحدود کائنات میں (یونیورس میں) جہاں چاہیں گے چلے جائیں گے اور اپنی جنّت بنالیں گے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

——— >:(⁂):< ———

باب چہارم

نور و ہیئت نور

(۱) آیاتِ قرآنی سے نور کا مفہوم
(۲) اللہ
(۳) سمٰوٰت والارض۔ نظامِ شمسی اور سیارے نظام کوکبی۔ کہکشاں۔
یونیورس میں بے شمار نظامِ کوکبی یا GALAXCIES
(۴) نور کا مفہوم
(۵) خلقتِ نور۔ مؤثّر واثر
(۶) عالمِ ارواح
(۷) تخلیقِ کائنات۔ علمِ طبیعات کا حالیہ نظریہ
(۸) تخلیقِ عالم کے متعلق علی کرم اللہ وجہ کا خطبہ
(۹) مدتِ تخلیق
(۱۰) زمین پر حیات کی ابتدا
(۱۱) غیر مرئی نوری شعاعیں
(۱۲) علمِ طبیعات کا حالیہ نظریہ نور
(۱۳) آیۂ نور کی تفسیر اور ہیئتِ نور کا مفہوم
(۱۴) زمین پر تخلیق انسان۔ آدم اور ابلیس
(۱۵) نفسِ انسان کے قوائے باطنی
(۱۶) غیب اور علمِ غیب

نورو بیتِ نور

لفظ نور کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے. کلام اللہ کی اکثر آیات میں یہ کلمہ آیا ہے جن کی مثالیں حسبِ ذیل ہیں:-

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۱ الانعام

(اور اس نے (اللہ نے) پیدا کیا تاریکیوں کو اور نور).

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۱۹ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۲۰ فاطر

(اور نہیں برابر ہوسکتے اندھا اور سہانکا. اور نہ تاریکیاں اور نور).

مندرجہ بالا آیات میں تاریکی کے مقابل نور آیا ہے لہٰذا اس کا ترجمہ یہاں روشنی کیا جاسکتا ہے:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۱۷ البقرہ

(ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پس جبکہ گرد و پیش میں روشنی ہوگئی اللہ نے ان کا نور زائل کر دیا اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ وہ دیکھ نہیں سکتے)

یہ چونکہ تمثیل ہے، اس لئے نور سے مادی روشنی مراد نہیں ہوسکتی بلکہ نورِ بصیرت مراد ہے جیساکہ ارشاد ہے:-

.... فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِي فِي الصُّدُوْرِ ۴۶ الحج

(کیونکہ) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہوجاتے ہیں)

دل کے اندھا ہونے سے نورِ بصیرت کا زائل ہونا ہی مراد ہوسکتا ہے. اب اور

آیات ملاحظہ فرمائیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۵﴾ النساء

(اے بنی نوع انسان تمہارے رب کے پاس سے تمہارے پاس دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف کھلا ہوا نور نازل کر دیا)۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ المائدہ

(تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آچکی ہے)۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ .... ﴿۴۴﴾ المائدہ

(ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے)۔

آیات مذکورہ بالا میں نور کے معنی ہیں ذریعہ ہدایت یا صفائے قلب اور نور باطن تک پہنچانے کا ذریعہ۔ اب اور آیات ملاحظہ ہوں:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ... ﴿۲۵۷﴾ البقر

(اللہ ہی ولی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے نکال کر لاتا ہے ان کو تاریکیوں میں سے روشنی میں)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ...... ﴿۵﴾ ابراہیم

(اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں میں سے روشنی میں نکال لاؤ)۔

یہاں کفر وضلالت کی تاریکی سے ایمان کی روشنی میں لانا مراد ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ....... ﴿۳۲﴾ التوبہ

(وہ لوگ چاہتے کہ اللہ کے نور کو منہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں)۔

یہاں نور سے مراد حق کی باتیں ہے۔ اب آیات ذیل دیکھیں:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا..... ﴿۵﴾ الیونس

(وہ وہی ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو روشنی والا بنایا)۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا...... ﴿۱۶﴾ نوح

(کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا۔ اللہ نے سات آسمان تہ بہ تہ کیوں کر بنائے اور چاند کو ان میں روشنی کا باعث قرار دیا اور سورج کو اس نے چراغ قرار دیا)۔

یہاں نور کے معنی علتِ ضو یا روشنی کا باعث ہی ہو سکتے ہیں۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ...... ﴿۱۲۲﴾ الانعام

(آیا وہ شخص جو مُردہ تھا ہم نے اس کو زندہ کیا اور قرار دیا ہم نے اس کے لئے ایک نور جس کے ذریعے سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے)۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴿۲۲﴾ الزمر

(کیا وہ شخص جس کے سینے کو اللہ نے اسلام کے لئے کشادہ کیا پس وہ تو اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے)

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ...... ﴿۲۸﴾ الحدید

(وہ تمہارے لئے نور قرار دے گا جس کے ذریعہ سے تم چلو پھرو گے)۔

یہاں نور سے نور باطن قوتِ روحانی ہی مراد ہو سکتی ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ...... ﴿۱۲﴾ الحدید

(اور جس دن تو مومنوں کو اور مومنات کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے آگے اور داہنی طرف دوڑتا ہوگا)۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ...... ﴿۸﴾ التحریم

(ان کا نور ان کے آگے اور داہنی طرف دوڑتا ہوگا)۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا...... ﴿۶۹﴾ الزمر

(اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی)۔

آیاتِ مندرجہ بالا میں نور کا مفہوم انسان کی فہم اور اس کے وہم و گمان سے بالاتر ہے لہٰذا اسے صرف نور ہی کہا جا سکتا ہے۔

اب نور کے متعلق علم طبیعات پر بھی نظر ڈالیں۔ پچھلی صدی کے آخر تک علماء طبیعیات کا نظریہ یہ تھا کہ مادہ قدیم و غیر فانی ہے۔ صرف صورتیں بدلتا ہے۔ مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظریہ صحیح نہ تھا۔ چنانچہ اس صدی کی ابتدا میں یہ نظریہ منظرِ عام پر آگیا کہ کائنات میں غیر مرئی تخلیقی شعاعیں پھیلی ہوئی ہیں جن کا مرکز روشنی کے لاکھوں سال کی مسافت پر ہے بلکہ نامعلوم ہے۔ جب کوئی شعاع آگے بڑھنے سے رُکتی ہے تو ایک ایٹم بناتی ہے۔ اسی طرح مادہ خلق ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ شعاعیں خارج ہو جائیں تو ایٹم بھی فنا ہو جائے۔ ایٹم بم کی ایجاد کے بعد تجربات سے یہ امر مشاہدے میں آگیا کہ مادے کا کچھ حصہ انرجی میں منتقل ہو جاتا ہے۔ جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کائنات میں نوری شعاعیں پھیلی ہوئی ہیں جو کسی مرکزِ نور سے آرہی ہیں۔ شعاعِ نوری اگر ختم ہوتی ہے تو وہ مثبت و منفی برق میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ پھر برق سے ایٹم وجود میں آتا ہے۔

قارئین پر اب یہ امر واضح ہو گیا کہ لفظ نور کا ترجمہ محض روشنی سمجھ لینا کیسی غلطی ہے؟ اس لئے کہ بجلی کے بلب سے جو روشنی ہوتی ہے اس کا باعث وہ شعاعیں ہیں جو اس سے نکلتی ہیں اور شعاعیں اسی وقت نکلتی ہیں جب بلب کا تار گرم ہو کر سفید ہو جائے گویا کہ شعاعوں کی علت گرمی ہے اور گرمی برق کے گزرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تو حدّت کا سبب برق ہے اور برق کی مورث غیر مرئی شعاعیں جن کی علت نور یا مرکزِ نور ہے۔ اب نور کا ترجمہ کتنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس توضیح سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نور کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ روشنی یا ضیاء کے سبب کی مورث کے باعث کی علت ہے۔ لہٰذا بجائے ترجمہ کرنے کے بہتر یہی ہے کہ نور ہی کہا جائے۔

اب آیۂ نور کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ﴿۳۵﴾ النور

(اللہ ہی نور یا علت العلل ہے آسمانوں اور زمین کا)۔

اللہ

یہ الف۔ لام۔ لام۔ ہ سے مرکب ایک کلمہ ہے جو عربی زبان میں اس ذات کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہے جس کی طلب ہر بچہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ باب دوم میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ ہر بچے کے نفس میں یہ طلب ہوتی ہے کہ کوئی ایسی قوت مل جائے جو ہر شے پر قادر ہو جس کے ذریعہ سے میں جو چاہوں فوراً ہو جائے۔ ایک دہریہ یہ تو کہہ سکتا ہے کہ "اللہ، رام، پرم ایشور یا گاڈ کا تصور بچے کے ذہن میں خارج سے آتا ہے" مگر اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہر بچے کے نفس میں ایسی ہستی کی طلب ہونا جو ہر شے پر قادر ہو ایک فطری رُجحان ہے جو خارج کے اثر سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ خود نفس میں موجود ہے۔

ایک بچے نے جو تختی، قلم، پنسل لئے بیٹھا تھا مجھ سے کہا کہ تختی پر اب۔ت کے نقش بنا دوں میرے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک دانہ تھا وہ مَیں نے اس کے سامنے تختی پر رکھ دیا اور اس سے دریافت کیا کہ اس مٹھائی کے کھانے کو تمہارا جی چاہتا ہے یا نہیں۔ بچے نے کہا ہاں۔ مَیں نے کہا بھلا تم اکیلے کیسے کھا سکتے ہو جبکہ تمہاری تختی کا بھی جی چاہ رہا ہے اور تمہارا قلم تو تاک لگائے ہے اس کا بھی جی چاہ رہا ہے کہ میں ہی کھاؤں۔ بچہ ہنسا۔ میں نے پوچھا تم ہنستے کیوں ہو۔ تو بولا "اوں۔ ان میں تو جی ہے ہی نہیں ــــ" معلوم ہوا کہ ہر بچہ بھی جانتا ہے کہ چاہ یا منشا۔ بغیر جی کے نہیں ہو سکتی۔ جی ہی چاہ سکتا ہے۔

پھر مَیں نے تختی پر پنسل رکھ کر تختی کے ایک سرے کو ذرا اُونچا کیا تو پنسل حرکت کرنے لگی تو مَیں نے بچے سے کہا، دیکھو تمہاری پنسل آپ ہی چل رہی ہے۔ تو کہنے لگا۔ یہ تو آپ نے چلائی ہے۔ مَیں نے کہا کیوں کوئی چیز آپ ہی آپ نہیں چل سکتی۔ کہا، نہیں جب تک کوئی نہ چلائے کیسے چلے گی۔ تو مَیں نے اس سے دریافت کیا۔ پھر یہ چاند، سورج، ستارے کیسے چل رہے ہیں؟ بولا۔ "ان کو تو اللہ چلاتا ہے۔"

مَیں نے کہا کیا تمہاری تختی پنسل کو نہیں چلا سکتی؟ بولا اس میں تو جان ہی نہیں وہ کیسے چلا سکتی ہے۔ مَیں نے کہا اچھا تم جانتے ہو کہ اس تمام عالم میں (کائنات میں) کوئی جان

ضرور ہے جو ان ستاروں، سیاروں، چاند، سورج کو چلا رہی ہے۔ بولا ہاں؛ اس سے معلوم ہوا کہ ہر بچہ بھی جانتا ہے کہ حرکت بغیر ایسے محرک کے نہیں ہو سکتی جو حی و مُرید ہو۔

میں نے کہا "اچھا بتاؤ اللہ کہاں ہے"؛ اس پر وہ سوچنے لگا تو میں نے کہا اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ تمہارے بدن میں جان ہے۔ کہا ہاں۔ میں نے کہا وہ کہاں نہیں ہے جسم کا کونسا حصّہ ہے جس میں جان نہیں۔ بولا سب جگہ ہے۔ میں نے کہا اب سمجھ لو جو اس ساری کائنات کی جان ہے وہ بھی ہر جگہ ہے۔ جب تمہیں اپنی جان نہیں دکھائی دیتی تو کائنات کی جان کیسے دکھائی دے سکتی ہے۔ جو اپنی جان کو دیکھ سکے گا وہی ممکن ہے کائنات کی جان کو دیکھ سکے (دل کی آنکھوں سے)۔

میری ایک لڑکی تقریباً چار سال کی تھی۔ والدہ مرحومہ کا یوم وفات تھا تو برسی کی رسم کے لئے کچھ کھانا وغیرہ پکایا تھا۔ لڑکی کی والدہ نے اس سے کہا "آج تمہارے ابا کی اماں آئیں گی"۔ وہ بہت ہنسی اور بولی، "کہیں ابا کی بھی اماں ہوا کرتی ہیں"؛ اس وقت قلب کو جھٹکا سا لگا اور یہ معلوم ہو گیا کہ ہر بچہ ازلیت کا تصور لئے آتا ہے۔ پھر میں نے کتنے ہی بچوں سے جنھوں نے اپنے دادا دادی نانا نانی کو نہیں دیکھا تھا ایسے ہی سوال کئے۔ کوئی بچہ ایسا نہ تھا جس نے یہ نہ کہا ہو، "کہیں ابا کے بھی ابا ہو سکتے ہیں؟ اماں کی بھی کہیں اماں ہوتی ہیں؟ اس پر خیال ہوا کہ بچوں سے اور بھی علم سیکھنا چاہیئے یہ تو قدرت کے پڑھائے ہوئے ہیں۔

ایک روز میں نے اسی چار سالہ لڑکی سے کہا، "بیٹی جب ہم بڈھے ہو جائیں گے"، تو وہ بہت ہنسی اور بولی "آپ کیسے بڈھے ہو جائیں گے بڈھا تو وہ ہے جو بیان بیچنے آتا ہے"۔ اب معلوم ہوا کہ بچہ ازلیت و ابدیت کا تصور لئے ہوئے آتا ہے۔ حدوث تغیر کا تصور اس کے ذہن میں نہیں ہوتا وہ تو لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ کا سبق پڑھے ہوئے آتا ہے۔

ایک تین ساڑھے تین سال کے بچے سے پوچھا یہ کرسی کس نے بنائی ہے؟ بولا، ترکھان نے۔ اسی طرح کئی چیزوں کے متعلق دریافت کرنے کے بعد پوچھا: یہ گھوڑا کس نے بنایا؟ بولا: اللہ میاں نے۔ اس سے کہا تم نے کیسے جانا؟ بولا: اس میں کھال ہے۔

کچھ فرنیچر بنوانے کے لئے ایک ترکھان لگایا۔ وہ گھر پر ہی کام بنا رہا تھا میرے

ایک پانچ سالہ بچے نے ترکھان سے کہا کہ مجھے ایک گاڑی بنا دو۔ ایک تختے کے پچھلے حصہ میں دو پہیے لگا کر اگلے حصہ میں سوراخ کر کے ایک ڈنڈا ڈال دو۔ اس ڈنڈے کے نیچے اس میں پہیہ لگا دو اور اوپر ہتی بھی بنا دو۔ غرضکہ وہ گاڑی بن گئی۔ اس کو چلاتا رہا۔ کچھ دن بعد ایک روز مجھ سے کہنے لگا "ابا جی! جب اللہ میاں کے ہاتھ ہی نہیں تو وہ بناتا کیسے ہے؟ یہ ایسا سوال تھا وہ اگر اس بچے نے وہ گاڑی نہ بنوائی ہوتی تو جواب دینا مشکل تھا۔ چونکہ گاڑی بنوائے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ میں نے اس کی یاد تازہ کرائی اور پوچھا کہ یہ گاڑی جو تم نے بنوائی، کہیں دیکھی تھی؟ بولا کہ نہیں! یہ تو میں نے آپ ہی سوچ کر بنوائی ہے۔ میں نے کہا جب تمہیں گاڑی بنوانے کی خواہش ہوئی تو خیال آتے ہی اس کی تصویر ذہن میں بنی ہوگی؟ بولا: ہاں! میں نے کہا جب تم کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتے ہو تو ذہن میں تصویر بن جاتی ہے؟ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ چیز بن جاتی ہے۔ بچہ سمجھ گیا اور اس کی تسکین ہوگئی۔

یہ فطری رجحانات ہیں جو ہر بچہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دوئی کا تصوّر اس کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم اس سے کہلواتے ہیں "کہو اللہ ایک"۔ چنانچہ اس کا ذہن دوئی کی طرف متوجہ ہوتا ہے حالانکہ وہ تو واحد کا نہیں احدیت کا تصوّر لئے ہوئے ہے۔ بچوں کے ان تمام جوابات کو یکجا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ یہ سبق پڑھے ہوئے آتا ہے کہ ایک ایسی ہستی کا ہونا لازم ہے جو حی و قیوم ہو، ازلی و ابدی احد و صمد لم یلد ولم یولد ہر جگہ موجود (عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡد)، ہر شے پہ قادر (عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر)، جس میں تغیر ناممکن، خالق، رازق، بڑا شفیق (رؤف و رحیم)۔ اس کی جستجو و طلب اس کے نفس میں ہوتی ہے کہ ایسی ہستی میری ہو جائے۔ مجھے مل جائے۔

یہ تو وہ اسباق ہیں جو بچے ہمیں پڑھاتے ہیں مگر ہم ان کو نادان سمجھ کر اپنے خیال کے مطابق سبق پڑھاتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں بچے سے کہتے ہیں "اللہ مٹھائی دے گا۔ اللہ روٹی دے گا"۔ کسی بُرے کام سے روکنے کو کہتے ہیں "اللہ مارے گا"، ہم چونکہ اس کے فطری رجحانات سے جو اس کے نفس میں ودیعت کئے ہوئے ہیں، واقف نہیں

ہوتے اس لئے ایسی باتیں کر کے اپنے خیال کے مطابق اللہ کا تصوّر اس کے ذہن میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ بچّہ سب سے زیادہ پیار کا شائق ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کوئی نہیں کہتا کہ اللہ تو سب سے زیادہ پیار کرنے والا ہے۔ اس کا پیار تو ماں باپ، بھائی بہن سب کے پیار سے کہیں زیادہ ہے۔ جس سے اللہ راضی ہو جائے اس کو بے انتہا پیار کرتا ہے۔

بچّے کو سمجھانے کے لئے یہ بھی بتاتے ہیں کہ تم آنکھوں سے دیکھتے ہو اور بغیر روشنی کے نہیں دیکھ سکتے مگر اللہ تمہارے ہر کام کو دیکھتا ہے۔ اس کو دیکھنے کے لئے آنکھوں کی ضرورت نہیں، وہ اندھیرے میں بھی دیکھتا ہے۔ جب بھی تم اس کو پکارو، کوئی دعا مانگو وہ سنتا ہے اسے سننے کے لئے کانوں کی حاجت نہیں۔ وہ تو چیونٹی کے پاؤں کی حرکت کی آواز بھی سنتا ہے۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس ہے ہر دم و لحظہ تمہارے ساتھ ہے۔

ممکن ہے بعض حضرات پر یہ بیان کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے گراں گزرے اس لئے کہ اکثر علماء سلف کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہیں مخلوقات سے دُور۔ ہر چند کہ یہ مسئلہ متکلمین سے تعلق رکھتا ہے اور اس کتاب کا تعلق عقائد و کلام سے نہیں مگر چونکہ دہریت کا پروپیگنڈا کرنے والے اسی مسئلہ سے عدم وجود باری ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں لہٰذا اس کے متعلق کچھ مجملاً بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ایک مترجم کلام اللہ میں دیکھا کہ "ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" (۱۶) الاعراف۔ جہاں بھی قرآن میں آیا ہے اس مقام پر بہت سی مستند کتب کے حوالوں سے ایک ہی سا مضمون حاشیہ پر درج ہے۔ تمام حواشی کو یکجا کیا جائے تو ان کا لب لباب حسب ذیل ہو گا:

(۱) اللہ تعالیٰ اوپر ہے عرش پر جو ایسا عقیدہ نہ رکھے اس سے توبہ کرانی چاہیئے۔ اگر توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات سے اوپر ہے اور تمام مخلوقات سے جدا ہے۔

(۳) اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے تمام مخلوقات سے جدا ہے۔

(۴) ارسطو سے پہلے تمام فلاسفہ قائل تھے کہ صانع عالم تمام خلقت سے الگ ہے اور تمام جہان سے اوپر ہے۔

اس آخری بیان سے ظاہر ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر ہونے کا عقیدہ مسلمانوں میں فلسفۂ قدیم سے ماخوذ ہوکر رائج ہوا اور وہ فلسفہ کئی صدیاں ہوئیں باطل ثابت ہوچکا ہے۔

اب تیسرے نمبر کا یہ بیان کہ اہلِ سنّت کا اس پر اجماع ہے غلط ہے۔ ایک حاشیہ پر یہ مضمون موجود ہے کہ "تمام سلف صالحین کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہیں عرش پر مگر معتزلہ نے اس کی نفی کی ہے اور متاخرین اشاعرہ ان کے تابع ہوئے"۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بیان بھی کہ اہلِ سنّت کا کہ اس پر اجماع ہے، درست نہیں۔ اس کا دعویٰ کرنے والوں نے خود ہی اس کی تردید بھی کردی ہے۔ کیا معتزلہ و اشاعرہ اہلِ سنّت نہیں؟

اب رہے یہ دو امر کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہیں مخلوقات سے جدا مخلوقات سے دور، سب سے اوپر، تو اس کے متعلق عرض ہے کہ فلاسفہ قدیم کا عقیدہ تھا کہ سات آسمانوں پر آٹھواں آسمان ہے اور اس کے اوپر نواں آسمان فلک الافلاک ہے۔ اسی کو علماء سلف عرش کہتے تھے۔ افسوس کہ یہ نواں آسمان تو اب علم و حکمت کی روشنی سے معدوم ہوگیا۔ پس اگر اللہ تعالیٰ عرش پر تھے تو ان کا بھی عدم ثابت ہوتا ہے۔

اس زمانہ میں تو راکٹ فضا میں گھوم رہے ہیں زمین کی کشش سے باہر جا کر اوپر کوئی سمت ہی نہیں رہتی۔ پس جب اوپر کی سمت معدوم ہوگئی تو یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہیں عدمِ وجود پر دلالت کرتا ہے۔

اس صدی میں علم طبیعات کے نظریۂ نور سے ثابت ہوگیا ہے کہ غیر مرئی نوری شعاعیں تمام یونیورس میں پھیلی ہوئی ہیں اور کوئی ایک نقطہ کی جگہ بھی ایسی نہیں جہاں نوری شعاعیں موجود نہ ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مخلوق ہی ہیں۔ پس اگر یہ عقیدہ درست ہو کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے جدا اور دور ہیں تو پھر بتائیں کہ وہ کہاں ہیں؟ اس عقیدہ سے بھی عدم وجود باری ثابت ہوتا ہے۔ یہ تمام عقائد جہالت و نادانی کے زمانہ کے عقائد ہیں۔ اب علم و حکمت کے زمانہ میں ان عقائد کے لئے کوئی مقام نہیں۔ کلام اللہ میں بہت سی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے۔ مگر اس کی یہ تاویل کردی جاتی ہے کہ اس کا علم ہر جگہ ہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کو لازم ہے کہ فقرائے عارفین کی تعلیم کی طرف رجوع کریں۔ مثلاً

مولانائے روم۔ جنید بغدادی وغیرہ وغیرہ۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

آیئے آیۂ نور کی طرف پھر رجوع کریں:۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴿۳۵﴾ النور

(اللہ نور (علت العلل) ہے آسمانوں اور زمین کا)۔

سَمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

سماء کے معنی ہیں بلندی اور بلندی کے مقابل لفظ ارض استعمال ہوا ہے اور ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر صاحب فہم سمجھ سکتا ہے کہ بلندی کے مقابل جو لفظ استعمال کیا جائے اس کا مفہوم پستی ہی ہوگا۔ چنانچہ ارض کو دُنیا بھی کہا جاتا ہے اور دُنیا کے معنی ہیں "پست ترین شے" اس لحاظ سے آیت کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ "اللہ علت العلل ہے تمام بلندیوں اور پستیوں کا"۔

پہلے تو ہمیں بلندی اور پستی کا مفہوم سمجھنے کے لئے غور کرنا لازم ہے۔ زمین ہر شے کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتی ہے۔ لہٰذا سطح ارض پر کسی نقطہ پر ایک عمودی خط کھینچا جائے اس خط کا رُخ اُوپر کی طرف ہی ہوگا۔ اسی طرح ہر ستارے اور سیارے کا حال ہے کہ اس پر سب سے نیچی جگہ اس کا مرکز ہے۔ اور اس کی سطح پر جو عمود ڈالا جائے وہ اُوپر کی طرف رُخ کئے ہوگا۔ غرض کہ سطح کے ہر طرف اوپر ہی اوپر ہے۔ لہٰذا اُوپر اور نیچے نسبتی سمتیں ہوئیں۔ جب زمین کی قوت کشش سے باہر چلے جاتے ہیں تو اوپر اور نیچے کوئی سمت باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا یونیورس میں نسبت کے تصور کے بغیر جہاں بھی کوئی نقطہ فرض کرلیں اس کے ہر طرف اُوپر ہی اوپر ہوگا۔ اور ہر طرف بلندی ہی بلندی کہلائے گی۔ آیہ و فی ہدایہ میں "اَلسَّمٰوٰتِ" ہے جس سے مُراد ہوتی ہے تمام بلندیاں۔ اب ذرا غور کریں کہ اس کلمہ کے مفہوم کی دلالت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ وہ تو تمام کائنات پر دلالت کرتا ہے جہاں پہنچنے سے ہمارا وہم وگمان بھی عاجز ہے۔ ہمیں تو کائنات کے ایک ذرا سے جزء کا بھی شعور نہیں۔ اس وسیع کائنات میں یہ ہمارا نظام شمسی تمام بحرِ اعظموں میں سے ایک قطرہ کی برابر بھی نہیں۔ اور اس نظام شمسی کے متعدد سیاروں میں سے

ایک یہ ہماری زمین ہے جس پر ہم رہتے ہیں۔ ہمیں تو اس کی سطح کا بھی پورا علم حاصل نہیں۔ بے شمار پہاڑوں کی سطح کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ قطبِ جنوبی و قطبِ شمالی کی سطح کے متعلق بہت تھوڑا علم ہے۔ سمندروں میں ہزاروں مقامات کی گہرائی معلوم کرنے کے باوجود بے شمار مقامات کی گہرائی نامعلوم ہے۔ ہمیں سمندر کی تہ کی سطح اور اس کے اندر کی مخلوق کے متعلق بہت کم علم ہے۔

ہماری زمین اس آفتاب کے گرد حرکت کرنے والے نو سیاروں میں سے ایک ہے۔ اس کا قطر سات ہزار نو سو میل ہے۔ یہ اپنے محور کے گرد ۵۶-۲۳ تقریباً ۲۴ گھنٹے میں ایک چکر کر لیتی ہے۔ یہ اس کا ایک دن رات ہوتا ہے۔ اس کے گرد گردش کرنے والا ایک چاند ہے جس کا قطر تقریباً دو ہزار ایک سو چھتیس میل ہے اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے اور یہ زمین کے گرد ۲۴-۲۹ دن میں ایک گردش پوری کرتا ہے۔ ہمارے آفتاب کا قطر اندازاً آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار میل ہے۔ اور اپنے محور کے گرد ہماری زمین کے پچیس دن کے برابر وقت میں گردش کرتا ہے۔

نوٹ:۔

عنوان "سمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے تحت اور دیگر چند مقامات پر جو سائنسی معلومات حسبِ ضرورت فراہم کی گئی ہیں وہ ۱۹۶۷ء تک کے مطالعہ پر مبنی ہیں اس کے بعد سے تا حال جو تحقیقی کام "اسپیس" (SPACE) میں ہوا ہے اس سے سائنسی دُنیائے علم میں ایک انقلاب رونما ہوا ہے اور حیرت انگیز انکشافات، جو اب تک انسانی علم و مشاہدہ میں نہ تھے، غیب سے شہود میں آئے ہیں۔ لہٰذا قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب بالخصوص مضمونِ مذکورہ کا مطالعہ کرتے وقت حالیہ علمِ سائنس و مشاہدات کو مدِّ نظر رکھیں تاکہ مصنّف کی تحریر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ ہو سکے۔ شکریہ!

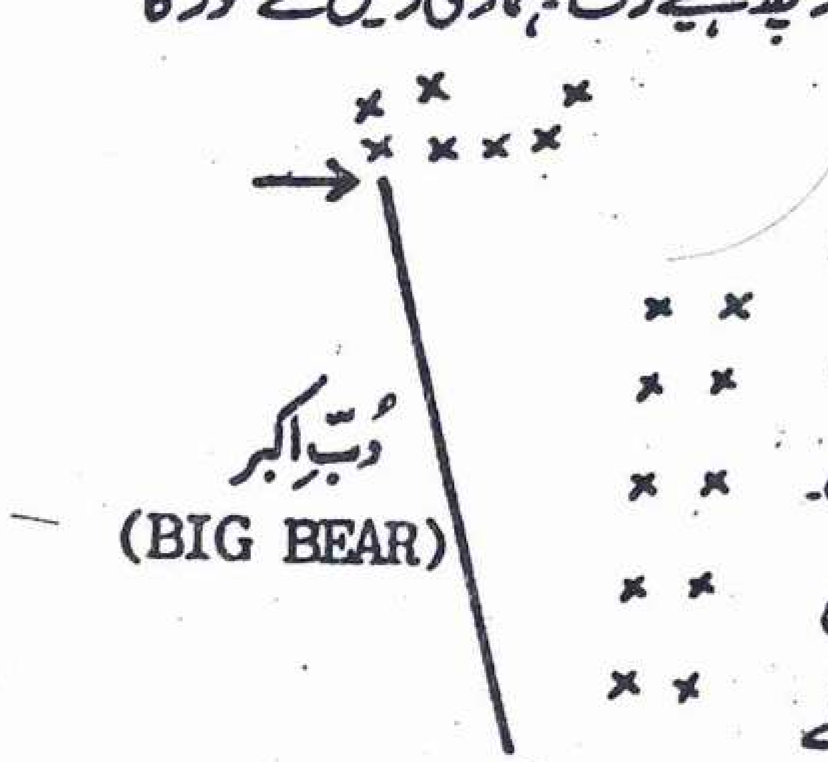
(حزب الطالبین، کراچی)

ہمارے نظامِ شمسی کے سیاروں کی جسامت اور سورج سے فاصلہ وغیرہ اور ان کی گردشوں کے متعلق جو معلومات اہلِ عالم کو اب تک حاصل ہو چکی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔*

سیارے کا نام	سورج سے فاصلہ اندازاً	سیارہ کا قطر میلوں میں	محور کے گرد گردش کا وقت	سورج کے گرد گردش کا وقت	چاند کی تعداد
عطارد	تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل	تین ہزار میل	ہماری زمین کے ۸۸ دن	زمین کے ۸۸ دن	کوئی نہیں
زہرہ	چھ کروڑ ستر لاکھ	سات ہزار چھ سو	ہماری زمین کے ۲۰۰ دن	دو سو پچیس دن	کوئی نہیں
زمین	نو کروڑ تیس لاکھ	سات ہزار نو سو	۲۳،۵۶ تقریباً ۲۴ گھنٹے	تین سو سوا پینسٹھ دن	ایک
مریخ	چودہ کروڑ دس لاکھ	چار ہزار دو سو	چوبیس گھنٹے سینتیس منٹ	چھ سو ستاسی دن	دو
مشتری	اڑتالیس کروڑ نوے لاکھ	ستاسی ہزار	نو گھنٹے پچاس منٹ	بارہ سال	بارہ
زحل	اٹھاسی کروڑ ساٹھ لاکھ	بہتر ہزار	دس گھنٹے چودہ منٹ ارضی	ساڑھے انتیس سال	نو
یورینس	ایک سو اٹھتر کروڑ بیس لاکھ	اکتیس ہزار	دس گھنٹے چالیس منٹ ارضی	چوراسی سال	پانچ
نیپچون	دو سو اناسی کروڑ تیس لاکھ	تینتیس ہزار	زمین کے آٹھ گھنٹے	ایک سو پینسٹھ سال	دو
پلوٹو	تین سو سرسٹھ کروڑ	تین ہزار چھ سو	نامعلوم	دو سو اڑتالیس سال	کوئی نہیں

* صفحہ ۲۳۹ پر آخر میں دیئے گئے نوٹ کو ذہن میں رکھیے گا۔

یہ ہمارا نظامِ شمسی ہے جس کے متعلق کلام اللہ میں ہے "وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ"۔
(۱۷ المؤمنون) (ہم نے تمہارے اوپر سات راستے خلق کئے ہیں)۔ ہماری زمین کے اوپر ایک راستہ یا مدار تو چاند کا ہے۔ اس کے اوپر سیاروں کے مدار ہیں۔ یہ نظامِ شمسی تقریباً ساڑھے سات ارب میل لمبائی اور اتنی ہی چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر ایک سرے سے ریڈیو کا پیغام بھیجا جائے تو دوسرے سرے تک پہنچنے میں تقریباً گیارہ گھنٹے صرف ہوں گے جبکہ اس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ جو کچھ بھی ستارے وغیرہ ہمیں نظر آتے ہیں یہ ہمارا ایک نظام کوکبی (GALAXY) ہے جس کی اندازاً وسعت ہمارے نظامِ شمسی سے نو دس ارب گنا ہے۔ ہمارے نظامِ شمسی کی حدیں اس نظامِ کوکبی میں گویا دریا میں ایک قطرہ پانی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس نظامِ کوکبی میں جس ستارہ کی طرف خاص توجہ جذب ہوتی ہے وہ قطب ستارہ ہے جو کبھی جگہ نہیں بدلتا۔ خطِ استوا پر یہ بالکل اُفق پر نظر آتا ہے۔ جتنے جتنے شمال کی طرف بڑھتے جائیں یہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ زمین کے شمالی سرے پر بالکل سر پر آجاتا ہے۔ یہ نقطہ ہی زمین کے محور کا شمالی سرا ہے۔ اس نقطہ سے ۲۲½ درجہ کے دائرہ میں چھ مہینے دن رہتا ہے اور چھ مہینے رات۔ ہماری زمین کے محور کا شمالی سرا ہمیشہ قطب کی طرف رہتا ہے۔



قطب کی شناخت ہم بعض چمکدار ستاروں سے کرتے ہیں جو گردشِ ارض کی وجہ سے ہمیں قطب ستارے کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک کھٹولا یا چوکھٹا اور اس کے ساتھ تین ستارے ہیں۔ یہ سات ستارے بنات النعش کہلاتے ہیں۔ ان ہی کو دُبّ اکبر یا (BIG BEAR) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کھٹولے کے آخری دو ستاروں کو ملا کر اگر خط کھینچا جائے تو اسی خط پر قطب ستارہ ملتا ہے۔ ان کے علاوہ دو چمکدار ستارے اس سے ہمیشہ یکساں فاصلے پر رہتے ہیں۔ ان کو ہم قطبین کہتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھیں تو ان قطبین کے نیچے خمدار خطوط پر چار جوڑ ستارے قطب اور

ان کے درمیان نظر آتے ہیں! ان کے مقام اور فاصلے میں بھی کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ تمام ستارے اپنے اپنے نظام شمسی کے آفتاب ہیں۔ جن کے گرد حرکت کرنے والے سیارے ہمیں نظر نہیں آتے، اور قطب ستارہ تو بڑا عظیم الشان آفتاب ہے اس کے گرد حرکت کرنے والے تو نامعلوم کتنے سیارے ہوں گے۔ وہ تو ابھی نظر ہی نہیں آسکے ہیں۔

اس نظام کوکبی میں ستاروں سے بنی ہوئی مختلف اشکال نظر آتی ہیں کہیں مثلث کہیں مربع، کہیں چوکور وغیرہ۔ آسمان کے دائرے کو ہیئت دانوں نے بارہ حصّوں میں تقسیم کیا ہے، ان کو بروج کہتے ہیں۔ ہر حصّہ میں ستاروں سے بنی ہوئی جو مستقل شکل نظر آتی اس پر اس برج کا نام رکھ لیا گیا ہے۔ مثلاً حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت۔ ان تمام بروج میں عقرب کی شکل سب سے زیادہ واضح ہے۔ اس میں تقریباً بیس ستارے ہیں۔ اگر ان کو خطوط سے ملایا جائے تو بچھو کی صاف شکل بن جاتی ہے۔

اپنے نظام کوکبی میں ہمیں کہکشاں بھی نظر آتی ہے (MILKY WAY) اسکے متعلق اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ یہ بے شمار نظام شمسی کا مجموعہ ہے۔

اس کے علاوہ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ ہمیں سیارے تو صرف اپنے نظام شمسی ہی کے نظر آسکتے ہیں۔ دوسرے نظامہائے شمسی کے سیارے تو ہمیں نظر ہی نہیں آتے۔ تب سمجھ میں آتا ہے کہ جتنے ستارے ہمیں نظر آتے ہیں اور جگہ نہیں بدلتے ان میں سے ہر ایک اپنے نظام شمسی کا آفتاب ہے۔

عرصہ دراز سے اہلِ عالم کے ذہنوں میں یہ خیال گھوم رہا ہے کہ آیا ہماری زمین کے علاوہ بھی اور سیاروں میں آبادیاں ہیں یا نہیں۔ حضور سرور دو عالم صَلّی اللہ علیہ وسلّم نے تقریباً چودہ سو سال قبل بتادیا تھا "کُلُّ کَوَاکِبُ مَدِیْنَۃٌ" (تمام کواکب میں آبادیاں ہیں)۔ اس کی مثل اور بھی چند احادیث اس پر دال ہیں کہ بعض سیاروں میں انسانی آبادیاں ہیں۔ اس زمانہ میں اس کے ثبوت مہیا ہوتے جارہے ہیں۔ اُڑن طشتریوں کے زمین کی فضا میں ظاہر ہوتے رہنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہمارے نظام کوکبی کے کسی سیارے سے آتی ہیں جہاں کی آبادی تہذیب میں ہم سے بہت آگے ہے۔

روزنامہ جنگ ۱۹ اگست ۱۹۶۷ء کے اداریہ میں بھی یہ مضمون شائع ہُوا تھا کہ کینبرا کے قریب جو ریڈیائی دوربین نصب ہے۔ اس پر ایسے سگنل سُنے گئے ہیں جو پانچ سو سال کے شعاعی فاصلے سے آ رہے ہیں۔ جبکہ شعاع کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ اس انکشاف سے اندازہ ہوا کہ اس ناقابلِ تصوّر بُعد پر بھی کسی تہذیب کا وجود ہو چکا ہے۔ غرضکہ اب اہلِ عالم کو فرمانِ رسول ایزدی کی تصدیق کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

ہم کو جو نظر آتا ہے یہ تو صرف ایک نظامِ کوکبی ہے جس کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ لگانا محال ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسّی، نوّے ہزار یا اس سے بھی زیادہ نوری سالوں کا فاصلہ ہو۔ یہ ایک گلیکسی (GALAXY) ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۵ء کے اردو ڈائجسٹ کے ایک مضمون زیرِ عنوان "آؤ ستارے گنیں" میں تھا کہ "آج سے چالیس سال پہلے دو یورپی ہیئت دانوں، سِیرز اور وان رائن، نے ستاروں کی نہایت محتاط گنتی کرنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔ اس سے قبل اٹھارویں صدی کے آخر میں سَر ولیم ہرشل نے بھی اسی طرح کا کام شروع کیا تھا۔ اصل مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ آسمان کے تمام ستارے کسی خاص نظام کے ساتھ منسلک ہیں یا بے ہنگم طور پر خلائے بسیط میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی ہے کہ رات کے وقت ہمیں آسمان پر جو دودھیا راستہ (MILKY-WAY) نظر آتا ہے وہ کوئی بادل یا دُھوئیں کا دودھیا روشن غبار نہیں بلکہ کروڑوں مدھم ستاروں کا حلقہ ہے۔ ان ستاروں کو آنکھ الگ الگ نہیں دیکھ سکتی۔ مگر ان کی روشنی مجموعی طور پر ایک منوّر غبار کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ دوسری بات جس کا انکشاف ہوا یہ تھی کہ کہکشاں (MILKY WAY) اور آسمان کے دوسرے تمام ستاروں کا آپس میں ایک گہرا تعلق ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ ایک ہی نظام ہے۔ اسے فلکیات کی اصطلاح میں نظامِ کوکبی (GALACTIC SYSTEM) کہتے ہیں۔
اس میں سوا ارب کے قریب ستارے ہیں۔ ان ہی میں ہمارا سورج بھی شامل ہے جو ایک معمولی قسم کا ستارہ ہے۔ پھر اس سورج کے نو سیّاروں میں سے ایک چھوٹے سے سیّارے زمین پر حضرت انسان اپنی دُنیا بسائے ہوئے ہیں۔"

"اس نظام کو کبی سے آگے گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ستاروں کی اس عظیم انسان بستی سے باہر دُور دُور تک کوئی اور چیز نہیں۔ یعنی اک طرح کا مکمل خلا ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم کسی طرح اس مقام تک پہنچ جائیں اور خلا میں ایک طرف بڑھتے چلے جائیں تو ہمیں بالآخر ایک اور نظام کو کبی ملے گا جو ہمارے نظام جیسا ہو گا۔ اس سے بھی آگے اتنا ہی دُور جا کر پھر کوئی اور نظام ہو گا اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا جائے گا۔ ہیئت دانوں نے بڑی بڑی دُوربینوں کی مدد سے اب ان دوسرے نظاموں کا پتہ چلا لیا ہے جنھیں بیرونی کہکشائیں یا سحابیے کہتے ہیں۔ تصویروں میں ان کی شکل چکر کھاتے ایک غبار کی نظر آتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارا اپنا نظام کو کبی بھی باہر سے جا کر ایسا ہی نظر آئے گا۔ ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ ہر سحابیہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ اگر اس کے ایک سرے سے ریڈیو پر کوئی پیغام بھیجا جائے تو دوسرے سرے پر یہ پیغام تقریباً اسی ہزار سال بعد سنا جائے گا۔ اور ایک سحابیے سے اگلے سحابیے کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ ریڈیو کا ہی پیغام ایک سے دوسرے سحابیے تک پہنچنے میں کوئی چالیس لاکھ سال تو ضرور لگیں گے"۔

"دنیا کی سب سے بڑی دُوربین کے ذریعے نظر آنے والے سحابیوں کی تعداد سیکڑوں یا ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں تک پہنچتی ہے اور کہیں کہیں تو ان کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بزرگی اور عظمت کا احساس یوں تو اس کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے ہوتا ہے مگر کائنات کی وسعت کو دیکھ کر خدا کی کبریائی اور انسان کی کمتری کا احساس اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انسان اجرام سماوی کے متعلق خود اپنی معلوم کی ہوئی باتوں پر شک کرنے لگتا ہے اور جتنا زیادہ کائنات کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے اتنا ہی اس کا دماغ چکرا اٹھتا ہے"۔ (ڈائجسٹ کا مضمون ختم ہوا)۔

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: "شاید تم لوگ یہ سمجھتے ہو گے کہ اللہ تعالیٰ نے بس اسی عالم کو پیدا کیا ہے یا یہ سمجھتے ہو گے کہ خدائے تعالیٰ نے تمہارے سوائے اور آدمی ہی پیدا نہیں کئے۔ ایسا نہیں ہے۔ واللہ خدائے تعالیٰ نے ہزاروں ہزار عالم اور ہزاروں ہزار آدم پیدا کئے ہیں۔ تم تو ان عالموں میں ایک ہو"۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ الحمدللہ کہ اب اس زمانہ میں قوالِ رسول کریم کی تصدیق ہو رہی ہے۔

حضور سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عرش کے معنی دریافت کئے گئے تو حضورؐ نے فرمایا: "تمام عوالم کا مجموعہ عرش ہے۔" اور عرش کے متعلق حضورؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: "عرشِ الٰہی کے ستّر(۱) ہزار دروازے ہیں اور ہر دروازے میں ستّر ستّر ہزار عالم ہیں۔ الحمدللہ کہ اب اس صدی میں فرمانِ رسولؐ کی تصدیق ہو رہی ہے۔

عرش کے ستونوں کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے "عرش کے ستونوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ اگر ایک پرندہ ہزاروں سال اڑتا رہے تب بھی نہ پہنچ سکے۔" اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک سحابیے سے دوسرے سحابیے کا فاصلہ اتنا ہے کہ برقی پرندہ بھی ہزاروں سال اڑتا رہے تب بھی نہیں پہنچ سکتا۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ

اللہ اکبر اس کے عرش کی عظمت کا تصوّر کرنا بھی ممکن نہیں۔ پھر جس کی مخلوق کی عظمت کے احساس میں عقل و وہم و گمان عاجز ہوں اس ذات کی عظمت و کبریائی کا کیا تصوّر ہو سکتا ہے؟؟ آیئے زیرِ بحث آیت کی طرف پھر توجہ کرتے ہیں:۔

"اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ" (اللہ نور ہے سماوات و ارض کا اس کے نور کی مثال)

نُوْرِہٖ۔ اس کا نُور

غور طلب امر ہے کہ اس کے نُور سے کیا مُراد ہو سکتی ہے۔ ہم روزانہ بولتے ہیں۔ اس کی زمین، اس کا آسمان، اس کی مخلوق، اس کا بندہ۔ اس کے سوائے ادعیہ ماثورہ میں جو کچھ ہمیں تعلیم دیا گیا ہے وہ یہ ہے "یَا مُدَبِّرَ النُّوْرِ" (اے نور کی تدبیر کرنے والے) "یَا خَالِقَ النُّوْرِ" (اے نور کے خالق "یَا نُوْرَ النُّوْرِ" (اے نور کے باعث ظہور) لہٰذا ظاہر ہو گیا کہ "نُوْرِهٖ" (اس کے نور) سے مراد وہ نُور ہے جو اس کا اوّل مخلوق ہے۔

(نوٹ) (۱) ستّر ہزار شمار نہیں ہے بلکہ اظہارِ کثرت کے لئے محاورہ ہے اور اس سے بے شمار مُراد ہے۔

خلقتِ نُور۔ مُوثّر واثر

اس عالم مادّی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک دھات کا ٹکڑا یا پتھر یا اور کوئی شئے، جو گرم ہو، کہیں رکھی ہو تو اس سے حرارت کی شعاعیں نکلتی ہیں جو ماحول کو گرم کر دیتی ہیں۔ بجلی جب کسی تار میں گزرتی ہے تو اس کو گرم کرتی ہے اور تار کے گرد مقناطیسی شعاعیں اس سے نکلتی ہیں۔ اور جب باریک تار کے گچھے سے جو بلب میں ہوتا ہے، گزرتی ہے اور وہ گرم ہو کر سفید ہو جاتا تو چمکنے لگتا ہے۔ پھر اس سے بھی روشنی کی گرم شعاعیں خارج ہو کر ماحول کو روشن کر دیتی ہیں نفسِ انسان سے بھی مقناطیسی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں جو اس کے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر انسان کی قوّتِ ارادی ترقی کر جائے تو بالارادہ مؤثر شعاعیں خارج کر سکے گا جن سے حیرت انگیز اثرات ظاہر ہو سکیں گے۔ مگر افسوس کہ انسان خود اپنے قوائے باطن کے اثرات وفیوض سے بالکل ناواقف ہے۔ جب یہ نادان و لاشعور جو اپنی قوتوں کے اثرات ہی کو نہیں جانتا تو پھر اس کا وہم وگمان اس ذاتِ اقدس کے ارادے اور تاثیر کے تصور تک کیسے پہنچ سکتا ہے جو ارادہ، تاثیر، تاثر و مؤثر کی بادی ہے، یعنی عدم سے وجود میں لانے والی ہے اس کے امور تک اس کے عقل وفہم کی رسائی کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟

ابتدائے خلقت کے متعلق بیان کرنے سے قبل اس کا واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے گا محض فلسفہ ہی ہوگا جو ظنی ہوتا ہے۔ اس کتاب میں اس وقت تک محض فطرت کا بیان کیا گیا ہے جس کا تعلق نہ فلسفہ سے، نہ ظن وقیاس سے ہے بلکہ وہ تو حقائق ہیں مگر تخلیقِ کائنات کا بیان فلسفہ سے تعلق رکھتا ہے اور صرف افہام وتفہیم کے لئے ہوتا ہے۔ غیب کے حقائق تو تحریر میں آ سکتے ہیں نہ تقریر میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا افہام وتفہیم کے لئے جو کچھ احادیث اور فلسفہ کے بیانات سے مستنبط ہوتا ہے، وہ قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں:۔

اس مُرید و مُوثّرِ حقیقی کی ذات کا اثر جو اس کے علم مکنون میں مخزون تھا۔ جب اس نے چاہا تو نورِ کائنات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس کا مرکز نوری مجسّمہ ہے جس کا عکس شکل و ہیئت انسانی ہے۔ انسان جو قیدِ زمان ومکان میں مُقیّد ہے وہ لازمانیت و

لامکانیت کا تصور کیسے کر سکتا ہے؟ عالمِ نور میں تو پلک جھپکانے کا وقفہ بھی ہمارے کرۂ ارض کی صدیوں کے برابر ہوگا۔ ہم کو تو عالمِ نور کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ حضورِ سرورِ کائنات کے بعض خطبات میں حمد کے بیان میں ہے: " ذو اناۃٍ " (بتدریج خلق فرمانے والا) اور دعائے جوشن صغیر کی ہر فصل کے آخر حمد میں یہ فقرے موجود ہیں " فَلَكَ الْحَمْدُ یَارَبِّ مِنْ مُّقْتَدِرٍ لَایُغْلَبُ وَذِیْ اَنَاۃٍ لَّایَعْجَلُ " (پس تیرے لئے ہی ہے حمد۔ اے پالنے والے جو ایسا قادر ہے جو مغلوب نہیں ہو سکتا اور ایسا بتدریج عمل کرنے والا ہے کہ جلدی نہیں کرتا)۔

ہمیں معلوم ہے کہ پتھر کا کوئلہ زمین کے اندر دبی ہوئی لکڑی سے لاکھوں سال میں بنتا ہے۔ کاربن لاکھوں سال میں ہیرے میں تبدیل ہوتا ہے۔ قوانینِ فطرت کے تحت کائنات میں جو عمل و ردِّ عمل، تغیر و تبدل، تعمیر و تخریب ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہے گی، یہی اس کے کام ہیں۔ یہ بات قارئین پر واضح کر دینی ضروری ہے کہ ہر ملک میں ایک قانون ساز جماعت ہوتی ہے جو اس ملک کی حکومت کہلاتی ہے۔ اس ملک میں جتنے کام حکومت کے بنائے ہوئے قانون کے تحت ہوتے ہیں وہ تمام کے تمام حکومت ہی کے کام ہیں اور سب مقنن کی طرف ہی منسوب کئے جاتے ہیں۔ اب کلام پاک میں دیکھیں۔ جناب باری تعالیٰ عزّ اسمہ ارشاد فرماتا ہے: "وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی" (۳) الاعلیٰ (وہ وہی ذاتِ اقدس ہے جس نے قوانین مقرر کئے اور ہر شے کو (اسی کے مطابق) ہدایت فرمادی)۔ لہٰذا تمام کائنات میں اس کے معیّنہ قوانین کے تحت جو کام جاری و ساری ہیں وہ سب اسی کے کام ہیں۔ مثلاً سمندروں سے ہوائیں آبی بخارات لے آتی ہیں۔ فضا میں بادل بناتی ہیں۔ جب ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے بخارات آبی قطرات میں منتقل ہو جاتے ہیں، پھر ایک دوسرے سے مل کر وزنی ہو جانے سے نیچے گرتے ہیں اور بارش ہوتی ہے۔ مالکِ کائنات فرماتا ہے " وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً " (۵۳) طٰہٰ (اور اللہ نے بلندی سے پانی برسایا)۔ یہ فطرت کی قوتوں کے کام ہی اُس کے کام ہیں اور فطرت یا نیچر کا کوئی کام عجلت سے نہیں ہوتا۔ وہ تو " ذُوْ اَنَاۃٍ " بتدریج خلق فرمانے والا ہے " لَایَعْجَلُ " جو جلدی نہیں کرتا۔

پس مخلوقِ اوّل کے ظہور و تکمیل صفات کے متعلق جو لازمانیت میں ہوئی ہمارا وہم و گمان بھی اس کا یہ اندازہ کرنے سے قاصر ہے کہ ہمارے کرّۂ ارض کے وقت کے حساب سے کتنا وقت اس پر صرف ہوا ہوگا۔ غرضکہ جب اس نورِ اوّل کی تمام صفات سے تکمیل ہو چکی تو وہ مظہرِ صفاتِ الٰہیہ قرار پایا۔ وہ ہی اس تمام کائنات میں انائے مطلق ہے۔ وہ ہی روح یا روحِ اعظم یا روح القدس یا مہا آتما ہے۔

اِس نورِ کائنات، مخلوقِ اوّل، انائے مطلق کے بارے میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی مختلف احادیث نقل کی گئی ہیں:-

(۱) "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ اللَّوْحَ" (سب سے پہلے جو شے اللہ نے خلق فرمائی وہ لوح ہے) یعنی تختی، ہم تختی اس کو کہتے ہیں جس پر علم نقش کیا جاتا ہے اور چونکہ قلب پر ہی علمِ حقیقی وارد ہوتا ہے اور نقش ہو جاتا ہے لہٰذا اس کو بھی لوح کہتے ہیں ہم محاورے میں لوحِ دل بولتے ہیں۔ چونکہ اسی نورِ کائنات انائے مطلق میں علمِ باری کا خزانہ مکنون ہے لہٰذا یہی لوحِ محفوظ ہے جیسا کہ علی کرم اللہ وجہہٗ کے ایک خطبہ میں ہے "اَنَا اللَّوْحُ الْمَحْفُوْظُ" یعنی انائے مطلق ہی تو لوحِ محفوظ ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:- "بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ (۲۱) فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" (۲۲) البروج (بلکہ وہ بزرگ قرآن ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے) اور یہی اُم الکتاب ہے۔

(۲) "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْقَلَمَ" (سب سے پہلے جو اللہ نے خلق فرمایا وہ قلم ہے)۔ ہم علوم کے نقش تختی یا کاغذ پر قلم کے ذریعے سے بناتے ہیں اور لوحِ قلب پر علمِ حقیقی اسی نور کی شعاعوں سے وارد ہوتا ہے۔ علمِ فطرت، نفسِ انسان میں اسی نور کی شعاعوں سے ڈالا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ ربّ العزت ہے:- "اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۴) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۵)" العلق۔ (پڑھو تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ سکھا دیا انسان کو وہ سب جو کچھ بھی وہ نہ جانتا تھا)۔

قربان اس ربِ اکرم کے جس نے ہمیں تمام علم پڑھا کر پیدا کیا۔ مگر افسوس ہے اپنی بدنصیبی پر کہ ہم نعمات کے خزانے کو غفلت و لاشعوری کے تاریک گڑھے میں دبائے ہوئے ہیں اور مالک کی سب سے بڑی نعمت سے محروم ہیں۔ ایک زمانہ میں فلاسفۂ یونان میں ایک

گروہ ایسا تھا جو اس امر کا قائل تھا کہ تمام علم حقیقی نفسِ انسان کے باطن میں ودیعت کیا ہوا ہے جس کو غفلت ولاشعوری کے حجاب گھیرے ہوئے ہیں، جس کے باعث وہ علم اس کے شعور میں نہیں آتا۔ افسوس ہم بدبختوں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ پیارے مالک سے اس کی نصرت و تائید طلب کریں وہ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ اس کی نعمات سے فیض حاصل کر سکیں اور علم مخزون ہمارے شعور میں آنے لگے۔

(۳) اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ (سب سے پہلے جو چیز اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے)۔ اسی نور کا نام عقل ہے۔ یہی عقلِ اوّل یا عقلِ کُل ہے۔ احادیث میں عقل کی یہ تعریف کی گئی ہے اَلْعَقْلُ مَاعُبِدَ بِهِ الرَّحْمٰنُ (عقل وہ قوت ہے جس کے ذریعے سے رحمٰن کی بندگی کی جائے)۔ عقلِ فطری وہ قوتِ نورانی ہے جو ہر انسان کے ساتھ ہے وہ اسی نور کی شعاعیں ہیں یہی وہ قوتِ نورانی ہے جو نیکی کی طرف ہدایت کرتی ہے اور شر کو خیر سے تمیز کرنے اور اس سے بچنے کی ترغیب دیتی ہے۔ چونکہ یہ شعاعیں انائے مطلق، نورِ کائنات، اوّل مخلوق کی ہیں جس کی جان، جس کی روح، جس کی علت ذاتِ باری ہے لہٰذا ان کا قرب رب کا قرب ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۱۶) ق (ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں)۔

(۴) اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ الْعِلْمَ (سب سے پہلے جو شے اللہ نے پیدا کی وہ علم ہے)۔ یہی نور علم محض ہے۔ اسی کی شعاعوں سے علم حاصل ہوتا ہے۔ جب اس کی شعاعیں قلبِ انسان پر پڑتی ہیں تو اس میں خزانہ کیا ہوا علم حقیقی شعور میں آتا ہے۔ اسی کے متعلق حضورؐ سرورِ کائنات کا ارشاد ہے اَلْعِلْمُ نُوْرٌ يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِيْ قَلْبِ مَنْ يَّشَآءُ (علم وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ ڈالتا ہے جس کے قلب میں وہ چاہے) اور اسی کے لئے ارشاد ہے طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ وَّ مُؤْمِنَةٍ» (علم کی یعنی نور کی طلب ہر مومن مرد و عورت پر واجب ہے)۔

(۵) اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ الرُّوْحَ (سب سے پہلے جو شے اللہ نے خلق کی وہ روح ہے)۔ اسی نور کا نام روح ہے، یہی روحِ اعظم یا جہاں آتما ہے۔ ہمارے جسم مادی میں

ایتھر کا ایک جسمِ لطیف حلول کئے ہوئے ہے جو اس جسمِ مادی کے مشابہ ہے۔ اسی کو نفسِ امّارہ کہتے ہیں۔ یہی اس جسم پر حاکم اور اس میں عامل ہے۔ جب یہ خارج ہو جاتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے اس نفس سے کہیں زیادہ لطیف نفسِ قدسیہ ہے جو نورانی مجسمہ ہے۔ وہ بھی ہمارے اندر موجود ہے مگر اس میں قوتِ عمل بغیر اتصال شعاعہائے نوری پیدا نہیں ہوتی۔ عام محاورے میں نفس کو روح کہا جاتا ہے مگر یہ غلط العام ہے۔ روح تو یقیناً یہی نور ہے جس کے لئے ارشاد ہوا ہے "یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" (۸۵) الاسرا (اے حبیب تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ روح میرے رب کے امر سے ہے)۔ ایک مقام پر اس امر کی تصریح فرمادی ہے جیساکہ ارشاد ہے "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ" (۵۴) الاعراف (آگاہ ہو کہ اسی کے لئے عالمِ خلق ہے اور اسی کے لئے عالمِ امر ہے)۔ عالمِ خلق مادی عالم ہے اور عالمِ نوری عالمِ امر ہے اس لئے کہ خلق کرنا تو کسی شے سے دوسری شے بنانے کو کہتے ہیں اور مادہ نور سے خلق ہوتا ہے مگر عالمِ نور کسی شے سے نہیں بنتا بلکہ وہ مالک کے ارادے سے وجود میں آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ روح مخلوق نورانی ہے۔ آیہ ماسبق "قُلِ الرُّوْحُ" میں اکثر مترجمین نے امر کا ترجمہ "حکم" کیا ہے جس سے روح کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا اور نہ سوال کا جواب ملتا ہے۔ حالانکہ آیت میں یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ روح مخلوقِ نوری ہے جس کی شعاعیں اہلیت پیدا ہونے پر مومن کے جسم میں عامل ہو جاتی ہیں۔ اسی کے لئے ارشادِ باری ہے "وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ" (۸۷) البقرہ (اور ہم نے روح القدس سے اس کی مدد کی)۔ دوسری جگہ ارشاد ہے "اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ" (۲۲) المجادلہ (ان کے دلوں میں ایمان کے نقش بٹھا دیئے اور اپنی روح سے ان کی مدد کی) یعنی ان کے قلوب میں روح کی شعاعوں سے نور ڈال دیا اور یہی ایمانِ کامل اور ایمانِ حقیقی ہے۔ اسی کے لئے دعا کرنا سکھایا گیا ہے کہ بارگاہِ رب العزت میں بہ الحاح وزاری عرض کرتے رہو: "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ اِیْمَانًا تُبَاشِرُ بِهٖ قَلْبِیْ" (یا اللہ میں تجھ سے ایسا ایمان مانگتا ہوں جس میں میرا قلب شامل ہو) یعنی نورِ ایمان۔ اکثر علماء عارفین نے یہ راز ظاہر کر دیا ہے کہ جسمِ انسان روح کا مسکن نہیں

بلکہ معمل ہے۔ یعنی روح جسم میں حلول نہیں کرتی بلکہ عامل ہو جاتی ہے۔

(۶) اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ (سب سے پہلے جو اللہ نے بنایا وہ میرا نور ہے) اس نور کائنات، انائے مطلق مخلوق اوّل کی شعاعیں بندۂ مومن کی اہلیت کے مطابق ہی اس کے قلب پر پڑتی ہیں اور اس کے نفسِ قدسیہ سے متصل ہو جاتی ہیں۔ پس جس کے نفسِ قدسیہ سے اِتصال کامل ہو جائے اس کے کام اس نور انائے مطلق کے کام ہوں گے اور انائے مطلق کے کام خدا کے کام ہیں۔ لہٰذا ایسے بندے کے افعال کو ربُّ العزّت اپنے کام فرمائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہے "وَمَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی" (۱۷) الانفال، (تم نے تو سنگریزے نہیں پھینکے جبکہ پھینکے بلکہ وہ تو اللہ نے پھینکے تھے) پس جس کے نفس قدسیہ نورانی سے انائے مطلق کی شعاعوں کا اِتصال کامل ہو جائے اور وہی اس میں بولنے لگے تو اس کو ہی یہ حق ہے کہ وہ کہہ سکے "سب سے پہلے جو اللہ نے پیدا کیا وہ میرا نور ہے"۔ ایسا بندہ ہی اس کو اپنا نور کہہ سکتا ہے۔

یہ تو سب کہتے ہیں کہ تمام کائنات انسان کے لئے بنائی گئی اور انسان کو رب نے اپنے لئے پیدا کیا تاکہ اس کے ذریعے اپنی صفات کا اظہار فرمائے۔ لہٰذا وہ انسانِ کامل جن کے نفوسِ نوری سے انائے مطلق، نورِ کائنات کا اتصالِ کامل ہو جائے وہی تو صفاتِ الٰہیہ کے مظہرِ کامل اور خلقتِ کائنات کا مقصدِ منتہیٰ ہوں گے۔ اسی لئے تو حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے "لَوْلَاكَ لَمَاخَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ" (اے حبیب اگر تو نہ ہوتا تو میں کائنات کو خلق نہ کرتا)۔ جب تمام کائنات اس انائے مطلق نورِ محمدیؐ سے پیدا ہوئی تو ظاہر ہے اگر یہ نور نہ ہوتا، کائنات بھی نہ ہوتی۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی حَبِیْبِكَ وَ مُنْزِلِ وَحْیِكَ كَاَفْضَلِ مَاصَلَّیْتَ عَلٰی اَحَدٍ فِی الْعَالَمِیْنَ۔

اکثر ایسے ظاہری مسلمان جو خدا و رسولؐ کے دشمن ہیں خدا کے قول کی تکذیب کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ بندۂ حقیر ۱۹۳۳ء میں ایک شخص سے ملنے گیا وہاں اور چند افراد بھی موجود تھے۔ اتفاقاً حضورؐ سرکارِ دو عالم کا ذکر آگیا میں نے کہا ان کے فضائل و مناقب کوئی کیا سمجھ

سکتا ہے وہ تو باعث خلقتِ کائنات ہیں۔ ایک شخص بولا یہ کیسی تعلّی کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ یہ تو حدیثِ قدسی ہے " لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ " وہ کہنے لگا کہ ہاں حدیث خبیثی ہوگی۔ میرے ایک نشتر سا لگا۔ اس وقت میں اس کو جواب دینے کے قابل نہ تھا، اور وہاں سے یہ خلش لئے چلا آیا۔ خاک بمنہ رکھ کر دیا عرض کرتا رہا۔ ربّا تیرے دشمن تیرے حبیب کی توہین کریں اور یہ تیرا گنہگار بندہ ان کا منہ نہ توڑ سکے۔ رات کو روتے روتے ہی سو گیا۔ شب کے تقریباً دو بجے دل کو جھٹکا سا لگا اور آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر اٹھا، سرہانے میز پر کلام اللہ رکھا تھا دل اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ فوراً بتی جلائی اور قرآن کھولا تو سورۃ فرقان کا آخری رکوع سامنے تھا:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا (۶۱) وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (۶۲) الفرقان

(بڑی برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں برج قرار دیئے اور اس میں چراغ قرار دیا اور چمکتا چاند۔ اور وہی ہے جس نے رات و دن کو آگے پیچھے آنے والا قرار دیا۔ انکے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہیں یا شکر گزار ہونے کا ارادہ کریں)۔

اس کے بعد ان بندوں کے اوصاف کا بیان شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۶۳) وَ الَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا (۶۴) الفرقان

(وہ رحمٰن کے بندے جو زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے خطاب کرتے ہیں تو سلامتی کی بات کہہ دیتے ہیں اور وہ وہی ہیں جو رات گزارتے ہیں اپنے رب کے لئے سجدے اور قیام میں)۔

آگے ان بندگانِ رحمٰن کے فضائل بیان ہو رہے ہیں۔ سات آٹھ آیات کے بعد یہ ارشاد باری ہے:

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿٧٢﴾
وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ
وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا ﴿٧٤﴾ الفرقان

(وہ لوگ جو فریب (راگ ورنگ) کے پاس نہیں کھڑے ہوتے۔ جب کسی بیہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں (یعنی اس کی طرف توجہ نہیں کرتے)۔ جب انھیں رب کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو ان پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے اور جو کہتے ہیں اے رب ہمارے ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان عطا فرما اور ہمیں متقین کا امام بنا دے)۔

اِن آیاتِ مقدسہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خالقِ کائنات نے زمین، آسمان، چاند سورج، دن رات سب کچھ اپنے ان بندوں کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے اوصاف اس رکوع میں بیان فرمائے ہیں جن کا آخری وصف یہ ہے کہ وہ متقین کے امام ہیں۔

کیوں پیارے بھائیو! مسلمانو! کسی مسلمان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ کیا دُنیا میں کوئی شخص خواہ کسی قوم و نسل، کسی مذہب و ملت کا ہو اس سے انکار کرسکتا ہے کہ جو رحمٰن کے بندے ایسے ہوں، جو بے شمار گنہگار انسانوں کو متقی بنا دیں وہ ہی تو متقین کے پیشوا ہو سکیں گے؟ پھر کیا کوئی مسلمان ایسا ہو سکتا ہے جو اس سے انکار کر سکے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم روحی لہ الفدا نے بے شمار گناہگاروں کو پرہیزگار بنا دیا۔ پھر یہ سب اقرار کرتے ہوئے بھی جو " لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ " (اگر تو نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا) سے انکار کرے کہ یہ حدیثِ قدسی نہیں تو ایسا منکر وہی شخص ہو سکتا ہے جو خدا اور رسولؐ کا دشمن اور بندۂ شیطان ہو۔

عالمِ ارواح

ہر شخص جانتا ہے کہ مضئ (ILLUMINANT) سے یعنی روشنی دینے والی

ہر شے سے جتنی شعاعیں نکلتی ہیں ان میں سے ہر ایک شعاع روشنی دینے والی شے کا پورا عکس لئے ہوتی ہے ایک آئینہ کے سیکڑوں ٹکڑے کر کے دھوپ میں پھیلا دیں تو ہر ذرّے میں پورا آفتاب نظر آئے گا۔ بلکہ اگر ایک شعاع بے شمار فروعی شعاعوں میں بھی منقسم ہو جائے تو ہر فروعی شعاع میں بھی اصل مضیٔ کا پورا عکس موجود ہوگا۔ یہ شعاعِ نوری کا فطری قانون ہے۔ لہٰذا اس انائے مطلق مجسمہ نوری سے، جو مخلوق اوّل ہے، جتنی شعاعیں کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں وہ ہی روح القدس ہیں اور ان شعاعوں کی فروعی شعاعوں میں سے ہر ایک میں اس انائے مطلق کا پورا عکس موجود ہے، ملائکہ ہیں جن کا شمار سوائے ذاتِ باری یا انائے مطلق کوئی نہیں جانتا۔ ان کی قوتوں کا احصئی فہم انسانی نہیں کرسکتی۔ یہ بشکل انسان ظاہر ہو سکتے ہیں اور ہر مشکل سے مشکل کام چشم زدن میں انجام دے سکتے ہیں۔ یہی قلبِ انسان پر علم القا کرتے ہیں، یہی ذریعۂ وحی ہیں۔ ان ہی کے ذریعے سے نفسِ انسان پر الفاظ و کلمات، اعمال و افعال وغیرہ کے نقوش بنتے رہتے ہیں اور یہی کراماً کاتبین ہیں۔ یہی انسان کے محافظ و قابض ارواح بھی ہیں۔ ملائکہ اور رُوح کی عبادت اور سجدہ کا مطلب و مقصد خالقیت کا مظہر بننا اور مالک کی مشیت کے مطابق عمل کر کے کائنات کو تخلیق کرنا ہے۔ پس جب اس انائے مطلق، مخلوق اوّل مجسمۂ نورِ حقیقی سے شعاعیں پھیلیں، احادیث سے پتہ چلتا ہے تو جنابِ باری تعالیٰ نے بارہ حجاب خلق فرمائے۔ بعض فلاسفہ نے چودہ، بعض نے پندرہ اور بعض نے سترہ بھی بیان کئے ہیں۔

حجاب سے کیا مراد ہے؟ حجاب پردے کو کہتے ہیں جس کے دو کام ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شے کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہو۔ دوسرا دو وجودوں کے درمیان حائل ہو۔ لہٰذا وہ اجسام نوری جو سب سے پہلے نورِ اوّل کے اثر سے خلق ہوئے اپنے اندر اس نور کی شعاعوں کو لئے ہوئے تھے اور وہی خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ و حجاب ہوئے۔

جو نفوس نوری پہلی شعاعوں سے ظہور میں آئے ان کی تکمیل پر تقریباً اسّی ہزار سال صرف ہوئے جن کا ایک یوم ہمارے کرۂ ارض کے ہزار سال کے برابر تھا، اور یہ بھی محض ظنّی ہے، ممکن ہے کہ ان کا ایک یوم ہمارے کرۂ ارض کے پچاس ہزار سال کے برابر ہو۔ قطع نظر

اس لا حاصل وقتی بحث کے مقصد بیان اسی قدر ہے کہ ایک مدت مدید میں ان اجسام نوری یا نفوس مقدسہ نوری کی تکمیل ہوئی۔ ان ہی میں اس نور کی شعاعیں مستور ہوئیں اور یہی خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ قرار پائے۔

ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ ایٹم میں الکٹرون مرکز کے گرد حرکت کرتے رہتے ہیں۔ یہ اجسام و ذرات نوری کی فطرت ہے۔ اسی طرح سے اجسام نوری یا نفوس نوری انائے مطلق یعنی مرکز حقیقی کے گرد حرکت کرتے رہے اور ان انوار قدسی کی شعاعوں سے بہ کثرت اجسام نوری یا نفوس نوری خلق ہوتے رہے جن کا شمار اور ان کی تخلیق پر جو بھی وقت صرف ہوا اس کا اندازہ بجز ذات باری کوئی اور نہیں جانتا۔ یہ تمام نفوس نوری ہی انبیاء کی ارواح ہیں اور یہ سب کے سب اپنی قوت نورانی کی اہلیت کے مطابق مرکز سے مناسب فاصلہ پر رہتے ہوئے مرکز حقیقی کے گرد گردش کرنے میں مصروف رہے۔ پھر ان انوار کی شعاعوں سے نفوس قدسیہ خلق ہونے لگے۔ مگر نورانیت بہ تدریج کم ہوتی چلی گئی۔ اس مرتبہ کے نفوس اوصیاء، انبیاء، صاحبان معرفت اور مومنین کاملین کی ارواح قرار پائے۔ ان کے بعد جو نفوس خلق ہوئے ان میں نورانیت سابق اجسام نوری کی نسبت بہت کم ہو گئی۔ یہ ضعیف الایمان مستضعفین کی ارواح ہوئیں۔ یہاں تک کہ ان شعاعوں سے نہایت لطیف ایٹم بننے لگے۔ اس وقت جو نفوس خلق ہوئے وہ نہایت لطیف گیس اور خفیف نوری اثر سے بنے اور یہ جنات کی ارواح ہوئیں۔ اس کے بعد جب نوری شعاعیں تمام اجسام و نفوس سے گزرتی ہوئی گیس کے ایٹم بنانے لگیں تو گیس کے اجسام خلق ہونے لگے۔ ان میں نورانیت شامل نہیں تھی یہ مطلق لاشعور تھے اور یہی نفوس امارہ اور پھر شیاطین ہوئے۔

تخلیقِ کائنات

علم طبیعات کی زمانہ حال کی تحقیقات سے یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ غیر مرئی نوری شعاعیں فضائے بسیط میں مادے کے ایٹم خلق کرتی رہتی ہیں جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق نوری شعاعوں کے ذریعے سے ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب فضائے بسیط کے کسی حصہ میں اربوں کھربوں فرسخ تک ایٹم بھر جاتے ہیں اور وہ فضا گیس سے لبریز ہو جاتی ہے

تو ایک عالم کی خلقت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ تمام کائنات کی تخلیق کے متعلق کچھ کہنا تو امر محال ہے۔ البتہ اپنے نظام شمسی کے متعلق جو اس کائنات میں بحر اعظموں کے مقابل ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے کچھ بیان کیا جا سکتا ہے وہ بھی محض اس سبب سے ممکن ہو سکا کہ بعض احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ اشارے ملتے ہیں اور چند خطبات علی کرم اللہ وجہہ کے موجود ہیں۔ جن میں تخلیق نظام شمسی کا ذکر ہے اور جو بہت مشہور ہیں وہ پیش کرتا ہوں مگر ان سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق عالم کے متعلق موجودہ طبیعیات کا حالیہ نظریہ ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

نظریۂ تخلیقِ عالم

ستارے اور سیارے (اقتباس از حالیہ کتب علم طبیعیات)

ہمارا نظام شمسی (ہمارا سورج اور اس کے نو سیارے) اپنی تمام وسعت کے باوجود تمام کائنات میں محض ایک ذرّے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کائنات جتنی وسعتوں کی حامل ہے اس کا تصوّر کرنا بھی ممکن نہیں۔ غالباً اس میں ستاروں (یعنی آفتابوں) اور ان کے ساتھ کے سیاروں کی تعداد ان تمام ریت کے ذرّوں کی جتنی ہوگی جو اس دنیا کے سمندروں کے کنارے پائے جاتے ہیں۔

ستارے (آفتاب) بہت بڑے جسیم گیسی مادّے سے جو بے پناہ گرم ہے بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے سورج کے مرکز کی گرمی کا اندازہ دو کروڑ ڈگری سینٹی گریڈ کیا گیا ہے۔ انسانی ذہن اس قدر گرمی کا تصوّر کرنے سے بھی قاصر ہے۔ ایک خام تخمینے کے مطابق سورج کی بناوٹ میں جو گیسی مادہ ہے اس میں پچاس فیصد ہائیڈروجن اور اس سے ذرا کم ہیلیم گیس شامل ہے۔ باقی حصہ بہت کم فیصد دوسرے عناصر کے بخارات کا ہے۔

کاسمک فضا بھی، اسی مادّے سے جو نہایت خفیف شکل میں ہے بھری ہوئی ہے۔ مگر اس کا تناسب بھی اتنا ہی ہے۔

ایک ستارے (سورج) کا حجم، اس کی حرارت اور کثافت اس کی عمر کا پتہ دیتے ہیں۔ عام مقبول نظریہ جواب تک علم ریاضی کی رو سے ہمارے علم میں ہے حسبِ ذیل ہے:۔

ہر جسم دوسرے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پس اگر دو ذرّے ایک ہی سمت میں اور ایک ہی رفتار سے حرکت کر رہے ہوں تو اندازہ یہی ہے کہ وہ باہم مل جائیں اور مل کر ایک بڑا ذرہ بنائیں۔ اگر کوئی چھوٹا ذرہ اس سے ٹکرائے تو اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ بڑا ذرہ اس کو اپنے اندر جذب کرے گا۔ اس طرح کروڑوں برسوں میں فضائے بسیط میں ایک بہت بڑا گیس کا حجم جو ایک بہت بڑے گیند نما جھاگ کی شکل ہوگا، حرکت کرنے لگے گا اور وہ گول ہوگا۔ کیونکہ یہی شکل ہے جو اغلباً وہ اختیار کر سکتا ہے۔

جیسے جیسے یہ گیند گھومے گی مختلف اور آگے پیچھے حرکت کرنے والی لہریں اس عظیم گنبد کے اندر پیدا ہوں گی جو متواتر و مسلسل تمام اردگرد کے مادّے کو بلوتی رہیں گی۔ اور یہ بھی ہوگا کہ ارتکازی قوّتیں بڑھتی رہیں گی اور گیند کا حجم برابر کم ہوتا رہے گا۔ اس طرح مادّے کی کثافت اور اس کی اندرونی تہوں کا وزن بڑھتا جائے گا۔ آخر کار کہیں اربوں سالوں میں ان گیس کے ذرات کی محرک توانائی و حرارت برابر بڑھتی چلی جائے گی۔ پھر بعض مناسب حالات پیدا ہو جانے پر پہلا ہائیڈروجن بم پھٹے گا یا ردّ عمل کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہو جائیگا جس سے ہائیڈروجن ہیلیم میں تبدیل ہوتی رہے گی اس دوران حرارت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور کروڑوں ہائیڈروجن بم پھٹتے رہیں گے جو کہ مزید حرارت روشنی اور توانائی کی دیگر صورتیں مہیا کرتے رہیں گے۔

اس گیند نما گنبد کی مسلسل گردش کی وجہ سے کچھ مادّی ذرّات اس کے گرد اس کے راستے میں ایک ہالا سا بنالیں گے جس کا باعث سنٹری فیوگل قوّتیں ہوں گی۔ اس کے بعد پھر اجزا کے اکٹھا ہونے کا عمل شروع ہوگا جیسا کہ ابتدا میں ستارے کی بناوٹ میں ہوا تھا۔ ستارا برابر سکڑتا چلا جائے گا اور اس کے گرد بہت زیادہ گرم گیسی مادّے کے (جو ستارے سے خارج ہوا تھا) ہالے بنتے چلے جائیں گے اور وہ برابر بڑھتے رہیں گے یہاں تک کہ کروڑوں برسوں میں جا کر اس ستارے کے سیّاروں کی صورت اختیار کر لیں گے۔

قارئین ماڈرن فزکس کا نظریۂ تخلیق عالم تو ملاحظہ فرما چکے اب ایک خطبہ علی کرم اللہ وجہٗ کا اور بعض فقرے احادیث اور ادعیہ کے جو تخلیقِ عالم کے متعلق ہیں پیش کئے جاتے ہیں ان کے ترجمہ کے متعلق ضروری ہے کہ پہلے چند نکات قارئین پر واضح کر دیئے جائیں تاکہ مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں وساوس و شبہات پیدا نہ ہوں۔

خطبہ میں جہاں "ھواء" ہے اس کا ترجمہ گیس کیا گیا ہے اس لئے کہ "ھواء" گیس ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ مترجمین نے قرآن و حدیث میں ہر مقام پر "مآء" کا ترجمہ پانی کیا ہے جس سے قاری کا ذہن پینے کے پانی کی طرف جاتا ہے۔ حالانکہ کلام اللہ میں خلقت انسان کے ذکر میں آیا ہے کہ اس کو "مآءٍ دافق" (اچھلتے پانی) سے پیدا کیا۔ کہیں ہے "ذلیل پانی" سے اور کہیں ہے "نطفہ سے خلق کیا"۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ "مآء" کا اطلاق صرف پینے کے پانی ہی پر نہیں ہوتا بلکہ ہر سیال جو بہ آسانی بہہ سکے یا سیال کی طرح حرکت کر سکے اس پر بھی "مآء" کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ رقیق ہو یا غلیظ گیس۔

تیسرا امر یہ ہے کہ "فلق" کا ترجمہ قرآن و حدیث میں ہر جگہ "سحر" (DAWN) کیا گیا ہے حالانکہ فلق کے معنی ہیں پھاڑنا یا پھاڑا ہوا بھی ہو سکتا ہے۔ مترجمین اپنے ترجمہ کے لئے یہ دلیل لاتے ہیں کہ سحر کے وقت تاریکیٔ شب پھٹ جاتی ہے لہٰذا اس سے وقت سحر مراد ہے۔ یہ کلمہ بعض مقامات پر خطبات و ادعیہ میں استعمال ہوا ہے۔ ان مقامات پر اگر فلق کا ترجمہ سحر کیا جائے تو مضمون مہمل ہو جاتا ہے۔ وہاں پھاڑا یا پھاڑا ہوا ترجمہ ہی صحیح ہوگا۔

چوتھے یہ کہ اُس زمانۂ جہالت و تاریکی میں ایسے حقائق کو کھول کر بیان کرنا جن کو عوام سمجھ نہ سکیں ان کے ذہنی انتشار کا باعث ہوتا۔ لہٰذا ایسے رنگ میں بیان کرنا ضروری تھا جو عوام کے تخیل کے بالکل ہی خلاف نہ ہو۔ اس لئے متفرق مقامات پر ایسے فقرے بیان کئے گئے ہیں جن کو یکجا کرنے سے حقیقت واضح و آشکار ہو جاتی ہے۔

تخلیقِ کائنات پر حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا خطبہ

"ثُمَّ اَنْشَاءَ سُبْحَانَهٗ فَتْقَ الْاَجْوَاءِ وَشَقَّ الْاَرْجَاءِ وَسَكَائِكَ الْهَوَاءِ"

(پس اس پاک ذات نے آزاد فضا اور کشادہ اطراف و وسیع و بلند ہوا کو پیدا کیا)

(توضیح : اس پاک ذات نے آزاد فضائے بسیط اور کشادہ اطراف ایجاد کئے۔ اور بہت وسیع و بلند گیسوں کو اس فضا میں بھر دیا)۔

"فَاَجْرٰی فِیْهَا مَآءً مُتَلَاطِمًا تَیَّارُهٗ مُتَرَاکِمًا ذَخَّارُهٗ"

(پس جاری کیا اس میں سیال کو جس کے بحر ناپید اکنار کی موجوں میں تلاطم تھا۔ اس بحر ذخار کی موجیں تہ بہ تہ تھیں)

(توضیح : فطرت کا قانون ہے ہر ایٹم میں الیکٹرون گردش کرتے رہتے ہیں اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہر دم و ہر لحظہ عمل و ردِّ عمل میں مصروف ہے۔ یہ گیس کا لا محدود گولا بھی وسیع و عریض فضا میں گردش کرتا رہا۔ گیس اس کے اندر سیال کی طرح ہر طرف بہتا رہا اور ایک بحر ناپید اکنار بن گیا۔ اس میں نہایت اونچی اونچی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ زبردست تلاطم برپا تھا اس کی موجیں تہ بہ تہ تھیں)۔

"حَمَلَهٗ عَلٰی مَتْنِ الرِّیْحِ الْعَاصِفَةِ وَالزَّعْزَعِ الْقَاصِفَةِ فَاَمَرَهَا بِرَدِّهٖ وَسَلَّطَهَا عَلٰی شَدِّهٖ وَقَرَنَهَا اِلٰی حَدِّهٖ اَلْهَوَآءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِیْقٌ وَالْمَآءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِیْقٌ ثُمَّ اَنْشَاَ سُبْحَانَهٗ رِیْحًا اعْتَقَمَ مَهَبَّهَا وَاَدَامَ مُرَبَّهَا وَاَعْصَفَ مَجْرٰهَا وَاَبْعَدَ مَنْشَاهَا"

(اس کو نہایت تیز ہواؤں اور نہایت تند و تیز آندھی کی پشت پر بار کیا۔ پھر ان کو حکم دیا کہ اس کو اُلٹتی پلٹتی رہیں اور ان کو طاقت دی کہ اس کو روکے رہیں۔ اور اسے اس کی حدوں سے ملا دیا۔ ہوائیں (گیسز) اس کے نیچے دُور تک پھیلے ہوئے تھیں۔ پھر اس پاک ذات نے اک ہوا کو پیدا کیا جس کا چلنا بانجھ تھا یعنی اس سے کوئی اور شے پیدا نہ ہوسکتی تھی (INERT GAS) اس کو اس کے مرکز پر برقرار رکھا اور برابر تیز چلتے رہنے پر مامور کیا۔ اس کے جھونکوں کو تیز کر دیا اس کے مرکز کو دُور تک پھیلا دیا)۔

"فَاَمَرَهَا بِتَصْفِیْقِ الْمَآءِ الزَّخَّارِ وَاِثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ فَمَخَضَتْهُ مَخْضَ السِّقَآءِ وَعَصَفَتْ بِهٖ عَصْفَهَا بِالْفَضَآءِ تَرُدُّ اَوَّلَهٗ اِلٰی اٰخِرِهٖ

وَسَاجِيَهُ اِلَى مَايِرِهٖ حَتّٰى عَبَّ عُبَابُهٗ وَرَمٰى بِالزَّبَدِ رُكَامُهٗ فَرَفَعَهٗ فِيْ هَوَاءٍ مُنْفَتِقٍ وَجَوٍّ مُنْفَهِقٍ فَسَوّٰى مِنْهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ "

(پھر اسے حکم دیا کہ اس بحرِ ذخّار کو تھپیڑے دے اور اس بحرِ ناپیداکنار کی موجوں کو اچھالے۔ پس اس کو بلو دیا جیسے مشکیزہ میں دہی ڈال کر اس کو شدید حرکت دے کر بلوتے ہیں۔ اور اسے دھکیلی ایسی تیزی سے چلی جیسے خالی فضا میں چلتی ہے اور پلٹانے لگی اس کے ابتدائی حصّے کو آخری پر اور ٹھہرے ہوئے کو متحرّک پر، یہاں تک کہ اس کی سطح میں اُبھار پیدا ہوا اور تہ و بالا ہونے کی وجہ سے جھاگ پھینکنے لگا۔ پس اس جھاگ کو کھلی ہوا اور کشادہ فضا میں بلند کر دیا پس اس سے سات بلندیاں پیدا کیں (یا سات بلندیوں کی تکمیل کی)۔

(توضیح: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بحرِ اعظم کے گولے سے پہلے سات حلقے گیس کے جُدا ہوئے جو تہ بہ تہ تھے جن سے زمین اور اس کے اوپر کے چھ سیّارے بنے)

اَب دو فقرے دعاءِ صباح کے ملانے سے پوری وضاحت ہو جاتی ہے:

" وَفَلَقْتَ بِرَحْمَتِكَ الْفَلَقَ وَاَلَّفْتَ بِقُدْرَتِكَ الْفِرَقَ "

(اور تُو نے پھاڑا اپنی رحمت سے پھاڑے ہوؤں کو اور ان جُدا شدہ حصّوں میں اپنی قدرت سے جذب کشش پیدا کر دی)۔

(توضیح: پہلے معلوم ہو چکا کہ گیس کے بحرِ اعظم سے پہلے سات حلقے یا ٹکڑے جُدا ہوئے اب یہ آٹھ ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے بعد یہ پھاڑے ہوئے ٹکڑے پھر پھاڑے تو باقی دو سیّارے اور بعض سیّاروں کے گرد حرکت کرنے والے چاند وجود میں آئے۔ بحرِ اعظم کا باقی ماندہ بزرگ ترین حصّہ اس نظامِ شمسی کا آفتاب ہے۔ پھر غیر مرئی شعاعوں کے ذریعے سے جو اس کی رحمت ہیں ان میں جذب و کشش پیدا کر دی جس کے ذریعے اپنے مدار پر قائم رہتے ہوئے گردش کر رہے ہیں)۔

اَب آگے خطبہ امیر المومنین کی عبارت یہ ہے:۔

" جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجًا مَكْفُوْفًا وَعُلْيَاهُنَّ سَقْفًا مَحْفُوْظًا وَسَمْكًا مَرْفُوْعًا بِغَيْرِ عَمَدٍ يَدْعَمُهَا وَلَا دِسَارٍ يَنْظِمُهَا "

(نیچے والے حصّے کو رُکی ہوئی موج قرار دیا اور اوپر والوں کو محفوظ چھت کی طرح قرار دیا۔

اور بلند عمارت کی طرح قائم کیا۔ بغیر اس کے کہ کوئی شے ان کو سہارا دیتے ہوئے ہو اور نہ بندھنوں کی ضرورت کہ ان کو جوڑے رکھیں)۔

(توضیح: گیس کے بحر اعظم کا سب سے نیچے کا حصہ اپنے مرکز پر قائم ہوا جو رکی ہوئی موج کی طرح ہے اور آج تک بھی سرد ہو کر رقیق نہیں ہوا یہی ہمارے نظام شمسی کا آفتاب ہے اور اوپر والے حصے یعنی سیارے چھت کی طرح قائم ہو گئے جیسے عمارت ہوتی ہے اور اس طرح سخت اور ٹھوس ہو گئے اور ان کو اٹھائے رکھنے کے لئے کسی ستون یا سہارے کی ضرورت نہ ہوئی۔ نہ کسی مادی بندھن کی ضرورت ہوئی کہ ان کو آفتاب یا دیگر سیاروں سے معین فاصلہ پر قائم رکھنے کے لئے درکار ہوتی۔ بلکہ غیر مرئی شعاعوں سے ان میں باہم کشش پیدا کر دی جس سے اپنے مدار پر قائم رہتے ہوئے گردش کر رہے ہیں)۔

" ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ وَضِيَاءِ الثَّوَاقِبِ وَأَجْرَى فِيهَا سِرَاجًا مُسْتَطِيرًا وَقَمَرًا مُنِيرًا فِي فَلَكٍ دَائِرٍ وَسَقْفٍ سَائِرٍ وَرَقِيمٍ مَائِرٍ "

(پھر اس فضا کو زینت بخشی سیاروں کی زینت سے اور چمکنے والوں کی روشنی سے اور جاری کر دیا اس میں ضو پاش چراغ اور چمکتا چاند۔ گھومتے ہوئے دائرے میں اور چلتی پھرتی چھت میں اور جنبش کھانے والی تختی میں)۔

(توضیح: فضائے عالم کو سیاروں اور ستاروں سے سجایا اور بے شمار ایسے چمکتے چھوٹے چھوٹے اجسام سے جو فضا میں حرکت کرتے رہتے ہیں زینت دی۔ آفتاب کو روشنی دینے والا چراغ قرار دیا۔ اور چاند کو منیر (نور پھیلانے والا) یہ سیارے دائروں میں گردش کرنے لگے۔ تمام سیارے حرکت کرتی چھت معلوم ہوتے ہیں گویا کہ کوئی چمکتی لکھی ہوئی تختی حرکت کر رہی ہے)۔

" ثُمَّ فَتَقَ مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ الْعُلَا فَمَلَأَهُنَّ أَطْوَارًا مِنْ مَلَائِكَتِهِ "

(پھر بلندیوں کے درمیان شگاف پیدا کئے اور ان کی وسعتوں کو طرح طرح کے فرشتوں سے پر کر دیا)۔

(توضیح: پھر تمام سیاروں ستاروں کے درمیان کی خلاء بسیط کو مختلف اقسام و اثرات

کی غیر مرئی نوری شعاعوں سے بھر دیا۔ جو تمام کائنات میں ہر دم و ہر لحظہ عمل و ردِ عمل میں مصروف ہیں۔

مُدّتِ تخلیق

نظامِ شمسی کی تخلیق کے بیان کے بعد مدتِ تخلیق کی طرف بھی ذہن کی توجہ ہوتی ہے۔ اس مدت کے متعلق اکثر ذہنوں میں خیالات گھومتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ قرآن و حدیث سے اپنے خیال ناقص کے مطابق استخراج کیا ہے۔ قارئین کی خدمت میں پیش کر دوں۔

فضائے بسیط میں گیس کے اجتماع اور بحرِ ذخار کے تیار ہونے پر کتنا وقت صرف ہوا ہوگا اس کا تو تصور کرنا بھی ممکن نہیں۔ گیس کے بحرِ ذخار سے سیاروں کے حلقوں کے جدا ہونے سے ان کے سرد ہو کر سخت جسم بن جانے تک کا وقت ہی تصور میں آسکتا ہے۔ قرآن میں متعدد مقام پر اس کا تکرار کیا گیا ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۝

(وہ وہی ہے جس نے بلندیوں اور زمین کو چھ دن میں خلق کیا)

یہاں چھ دن سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی ہمیں کلام پاک ہی میں تلاش کرنا لازم ہے۔

پہلے اس پر غور کریں کہ سیال گیس کے بحرِ بیکراں سے ہالے کی شکل میں سیارے جدا ہوئے! اسی طرح ہماری زمین نے بھی پھر کرّے کی شکل اختیار کی اور اس کے بعد جو تبدیلیاں ہوتی رہیں جیسے سطح کا سرد ہونا، بالائی حصّہ کا منجمد ہو کر مٹی میں تبدیل ہونا، پہاڑوں اور سمندروں کا پیدا ہونا، پھر اس میں دریاؤں اور چشموں کا جاری ہونا۔ اس تمام عمل و ردِ عمل پر کتنا وقت صرف ہوا ہوگا۔ قرآن حکیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمین پر یہ کام بھی چھ دن میں ہوئے۔ جیسا کہ ارشادِ ربُّ العزّت ہے:۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۹ حٰمٓ السجدہ

(کہہ دو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں بنایا۔ اور تم اس کے لئے ہمسر یا شریک قرار دیتے ہو۔ وہ ہی تمام جہانوں کا رب ہے)۔

اس سے اگلی آیت میں پہاڑوں کے پیدا کرنے، دریاؤں، سمندروں اور سامانِ معیشت یعنی نباتات وغیرہ کے پیدا کرنے اور خلقت ارض کی تکمیل کرنے کا ذکر ہے کہ اس پر چار یوم صرف ہوئے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ﴿١٠﴾ حٰم سجدہ

(اور اس کے اوپر پہاڑ پیدا کئے اور اس میں برکت دی اور مناسب اندازے سے اس میں سامانِ معیشت کا بندوبست کیا (اور یہ سب) چار یوم میں تمام طلب گاروں کے لئے)۔

یہ تو معلوم ہو گیا کہ سیاروں کی خلقت پر چھ دن اور زمین کی تکمیل پر مزید چھ دن صرف ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان چھ یوم سے کتنی مدت مراد ہے۔ اس لئے کلام اللہ کی مندرجہ ذیل آیات پر غور و خوض کر کے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے:۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿٥﴾ السجدۃ

(تدبیر کرتا ہے امر کی بلندی سے زمین تک پھر بلند ہوتا ہے اس کی طرف ایک یوم میں جس کا اندازہ ہزار سال کے برابر ہے جو تم شمار کرتے ہو)۔

پہلا حل طلب امر یہ ہے کہ بلند ہونے سے کیا مراد ہے جبکہ یونیورس میں بلندی و پستی کے کوئی معنی ہی نہیں ہوتے۔ اس لئے ان محاورات پر غور کرنا لازم ہے جو ہم خود بولتے ہیں۔ مثلاً اس کا اخلاق بہت بلند ہے، وہ اپنے فن میں بہت اونچا ہے، اور عربی میں اخلاق عالیہ کہتے ہیں۔ اس سے سطح ارض سے اونچا ہونا مراد نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ بلندی سے کامل ہونا مراد ہوتا ہے "یَعْرُجُ اِلَیْہِ" (یعنی بلند ہوتا ہے اس کی طرف) سے بھی تکمیل امر ہی مراد ہو سکتی ہے۔ اس کے سوائے کچھ اور معنی ہو ہی نہیں سکتے۔

علم طبیعیات کی حالیہ تحقیقات سے معلوم ہو گیا ہے کہ غیر مرئی نوری شعاعیں زمین پر عمل کرتی رہتی ہیں اور ذرات بناتی رہتی ہیں جس سے ضائع شدہ ذرات کی کمی پوری ہوتی رہتی ہے۔ اس کو علم طبیعیات میں تخلیق زوجین (PAIR PRODUCTION)

کہتے ہیں۔ یہی تو تدبیر ہے! اور ایک یوم تدبیری ہمارے کرۂ ارض کے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک سال تدبیری ہماری زمین کے سالوں کے حساب سے تین لاکھ پینسٹھ ہزار دو سو پچاس سال کے برابر ہوا۔

اب دوسری آیت دیکھیں:۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ المعارج

(فرشتے اور روح بلند ہوتے ہیں اس کی طرف ایک یوم میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے)۔

اس آیہ دانی ہدایہ میں جو محاورات وکلمات استعمال ہوئے ہیں ان کو ایک ایک کر کے غور وفکر سے سمجھنا ضروری ہے۔

یہ امر تو آیہ ماسبق میں واضح ہو چکا کہ "تَعْرُجُ إِلَيْهِ" سے تکمیل اَمر مراد ہے۔ دوسرا جز ملائکہ اور روح ہے۔ "مَثَلُ نُوْرِهٖ" کی تفسیر اور عالم ارواح کے بیان میں واضح ہو چکا ہے کہ اَسمائے مطلق اوّلِ مخلوق نور کائنات کی شعاعیں اور ان کی فرعی شعاعیں ہی روح اور ملائکہ ہیں اور ان ہی شعاعوں سے مادے کی تخلیق ہوتی ہے۔ لہٰذا روح وملائکہ ہی تخلیق کا کام بجالاتے ہیں۔

اس آیہ دانی ہدایہ میں جس یوم کا ذکر ہے وہ تکمیل تخلیق کا یوم ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ تمہارے پچاس ہزار سال کے برابر ہے جو تم شمار کرتے ہو۔ چونکہ تکمیل تخلیق تدبیر سے ہوتی ہے لہٰذا ظاہر ہو گیا کہ ایک تکمیلِ تخلیق کا یوم پچاس ہزار سال تدبیری کے برابر ہے اور ایک سال تدبیری تین لاکھ پینسٹھ ہزار دو سو پچاس سال ارضی کے برابر۔ لہٰذا یوم تخلیق اس سے پچاس ہزار گنا وقت ہوا۔ یعنی اٹھارہ ارب چھبیس کروڑ پچیس لاکھ سال ارضی ہوتے۔

گیس کے بحرِ ذخار سے حلقوں کی شکل میں سیاروں کے جدا ہو کر کروی شکل میں آنے تک چھ یوم صرف ہوتے۔ لہٰذا یہ مدت ایک کھرب نو ارب ستاون کروڑ پچاس لاکھ سال ارضی کے برابر ہوتی ہے۔

زمین کے سیال شکل سے بیرونی سطح کے کثیف وجامد ہونے پر دو یوم صرف ہوتے یعنی چھتیس ارب باون کروڑ پچاس لاکھ سال ارضی اور سطح کے سرد ہونے سمندر دریا پہاڑ وغیرہ

کے بننے نباتات پیدا ہونے غرضکہ آبادی کے قابل ہونے پر چار یوم صرف ہوتے جو ہمارے سال ارضی کے حساب سے تہتر ارب پانچ کروڑ سال کے برابر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس نظامِ شمسی کی کل مدتِ تخلیق تکمیل ارض تک تقریباً دو کھرب بیس ارب سال ارضی کے برابر ہوتی ہے۔

یہ تو ہمارے حساب کے مطابق ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فضا کا حساب ہمارے حساب سے ہزار گنا ہے۔ لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ مدتِ تخلیق جو اس مدت کے ساتھ پیش کی گئی ہے ہزار گنا ہو اور یہ تقریباً $۱۰^{۱۴} \times ۲$ سال ارضی کے برابر ہوتی ہے۔

یہ حساب جو آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے یہ تو وہ ہے جو اس حقیر کی سمجھ میں آیا کسی دوسرے شخص پر حجت نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ سمجھ سکا پیش کر دیا ہے جو محض ظنی ہے۔ صاحبانِ فکر اس میں خود ہی غور و خوض کر سکتے ہیں۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ یہ کہہ سکے کہ اس آیت کا حقیقی مفہوم یہی ہے اس لئے کہ کلامِ الٰہی تو معجزہ ہے جس کے ایک ایک کلمہ میں بے شمار مفاہیم پوشیدہ ہیں۔ البتہ آیات کے وہ مفاہیم جو فطرتِ انسانی کے مطابق ہوں ان کے لئے یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات کا پست ترین مفہوم یہی ہے اور ان کے اعلیٰ مفاہیم تک ہماری عقل و فہم کی رسائی نہیں۔

زمین پر حیات کی ابتدا

کارکنانِ قدرت، قوانینِ فطرت، غیر مرئی شعاعیں، تند و تیز ہوائیں، عمل و ردِ عمل میں مصروف تھیں۔ کئی قسم کی خاک یا مٹی ایک جگہ کارکنانِ قدرت (فرشتوں) نے جمع کی یعنی کیمیاوی اجزاء جمع ہوئے اور اس پر تقریباً ساٹھ یوم صرف ہوئے جبکہ ایک یوم ہمارے ہزار سال کے برابر ہے۔ اس پر نوری شعاعیں، بارشیں، ہوائیں عمل کرتی رہیں اور وہ گوندھی جاتی رہی یعنی اس میں عمل کیمیاوی ہوتے رہے یہاں تک کہ خمیر ہونے لگی۔ علی کرم اللہ وجہہٗ کا فرمان ہے کہ آدم کی مٹی چالیس صبح یعنی چالیس یوم خمیر کی گئی۔ یہ مدت ہمارے چالیس ہزار سال کے برابر ہوتی ہے۔ پھر اس سے متحرک ذرات خارج ہو کر زمین پر پھیل گئے (ماخوذ از احادیث)۔ کارکنانِ قدرت تخلیق میں مصروف رہے۔ یہاں تک مدتِ مدید میں انسان نما حیوان خلق ہونے لگے۔ ان کے اندر باعثِ حیات نفوس مادی (گیس کے نفوس) تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ

پہلے جو انسان صورت اجسام پیدا ہوئے وہ نسناس تھے ان میں چونکہ نفوس نوری نہ تھے اس لئے شعور صحیح بھی نہیں تھا، وہ تو محض مٹی کے پتلے تھے۔ نوری شعاعیں یعنی روح ان میں عامل نہ تھی اور ایسے آدمی جن میں روح یعنی نور عامل نہ ہو حیات حقیقی سے عاری ہوتے ہیں۔ ان کی حیات مادی نفس پر منحصر ہوتی ہے۔ ان کو رب العزت نے مُردہ کہا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔ "فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ (۵۲) الروم (اے رسولؐ تم اپنی آواز مردوں کو نہیں سنا سکتے)۔

أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ..... (۱۲۲) الانعام

(کیا وہ شخص جو مُردہ تھا ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے)۔

یہ نسناس حرکت کرتے مٹی کے پتلے تھے۔ مطلقاً لاشعور، ہر دم آپس میں لڑتے رہتے تھے جیسے مٹی کے ٹھیکرے اور برتن ٹکراتے ہیں۔ اسی لئے ان کو کھنکتے ٹھیکروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ النّاس کہلانے کے مستحق نہ تھے چونکہ ان ہی سے انسان بنایا گیا اسی لئے سورہ رحمٰن میں ارشاد باری ہے:

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۱۴) الرحمان

(انسان کو ٹھیکروں کی طرح کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا)

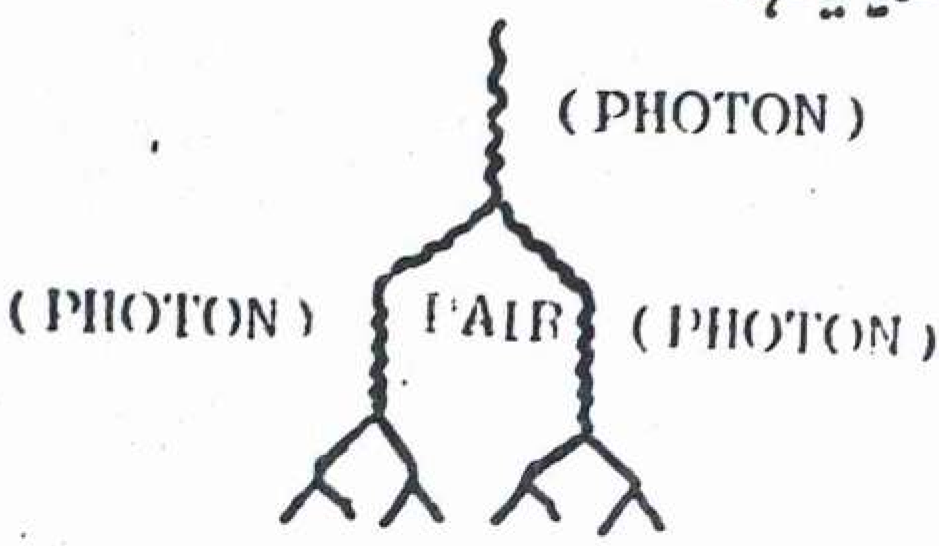
یہ مٹی کے پتلے، کھنکھناتے ٹھیکرے بہت قتل و غارت کرتے رہے مگر بتدریج ان کے قوائے ذہنی بھی ترقی کرتے رہے حتیٰ کہ تھوڑا بہت شعور بھی حاصل ہو گیا تو ان میں نفس مادی کے ساتھ وہ نفوس نوری بھی شامل ہونے لگے جو عالم ارواح میں ہلکے اثر نوری سے خلق ہوئے تھے۔ چونکہ ان نفوس نوری میں اتنی قوت نہ تھی جو بقاء حیات کا باعث ہو سکتی لہٰذا ضروری تھا کہ گیس کے نفوس بقاءِ حیات کے لئے قائم رہیں۔ نفوس نوری کی حیات تو شعاع نوری یعنی روح کے اتصال پر منحصر ہے۔ اگر روح سے اتصال ہو جائے پھر نفس مادی یا نفس امارہ کی ضرورت نہیں رہتی اور حیات حقیقی مل جاتی ہے۔ جب نفوس نوری ان میں شامل ہونے لگے تو یہ نسناس

شبیہہ الناس میں داخل ہو گئے۔ خلقتِ آدم یا خلقتِ انسان کا بیان سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک نظریۂ نور نہ سمجھیں اور بعدہٗ آیۂ نور کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

غیر مرئی نوری شعاعیں (اقتباس از حالیہ کتب علم طبیعات)

۱۹۰۰ء کے قریب بعض تجربات کے نتائج سے یقینی حد تک اس امر کا اظہار ہوا اور ثبوت مل گیا تھا کہ ہمارے اِرد گرد ہر مقام پر بہت طاقتور شعاعیں موجود ہیں۔ اور یہ حساب بھی لگایا گیا کہ یہ شعاعیں لیبارٹری ایکس ریز سے تقریباً دو ہزار گنا زیادہ طاقتور ہیں۔ مزید تجربات سے ثابت ہُوا کہ ان شعاعوں کا منبع اور مبداء ہماری زمین پر یا زمین کے اندر کہیں واقع نہیں ہے۔ بلکہ یہ امر ثابت ہو گیا کہ یہ شعاعیں کہیں باہر سے آرہی ہیں۔ پھر دن کے وقت دُھوپ میں، رات کے وقت سایہ میں، اور گہنوں کے دَوران تجربات کئے گئے جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کی یہ شعاعیں نہ تو ہمارے سورج سے آرہی ہیں اور نہ ہماری گلیکسی سے (نظام کوکبی یا ستاروں کے مجموعے سے) جس میں ہمارا سورج بھی شریک ہے اور جس میں اس کی (سورج کی) حیثیت صحرا میں ایک ذرّے سے بھی کم تر ہے۔ وہ فاصلہ جس کو یہ شعاعیں طے کر کے زمین تک پہنچ رہی ہیں تخمیناً ایک ارب نوری سال کے برابر ہے (جبکہ روشنی کی رفتار ۱،۸۶،۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے) ان کا اصل مبداء تاہنوز نامعلوم ہے۔ تاہم مزید تجربات سے یہ انکشاف ہُوا کہ یہ شعاعیں اس دُنیا میں مادّے کی تخلیق کا مُستقل ذریعہ ہیں اور یہ شعاعیں جن کو زبردست توانائی کے پیکٹ بھی کہہ سکتے ہیں جب کچھ خاص حالات سے دوچار ہوتی ہیں تو دو حصّوں میں، جو متضاد برقی چارج کے حامل ہوتے ہیں، منقسم ہو جاتی ہیں۔ ان دو اجزا کا (جو علمِ طبیعیات میں الیکٹرون اور پازیٹرون کے نام سے موسوم ہیں) مونثم مساوی اور برعکس ہوتا ہے اور اس طرح توانائی مادّے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جدید علم طبیعیات میں یہ عمل تخلیق زوجین کے نام سے موسوم ہے۔ نیز اگر ایسے عملِ مسلسل کو جو توانائی مفرد پیکٹ (شعاع) سے شروع ہوتا ہے گراف کی صورت میں ظاہر کریں (یعنی خطوط کے ذریعے)

تو اس کی شکل ایک ایسے اُلٹے درخت کی سی ہو گی جس کی بہت سی شاخیں ہوں جیسا کہ مندرجہ ذیل میں دکھلایا گیا ہے۔



اس طرح ہمیں توانائی کے تخلیقی پیکٹ سے مختلف پیکٹ اور اجزاء حاصل ہو جاتے ہیں، اب آیۂ نور کی طرف پھر توجہ دلاتا ہوں:۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (اللہ نور ہے (علت العلل ہے) بلندیوں اور زمین کا، تمام کائنات کا)۔ اس کی تفصیل گزر چکی۔

مَثَلُ نُوْرِہٖ (اس کے نور کی مثال) اس کی شرح گزر چکی۔

کَمِشْکٰوۃٍ (ایسی ہے جیسی کہ ایک قندیل ہو (وہ چیز جس میں چراغ رکھا جاتا ہے مثلاً گلوب۔ لالٹین یا شیڈ)۔

فِیْھَا مِصْبَاحٌ ط (اس کے اندر چراغ ہو)

اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ط اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ لا

(وہ چراغ شیشے کے فانوس میں ہو۔ وہ شیشے کا فانوس ایسا ہو گویا کہ چمکتا ستارہ روشن کیا جاتا ہے برکت دیئے گئے زیتونی درخت سے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی)۔

علم طبیعیات کے حالیہ نظریۂ نور مذکورہ بالا سے یہ امر ظاہر ہو چکا کہ شعاعِ نوری کے گچھے کو درخت ہی کہا گیا ہے جو شرق و غرب سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ تو لامکانیت سے تعلق رکھتا ہے۔

یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط (قریب ہے کہ تیل اس کا

روشن ہو جائے اگرچہ آگ اس سے چھو بھی نہ گئی ہو)

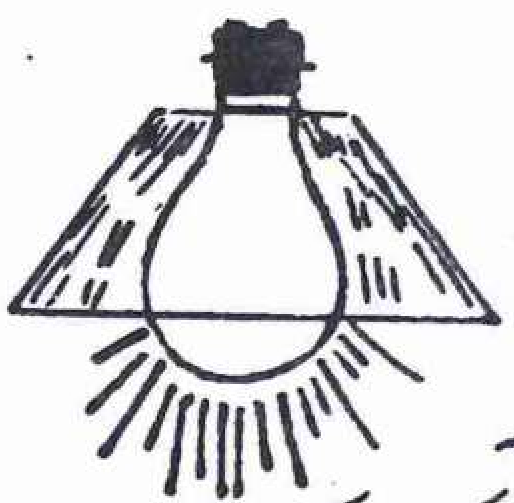
نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط (نور بالائے نور)

يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ لا ﴿۳۵﴾ النّور

(اللہ ہدایت کرتا ہے اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے اور اللہ تو ہر شے کا جاننے والا ہے)۔

ترجمہ کا مفہوم: اللہ تمام کائنات کا سبب وجود ہے! اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسی کہ اِک قندیل (شیڈ) ہو جس میں ایک چراغ ہو۔ چراغ شیشے کے فانوس (بلب) میں ہو۔ اور وہ فانوس ایسا چمکتا ہو جیسے روشن ستارہ۔ وہ چراغ اس شجر نوری سے روشن کیا جاتا ہے جو لامکانیت سے تعلق رکھتا ہے بغیر آگ سے مس ہوئے روشن ہو جاتا ہے۔ نور بالائے نور ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور سے واصل کرتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ تو ہر شے کا عالم ہے)۔



اس آیت میں ایک برقی لیمپ کی پوری تصویر کھینچی ہوئی سامنے آتی ہے اور اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ یہ امر علم طبعیات کی حالیہ تحقیقات سے منکشف ہو چکا ہے کہ برق کی خلقت شجر نوری کی شعاعوں سے ہوتی ہے۔ لہذا یہ نور جو اوّل مخلوق ہے علتِ برق ہے۔ آیۂ مذکور کا اگلا حصّہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ نور جو علتِ برق ہے اس کی شعاعوں کا اس عالم میں محل کہاں ہے! اس کیلئے ارشاد ہے:۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ لا يُسَبِّحُ

لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ لا ﴿۳۶﴾ النّور

(وہ ان گھروں میں ہے جن کے لئے اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے (یعنی ان کا مرتبہ بلند سمجھا جائے) ان میں اس کے نام کی یاد کی جاتی ہے! اس کی پاکیزگی کا اظہار کیا جاتا ہے صبح و شام (یعنی ہر دم و ہر لحظہ)۔

گھروں سے ہر شخص کا خیال عمارتی مکانات کی طرف منتقل ہوگا بعض لوگ ان سے مساجد مراد لیں گے مگر آیت کے اگلے حصہ میں اس کی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے کہ یہ کون سے گھر ہیں اور گھروں سے کیا مراد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾

(وہ مرد ہیں کہ نہیں غافل کرتی ان کو تجارت اور نہ خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور نماز کو قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے، وہ تو ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے جس میں بہت سے دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی)۔

آیت کے اس حصے سے ظاہر ہوگیا کہ اس انائے مطلق نور کائنات مخلوق اوّل کی شعاعوں کے (جو علّتِ برق ہیں) گھر یا محل یا حامل کچھ مرد ہیں جن کی کیفیتِ نفسی یہ ہے کہ دُنیا کے کاروبار میں مصروف رہتے ہوئے کوئی مشغلہ بھی ان کو اللہ کی یاد، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دیتے رہنے سے غافل نہیں کرتا۔ وہ تو یوم قیامت سے ہر دم ڈرتے رہتے ہیں۔

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾ النور

(تاکہ بدلہ دے اللہ ان کو بہتر اس سے جو کچھ انھوں نے عمل کئے اور اپنے فضل سے ان کے اجر کو زیادہ کردے اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے)۔

سورہ بقر کے پہلے رکوع میں ہے " وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ " (اور جو ہم نے رزق دیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں صرف کرتے ہیں)۔ اس کی تفسیر میں ایک حدیث نظر سے گزری کہ یہاں رزق سے مُراد علم ہے۔ اور علم کی تعریف حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نے یہ بیان فرمائی کہ " علم وہ نور ہے جو اللہ ڈالتا ہے جس کے دل میں وہ چاہے "۔

اب آیۂ نور کے مذکورہ الصدر جز میں رزق سے نور ہی مُراد ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہے ہی آیۂ نور اس میں نور ہی کا ذکر ہے۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جو حاملانِ نور ہیں ان کے اعمال کے بدلے بے حساب نور عطا فرماتا ہے۔

اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نورِ کائنات، عِلّتِ بَرق کو بَرق سے کیوں تشبیہ دی گئی ہے۔ بَرق سے اس کو کیا مماثلت ہے۔ تو یہ اَمر بھی بَرق کے متعلقہ قوانینِ فطری پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا۔ بجلی کے دباؤ یا پریشر کی اکائی (UNIT) وولٹ ہے اور جس شے میں سے بجلی گزرتی ہے اس میں رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ رُکاوٹ کی اکائی (OHM) اوہم ہے۔ اور بَرقی رَو کی اکائی کو ایمپیئر کہتے ہیں۔ اس مادّی دُنیا میں کوئی شے ایسی نہیں جو بجلی کو بالکل ہی نہ گزرنے دے اس کے متعلّق قانون یہ ہے کہ جتنے اوہم (OHM) کی رُکاوٹ ہوتی ہے اس کی نسبتِ معکوس سے بَرقی رَو اس میں دَوڑتی ہے۔ پَس اگر دو سو وولٹ (VOLT) کی بجلی ہو اور پچاس اوہم رُکاوٹ تو $\frac{200}{50}=4$، ایمپیئر کی کرنٹ اس میں گزرے گی اور رُکاوٹ ہزار اوہم ہو تو $\frac{200}{1000}=\frac{1}{5}$، ایمپیئر کی کرنٹ اس میں سرایت کرے گی جس کا احساس انسان کو نہ ہو گا۔ ایسی اشیاء جن میں رُکاوٹ بہت زیادہ ہوتی ہے غیر موصل یا اِنسولیٹر یا نان کنڈکٹر کہلاتی ہیں۔ مثلاً رَبر۔ کپڑا۔ خشک لکڑی۔ موم۔ چینی۔ ریشم۔ اَبرک وغیرہ۔

بَرق کی طرح ان نوری شعاعوں کو بھی کوئی مادّی شے گزرنے سے نہیں روک سکتی۔ بَرق کو تو غیر موصل اشیاء کچھ روک بھی لیتی ہیں، مگر ان علّتِ بَرق شعاعوں کو کوئی شے نہیں روک سکتی۔ البتّہ قلبِ انسان سے واصل ہونے میں نفسِ انسان کی غفلت ولاشعوری کے حجاب حائل ہوتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شعاعیں خود ہی رُک جاتی ہیں۔ البتّہ اِتنا خفیف اثر ضرور چھوڑتی ہیں جس سے نفس کی حیات باقی رہ سکے۔

دوسری مماثلت یہ ہے کہ بَرقی رَو سے جو جھٹکا (SHOCK) لگتا ہے اور بَرقی رَو اِنسان یا حیوان کے جسم میں گزرتی ہے تو ہلاکت کا باعث ہوتی ہے! اسی طرح اگر اس نُور کی شعاعوں کی جھلک کا بار قلبِ انسان پر پڑ جائے تو ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا ذکر بھی کلام پاک میں موجود ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السّلام نے بارگاہِ ربّ العزّت میں عرض کی "رَبِّ اَرِنِیٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ" (اے رَب تو مجھے دکھلا دے کہ مَیں تجھے دیکھوں) "قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ" (فرمایا تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا) "فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (۱۴۳) الاعراف۔ (پس جب اس کے رَب نے پہاڑ پر تجلّی ڈالی

(نور کی شعاعیں ڈالیں) اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو گئے۔

خیال رہے یہاں لفظ "صَعِقًا" آیا ہے۔ اور صاعقہ، بجلی کی کڑک اور اس کے زبردست جھٹکے (شاک) کو کہتے ہیں پس معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کو بجلی جیسا شاک لگا جس سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس کا ذکر سورہ بقرہ کے چھٹے رکوع میں بھی ہے:۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ البقرہ

(اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم تو ہرگز تمہاری بات تسلیم نہ کریں گے جب تک اللہ کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں تو تمہارے دیکھتے دیکھتے تم کو بجلی نے پکڑ لیا)۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ البقرہ

(پھر ہم نے تم کو تمہارے مرنے کے بعد زندہ کر دیا تاکہ تم شکر ادا کرو)۔

یہ حضرت موسیٰؑ کے منتخب کردہ ستر آدمی تھے۔ نوری شعاعوں کی بے حجاب جھلک سے سب کے سب مر گئے۔

اس نور کی شعاعوں کا بار اٹھانا بہت مشکل ہے۔ بعض لوگوں کو اہلیت پیدا ہونے سے قبل اگر کشف سے اس کا ادراک ہو جاتا ہے تو ان کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں۔ ان کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی ان کو ہم مجذوب کہتے ہیں۔ ان کے تعلقات مادی دنیا سے منقطع ہو جاتے ہیں ان کی زبان سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے۔

اس نور کا بار اٹھانے کی اہلیت تو بہ تدریج پیدا ہوتی ہے۔ جب تک عالم نور کا ادراک نہیں ہوتا اور دل کی باطنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ نہیں ہو جاتا، عالم غیب کا یقین قلبی حاصل نہیں ہوتا۔ عالم نور کے ادراک کے بعد ہی ایسا یقین حاصل ہوتا ہے جس کے بعد امکان شک باقی نہیں رہتا۔ اس بارے میں ربّ العزت کا ارشاد ہے:۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا ﴿۱۵﴾ الحجرات

(سوائے ان کے کوئی مومن نہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولؐ پر پھر امکانِ شک باقی نہ رہا)۔

اور مولائے کائنات کا ارشاد ہے "علم کی طلب ہر مومن مرد و عورت پر فرض ہے۔"
اور علم کی تعریف یہ بتلائی کہ "علم وہ نور ہے جو اللہ ڈالتا ہے جس کے دل میں وہ چاہے۔"
اور آیہ نور میں بھی ارشاد باری ہے "اللہ اپنے نور سے واصل کرتا ہے جس کو وہ چاہے۔" یہ تو باری تعالیٰ کی رحمت ہے وہ جس کو اہل پاتا ہے اپنی رحمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ بندے پر تو صرف طلب واجب ہے۔ اسی لئے حضور سرکارِ دو عالم صلعم نے یہ نہیں فرمایا کہ ہر مسلمان پر علم یعنی نور کا حاصل کرنا واجب ہے اس لئے کہ یہ بندے کا کام نہیں۔ اس کا کام تو بارگاہِ ربّ العزّت سے طلب کرنا ہے۔ طلبِ صادق ہی باعثِ نجات ہو جائے گی۔

ہمارے علماء عارفین لکھ گئے ہیں کہ جب تک نورِ ایمان کی طلب پیدا نہیں ہوتی اور نفس میں اس کے حصول کے لئے اضطرار پیدا نہیں ہوتا بلکہ نفس پر سکون طاری رہتا ہے تو یہ اس کے مردہ ہونے کی علامت ہے۔ جنابِ ربّ العزّت نے بھی ایسے لوگوں کو مردہ ہی کہا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ ﴿۱۲۲﴾ الانعام

(کیا وہ شخص جو مردہ تھا ہم نے اس کو زندہ کیا (کس طرح) اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا کہ اس کے ذریعے سے لوگوں میں چلتا پھرتا ہے)۔

اس آیہ دانی ہدایہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ حیاتِ حقیقی اسی وقت ملتی ہے جب اس نور کی شعاعوں سے قلب کا اتصال ہو جائے۔

ہمارے جسم میں ایک تو گیس کا لطیف جسم ہے جو ہمارے مادی جسم سے مشابہ ہے۔ یہی نفسِ امارہ ہے جو اس جسم پر حاکم و عامل ہے اور ایک نوری نفس ہے جس کو نفسِ قدسیہ کہتے ہیں، اس میں حیاتِ کامل اسی وقت آتی ہے جب شعاعِ نور سے اتصال ہو جائے پھر اس جسم پر حاکم و عامل وہی ہوتا ہے۔ اور نفسِ امارہ جو شیطانِ باطنی ہے خارج ہو جاتا ہے مگر ہر دم ساتھ رہتا ہے اور اس تاک میں رہتا ہے کہ ذرا نور کا رابطہ ٹوٹے اور میں پھر داخل ہو کر اپنے گھر پر قبضہ کر لوں۔

جب تک نوری شعاعیں، جو رُوح ہیں، عامل نہیں ہوتیں جسم کی حیات کا دارومدار نفسِ امارہ ہی پر ہوتا ہے۔ اگر یہ قبل اتصالِ رُوح، خارج ہو جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا شعاعِ نور کے اتصال پر اس کا خارج ہو جانا یہ پہلی موت ہے۔ اس کے لئے حضورؐ سرورِ کائنات سرکارِ دوعالم کا ارشاد ہے "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا"، مر جاؤ قبل اس کے کہ تم مرو۔ مطلب یہ ہے کہ مالک سے طلب کرتے رہو کہ وہ اپنی رحمت سے حیاتِ حقیقی عطا فرمادے تاکہ یہ نفسِ خبیث خارج ہو جائے اور رُوح عامل ہو جائے۔ جب نوری شعاعیں عامل ہو جاتی ہیں تو جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ جتنے بھی حظّ و سرور، حواسِ خمسہ ظاہری سے حاصل کئے ہوتے ہیں تمام بہ کمال جاری ہو جاتے ہیں۔ جس شے کا خیال آئے یا خواہش ہو وہ ہی عالمِ نور میں موجود ہو جاتی ہے اور وجدان کامل طاری رہتا ہے (اس کی تفصیل باب سوم میں گزر چکی ہے)۔ موت اولیٰ کے بعد جیسے ہی نور سے اتصال ہوا اور جنت سامنے آئی نفسِ امارہ جو شیطان باطنی ہے فوراً جنت سے نکل جاتا ہے یہ نور کا بار اُٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا (یہ اس سے قبل بھی بیان ہو چکا ہے)۔

کلام اللہ میں بھی اس پہلی موت کا ذکر ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى (۵۶) الدخان

(اس میں (جنت میں) موت کا ذائقہ نہ چکھیں گے سوائے پہلی موت کے)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر اتصال نور سے نفسِ امارہ خارج ہو جاتے تو اس پہلی موت کے بعد اگر اس کیفیت کو استقرار ہو جائے تو جنت ہی میں رہیں گے۔ ان کو حیاتِ حقیقی مل جائے گی جس کے بعد پھر موت نہ ہوگی۔ ایسے کامل الایمان بندوں کی ظاہری موت تو یہ ہوتی ہے کہ جب ان کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے تو کوئی ظاہری سبب پیدا کر کے جسم مادی کو چھوڑ دیتے ہیں اور عوام کی نظر میں مر جاتے ہیں حالانکہ ان کو حیاتِ ابدی ملی ہوئی ہوتی ہے۔

اس نورِ کائنات، رُوحِ اعظم، انائے مطلق کی شعاعوں سے اتصال کے ذرائع بھی کلامِ پاک میں ظاہر کر دیئے گئے ہیں۔ چند حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) آیۂ نور، جس کی تفسیر قارئین کے پیشِ نظر ہے، اس میں ایک ذریعہ اشارتاً بیان

کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ بندگانِ خدا جو بیتِ نور یعنی حاملانِ نور ہیں رب کی یاد سے کسی حال میں بھی غافل نہیں ہوتے "لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ" لہٰذا ایک ذریعہ تو مالک کی یاد میں استغراق کامل ہے۔

(۲) خوف۔ متقین کی تعریف میں اکثر مقامات پر ارشاد ہے۔ مثلاً:۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (۳۱) مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (۳۳) ق

(اور متقین کے لئے جنت قریب لائی جائے گی۔ جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرے اور رجوع ہونے والا دل لے کر آئے)۔

شدید خوف سے جو کیفیتِ وجل قلب پر طاری ہوتی ہے وہ حصولِ نور کے لئے مفید ہے۔

(۳) موت کا وقت سامنے رہنا۔ جس سے وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جو کشتی کے سواروں پر طوفان کے وقت طاری ہوتی ہے اس وقت رب کو خلوصِ کامل سے پکارتے ہیں۔ اس کو کلام پاک میں کئی مقام پر بیان کیا گیا ہے مثلاً:۔

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۳۲) لقمان

(اور جب ان کو سائبانوں کی طرح موج گھیر لیتی ہے اس وقت خالص اعتقاد سے اللہ کو پکارتے ہیں)۔

اسی کیفیت کے حصول کے لئے کئی جگہ ارشاد فرمایا ہے:۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۹۴) البقر

(پس موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو)۔

جو بندۂ مومن جہاد فی سبیل اللہ کے لئے شہادت کی آرزو کرتے ہوئے نکلتا ہے اس پر بھی مالک کی نظرِ رحمت پڑتی ہے اور اس کے قوتِ ادراک میں بہت ترقی ہو جاتی ہے جس سے عالمِ نور کا مشاہدہ ہو جانے کا امکان ہے۔

(۴) درد۔ کسی محبوب ترین عزیز کے فوت ہو جانے یا کسی محبوب شے کے ضائع ہونے یا عزت و شہرت کے فقدان سے جو کیفیتِ درد و الم طاری ہوتی ہے اتصالِ نور کے لئے مفید ہے۔ اگر اس وقت مالک کی طرف کامل توجہ رہے اور اسے پکارتا رہے تو اس کا وعدہ ہے کہ

معیت اللہ اس کو حاصل ہو گی اور عالم نور کا مشاہدہ ہو جائے گا۔ ارشاد باری ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾ البقرۃ (اللہ صابروں کے ساتھ ہے)

اور حضور سرور دو عالم صلعم کا ارشاد ہے " اللہ تعالیٰ شکستہ دلوں پر اور شکستہ قبروں پر نظر رحمت فرماتا ہے "۔

(۵) حسرت:۔ جب اپنی غفلت، بھول یا غلطی سے ایسا شدید نقصان ہو جائے جس کی تلافی ممکن نہ ہو تو دل میں ایسی تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ وہ کشتی میں سواری کی کیفیت سے کم نہیں ہوتی۔ اگر اس وقت رب کی طرف توجہ رہے تو یہ کیفیت اتصال نور کے لئے بہت مفید ہے یہی سبب ہے کہ ہم جیسے خبیث النفس بندوں کے سمجھانے کے لئے رب العزت نے اپنی ذات اقدس کے لئے اس کیفیت کا اظہار فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

یٰحَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ ۚ مَا یَاْتِیْہِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَہْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾ یٰسین

(کیسی حسرت ہے بندوں پر کہ نہیں آیا ان کے پاس کوئی رسول مگر یہ کہ اس کی ہنسی بناتے رہے)۔

بتدریج حصول ایمان کے لئے بعض آیات محکمات میں احکام وارد ہوئے ہیں مگر اس باب میں بیان نہیں کئے جا سکتے۔ اس باب کا تعلق نور سے ہے اور نظریہ نور بیان ہو چکا۔ اب خلقت انسان کی طرف رجوع کرنا ہے۔

زمین پر تخلیقِ انسان

اسی باب میں " زمین پر حیات کی ابتدا " کے عنوان سے جو مضمون آپ کی نظر سے گزرا اس سے یہ واضح ہو گیا کہ انسان نما پہلی مخلوق نسناس تھے۔ ان میں بتدریج شعور پیدا ہوا تو گیس کے نفوس کے ساتھ نفوس نوری بھی ان میں شامل ہونے لگے۔ اس وقت وہ الناس کی شبیہہ ہوئے مگر روح سے محروم تھے جو حیات حقیقی کا باعث ہے۔ دراصل یہ بے روح مٹی کے پتلے تھے جو ٹھیکروں کی طرح آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ مخالف کو قتل کرتے

تو سکا بوٹی کر کے کچا چبا جاتے۔ ان ہی کھنکتے ٹھیکروں، مٹی کے پتلوں سے انسان بنا۔ فطرت کی مہیب طاقتیں، برق و برف و باران و ژالہ باری، طوفانوں اور سیلابوں کے ریلے، موسم کی بے رحم سختیاں، درندوں اور موزی جانوروں کی چہار طرف موجودگی، ستم بالائے ستم اپنے ہی ہم جنس دشمنوں سے جان کا خطرہ۔ اور پھر بے سروسامانی کا عالم۔ نہ کوئی پناہ گاہ اور نا جان لیوا دشمنوں سے محفوظ رہنے کا کوئی بندوبست۔ ان حالات میں اس انسان نما حیوان مخلوق میں سے بہت سوں پر اکثر کیفیتِ خوف طاری رہنے لگی جب ہر طرف موت نظر آئی تو "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس سے یہ جستجو وطلب ہوئی کہ کوئی بچانے والی طاقت مل جائے۔

یہ فطری رجحان ہے جو ہر بچہ خواہ کہیں پیدا ہوا ہو، لے کر پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کوئی قوت جو ہر شے پر قادر ہو مل جائے یا میری ہو جائے جس کے ذریعے سے میں جو چاہوں وہ فوراً ہو جائے۔ پس جب موت سامنے آتی ہے تو ایک دہریہ کے نفس میں بھی غیر ارادی اور لاشعوری طور پر یہ فطری رُجحان اُبھر آتا ہے اور اس کا دل کسی بچانے والی طاقت کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔

۱۹۳۱ء میں لاہور کے ایک روزنامے میں جس کا نام اس وقت یاد نہیں۔ لندن کی ایک عورت کے بیان کا ترجمہ شائع ہوا تھا جس کا لبِ لباب حسبِ ذیل تھا:

"انگلستان میں درمیانہ اور نچلے طبقے کی عورتوں کی اکثریت اپنی گزر اوقات کے لئے اس امر پر مجبور ہوتی ہے کہ رؤسا کے گھروں میں ملازمت کریں۔ ان مجبوروں کی اکثریت رؤسا کی ہوس ناکی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان ہی بدنصیبوں میں سے ایک میں بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امراض خبیثہ کا شکار ہو گئی۔ اس وقت دُنیا مجھ سے متنفر ہو گئی۔ سب نے مجھ سے مقاطعہ کر لیا۔ لبِ سڑک اک بہت تنگ کمرہ تھا جس میں تنہا پڑی رہتی۔ کوئی خبر پوچھنے نہ آتا۔ تلاشِ رفیق کا جذبہ بڑی شدت سے طاری ہوا۔ دل میں تڑپ پیدا ہوئی۔ مسلسل تین سال ایسے گزرے کہ میرا دل اس طرح تڑپتا تھا جیسے پانی سے نکالی ہوئی مچھلی تڑپتی ہے۔ اب میں بہت خوش اور مطمئن ہوں، اس لئے کہ مجھے رفیق مل گیا۔ اب ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے

کہ ہم کو مادی آلات کی ضرورت نہیں رہے گی اور ہم بغیر ان کی مدد کے دور دراز فاصلہ پر سمندروں میں چلتے جہازوں پر سفر کرنے والے اعزّہ سے بات چیت کر سکیں گے"۔ اور اسی طرح کی کتنی ہی صفات اس نے بیان کی تھیں جو اتصالِ رُوح سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔

یہ مضمون بطور جملہ معترضہ اس لئے لکھ دیا کہ شاید اسی سے ہمارے مسلمان بھائی کچھ سبق حاصل کر سکیں۔ دیکھئے کفار و مشرکین تو مالک کو تڑپ تڑپ کر پکارنے سے اس کی رحمت کا نور حاصل کرلیں اور ہم خدا پر ایمان لانے کے مدعی، اس کی رحمت سے ہزاروں فرسنگ دُور پڑے ہوئے بندگیٔ شیطان میں مصروف نورِ ایمان اور رب کی رحمت سے محروم ہی رہیں۔ افسوس، خدا ہمارے حال پر رحم کرے اور توفیقِ طلب عطا فرمائے۔

اَب اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ زمین پر بسنے والے انسان نما حیوانوں یعنی نسناس میں سے جن کے دلوں میں تلاشِ رفیق کی تڑپ پیدا ہوئی ان کو کچھ شعور بھی حاصل ہونے لگا۔ ان میں سے جس پر کیفیتِ دردِ شدید زیادہ عرصہ تک طاری رہی اس کے قلب سے غفلت کے حجاب اُٹھ گئے عالمِ نور کا مشاہدہ ہو گیا۔ نورِ ایمان قلب میں داخل ہو گیا۔ اس غیر ذی حیات مٹی کے پتلے میں رُوح داخل ہو گئی۔ نتیجہ میں وہ ہی اس کرۂ ارض پر پہلا انسان، پہلا مومن، پہلا عارف اور پہلا بیتِ نور یا حاملِ نور ہُوا اور وہ ہی اس دُنیا کا پہلا آدم ہے۔

ادراکِ نور سے حُبِّ اللہ مل جاتی ہے پس جو عاملِ نُور ہو جائے وہ تو خلق اللہ کا عاشق ہو جاتا ہے اور اپنا سب کچھ ان پر قربان کرنے کو تیار رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان بے رُوح انسان نما حیوانوں کو بھی کچھ نہ کچھ حیات مل جائے اور اپنی اپنی اہلیت کے مُطابق مستحقِ رحمت ہو جائیں۔ ان ہی عشاق کو ہدایتِ خلق کا کام سپرد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا حضرت آدمؑ ہی پہلے نبی ہُوئے۔ اَب کلام اللہ کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ ارشادِ ربُّ العزت ہے:۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿٤﴾ الطارق

(کوئی نفس ایسا نہیں جس پر نگہبان نہ ہو)۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ﴿١١﴾ الانفطار

(اور بے شک تم پر نگہبان ہیں بزرگ لکھنے والے)۔

اور احادیث سے بھی ثابت ہے کہ ہر آدمی کی حفاظت، رزق رسانی اور کتابتِ اعمال کے لئے بے شمار ملائکہ معیّن ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ نورِ کائنات، اوّل مخلوق، رُوحِ اعظم کی فروعی شعاعیں ہی نوری مخلوق و ملائکہ ہیں جو ہر دم و ہر لحظہ انجام فرائض میں مصروف رہتے ہیں۔ یہی ان کی عبادت ہے۔ باب دوم میں یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ اطاعت کامل ہی سجدہ حقیقی ہے۔ پس جب ملائکہ فرع ہیں اور روح اصل تو ان کا فرض ہے کہ اصل کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے رہیں۔ گویا کہ تمام قوائے ملکوتی رُوح کی اطاعتِ کامل پر مامور تھے جیسا کہ ارشادِ باری ہے:-

فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۲۹﴾ الحجر

(پس جب میں اس کو درست کرلوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو اس کے لئے سجدے میں گر جانا)۔

چنانچہ جس وقت قلبِ آدم کا نور سے اتّصال ہُوا یعنی رُوح پھونکی گئی تو ملائکہ نے رُوح کی اطاعتِ کامل قبول کی یہی ان کا سجدے میں گرنا تھا۔

فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿۳۰﴾ الحجر

(پس تمام ملائکہ نے سجدہ کیا (یعنی اطاعتِ کامل قبول کی)۔

اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰۤى اَنۡ يَّكُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِيۡنَ ﴿۳۱﴾ الحجر

(سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کیا اس سے کہ وہ اطاعت کرنیوالوں میں شامل ہو)۔

تمام قوائے ملکوتی رُوح کی اطاعتِ کامل میں مصروف ہو گئے۔ مگر نفسِ امّارہ جو شیطانِ باطنی ہے کیسے اطاعت کر سکتا ہے۔ اس کی تو فطرت یہ ہے: "مَیں سب سے بڑا"، "میں سب سے اچھا"، "مَیں کسی کے آگے کیوں جھکوں"؟ یہ ہر نفس میں دیکھ لیں کہ جب تک اس کو اپنی معذوری یا کمزوری واحتیاج کا احساس نہیں ہوتا کسی کی بات مانتا ہی نہیں۔ جب تمام جسم پر حکومت کرتا تھا تو اب روح کا محکوم کیسے بنتا؟ اس میں نور کا بار اُٹھانے کی اہلیت بھی نہیں ہے۔

یہ بھی جاننا چاہیئے کہ نورِ کائنات، اَنائے مطلق کا فعل، رَب کا فعل اور اس کا کلام رَب کا کلام ہے۔ وہی تو لسان اللہ ہے۔ پس اس نے کہا:

قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَا لَکَ اَلَّا تَکُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمۡ اَکُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۳۳﴾ الحجر

(کہا اے نفسِ امّارہ کیا ہوا تجھے کہ تو اطاعت گزاروں کے ساتھ نہ ہوا۔ کہا میں ایسا نہیں کہ اک بشر کے آگے جھکوں جس کو تُو نے سڑے ہوئے گارے کھنکتی مٹی سے پیدا کیا)۔

اجسام کی ابتدا چونکہ خمیر کئے ہوئے عناصر، سڑے ہوئے گارے سے تھی لہٰذا اس کی نظر جسم ہی پر گئی۔ نور کی جھلک تو یہ دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس کی فطرت میں سرکشی ہے۔ لہٰذا کسی کی اطاعت کیسے کر سکتا ہے۔

قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡہَا فَاِنَّکَ رَجِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ وَّ اِنَّ عَلَیۡکَ اللَّعۡنَۃَ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۳۵﴾ الحجر

(کہا کہ اس سے نکل جا تو مردود ہے اور تحقیق کہ تجھ پر لعنت ہے قیامت کے دن تک)۔

اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے چند امور کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ پہلا یہ کہ جنّت کی حقیقت کیا ہے۔ ہر چند کہ باب سوم میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے مگر قارئین کی یاد دہانی کے لئے کچھ یہاں بیان کرنا ضروری ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ ﴿۸۵﴾ الاسراء

(تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ رُوح میرے رَب کے امر سے ہے) (یعنی نوری مخلوق ہے)

اور اس نور کے کام رَب کے کام ہیں اور حاملانِ نور تو کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہ جو مالک چاہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ﴿۳۰﴾ الدھر

(تم تو کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہ جو اللہ چاہے)

پس جب نور کی چاہ اللہ کی چاہ ہے اور اللہ جو چاہے وہ فوراً ہو جاتا ہے۔

اسی لئے اپنے اَمر یعنی رُوح کی یہ شان بیان فرماتا ہے:

اِنَّمَآ اَمۡرُہٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۸۲﴾ یٰسین

(اس کے امر کی شان یہ ہے (یعنی رُوحِ اعظم کی) کہ جب کسی شے کا ارادہ کرے گویا کہے ہوجا فوراً ہو جاتے)۔

کلام پاک میں رَبُّ العِزّت نے ہی جنّت کی تعریف بیان فرمائی ہے۔

لَہُمۡ فِیۡہَا مَا یَشَآءُوۡنَ ﴿۳۱﴾ النحل۔ وَلَہُمۡ فِیۡہَا مَا یَشۡتَہُوۡنَ ○

(اہلِ جنّت یا حاملانِ نور کے لئے اس میں وہ سَب کچھ ہے جو وہ چاہیں۔ ان کیلئے وہ سَب کچھ ہے جس کی خواہش کریں)۔

نور سے واصل ہوتے ہی اس کا بندہ جنّت میں پہنچ جاتا ہے اور یہ نور ہی رَب کی رحمت ہے لہٰذا اس سے دُوری ہی اس کی لعنت ہوئی۔

اَب ان فقرات کو سمجھیں "اس سے نِکل جا تو مَردُود ہے"۔ یعنی جسمِ آدم سے جس کے تمام اعضاء پر تو حکم چلاتا تھا خارج ہو جا اور تجھ پر قیامت تک لعنت ہے۔ یعنی تو ہمیشہ نُور سے دُور ہی رہے گا۔ کبھی تجھ کو اس کا وصال میسّر نہ ہوگا۔ اَب ارشاد ہے کہ شیطان نے کہا:

قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۳۸﴾ الحجر

(کہا اے رب مہلت دے مجھ کو قیامت تک۔ کہا تو مہلت دیا گیا ہے ایک وقتِ معلوم تک)۔

چنانچہ وقتِ معلوم تک اس کو مُہلت ملی ہوئی ہے کہ ہر شخص کے جسم میں موجود رہے۔ آدمی کی زندگی ہی نفسِ امّارہ سے قائم رہتی ہے۔ جب تک رُوح سے اِتّصال نہ ہو اس کا جسم میں موجود رہنا ضروری ہے۔ مگر ایک وقت دُنیا پر ایسا آنے والا ہے کہ تمام روئے زمین پر دوسرا طوفانِ نوح آئے گا۔ وہ پانی کا طوفان تھا مگر یہ آگ و خون کا ہوگا اور دُنیا کی کثیر آبادی تباہ ہو جائے گی۔ جو باقی رہ جائیں گے وہ وباؤں کے وَبال میں مبتلا ہوں گے، آب و غذا کے قحط کی بلائیں نازل ہوں گی۔ اس وقت بہت سے دل ماہیِ بے آب کی طرح تڑپیں گے جن پر یہ کیفیت عرصہ تک طاری رہے گی ان کو نُور کا ادراک ہو جائے گا اور وہ حاملانِ نور یا بیتِ نور ہو جائیں گے۔

صرف وہی اِنسان باقی رہ سکیں گے جن کو نُورِ ایمان مل جائے گا۔ باقی سب ہلاک ہو جائیں گے پھر بچّے بھی حاملانِ نُور پیدا ہوں گے اور گیس کے نفس کی اجسام میں ضرورت نہ رہے گی۔

زمین پر خلقتِ اِنسان یا خلقتِ آدم کا بیان تو تمام ہُوا اَب صرف یہ سوال رہتا ہے کہ اس پہلے انسان کی خلقت کو کتنی مدّت گزری۔ اس کے لئے پہلے اس پر غور کرنا لازم ہے کہ محاورے میں آدم کا لفظ کس کس کے لئے استعمال ہوا ہے۔ حضرت نوحؑ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب زمین کی آبادی پُوری تباہ ہو جائے اور تھوڑے سے نفوس باقی رہ جائیں ان میں جو بندۂ عارفِ کامل بیتِ نور ہو اُس پر آدم کا اطلاق ہوتا ہے۔ اَب ہمارے سامنے یہ روایت موجود ہے۔ علی کرم اللہ وجہٗ سے کسی نے پوچھا کہ آدم سے پہلے کیا تھا؟ کہا آدم۔ پھر کہا: اگر تو سَتّر مرتبہ یہی سوال کرے گا تو یہی جواب ہو گا۔

لائقِ غور ہے کہ دُنیا کی موجودہ آبادی کے آدم حضرت نوحؑ ہیں۔ ان سے پہلے حضرت آدمؑ ہیں جن کے متعلق تواریخ میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان کو آٹھ نو ہزار سال گزر چکے۔ مگر یہ مدّت صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اس سے بھی زائد ہو۔ اگر ہم ایک آدم کے زمانہ کی آبادی کی مدّت دس ہزار سال بھی فرض کرلیں اور سَتّر کو عدد سمجھ لیں تو اِنسانِ اوّل کو سات لاکھ سال گزر چکے۔ مگر سَتّر محاورہ میں اظہارِ کثرت کے لئے استعمال ہوتا ہے اس سے شمار مراد نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے تو ہم کہہ ہی نہیں سکتے کہ دُنیا میں اِنسانی آبادی کی عمر کتنی ہے۔ ہم تو اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

نُور کا بیان تو ختم ہُوا۔ حاملانِ نُور کی صفات سمجھ میں آنے کے قابل نہیں لہٰذا انکے بیان سے احتراز کیا جاتا ہے۔ البتہ نفسِ انسان کے قوائے باطنی کے متعلق جو کچھ اس زمانہ میں معلومات حاصل ہو چکی ہیں اس میں سے کچھ قارئین کی آگاہی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

نفسِ اِنسان کے قوائے باطنی

نفسِ انسان کے قوائے باطنی جو اہلِ عالم کے مُشاہدے میں آچکے ہیں ان میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) یہ ماضی کے حالات کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ ایسی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں مثلاً کچھ افراد جن میں کم سن بچے بھی شامل ہیں ایسے ہیں جو ماضی کے وہ حالات بیان کر دیتے ہیں جن کا انھوں نے نہ کتابوں میں مطالعہ کیا اور نہ کسی سے سُنا تھا۔

(۲) یہ آئندہ کے حالات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ ایسی متعدد مثالوں میں سے ایک مثال ایک امریکن عورت کی ہے جس نے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی پیشگوئی کی۔ ان واقعات میں صدر کینیڈی کے قتل کا واقعہ بھی ہے۔ اس پیش گوئی کے ساتھ ساتھ اس نے صدر کینیڈی کو ٹیکساس کے دورے پر جانے سے باز رہنے کی ہدایت بھی کی تھی۔ اسی عورت نے پیش گوئی کی تھی کہ ۱۹۶۹ء میں صدر ڈیگال اور صدر ایوب برسرِ اقتدار نہیں رہیں گے جو کہ دُرست ثابت ہوا۔

کراچی کے اخبار خواتین ۱۱ تا ۱۷ جنوری ۱۹۶۹ء میں صفحہ ۹ پر ایک خالہ کا تذکرہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان یہ تھا: "اس کی ناقابلِ یقین روحانی قوتوں نے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے"۔ یہ خالہ مریم کہلاتی ہیں انہوں نے اپنے ایک بھانجے کو جوان کی قوتوں کو محض افسانے سمجھتا تھا بوقتِ ملاقات یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا کہ "آخر آنا پڑا تمہیں"۔ بھانجے کا بیش قیمت قلم گم ہو گیا تھا جس کے لئے وہ پریشان تھا۔ خالہ نے اسے قلم کا پتہ دینے کے ساتھ لڑکے کا حلیہ بھی بتلا دیا جس کے پاس قلم تھا اور ہدایت کی کہ اس سے تم اس طرح مانگنا گویا تم نے خود ہی اس کو دیا تھا۔ چنانچہ اس پر عمل کرنے سے قلم مل گیا۔

اس کی مثل اور کتنی ہی خبریں دُنیا کے اخبارات میں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔

(۳) یہ دوسروں کے خیالات اور خواہشات کا علم حاصل کرسکتا ہے۔ اس کی ایک مثال تو مندرجہ بالا خالہ مریم کے ذکر میں ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ایسی کئی شخصیتیں بھی دیکھی گئی ہیں جو دوسروں کے خیالات و وساوس و مافی الضمیر کو بغیر بتلائے نہ صرف جان لیتی ہیں بلکہ چند جملوں میں ان کی تسکین بھی کر دیتی ہے۔

(۴) یہ نفس ہزاروں میل فاصلہ پر کے حالات مشاہدہ کرسکتا ہے اور کوئی مادی شے اس کے مشاہدے میں حارج نہیں ہو سکتی۔

اس کی ایک بہت دلچسپ مثال اردو کے مشہور شاعر ن۔م۔ راشد صاحب کے حوالے سے رسالہ خواتین کے متذکرہ بالا مضمون میں درج ہے۔ راشد صاحب نے نیویارک کی ایک لڑکی کا ذکر کیا ہے جس سے انہوں نے اپنی بیگم کے متعلق سوال کیا جو راولپنڈی میں تھیں۔ لڑکی نے دُنیا کے نقشے کی مدد سے راولپنڈی کا محل وقوع معلوم کیا اور ایک لمحے کے بعد کہا کہ وہ راولپنڈی پہنچ گئی ہے۔ ایک منٹ بعد بتلایا کہ اب وہ ان کے گھر پہنچ گئی ہے جہاں لان میں ایک آدمی کام کر رہا ہے اور گھر میں کوئی عورت نہیں۔ پھر راشد صاحب نے اپنی سسرال کا پتہ بتلایا تو لڑکی نے فوراً اطلاع دی کہ وہ وہاں پہنچ گئی ہے اور وہاں اس نے تین عورتوں کو دیکھا جن میں سے دو کام کر رہی تھیں اور تیسری بستر پر لیٹی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ لڑکی نے نہ صرف گھر کا پورا نقشہ بتلا دیا بلکہ تیسری عورت کی تحریر کا کچھ حصّہ بھی نقل کر دیا۔ وہ تیسری خاتون بیگم راشد تھیں جو راشد صاحب کو خط لکھ رہی تھیں۔ راشد صاحب نے یہ بھی تصدیق کی کہ لڑکی کی بتلائی ہوئی باتیں حرف بحرف درست تھیں۔

اس کے علاوہ ٹیلی پیتھی کی متعدد مثالیں روزمرہ مشاہدے میں آتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر رائن ایک مشہور پیراسائکالوجسٹ ہیں جو نفس کے قوائے باطنی کے سلسلے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں ٹیلی پیتھی کی ایک مثال بیان کی ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کی جاتی ہے:-

دوسری جنگ عظیم کے دوران نیویارک کی ایک عورت کا لڑکا فوجی خدمات کے لئے مشرقِ وسطیٰ گیا ہوا تھا۔ وہ ایک رات چیختی ہوئی اُٹھی: "درخت کے نیچے سے ہٹ جاؤ! میرے بچّے درخت کے نیچے سے ہٹ جاؤ!" ہوش میں آنے کے بعد اس نے بتایا کہ اس نے دیکھا کہ اس کا لڑکا ایک بہت تناور درخت کے نیچے سویا ہوا ہے۔ آندھی کے زبردست طوفان نے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ دیا ہے اور وہ عنقریب اس کے لڑکے پر گرنے والا ہے۔ کچھ دن بعد اس کے لڑکے کا خط آیا جس میں اس واقعہ کی تصدیق کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ ماں تو نے میری جان بچائی ہے۔ میں نے تجھے چیختے ہوئے سنا کہ درخت کے نیچے سے ہٹ جاؤ میرے بچّے۔ جونہی میں بھاگ کر درخت کی زد سے

باہر ہوا وہ درخت گر گیا۔

(۵) بعض نفوس میں قدرت کی ودیعت کردہ ایسی طاقت ہوتی ہے کہ بیماروں کو شفا دے سکتے ہیں۔ اخبار روزنامہ جنگ کراچی میں ایک روز یہ خبر شائع ہوئی کہ ویلز (برطانیہ) میں ایک پانچ سالہ لڑکی کے جنازے میں کئی ہزار افراد شریک ہوئے جس کا سبب یہ تھا کہ اس میں قدرت کی ودیعت کردہ یہ طاقت تھی کہ جس مریض کو وہ چھو دیتی تھی وہ شفایاب ہو جاتا تھا۔ اس مضمون میں اس کی مختصر زندگی کے حالات اور ان مریضوں کے بیانات بھی درج تھے جن کو اس کے ذریعے شفاء حاصل ہوئی تھی۔

(۶) بعض نفوس محیر العقول قوتِ حافظہ کے مالک ہوتے ہیں۔ بعض کمپیوٹر کی رفتار سے تیز بڑی بڑی رقوم کی جمع تفریق، ضرب و تقسیم وغیرہ حل کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم کی صلاحیت رکھنے والوں کی مثال پاکستان میں جناب منیر حسین صاحب ڈائرکٹر ٹیلی فون ہیں انہوں نے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ ٹیلی ویژن پر بھی کیا۔ پانچ ممتاز ممتحنوں سے انہوں نے پچاس نام پوچھے اور اس کے بعد اسی ترتیب سے انہوں نے ان کو دہرا دیا۔ پھر اُلٹی ترتیب سے دہرایا۔ اس کے بعد ہر نمبر کے لحاظ سے یعنی دسویں نمبر پر کیا ہے، اکیسویں نمبر پر کیا ہے، بتیسویں نمبر پر کیا ہے! اسی طرح تمام نمبروں پر بتلایا۔ ان کا فرمانا تھا کہ وہ ایک سو پچاس نام اسی طرح یاد کر سکتے ہیں اور اسی طرح ہر ترتیب سے' اور ہر علیحدہ نمبر پر کیا ہے' بتلا سکتے ہیں۔

دوسری قسم کی صلاحیت رکھنے والوں کی مثال ایک اور پاکستانی بزرگ محمود احمد صدیقی صاحب کی ہے۔ انہوں نے بھی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ ٹیلی ویژن پر کیا اور بڑی بڑی رقموں کا حاصل ضرب، جمع، تقسیم، تفریق غرض ہر قسم کا حساب کتاب فوراً بتلا دیا۔ ساتھ ہی ایک صاحب کمپیوٹر رکھے ہوئے بیٹھے تھے جو جوابوں کی صحت کی تصدیق کرتے جاتے تھے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ صدیقی صاحب نے کمپیوٹر سے پہلے ہی جواب بتا دیا۔

عرصہ دراز گزرا ایک انگریز جنٹلمین مسٹر جے۔ کے۔ آرتھر کا ایک مقالہ (IN THE INVISIBLE WORLD) یعنی "غیر مرئی عالم میں" شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے بیان کیا تھا کہ نفسِ انسان اگر کامل تربیت حاصل

کرلے تو اس سے ایسے محیر العقول اُمور صادر ہوسکیں گے جن کو سُن کر اس مادی دُنیا کا کوئی شخص یقین نہیں کر سکتا۔ اس میں بہت سے کمالات کا بیان تھا جس میں سے ایک یہ تھا کہ یہ بغیر حرکت کئے محض ارادہ کرنے ہی سے سیکڑوں میل پر پہنچ سکتا ہے (اس کو ہمارے اولیاء اللہ طے ارض کہتے تھے اور بعض ایسے عارفین گزرے ہیں جو واقعاً طے اَرض کرتے تھے)۔ ایک اور کمال کا تذکرہ بھی تھا کہ یہ ایک وقت میں متعدد مقامات پر خود کو دکھا سکتا ہے۔

اس اَمر کی توثیق علم طبعیات کے حالیہ نظریہ سے بھی ہوگئی ہے کہ ایک وقت میں متعدد مقامات پر ظاہر ہونا ممکن ہے۔ اَب ٹیلی ویژن ہی دیکھ لیں جس نفس میں یہ اہلیت پیدا ہو جائے کہ بالارادہ برقی شعاعیں خارج کر سکے۔ وہ متعدد مقامات پر اپنے کو دکھا سکے گا۔

ہمارے پنجاب ہی میں خدا کے ایسے بندے بھی دیکھے گئے ہیں کہ ان سے دس بارہ اشخاص ایک ساتھ مختلف مضامین کے سوالات کرتے اور وہ ہر ایک کو اس کے سوال کا جُدا جُدا جواب دے دیتے تھے اور اس طرح وہ "وَلَا يَشْغَلُهُ سَمْعٌ عَنْ سَمْعٍ" (اس کو ایک بات سُننا دوسری بات سُننے سے مشغول نہیں کر سکتا) کی صفت کا عملی مظاہرہ کرکے دکھلا دیتے تھے کہ اللہ کے بندوں جس کی ایک ادنیٰ مخلوق میں یہ صفت ہو کہ دس بارہ اشخاص ایک مرتبہ ایک ساتھ بات کریں اور اس کو اشتباہ نہ ہو اور ہر ایک کی بات سمجھ لے تو ایسے بندوں کا خالق کیسا ہوگا؟ اس کو تمام کائنات کے اَربوں سنکھوں عالموں کی اَربوں سنکھوں مخلوق کی باتیں سُننے میں کیسے اشتباہ ہو سکتا ہے؟

اِن کیفیاتِ نفس پر تو ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ اَب اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور اس باب کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ مگر غیرت و حمیت کی آگ جو سینہ میں بھڑک رہی ہے اس کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ امر تو قارئین پر واضح ہوگیا کہ یہ صفات جو بیان ہوئیں نفسِ انسان کی قوائے باطنی ہیں جو ایک دہریہ بھی ریاضتِ نفس سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ ایمان باللہ اور حق کی

علامت نہیں مگر ہمارے مسلمان بھائی جس شخص میں ان صفات میں سے کوئی جھلک دیکھ لیتے ہیں تو اس کو مومن کامل، ولی اللہ سمجھ کر اس کی پوجا کرنے لگتے ہیں۔ افسوس! خدا ہمیں ہدایت کرے۔

اس کے علاوہ یہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں کتنی ہی ایسی انجمنیں قائم ہیں جو نفس کے قوائے باطنی اور رُوح کے متعلق تحقیقات میں مصروف ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ زمانۂ جہالت کی خلافِ عقل و فطرت موضوعہ روایات پر دین کی بنیادیں قائم کئے ہوئے، تاریک غار میں پڑے ہیں۔ ہمارے اکثر فرقوں کے علماء کی تفاسیر میں اس کا بار بار تکرار کیا گیا ہے کہ علم غیب سوائے اللہ کوئی نہیں جانتا اور بالخصوص ان باتوں کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا کہ کل کوئی شخص کیا کرے گا۔ کوئی کہاں مرے گا؟ بارش کس جگہ ہوگی، حاملہ کے شکم میں کیا ہے نر یا مادہ اور قیامت کب ہوگی؟ یہ تمام باتیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اس سے تو یہ نتیجہ نکلا کہ جس کو ان باتوں کا علم ہو وہ ہی خدا ہوا۔ ہم ایسے بے حمیت ہیں کہ اس عقیدے کی بنا پر بے شمار خدا یورپ و امریکہ میں موجود پاتے ہیں جو ان میں سے بعض صفات کے حامل ہیں۔ ہمارے لفظ پرست علماء ان امور کا ثبوت کلام اللہ سے دیتے ہیں اور ہمیں بتلاتے ہیں کہ علم غیب تو رسولؐ اللہ کو بھی نہ تھا۔ علماء کرام کی تقریروں اور تحریروں میں اس پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور اس کے ثبوت میں متشابہ آیات کے اجزاء پیش کئے جاتے ہیں مثلاً:۔

لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ

(۱۸۸) الاعراف

(اگر میں غیب جانتا ہوتا تو اپنے لئے بہت خیر جمع کر لیتا)

وَمَا اَدْرِیْ مَا يُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ (۹) الاحقاف

(میں نہیں جانتا میرے ساتھ یا تمہارے ساتھ کیا عمل کیا جائے گا)۔

ایسی اور آیات پیش کر کے فرماتے ہیں کہ جو شخص اس کے خلاف عقیدہ رکھے وہ کافر ہے۔

الغیب : الغیب کی اصل ذاتِ باری ہے جس کا علم سوائے خود اس کی ذات کے کسی غیر کیلئے محال ہے۔ پھر اور باتوں کے لئے اس کا علم کامل ہے۔ بندوں کو تو تھوڑا وقوف ہو سکتا ہے نہ کہ علم، مگر علماء کرام نے غیب کا مفہوم اپنے قیاس سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہر پوشیدہ بات گزشتہ یا آئندہ کے حالات کا جان لینا علمِ غیب ہے جس کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔

ہمارے علماء کرام نے متشابہ آیات کے اجزاء پر عقائد کی بنیادیں قائم کی ہوئی ہیں مگر پوری آیت نہیں دیکھتے۔ مثلاً یہ کہ میں غیب جانتا ہوتا یا یہ کہ میں نہیں جانتا کہ تمہارے ساتھ یا میرے ساتھ کیا عمل کیا جائے گا وغیرہ۔ قارئین کرام ان آیات کا خود ہی مطالعہ فرمائیں:۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۗ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ الاعراف

(اے رسول) کہہ دو کہ میں اختیار نہیں رکھتا اپنی جان کے لئے نفع کا اور نہ نقصان کا مگر جو چاہے اللہ۔ اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت نفع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی مضرت نہ پہنچتی۔ نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا اور بشارت دینے والا اس قوم کو جو ایمان لاتے ہیں)۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۹﴾ الاحقاف

(اے رسول) کہہ دو کہ میں کوئی نیا رسول تو نہیں ہوں۔ اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ یا تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے اور نہیں ہوں میں مگر کھلا ڈرانے والا)۔

مذکورہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرما رہے ہیں وہ خدا کے حکم سے کہہ رہے ہیں نہ کہ اپنی طرف سے۔ جناب باری تعالیٰ کا اپنے رسولؐ کو یہ حکم ہے کہ تم ان جیسے بشر بن کر رہو اور کسی روحانی طاقت کا اظہار نہ کرو۔ اسی لئے ایسے احکام صادر ہوتے ہیں کہ وہ اپنی کسی باطنی قوت کا اظہار نہ کریں بلکہ عوام الناس کی کیفیاتِ نفسی کی مثل ہی اپنی کیفیات کا اظہار کرتے رہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ذاتِ باری تو خالقِ صفات ہے لہٰذا اس کی صفات تو انسان کے عقل و فہم، وہم و گمان سے بالاتر ہیں۔ ان کا بیان تو الفاظ میں ہو ہی نہیں سکتا اور انسان کو کسی ذات کی طرف توجہ دلانا بغیر الفاظ و کلمات ممکن نہیں۔ لہٰذا اپنے بندگان کامل، حاملانِ نور کی صفات کو اپنی صفات ظاہر فرماتا ہے تاکہ انسان کی توجہ خالقِ کائنات کی ذات کی طرف ہوسکے۔ اس کے جو بندے بیتِ نور، حاملانِ نور ہوتے ہیں وہ ہی اس کی صفات کے مظہر ہوتے ہیں لہٰذا ایسے بیشتر کلمات و آیات جن میں صفاتِ باری بیان کئے گئے ہیں تمام و کمال متشابہ ہیں۔ متشابہ کے پیچھے پڑ کر ان کو محکم سمجھ کر ان پر عقائد کی بنیادیں قائم کرنے والے گمراہی میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کو تو وجودِ باری کا یقینِ قلبی، ایمانِ حقیقی اور تزکیہ و معرفت کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس امر پر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے علمائے کرام اپنے قلم سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو احادیث محکم نقل کرتے ہیں وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتیں بلکہ وہ اپنے قیاسی عقیدہ ہی پر مُصر رہتے ہیں۔ صرف ایک حدیث ہی صاحبانِ عقل کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔ سورہ آل عمران کے رکوع اوّل میں آیہ متشابہات کی تفسیر میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ "بعض آیات کو اللہ تعالیٰ نے محکم فرمایا ہے اور بعض کو متشابہ اور متشابہ کے معنوں میں غور کرنے کو منع فرمایا ہے۔ جس طرح اس آیت میں ہے کہ متشابہ کے پیچھے وہ لوگ پڑتے ہیں جن کے دل ٹیڑھے ہوگئے ہیں اور محکم و متشابہ میں بھی علماء کی بحث ہے جس میں بالآخر سب کا اتفاق ابنِ عباسؓ کے قول پر ہوا ہے۔"

"حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ قرآن شریف میں جو آیات عمل کے لئے نازل ہوئی ہیں وہ محکم ہیں اور جن سے عمل متعلق نہیں صرف بندوں کا ایمان لانا اللہ کا مقصود ہے جیسے صفاتِ الٰہی کی آیات یا قیامت کے حالات کی آیات یا حروف مقطعات یہ سب متشابہ ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "متشابہ آیتوں کا مطلب سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔ تم محکم آیتوں پر عمل کرو۔ متشابہ پر صرف ایمان لاؤ۔"[۱] (ابن کثیر و در منصور)

---

[۱] یہ روایت و حدیث مندرجہ ذیل کلام اللہ کے حاشیے سے نقل کی گئی ہے:۔ متوسط قرآن مجید مترجم دو ترجمہ۔ ترجمہ اوّل از شاہ رفیع الدین صاحب رئیس الفقہاء والمحدثین دہلوی۔ ترجمہ دوم از حضرت حکیم الامّت مولانا اشرف علی تھانوی قادری چشتی۔ ناشران نور محمد کارخانہ تجارت کتب قریب جامع مسجد دہلی مطبوعہ ۱۹۲۷ء صفحہ ۲، حاشیہ بروایت ھو الذی انزل الیک الکتاب۔

اَب صاحبانِ عقل غور فرمائیں، کیا ہم متشابہات کے پیچھے پڑ کر گمراہی کے تاریک گڑھے میں نہیں گر گئے ہیں جس سے نکلنا قریب قریب محال ہے؟ جناب باری تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے توفیق وہدایت عطا فرمائے تاکہ ظلمت سے نور کی طرف نکل سکیں۔

دہریوں اور معاندینِ اسلام کے اعتراضات

باب چہارم میں مضامین کے بارے میں جو اعتراضات معاندین کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں۔ وہ تین قسم کے ہو سکتے ہیں:۔

ایک وہ جو نظامِ کائنات و نظامِ شمسی سے متعلق ہیں۔

دوسرے وہ جو وجود وصفاتِ باری سے متعلق ہیں۔

اور تیسرے وہ جو صفاتِ انبیاء و رسل سے متعلق ہیں۔

① دوسری تیسری صدی ہجری میں تدوین کتب کے وقت مصنفین کے ذہنوں پر نظامِ بطلیموس چھایا ہوا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ زمین ہی مرکز کائنات ہے اور اس کے اوپر سات آسمان، آٹھواں عرش اور نواں کرسی تہ بہ تہ پیاز کے چھلکوں کی طرح سے چھائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تمام آیات واحادیث کی اپنے تخیل کے مطابق تاویلیں کر کے کتابوں کو بھر دیا۔ اَب صاحبانِ فکر اولوالباب کو چاہیئے کہ علمائے کرام کی خدمت میں التماس کریں کہ اِن غلط تاویلات پر نظرِ ثانی کر کے اصلاح فرمائیں۔

② دوسری صدی ہجری میں ایسے جہال کی کثرت تھی جو دہر کی قدامت کے قائل تھے اور پچھلی صدی عیسوی تک بہت سے سائنسدان بھی مادّے کو قدیم تسلیم کرتے تھے۔ اسی نظریہ کے ابطال کے لئے مروجہ علمِ کلام میں طویل بحثیں اور کافی دلائل موجود ہیں۔ موجودہ صدی عیسوی میں یہ بحثیں اور دلیلیں (اس امر کا ثبوت مل جانے کے بعد کہ تمام کائنات میں غیر مرئی تخلیقی شعاعیں مادہ کے ایٹم بناتی رہتی ہیں) غیر ضروری ہوگئیں۔ اکثر سائنسدانوں نے جب اس امر پر غور کیا کہ تمام کائنات کا نظام معیّنہ قوانین کے تحت جاری وساری ہے اور یہ کہ کوئی قانون خود بخود نہیں بن سکتا، اس کے بنانے کے لئے اعلیٰ ذہن کی

ضرورت ہے نیز تمام مخلوق میں حیرت انگیز صنعتیں موجود ہیں۔ انسان خود اپنے اعضاء میں ایسی صنعتیں دیکھتا ہے جو کسی مُصوِّر و مجوز ذہن کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا اب وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کائنات کی اصل کُنہہ ذہنی ہے۔ اور یہ ایک عظیم ریاضی داں کے تخلیقی خیال کی مظہر ہے جو ہمیں مجسّم نظر آرہا ہے۔

مروّجہ علمِ کلام میں صفاتِ خداوندی اور ان پر مباحث اور دلائل کا بھی ایک طویل سلسلہ ہے۔ اسی باب میں یہ ظاہر کیا جا چکا ہے کہ جن آیات میں صفاتِ الٰہیہ کا تذکرہ ہے وہ متشابہ ہیں۔ قرآن نے بھی "لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ" (۱۱) الشوریٰ۔ کہہ کر ان بحثوں سے منع کیا ہے کیونکہ صفت سے تو تمثیل ہی ذہن میں آئے گی اور وہ تمثیل سے منزہ ہے جیسا کہ کہا گیا ہے "سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ" (۱۰۰) الانعام (اللہ منزہ ہے اس سے جو کچھ یہ صفات بیان کرتے ہیں)۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذاتِ باری کی صفات پر بحثوں کا نتیجہ تضیعِ اوقات کے سوائے کچھ نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک صفت "علم" ہی کو دیکھ لیں:

ہمارے اکثر علماء کلام اللہ سے استخراج کرکے بہت سے اُمور کے متعلق بتاتے ہیں کہ سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً وہی جانتا ہے جو رحموں میں ہے۔ یہاں گمراہی کا باعث علمِ الٰہی کو علمِ مخلوق سمجھ لینا ہوتا ہے۔ خدا کا علم تو انعقادِ نطفہ سے لے کر ولادت، زندگی، موت، حیات بعد الموت غرض کہ قیامت تک کے حالات پر حاوی ہے جو کسی غیر اللہ کو نہیں ہو سکتا۔ علمِ انسان کو تھوڑی سی واقفیت کہا جا سکتا ہے، علم تو اس کو ایک ذرّے کا بھی نہیں۔ لہٰذا ذاتِ باری کے علم کا احصاء ذہنِ مخلوق سے بعید ہے۔ یہی حال دیگر صفات کا ہے جو اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔

(۳) اس وقت دورِ حاضر کے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے افراد موجود ہیں جو بذریعہ ریاضتِ نفس قوائے باطنی کو ترقی دے کر یہ اہلیت حاصل کر لیتے ہیں کہ دوسرے کے دلی خیالات کو جان سکیں، دور دراز کے مقامات کا مشاہدہ کر سکیں، پوشیدہ باتوں اور آئندہ ہونے والے

☆ نوٹ:۔ آج سائنس یہ دکھا رہی ہے کہ رحمِ مادر میں کیا ہے۔ اور یہ ہی نہیں اب تو لڑکے یا لڑکی کا وجود میں آنا بھی حسبِ منشائے والدین ہُوا کرے گا۔ اور بانجھ عورتیں بھی ثمر دار ہوئی ہیں۔

واقعات کی خبر دے سکیں۔ یہ امر دہریت کا پروپیگنڈہ کرنے والوں کے ہاتھ میں ایک سخت ہتھیار ہے جو ہمارے نوجوانوں کو یہ کہہ کر گمراہ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ تمہارے تو انبیاء و رُسل میں بھی یہ صفات موجود نہ تھیں۔ لہٰذا جن لوگوں میں یہ صفات موجود ہیں وہ تمہارے انبیاء سے افضل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی تمام آیات جو انبیاء سے ان صفات کی نفی کرتی ہیں متشابہ ہیں۔ اِنسانِ کامل یا عبدِ کامل میں نفسِ امارہ تو ہوتا ہی نہیں لہٰذا بلحاظ بشریت ان میں یہ صفات بھی نہیں ہوتیں۔ عبدِ کامل میں تو رُوح یعنی نور عامل ہوتا ہے اور نور کے کام اور اس کے صفات خدا کے کام اور صفات ہیں لہٰذا جو معجزات انبیاء سے ظاہر ہوتے ہیں وہ خدا کی قدرت اور قوت کے افعال ہوتے ہیں۔ جو شخص ان کو انبیاء کے ذاتی افعال سمجھ لے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبعَ الْھُدٰی۔

مَکَرُوا وَمَکَرَ اللّٰہُ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "وَمَکَرُوۡا وَمَکَرَ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ ﴿۵۴﴾ آل عمران
(انھوں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی مکر کیا۔ اور اللہ تو مکر کرنے والوں میں بہترین ہے)۔
یہاں مکر پوشیدہ تدبیر کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ کفّار نے پوشیدہ تدبیریں کیں اور اللہ نے بھی تدبیر کی۔ اور اللہ کی تدبیر یہ ہے کہ ان کے نفس خراب ہوئے اور ان کی تدبیریں ان کے حق میں ہی مُضر ہوگئیں۔ اللہ تو سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔
دُوسری جگہ ارشاد ہے:۔
وَمَکَرُوۡا مَکۡرًا وَّمَکَرۡنَا مَکۡرًا وَّہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾ نمل
(اور انھوں نے تدبیریں کیں اور ہم نے بھی ایک تدبیر کی درآں حالیکہ ان کو شعور نہ ہُوا)۔
یہاں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی تدبیر جس کی مخالف کو خبر نہ ہو "مکر" ہے۔ ہم اپنی زبان میں لفظ مکر بُرے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص ایسی کیفیت کا یا ایسی حالت کا اظہار کرے جو اس پر وارد نہ ہوتی ہو یا اس کے دل میں نہ ہو اور اس اظہار سے اس کو کوئی ناجائز فائدہ اُٹھانا یا کسی کو دھوکہ دینا مقصود ہو۔ اس فعل کو ہم مکر کہتے ہیں۔ مگر عربی میں مکر پوشیدہ تدبیر کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ وہ نیک نیتی سے کی گئی ہو یا بدنیتی سے۔ قرآن میں کئی جگہ جہاں بدنیتی ظاہر کرنا تھی وہاں مکر کے ساتھ سَیِّئَۃ بھی آیا ہے۔ مثلاً
اَفَاَمِنَ الَّذِیۡنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّخۡسِفَ اللّٰہُ بِہِمُ الۡاَرۡضَ

اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ النحل
(کیا بے خوف ہو گئے ہیں وہ لوگ جو بُری تدبیریں کرتے تھے اس سے کہ اللہ انہیں زمین میں دھنسا دے۔ یا ایسی طرف سے ان کو عذاب آجائے جس کی ان کو خبر نہ ہو)۔
.... وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰﴾ فاطر
(وہ لوگ جو بُری تدبیریں کرتے رہتے تھے ان کے لئے سخت عذاب ہے)۔
ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ مکر تدبیر یا عمل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ نیک نیتی سے کیا جائے یا بدنیتی سے کہیں پر یہ کلمہ عذاب کے لئے استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔
اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ الاعراف
(کیا نڈر ہو گئے وہ اللہ کے عذاب سے۔ پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کے عذاب سے مگر گھاٹا پانے والے)۔
کہیں حیلہ بازی اور بہانہ سازی اور عذر تلاش کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔
وَاِذَا اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ﴿۲۱﴾ یونس
(جب ہم لوگوں کو اپنی طرف سے رحمت کا مزا چکھاتے ہیں سختی کے بعد جو ان کو پہنچی تھی۔ دفعتاً ہماری نشانیوں میں عذر تراشی و حیلہ سازی کرنے لگتے ہیں)۔
کہیں پہلے سے سوچی ہوئی چال لگانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ جادوگروں کے حضرت موسیٰ ؑ سے مغلوب ہو کر ایمان لانے پر فرعون نے ان سے کہا تھا:۔
قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ الاعراف
(فرعون نے کہا تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں یہ تم لوگوں کی چال بازی ہے جو تم نے شہر میں چلی ہے (یعنی موسیٰ ؑ سے پہلے مل گئے تھے) تاکہ اس کے باشندوں

کو شہر سے نکال دو۔ تو عنقریب اس کا نتیجہ یا سزا معلوم کر لوگے)۔

کہیں پوشیدہ مشوروں اور تدبیروں کے لئے آیا ہے۔ جب قریش نے دارالندوہ میں جمع ہو کر حضور سرورِ کائنات کے خلاف مشورے کئے تھے، اس کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ انفال

(اور جب کفّار تمہارے خلاف مشورے کر رہے تھے، تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تم کو قید کر لیں یا تم کو قتل کر ڈالیں یا (وطن سے) خارج کر دیں۔ وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا۔ اور اللہ تو سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے)۔

کہیں الزام تراشی اور بدگوئی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ سورہ یوسف میں ہے کہ جب شہر میں عورتیں چرچا کرنے لگیں کہ عزیز مصر کی زوجہ اپنے غلام سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش مند ہے۔ بے شک غلام نے الفت میں اسے لبھایا ہے۔ ہم اس کو یقیناً بڑی غلطی میں دیکھتی ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے:۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾ یوسف

(پس جب اس نے (زلیخا نے) ان کے مکر کو سنا (یعنی اس کے متعلق شہر کی عورتیں جو الزام تراشی کرتی تھیں اس کو سنا) تو ان کو بلوا بھیجا اور ان کے لئے ایک مجلس آراستہ کی۔ اور ان کے ہاتھ چھری (اور نارنج) دی (تاکہ یوسف آئیں تو اس کو کاٹ دیں) پھر حضرت یوسف سے کہا ان کے سامنے آؤ۔ جب انہوں نے اسے دیکھا تو انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ اور کہنے لگیں۔ حاشا للہ یہ آدمی نہیں یہ تو معزز فرشتہ ہے (بہت سی تو بے ہوش ہوگئیں)۔

عقائد باطلہ پر قائم رہنے کے لئے بھی لفظ مکر استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربّ العزت ہے:۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ
قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ
بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ
يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ الرّعد

(آیا وہ (خدا) جو قائم ہے ہر نفس پر جو اس نے کمایا (یعنی اعمال سے واقف ہے) اور انہوں نے اللہ کے لئے شریک ٹھہرا لئے۔ تم کہہ دو نام تو بتاؤ۔ کیا تم خدا کو ایسے (شریکوں کی) خبر دیتے ہو جن کو نہیں جانتا زمین پر کہیں ان کا پتہ بھی ہے یا صرف ظاہری باتیں ہی ہیں۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ کافروں کے لئے ان کے عقائد واعمال باطلہ زینت دیئے گئے ہیں۔ وہ راہ راست سے روک دیئے گئے ہیں اور جس کو اللہ (فطرت) گمراہ کردے اس کو ہدایت کرنیوالا کوئی نہیں ہو سکتا۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِىْ
ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ النحل

(اور تم صبر کرو اور تمہارا صبر نہیں ہے مگر اللہ (کی مدد) سے اور ان کے حال پر رنج نہ کرو اور تنگ دل نہ ہو اس سے جو مکر یہ کرتے ہیں (یعنی اپنے اعمال وعقائد باطلہ پر قائم رہتے ہیں)۔

یہ تو معلوم ہو چکا کہ پوشیدہ تدبیر کو بھی مکر کہتے ہیں اور ایسی کیفیت کا اظہار کرنا جو حقیقتاً ظاہر کرنے والے پر طاری نہ ہو یہ بھی ایک پوشیدہ تدبیر ہے۔ نفس انسان کی فطرت ہے کہ جو کیفیات اس پر طاری ہوتی ہیں اور جن کا اس کو احساس ہوتا رہتا ہے ان ہی کو دیکھ کر یا سن کر یہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے ہم بدبختوں کے نفوس کو متاثر کرنے کے لئے جناب ربّ العزت نے بھی اپنی ذات اقدس کے لئے ایسی ہی کیفیات کا اظہار فرمایا ہے حالانکہ وہ ان سے منزہ ہے۔ ایسی تمام آیات جن میں ایسی کیفیات نفسی بیان فرمائی ہیں متشابہ ہیں اور مکر اللہ میں شامل ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے:۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَ
غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ النساء

(جو کسی مومن کو عمداً قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے۔ ہمیشہ اس میں رہے گا اور اللہ اُس پر غضبناک ہوا اور اس کو اپنی رحمت سے دُور کر دیا اور اس کے لیے بڑا عذاب مقرر کیا)۔

یہاں غضب سے مُراد عذاب ہے اور لعنت اس کی یہ ہے کہ نفس پر لاشعوری کے حجاب زیادہ ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بندہ عالم نور سے جو اس کی رحمت ہے دُور ہو جاتا ہے۔

اس طرح لفظ غضب کتنی ہی آفات میں آیا ہے مثلاً "وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ" (۶۱) البقرہ۔ "مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ" (۶۰) المائدہ۔ "سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ" (۱۵۲) الاعراف۔ "غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ" (۶) الفتح

غرضکہ ایسی تمام آیات میں غضب سے رَبّ کا عذاب ہی مُراد ہے۔ اسی طرح سورۂ زخرف میں فرعون اور اس کی قوم کے لئے ارشاد ہے:۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۵۵) الزخرف

(پس جب ہم کو غصہ دلایا ہم نے ان سے اِنتقام لے لیا پس ان سب کو ہم نے غرق کر دیا)۔

ہمارے نفوس خبیثہ کو مُتاثر کرنے کے لئے وہ ذاتِ اقدس جو کیفیات سے منزہ ہے۔ اپنے لئے ہماری جیسی کیفیات کا اظہار فرماتا ہے۔ یہی مکر ہے اور یہ آیات متشابہ ہیں

اسی طرح اور الفاظ بھی کلام پاک میں ذاتِ اقدس کے لئے استعمال ہوئے ہیں جو کیفیاتِ نفسِ انسانی ظاہر کرتے ہیں مثلاً "اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ج (۱۴۲) النساء" (تحقیق کہ منافقین اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اللہ ان کو دھوکا دیتا ہے)۔

اگر یہ جاننا چاہیں کہ اللہ کے دھوکا دینے سے کیا مُراد ہے تو قرآن کریم ہی میں دیکھ لیں۔ ارشاد باری ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۸) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ؕ (۹) البقرہ

(اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے۔ حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ (اپنے خیال میں) اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ دھوکا نہیں دے رہے مگر خود اپنے نفسوں کو اور ان کو شعور نہیں ہوتا)۔

اس آیت سے واضح ہو گیا کہ جب دھوکہ دینے کی غرض سے ایسی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں جو حقیقتاً وارد نہ ہو تو ان کے نفس کی خود فریبی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ کام چونکہ خدائی قانون کے تحت ہوتا ہے لہٰذا مقنن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے! اسی طرح کے بعض اور کلمات بھی ہیں۔ مثلاً کید (چالبازی) چنانچہ ارشاد ہے:۔

اِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾ طارق

(بے شک وہ (کفار) اپنی چالیں چلتے ہیں اور میں بھی چالیں چلتا ہوں)۔

یہاں اللہ تعالیٰ کے چال چلنے سے کیا مراد ہے۔ یہ آیات ذیل سے واضح ہو جاتا ہے جب حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو نمرود اور اس کے وزراء نے آگ میں ڈال کر جلا دینا چاہا۔ اسکے متعلق ارشاد ہے:۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾ الصّٰفّٰت

(انھوں نے اس کے ساتھ داؤ یا چال لگائی۔ پس ہم نے ان کو نیچا دکھایا (ذلیل کیا))

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾ الانبیاء

(انھوں نے اس کے ساتھ داؤ کھیلا۔ پس ہم نے ان کو ناکام کر دیا)۔

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾ طور

(کیا یہ لوگ داؤ چلنا چاہتے ہیں تو جو لوگ کافر ہوتے وہ خود ہی اپنے داؤ میں پھنسے)۔

اب تو واضح ہو گیا کہ "اَكِيْدُ كَيْدًا (میں بھی داؤ چال چلتا ہوں) سے کیا مراد ہے۔ کفار اپنی چالوں میں ناکام ہوتے ہیں اور اس سے ان کے نفس ہی کو نقصان پہنچتا ہے۔ وہ خود ہی اپنی چالبازیوں سے نقصان اٹھاتے ہیں۔ غرض کہ ذات واجب کے صفات و اعمال کیلئے جو کلمات بھی مستعمل ہوں گے ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہو سکتے بلکہ تمام متشابہ ہوں گے۔

مکرالناس

یہ امر تو قارئین پر واضح ہو گیا کہ عربی میں لفظ مکر کتنے مفاہیم کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہو چکا کہ ہم میں سے ہر شخص اس سے واقف ہے کہ ہماری زبان میں "مکر" ایسی کیفیت کے اظہار کو کہتے ہیں جو حقیقتاً طاری نہ ہوئی ہو مگر اس کے ساتھ ہی اس کے مفہوم میں بدنیتی بھی شامل ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنی کسی غلطی کو چھپانے، کسی فرض کی ادائیگی سے بچنے، کوئی ناجائز فائدہ اُٹھانے، کسی کو دھوکہ دینے یا نقصان پہنچانے کی نیّت سے کسی ایسی کیفیت کا اظہار کرے جو حقیقتاً اس پر طاری نہ ہوئی ہو تو ہم اس فعل کو مکر کہتے ہیں۔

اب لائق غور امر یہ ہے کہ خلق اللہ کو فائدہ پہنچانے، شر و فساد، قتل و غارت کو روکنے، کسی کو نقصان سے بچانے یا بچّوں کو مُضر افعال و حرکات سے محفوظ رکھنے کے لئے اگر کوئی شخص "مکر" کرے تو اس کا یہ فعل قابلِ مذمّت ہو گا یا قابلِ ستائش؟ "اِنَّمَا الاَعمَالُ بِالنِّیَّاتُ" (عمل کا بدلہ یا اس کی جزا نیّت پر ہے) دیکھیں جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۷۳﴾ البقر

(اس نے تم پر حرام کیا ہے مُردار، خون اور سور کا گوشت اور وہ ذبیحہ جس پر خدا کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو۔ پس جو شخص مجبور ہو اور اس کی نیّت سرکشی اور زیادتی کرنے کی نہ ہو (اور ایسی چیز کھالے) اس پر گناہ نہیں۔ اللہ تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

دیکھیں اس آیۂ دانی ہدایہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر نیّت بغاوت کی نہ ہو اور یہ خیال نہ ہو کہ بغیر مجبوری کے بھی کھالیا کریں گے تو حرام اشیاء بھی کھالینا گناہ نہیں۔ وہ غفور و رحیم اس جرم کو بخش دے گا مگر نیّت بد ہونے سے بہترین اَمرِ خیر بھی جرم ہو جاتا ہے۔ نماز ہی کو دیکھ لیں جس کے لئے محبوب کردگار کا ارشاد ہے۔ "اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ اِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ مَا سِوَاھَا وَاِنْ رُدَّتْ رُدَّ مَا سِوَاھَا" (نماز دین کا ستون ہے۔ اگر قبول

ہوئی تو تمام دیگر اعمال بھی قبول ہوتے ہیں اور اگر رَدّ کر دی گئی تو تمام اعمال بھی رَدّ کر دیئے جاتے ہیں) پس اگر نماز میں جو افضلِ اعمال ہے بدنیتی شامل ہو جائے تو وہ بھی گناہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ﴿٤﴾ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ﴿٥﴾
الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ﴿٦-٧﴾ الماعون

(پس جہنم ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں۔ جو دکھاوے کے واسطے کرتے ہیں اور روز مرّہ کی استعمال کی چیزوں کے عاریتاً دینے سے انکار کر دیتے ہیں)۔

دیکھ لیجئے کہ نماز جو افضل ترین اعمال ہے اگر دکھاوے کے لئے پڑھی، بدنیتی سے بہت بڑے ثواب کا کام کیا تو وہ بھی جہنّم میں لے جانے والا ہو گا۔ اب تو واضح ہو گیا کہ نیک نیتی سے شر و فساد مٹانے، خلق اللہ کو فائدہ پہنچانے کے لئے مکر کرنا باعثِ اجر و ثواب دارین ہی ہو گا۔

تربیت اطفال ہی دیکھیں اگر تربیت کرنے والے اس پر یہ ظاہر کر کے کہ ہمیں تمہارے اوپر بہت پیار آتا ہے اس کو اکثر خوب پیار کرتے رہیں۔ جیسی کیفیات بچے پر طاری ہوتی ہیں ویسی ہی اپنے اوپر طاری کر کے دکھائیں۔ اس کے ساتھ کھیلیں۔ بچوں جیسی حرکات کریں تو وہ اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ پھر اس کو کسی کام سے روکنے کے لئے جھڑکنے، سختی یا جبر کرنے یا ڈرانے دھمکانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ کہنے پر فوراً عمل کرتا ہے۔ اگر کسی وقت ضد پر اَڑ جائے تو صرف یہ کہہ دینا کہ "اگر تم کہنا نہ مانو گے تو ہم تم سے ناراض ہو جائیں گے۔ اس کو رام کرنے اور نقصان دہ کام سے بچا لینے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ بچے کے ساتھ کھیل میں لیٹ کر ظاہر اسو گئے۔ اس سے کشتی لڑی گر گئے اور کہہ دیا "ارے ڈھا دیا ڈھا دیا۔ شاباش پہلوان بڑا بہادر ہے"۔ وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ اس کے نفس میں جرأت و خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے! اس کو تو یہ خیال ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ "مکر" ہے۔

بچے کو متاثر کرنے والی بہترین کیفیت اظہارِ درد ہے۔ جب کسی کو روتے دیکھتا ہے تو اتنا متاثر ہوتا ہے کہ خود بھی رونے لگتا ہے۔ پس بچہ اگر کسی مُضر کام کرنے پر مُصر ہو

اور کسی طرح نہ رُکے تو اس کے رد کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ شخص جس سے وہ بہت ہلا ہوا ہے اس کے سامنے رونے لگے اور کہے کہ تمہاری ضد سے ہمیں بہت تکلیف ہوتی ہے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی شرارت و ضد چھوڑ کر دوڑتا ہوا نہ آئے۔ اور خوشامد کر کے چُپ کرانے کی کوشش نہ کرے۔ یہ تمام تجربات و مشاہدات ہیں۔

ایک مثال دیکھیں: فرض کریں کہ ایک بچے کو بارہا سمجھایا گیا کہ جب تم پھل کھاؤ تو چھلکے زمین پر نہ ڈالا کرو۔ اگر کسی کا پیر چلتے میں چھلکے پر پڑ جائے گا تو وہ گر پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تم خود ہی چوٹ کھاؤ۔ مگر اس کو یاد ہی نہیں رہتا کہ اس ہدایت پر عمل کرے بس اگر وہ شخص جس سے وہ ہلا ہوا ہو بچے کے گرائے ہوئے چھلکے پر پیر رکھ کر ارادتاً پھسل کر گرے اور رو کر کہے کہ دیکھو تم نے باوجود کتنی مرتبہ منع کرنے کے پھر چھلکا فرش پر ڈال دیا اور ہمارے سخت چوٹ لگ گئی۔ یہ منظر بچے کے ذہن پر نقش ہو جائے گا اور پھر یقیناً ایسا عمل کرنے سے باز رہے گا۔

ایک ذاتی مشاہدہ پیش کرتا ہوں۔ ڈھائی سال کے ایک بچے کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ ہر وقت روتا رہتا تھا۔ کئی مہینے اسی حال میں گزر گئے اپنے والد سے بھی مانوس تھا مگر وہ اپنی ملازمت پر تھے آخر اس کو باپ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ بچے نے باپ سے ملنے کے بعد پہلی بات یہی کہی "ابا جی اماں مر گئی" اور یہ کہہ کر زمین پر لوٹ گیا۔ اس کو بہلانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ جب کھانا سامنے آتا تو اس کے آنسو جاری ہو جاتے اور ہائے اماں ہائے اماں کہہ کر مچل جاتا۔ کھانا بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ بہت کمزور اور دُبلا ہو گیا اور اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہونے لگا۔ بیماری کا علاج تو دوا دارو سے ہو سکتا ہے مگر روحانی مرض کا کیا علاج ہو سکتا تھا۔ تقریباً چار ماہ ہو چکے تھے مگر اس کا تڑپنا کم نہ ہوتا تھا۔ بس "ابا جی اماں مر گئی" کہتا اور زمین پر لوٹنے لگتا۔ باپ بے چارہ بھی پریشان اور دوسرے ساتھ رہنے والے بھی پریشان رہتے اور اس روحانی مرض کا کوئی علاج سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر ایک روز بچے نے ماں کو یاد کر کے زمین پر لوٹنا شروع کیا تو باپ کو ایک تدبیر سوجھی کہ ایک دم چارپائی پر لیٹ کر ہائے ہائے آہ مرا! اُف مر گیا! کہنا شروع کر دیا۔ بچہ سب رونا دھونا بھول گیا۔ فوراً کھڑا ہوا اور دوڑ کر باپ سے لپٹ گیا اور پوچھنے لگا "ابا جی کیا ہوا۔ میرے ابا جی کیا ہو گیا؟" باپ نے کہا جب تم روتے ہو تو ہمارے

دل میں چبک ہونے لگتی ہے اور بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ آج ہمارے دل میں درد ہونے لگا۔ اب ہم بھی مر جائیں گے۔ پھر تمہیں کوئی پیار کرنے والا بھی نہ رہے گا۔ تم روتے جاؤ۔ لو اب ہم بھی مرے جاتے ہیں۔ یہ سن کر وہ باپ سے زور سے لپٹ گیا اور کہنے لگا "نا ابا جی! تم مت مرلو۔ میرے پیارے ابا جی نا مرلو۔ میں اب نہیں روؤں گا۔ لاؤ تمہارا دل سہلا دوں۔ میرے پیارے ابا جی"۔ یہ کہہ کر اس نے منہ باپ کے سینے پر رکھ دیا اور دیر تک سینے پر منہ ملتا رہا۔ پیار کرتا رہا۔ سینہ چومتا رہا۔ جب باپ سے اقرار لے لیا کہ اب ہم نہیں مریں گے تب سیدھا ہو کر بیٹھا۔ پھر کچھ دیر بعد کہنے لگا کہ ابا جی میں کیا کروں اماں کی یاد آتی ہے تو مجھ سے رکا ہی نہیں جاتا۔ رونے اور تڑپنے ہی کو جی چاہتا ہے۔ تو باپ نے کہا: بیٹے تم دیکھتے تھے کہ تمہاری ماں بیمار تھی اور کتنی تکلیف میں تھی۔ اب تو بڑے آرام میں ہے۔ جس جگہ وہ ہے وہاں باغ ہیں۔ پھلواریاں ہیں۔ بڑے میٹھے میٹھے پھل ہیں۔ دودھ کی اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ تو بڑے آرام میں ہے۔ یہاں تو بڑی تکلیف میں تھی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ تمہاری اماں جنّت میں عیش کر رہی ہے پس جب بھی تمہیں ماں کی یاد آئے۔ جنّت کا ذکر کیا کرو کہ میری اماں جنّت میں ہیں بڑے مزے میں ہیں۔ اب بچّے کا یہ وطیرہ ہو گیا کہ دن میں کتنی مرتبہ ماں کا ذکر کرتا۔ ہر شخص سے کہتا کہ ہماری اماں جنّت میں ہیں۔ وہاں باغ ہیں، پھلواریاں ہیں، میٹھے میٹھے پھل ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب بجائے غم کے اس کو سرور حاصل ہونے لگا۔ کھانا پینا بھی اچھی طرح شروع کر دیا۔ اس طرح وہ ہلاک ہونے سے محفوظ رہا ورنہ اس کو ہلاکت سے بچانے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔

سبحان اللہ کس قدر پیارا ہے وہ رب جس نے جنّت کی ایسی تفصیل بیان فرما کر بچّوں کے لئے بھی ہلاکت سے بچنے کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اگر کلام پاک میں یہ تفصیل نہ ہوتی تو بچّے کے غم کو سرور میں کیا چیز بدل سکتی تھی۔ اب ذرا قرآن کریم ملاحظہ کریں۔ ارشاد رب العزت ہے۔

أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۚ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ... (۳۲) المائدہ

(جو شخص کسی کو جان کے بدلے کے بغیر یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کر دے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے ایک شخص کو جلا لیا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو جلا لیا....)

سُبحان اللہ واللہ اکبر ایک فرد کو ہلاکت سے بچانا ایسا ہے کہ جیسے تمام لوگوں کو ہلاکت سے بچالیا تو اس باپ کے اس مکر کے عوض جس کے ذریعے سے اس نے ایک نفس کو زندہ رکھ لیا۔ جناب ارحم الراحمین کی بارگاہ سے کتنا اجرِ عظیم ملے گا۔

مکرالسالکین والعارفین

اس بیان کے شروع کرنے سے قبل ضرورت ہے کہ حصولِ ایمان حقیقی کی راہ پر چلنے والوں کے مختلف مدارج کی کچھ تعریف بیان کر دی جائے۔ جناب باری تعالیٰ عزاسمہ اپنے کلام مقدس میں ارشاد فرماتا ہے:۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ الحجرات

(اعراب کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ کہہ دو کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا حالانکہ ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کرو گے تو رب تمہارے اعمال کے بدلے میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ اللہ تو بڑا غفور و رحیم ہے)۔

اس آیۂ کریمہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ آمنت باللہ اور کلمہ شہادت پڑھ لینے سے ایک شخص مسلمان ہو کر مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہو جاتا ہے اس پر احکام اسلام جاری ہو جاتے ہیں مگر ایمان تو احکام خدا اور رسولؐ پر عمل کرنے سے، ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے بتدریج قلب میں داخل ہوتا ہے اور ایسے احکام کلام پاک کی محکم آیات میں کھول کر بیان کر دیئے گئے ہیں مگر وہ تو اسی کو نظر آئیں گے جس کو رب کے راستہ پر چلنے کی طلب ہوگی۔ اس سے اگلی آیت ہی ملاحظہ کر لیں:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ

الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ الحجرات

(سوائے ان کے کوئی مومن نہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک نہ کر سکے (یعنی شک کا امکان بھی باقی نہ رہا) اور جہاد کیا انھوں نے اپنے مالوں اور نفسوں سے اللہ کے راستے میں بس وُہی سچے مومن ہیں)۔

اِس آیۂ دِ نی ہدایہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ سچے مومن تو بس وُہی ہیں جن کو وجودِ باری کا ایسا یقینِ قلبی حاصل ہوجائے کہ اگر وہ دینِ حقّہ کے خلاف ہزاروں دلائل بھی سُنیں سیکڑوں مصائب و تکالیف اس کے راستے میں پہنچیں مگر کسی حال میں بھی دینِ حقّہ کے بارے میں ان کے دل میں ذرا سا بھی شک و شُبہ پیدا نہ ہوسکے بلکہ وقوعِ شک کا اِمکان ہی باقی نہ رہے۔ پھر وجودِ باری کا یقینِ قلبی اور ایمانِ حقیقی حاصل کرنے کا طریقہ بھی ظاہر فرمادیا کہ وہ جہاد بالنفس سے ہوتا ہے۔

اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جہاد بالنفس کیا ہوتا ہے اور وہ کیسے کیا جائے۔ اس کے لئے رَبُ العزّت نے اپنے کلامِ اقدس میں محکم آیات نازل فرمائی ہیں۔ ان احکام پر عمل کرنا ہی جہاد بالنفس ہے۔ تمام احکام ایسے واضح ہیں کہ ہر شخص ان کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ تو فرماتا ہے :۔

لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ﴿۱۷﴾ القمر

(ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بہت آسان کردیا ہے پس آیا ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا)۔

مگر مشکل تو یہ ہے کہ جو لوگ غالبؔ و اقبالؔ کے کلام کو نہیں سمجھ سکتے وہ خدا کے کلام کو کیسے سمجھیں گے۔ جس کے ذہن میں یہ خیال قائم ہوجائے اور سمجھ لے کہ میں تو ایمان لے آیا ہوں مجھے تو رَب کے وجود کا یقینِ قلبی حاصل ہوگیا ہے اس کو تو سیکڑوں بار تلاوت کرنے سے بھی اِن آیات کی طرف توجّہ نہ ہوگی۔ جو لوگ اس دعوے میں مست رہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لے آئے ہیں ان کے لئے تو ارشاد فرماتا ہے :۔

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰہَ بِدِیْنِکُمْ ۚ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۶﴾ الحجرات

("اے حبیب" کہہ دو کیا تم اللہ پر اپنی دینداری (اپنا ایمان لانا) جتاتے ہو۔ اور اللہ تو

سب کو جانتا ہے جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور اللہ تو ہر شے کا جاننے والا ہے)۔

پس مدعیانِ ایمان کے دلوں پر مہر ہو جاتی ہے، آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں، ان کے دل اندھے ہو جاتے ہیں، ان کو حق نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ وہ ارشاد فرماتا ہے:۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ الحج

(پس آنکھیں تو اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں)۔

پس جو شخص یہ جان لے کہ میں قرآن سمجھ لوں گا اس کا دل اندھا ہو جائے گا اور واضح احکام دیکھتے ہوئے اور آیات تلاوت کرتے ہوئے بھی اس کے قلب کو ان کی طرف توجہ نہ ہوگی کوئی شخص اپنے ارادے سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتا۔ ہدایت کرنا تو رب کا کام ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے:

يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴿۳۵﴾ النور

(اللہ ہی ہدایت کرتا ہے اپنے نور کی طرف جس کو وہ چاہتا ہے)

وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ الشوریٰ

(اور وہ (اللہ) اپنی طرف آنے کا راستہ دکھاتا ہے اس کو جو رجوع کرے (جس کو دل سے طلب ہو))۔

پس جس کو وجودِ باری کا یقینِ قلبی، نورِ ایمانِ حقیقی حاصل کرنے کی طلب ہو اور صدقِ دل سے اس کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے۔ "اَللّٰهُمَّ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (اے پیارے مولا اپنی بارگاہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ دکھا دے) اسی کو قرآن پاک میں رب کی راہ پر چلنے اور جہاد بالنفس کے احکام نظر آجائیں گے۔ پھر مالک سے بہ صدقِ دل یہ بھی طلب کرے گا کہ مجھ کو ان پر عمل کی توفیق بھی عطا فرما۔ تیری تائید و نصرت کے بغیر تو کوئی بندہ تیرا نام بھی نہیں لے سکتا۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں) بغیر تیری مدد تو ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ پس جن بندوں کے دلوں پر یہ کیفیت طاری ہو جائے ان کو "طالبین" کہتے ہیں۔

ایک طالب کو تو نظر آجائے گا کہ مالک نے ایمان حقیقی کی علامت حُبِّ شدید بتلائی ہے

"وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ" (۱۶۵) البقرۃ (وہ جو ایمان لائے اللہ کی محبت میں بڑے شدید ہوتے ہیں)
اور حبِ شدید کی علامت وجلِ قلب ظاہر فرمائی ہے "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ
وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ" (۱) الانفال (سوائے ان کے کوئی مومن ہے ہی نہیں کہ جب اللہ کی یاد دلائی جائے
ان کے دل لرزنے لگیں) لہٰذا اس کو حبُ اللہ، ایمانِ حقیقی، وجود باری کا یقینِ قلبی
حاصل کرنے کی خواہش شدید پیدا ہوگی اور بارگاہ عظمت وجلال سے طلب کرتا ہے گا اپنے اس
بندے پر مالک بھی رحمت کی نظر ڈالتا ہے اور اس کو توفیق عطا فرماتا ہے کہ اس راہ پر چل سکے۔
ایسے بندے ہی "سالک" کہلاتے ہیں (یعنی وجود باری کا یقینِ قلبی، ایمانِ حقیقی یا حُبِ اللہ
کے حصول کے راستے پر چلنے والا)۔

حقائق کا بیان لوگوں کے لئے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے جنات یا پرستان کے قصے سُن لئے۔
اس لئے کہ نفسِ انسان کو جس کیفیت کا احساس یا ادراک نہ ہوا ہو، جو اس کے تجربہ میں نہ آئی
ہو۔ اس کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا ان کا بیان کرنا چنداں مفید نہیں ہوتا۔ البتہ طالبین کے لئے
ضرور مفید ہوتا ہے صرف اس غرض سے کہ طالبین محروم نہ رہیں جو کچھ علم سینہ بہ سینہ اس حقیر کو
اہلِ بصیرت سے پہنچا ہے تحریر کرتا ہوں:۔

جب سالک ان احکام قرآنی پر عمل کرتا ہے جو تزکیہ نفس کے لئے آیات میں واضح طور پر
بیان کئے گئے ہیں تو پہلے قلب میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور طبیعت میں گھبراہٹ ہوتی
ہے۔ یہیں سے حیاتِ حقیقی کی طرف پہلا قدم اُٹھتا ہے۔ اگر اس کیفیت کو استقرار
ہو جائے تو کسی دن کلام پاک کی آیات متشابہ میں سے کسی ایک کلمہ کا مفہوم حقیقی قلب
پر وارد ہوگا۔ اس وقت قلب کو ایسا جھٹکا لگتا ہے جیسے دو سو وولٹ کی کرنٹ برقی لگ گئی
ہو۔ جس سے سینے میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔ اس شاک (SHOCK) کی
اذیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ اس کا برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ
اس اذیت سے کہیں زیادہ بے انتہا سرور بھی قلب پر وارد ہوتا ہے۔ سینہ میں جو آگ سی بھڑکتی
ہے اس سے گھبراہٹ بھی بہت ہوتی ہے اور سخت اضطرار ہوتا ہے کہ یہ علم جو ملا ہے اس کو
جلد از جلد کسی سے کہہ دوں۔ اگر کہہ دے گا تو وہ آگ بھی سرد پڑ جائے گی اور گھبراہٹ بھی باقی

نہ رہے گی۔ اسی کے ساتھ وہ سرور وجدان بھی رخصت ہو جائے گا اور دروازۂ رحمت بند ہو جائے گا۔ دراصل وہ آگ سی جو سینے میں محسوس ہو رہی تھی جس سے سخت گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی وہ ہی تو غفلت و لاشعوری کے حجابوں کو جلا کر کمزور کرنے والی تھی۔ اگر صبر کرتا اور زبان نہ کھولتا تو قوتِ ادراک ترقی کرتی۔ لاشعوری و غفلت کم ہوتی۔ مزید نور عطا ہوتا۔ اللہ تو صابروں کے ساتھ ہے۔ جو صبر نہ کر سکیں ان کو معیت اللہ کی نعمت کیسے میسّر آسکتی ہے؟ البتہ جو صبر کرتا ہے اور زبان نہ کھولے تو تھوڑے تھوڑے عرصہ کے وقفہ سے وہ کیفیت طاری ہوتی رہے گی، علم حقیقی شعور میں آتا رہے گا جس سے وجدانی کیفیت طاری ہوگی۔ جب وجدان طاری ہوتا ہے تو اس کے ایک سیکنڈ کا سرور اتنا ہوتا ہے کہ اس کا موازنہ تیس چالیس سال کے مادی دنیا میں حاصل کردہ سروروں کے مجموعہ سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام اس کے سامنے ہیچ نظر آئیں گے۔ اس وقت سالک کو جنابِ رب العزت اطمینان کی نعمت عطا فرماتا ہے کہ وہ مادی دنیا کے سرور و الم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس مادی دنیا کی خوشیاں اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ دنیا کے غم و الم یا اذیتِ جسمانی اس کے لئے اضطرار کا باعث نہیں ہوتے۔ اس کے سرور وجدان پر ان میں سے کوئی امر بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔ اب وہ اس آیت کا مفہوم سمجھتا ہے: "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی یاد سے دل مطمئن ہو جاتے ہیں)۔

اطمینان ہو جانے کے بعد بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ عزیز و اقارب میں سرور و الم کے موقع پر اگر دوسروں کی طرح خوشی و غم کا اظہار نہ کرے تو لوگ اس سے متنفر ہو جائیں گے ممکن ہے بعض اس سے مقاطعہ بھی کر دیں۔ یہ سمجھ کر کہ ہماری خوشی سے یہ جلتا ہے اور ہماری مصیبت پر خوش ہوتا ہے تب ہی تو اس پر اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسی زندگی معاشرے میں تو گزار نہیں سکتا اور ترکِ دنیا کی سخت ممانعت ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" (اسلام میں ترکِ دنیا نہیں ہے)۔ لہٰذا سالک کے لئے مکر لازم ہو جاتا ہے کہ ہر موقع پر دوسروں ہی کی طرح جذبات و کیفیات کا اظہار کرتا رہے تاکہ لوگ اس سے نامانوس نہ ہوں اور اس کو ان کی خدمت کا موقع ملتا

رہے یہی تو دین کا مقصد ہے جیسا کہ سرورِ کائنات کا فرمان ہے "اَلْاِسْلَامُ هُوَ الطَّاعَةُ لِاَمْرِ اللّٰهِ وَالشَّفَقَةُ عَلٰى خَلْقِ اللّٰهِ" (اسلام کیا ہے وہ احکامِ الٰہی کی اطاعت کرنا اور اس کی مخلوق پر شفقت کرنا ہے)۔

مذکورہ بالا طریقہ سے جو علمِ حقیقی سالک کے شعور میں آتا ہے اس کو "القا" کہتے ہیں جس کا بوجھ اُٹھانا دشوار ہوتا ہے اس سے ہزار گنا بار "الہام" کا ہوتا ہے جو انبیاء پر ہوتا ہے اور وحی حقیقی و نورانی کے وزن کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کو تو حضرت موسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام سے ہی پوچھیں۔ پس جس شخص کو القا کے وزن کا تجربہ ہو جاتے۔ وہی رب العزت کے اس کلامِ اقدس پر ایمان لا سکتا ہے۔ "لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ" (۲۱) الحشر۔ (اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو خوفِ خدا سے لرزتا اور پھٹتا دیکھتے)۔ اور بغیر اس کے کہ کسی پر یہ کیفیت وارد ہوئی ہو کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس فرمانِ ایزدی پر ایمان لا سکے؟ اب اس بشر کی شان اور قوت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو اس وحی قرآنی کا بوجھ اُٹھاتا ہے جس سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں" قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" (اے حبیب کہہ دو میں تمہاری مثل ایک بشر ہوں فرق صرف اتنا ہے کہ میں ایسا بشر ہوں کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود واحد ہے)۔ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ الف الف مرّة فِي كُلِّ يَوْمٍ اِلٰى يَوْمِ الْاٰخِرِ۔

سالکین پر لزوم مکر کے دو سبب تو بیان ہو چکے۔ ایک یہ کہ اظہارِ حقیقت باعثِ انقطاعِ رحمت ہوتا ہے اور دُوسرا یہ کہ اگر مواقع سرور والم پر دوسروں کی مثل ہی اظہارِ جذبات نہ کرے تو لوگ متنفر ہو جائیں گے جو باعثِ فساد بھی ہو سکتا ہے۔ تیسرا امر یہ ہے کہ عوام حقائق کا بار نہیں اُٹھا سکتے۔ جنابِ رب العزت تو فرماتا ہے "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (۲۸۶) البقرۃ (اللہ کسی نفس کو اتنی تکلیف نہیں دیتا جس کی اس میں وسعت نہ ہو) یعنی کسی نفس پر اس کی وسعت و اہلیت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا۔ لہٰذا بندگانِ خدا پر بھی لازم ہے کہ کسی شخص کے سامنے ایسی حقیقت بیان نہ کریں جس کا بار اُٹھانے کی اس میں اہلیت نہ ہو۔ اب سالکین راہِ مولا کی مشکلات پر غور کریں اگر ان کی زبان پر کوئی ایسی بات آجائے جو حق کے رازوں میں سے ان پر منکشف ہوئی

ہے تو سُننے والا اس کا بار نہیں اُٹھا سکتا۔ کیونکہ ہر سامع پر اس کی اہلیت نفس کے مُطابق اثر ہوتا ہے۔ ایک صاف دل صاحب خلوص تو ممکن ہے ہوش کھو بیٹھے، اس پر تو حق ایک دم آشکار ہو جائے گا۔ حضرت جگر مراد آبادی کا شعر ہے ؎

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

چنانچہ ایک اپنا مشاہدہ پیش کرتا ہوں:۔

ایک کاریگر جو رُڑکی کا متوطن تھا پشاور میں مُلازم تھا۔ اس نے امام غزالی کی احیاء العلوم کے ترجمہ کا مطالعہ کیا تو ریاضت کرنے لگا۔ ملازمت ترک کر دی۔ اہل و عیال سے غافل ہو گیا۔ اکثر طالبانِ حق کے پاس جاتا اور مسائل معرفت پر گفتگو کرتا۔ اس غریب کو یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ اس راہ میں خاموشی لازم ہے۔ ایک روز ایک واقفِ اسرار کے پاس گیا۔ اتفاق سے یہ بندہ حقیر بھی وہیں حاضر تھا۔ وہ شخص صاحبِ موصوف سے گفتگو کر رہا تھا۔ چونکہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اب کافی واقفیت حاصل کر چکا ہوں۔ ایک بات پر بحث کرنے لگا اور اپنی بات پر اڑ گیا۔ وہ ٹالتے رہے مگر یہ مصر رہا۔ صاحب موصوف کے سامنے کلام اللہ کھلا ہوا رکھا تھا۔ انہوں نے ایک آیت کی طرف اُس مستری کی توجہ دلائی کہ لو اس کو پڑھ لو۔ مستری نے ایک چیخ ماری اور ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اُٹھ کر بھاگا، سر دروازے سے ٹکرایا۔ سخت چوٹ آئی خون جاری ہو گیا اور بیہوش ہو کر دروازے کے سامنے ہی گر گیا۔ اس کے اعزہ بھی سامنے والے مکان کی بیٹھک میں موجود تھے۔ سب دوڑے آئے۔ بندہ بھی باہر آ گیا۔ سب نے مل کر اُٹھایا اور اسکے گھر پہنچا دیا۔

واقفانِ اسرار کا تو ذکر ہی کیا ہے، ایک مولوی صاحب اس بندہ حقیر سے ایک امر پر تکرار کر رہے تھے۔ بالآخر ایک فقرہ میری زبان سے نکل گیا۔ قریب تھا کہ ان کو غش آ جائے۔ خیریت یہ ہوئی کہ آرام کرسی پر بیٹھے تھے کہ پیچھے کو گر گئے۔ اگر کہیں آرام کرسی نہ ہوتی تو معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔ اس پر میں نے اپنے اوپر نفرین کی اور مالک کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کرتا رہا۔ اسی لئے عوام الناس پر حقائق کا اظہار کرنا منع ہے۔

یہ تو ایسے اشخاص کا حال ہے جن میں کچھ صفائے قلب پیدا ہو گئی ہو۔ مگر عوام الناس

میں سے ایسے اشخاص پر جو بدطینت و بد باطن نہ ہوں اتنا اثر ضرور ہوتا ہے کہ وحشت گھیر لیتی ہے۔ کاروبار دُنیا کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور معلق ہو کر رہ جاتے ہیں کہ دُنیا کے رہے نہ دین کے۔ اور جو بدطینت، چالباز، حیلساز ہوتا ہے اس کے قلب پر اثر تو ضرور ہو گا اس لئے کہ حقیقت تو اپنے کو منوا لیتی ہے مگر اس کا نفس اس کو توجہ کرنے سے روکے گا۔ وہ تو کہے گا میاں یہ تو متقی اور پرہیز گار لوگوں کے لئے ہے۔ اس کا نفس اس کو بھلا دینے کی کوشش کرے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا جو رب العزت نے اپنے کلام اقدس میں بیان فرمادیا ہے:۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾
وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ الزخرف

(جو شخص رحمٰن کی نصیحت سے آنکھیں بند کرتا ہے ہم اس کے لئے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں پس وہی اس کا ساتھی رہے گا۔ وہ شیاطین، حق کی راہ سے روکتے رہیں گے اور لوگ یہ گمان کرتے رہیں گے کہ ہم ہدایت یافتہ ہیں)۔

جب اس کو ایسے شیاطین مل جاتے ہیں جو "يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ"، کے مصداق ہوں تو اس کو راہِ حق سے باز رکھتے ہیں، اس کو بہکاتے رہتے ہیں۔ جو کچھ اس کے دل پر اثر ہوتا ہے اس کو مٹاتے رہتے ہیں ارے یار کس خیال میں پڑے ہو بھلا ہم کوئی مولانا ہیں۔ کیا ہم متقی ہو سکتے ہیں۔ ہم تو سیدھے سادے مسلمان ہیں۔ کلمہ پڑھ لیا، خدا و رسول کو مان لیا بس کافی ہے۔ بے شک ہم گنہگار ہیں لیکن اللہ پاک تو غفور رحیم ہے، وہ تو کلمہ پڑھنے والوں کے گناہ بخش دے گا۔ بھلا اُس نے جب ہمیں دُنیا میں بھیجا ہے تو یہاں کا عیش ہم کیسے چھوڑ دیں۔ چار دن کی زندگی ہے اس میں دُنیا کے مزے لُوٹ لو۔ ہمارے باپ دادا سب یہی کرتے آتے ہیں، کیا توبہ توبہ وہ مسلمان نہ تھے، کیا وہ سب کے سب گمراہ تھے۔ اے یار چھوڑ و ان مُلّانوں والی باتوں کو، بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست (اے بابر دُنیا کے عیش اُڑا لے اس لئے کہ زندگی دوبارہ نہ ہو گی)، اللہ کا شکر ہے ہم مسلمان ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں۔ یقین رکھیئے کہ اللہ پاک بڑا غفور رحیم ہے۔ بس اور کیا چاہیئے؟"

اب اس تمام کارروائی کا نتیجہ بھی دیکھ لیں جسے آیاتِ مذکورہ بالا کے ساتھ اگلی ہی آیت میں ظاہر فرمادیا ہے:۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾ الزخرف

(یہاں تک کہ جب ہمارے پاس آئے گا تو (اس شیطان سے) کہے گا۔ کاش میرے تیرے درمیان مشرق و مغرب کی دوری ہوتی تو بہت ہی برا ساتھی ہے۔ آج تم کو ہرگز فائدہ نہ دے گا کچھ بھی جبکہ تم ظلم کر چکے ہو۔ اب تو تم عذاب میں ایک دوسرے کے شریک رہوگے)۔

جو بالکل خبیث النفس ہوتا ہے اس پر اظہارِ حقیقت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ حق کا اور حق گو کا دشمن ہوجاتا ہے جس کا ربّ العزت نے اپنے کلامِ اقدس میں بیان کردیا ہے:۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ ﴿۴۵﴾ الانعام

(پس ان کو جو نصیحت کی گئی تھی جب اس کو ترک کردیا (بھلادیا) تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے جو ان کو دی گئیں خوب خوش ہوئے تو ہم نے ان کو اچانک عذاب میں پکڑ لیا۔ پس وہ مایوس ہوکر رہ گئے۔ پس ظالموں کی نسل قطع کردی گئی)۔

اس طرح جب حق واضح ہوجاتا ہے تو اس پر حجّت تمام ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ حق سے روگردانی کرتا ہے اور حق گو کا بھی دشمن ہوجاتا ہے تو اس پر دنیا کی نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ خوب رشوتیں لیتا ہے، حرام مال بٹورتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ غریبوں کا خون چوستا ہے، زمین پر فساد پھیلاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب مالک کی ڈھیل کا وقت ختم ہوجاتا ہے اور اس کے گناہ حد سے بڑھ جاتے ہیں تو دفعتاً عذابِ شدید میں گرفتار ہوکر تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔ دنیا بھی تباہ ہوتی ہے اور ہلاکت و عذابِ دائمی اس کو نصیب ہوتی ہے۔

پس اگر اظہارِ حقیقت سے کسی نااہل کو بھی ایسا نقصان پہنچ جائے تو ظاہر کرنے والا بھی سزا میں گرفتار ہوگا اور اس سے ذکر و فکر کی توفیق سلب ہو جائے گی۔

نیک نفس اور صاف دل اشخاص میں سے جو حق کا متلاشی ہو اور کسی سالک سے ایسا سوال کرے جو حقائق سے متعلق ہو تو سالک اتنا کر سکتا ہے کہ اشارتاً اصل مفہوم کی طرف توجہ دلائے اور یہ ہدایت کر دے کہ غور و فکر کرو۔ اور مالک سے دُعا کرو "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" (ربّا مجھے اپنا سیدھا راستہ دکھلا دے)۔ غور و فکر و طلبِ صادق سے جب سائل حقیقت کے قریب پہنچ جائے اس وقت اس پر حق کا اظہار کیا جا سکتا ہے اور وہ اس کا بار اُٹھا سکے گا جو زیادتی ایمان کا باعث ہوگا جیسا کہ ربّ العزّت کا ارشاد ہے:۔

وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (۲) الانفال۔ (جب ہماری آیات ان پر تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کا ایمان زیادہ کرتی ہیں)۔ چونکہ صاف باطن طالبانِ حق و صداقت بہت کم ہوتے ہیں۔ "قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ" (بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہیں)۔ "قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ" (بہت تھوڑے شکر کرتے ہیں) اور اکثریت غافلوں کی ہے جن کو دین کی طرف توجہ نہیں ہوتی، جیسا کہ کلامِ پاک میں جگہ جگہ ارشاد ہے:۔

"وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ" (لیکن اکثریت لوگوں کی ایمان نہیں لاتی)۔ "وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ" (لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو علم نہیں رکھتے "وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ" (لیکن کثرت ان لوگوں کی ہے جو شکر نہیں کرتے)۔ لہٰذا حقائق کا اظہار اکثریت کے لئے گمراہی کا باعث ہوتا ہے جس سے مستحق عذاب ہو جاتے ہیں اسی لئے حقائق کا اظہار ممنوع ہے جب تک دین کی حفاظت کے لئے ضرورت پیش نہ آئے۔

جو سالکین مالک کی راہ پر جہاد کرتے ہوئے صراط پر چلتے رہتے ہیں ان کو معرفتِ باری حاصل ہوتی ہے، عالمِ نور کے مشاہدات ہو جاتے ہیں۔ ہم تو اپنے نفس کی ان کیفیات کو بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جو ہمارے نفس پر وارد ہوتی رہتی ہیں تو ان کیفیات کے متعلق جن کا ہمیں کبھی احساس ہی نہ ہوا، نہ دیکھا جانا یا سمجھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ ہمارے لئے تو ان کا تصور کرنا بھی محال ہے پھر ان صاحبانِ معرفت کی کیفیاتِ نفسی و روحانی قوتوں کا ہم کیا

تصور کر سکتے ہیں جن کو شعور کامل اور علم حقیقی حاصل ہو گیا ہو، جن کو معیت اللہ مل گئی ہو۔ جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے: "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾ البقرۃ (اللہ متقین کے ساتھ ہے، نیکوکاروں کے ساتھ ہے، صابروں کے ساتھ ہے)۔ پس جن خوش نصیبوں کو ایمان کامل اور معیت اللہ حاصل ہو جائے وہ ارحم الراحمین کے فضل و کرم سے غفلت ولاشعوری کی تاریکی سے نکل جائیں اور خالق النور اپنے نور کی شعاعوں سے ان کے سینوں کو منور فرما دے۔ ان کے قلوب اس کا عرش بن جائیں (قلب المؤمن عرش اللہ) ان کی روحانی طاقتوں اور کیفیات نفسی کو ہم کیا سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے لئے تو وعدہ الٰہی ہے: "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ" (مجھ سے طلب کرو میں قبول کروں گا)۔ وہ تو مالک سے جو چاہیں فوراً ہو جائے گا۔ رب کا وعدہ سچا ہے، وہ تو وعدہ خلافی کرتا ہی نہیں: "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ" ﴿۹﴾ آل عمران (اللہ تو وعدہ خلافی نہیں کرتا)۔

یہ صاحبان معرفت اولیاء اللہ، حاملان نور ایمان حجاب ہی میں رہتے ہیں اور بالکل عام لوگوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان کو قرب خداوندی حاصل ہے۔ اس طرح پس پردہ خدمت خلق میں منہمک اور طالبین کو فیض پہنچاتے میں مصروف رہتے ہیں سوائے چند رازداروں کے کوئی ان کے حال سے واقف نہیں ہوتا۔ اگر کسی وقت ان کا راز افشا ہو جائے تو ان کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ پھر تو ایسی جگہ جا کر بیٹھ جاتے ہیں جہاں عوام الناس کا پہنچنا دشوار ہو۔ ان کو دنیا سے کوئی طلب نہیں ہوتی۔ جب دنیا پرستوں کو ان کا پتہ چل جائے اور وہ گوشہ نشینی اختیار نہ کریں تو اہل غرض ان کو کسی وقت بھی چین نہ لینے دیں، ہر وقت ہجوم کئے رہیں جس سے کتنے ہی نقصانات ہو سکتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ طالبان دنیا ان کی عبادت ذکر اللہ توجہ الی اللہ میں حارج ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ یہ نعمات کسبی نہیں ہوتیں۔ اوراد و وظائف، اعمال علوی و سفلی وغیرہ سے جو شخص نفس کے قوائے باطنی میں ترقی کر کے کچھ قوتیں حاصل کرتا ہے وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ان کو استعمال بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اس میں آزاد ہوتا ہے مگر عارف کو جو کچھ ملتا ہے وہ تو واہب العطایا کی بخشش ہوتی ہے۔ لہٰذا بدون اذن اللہ کسی کے لئے دعا بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو بغیر رضائے الٰہی لب بھی

نہیں ہلا سکتا۔ اگر کسی سے ایسا فعل صادر ہو جائے تو وہ نعمات جو اللہ تعالیٰ کے جود و کرم سے عطا ہوئی ہیں سلب ہو سکتی ہیں۔ تیسرا امر یہ ہے کہ جب دو فریقین میں باہم تنازع ہو تو ایک حق پر اور دوسرا ناحق پر ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ حصہ دعویٰ مدعی صحیح ہو اور کچھ غلط۔ ایسی حالت میں دونوں فریق طالب نصرت ہوں تو سوائے تضیع اوقات کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چوتھے ایک نقصان جو لوگوں کے لئے ہوگا وہ یہ کہ خود مالک کی طرف توجہ کرنے اور اس سے لو لگانے سے محروم رہیں گے جو ان کی گمراہی کا باعث ہوگا۔ ان حضرات کو تو صرف انہیں کی طرف توجہ کرنا ضروری ہوتا ہے جو نورِ ایمان کے طالب، حصولِ تقربِ الی اللہ کے شائق ہوں۔ لہٰذا اصحابِ معرفت پر بدرجہ اولیٰ مکر لازم ہے کہ وہ رب کی عطا کردہ قوتوں کو ظاہر نہ کریں۔

کلامِ الٰہی کے راز جو حسبِ فرمانِ ایزدی "فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" (۴۹) العنکبوت اب تک اولیاء اللہ صاحبانِ معرفت کے سینوں میں امانت تھے اور آج سے پندرہ بیس برس قبل ان کا اظہار عوام الناس کے لئے مضر تھا۔ ان میں سے بعض علم طبیعیات (فزکس) کی جدید تحقیقات سے دنیا پر آشکار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اب ان کا اخفا باعثِ گمراہی ہوگا۔ سائنس کی جدید تحقیقات سے نفسِ انسانی کے قوائے باطنی کے جو کمالات ظاہر ہوئے ہیں ان کو اگر مسلمان نہ سمجھیں گے تو مہذب اقوام کی نظر میں ذلیل ہو جائیں گے۔ تعلیم یافتہ طبقہ تو دین سے ہی برگشتہ ہو جائے گا۔ اس لئے ضروری ہو گیا کہ کم از کم دین کے وہ راز جن سے مادی دنیا واقف ہو گئی ہے اب ظاہر کر دیئے جائیں۔

چھٹی ساتویں صدی ہجری تک کامل الایمان عارفین اولیاء اللہ کی بہتات تھی جس کے بعد زوال شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے۔ گزشتہ چار سو سال کے اندر شاذ ہی ہوئے اور وہ بھی حجاب ہی میں رہے۔ البتہ ایسے سالک ہوتے رہے جو ابتدائی منزلِ معرفت تک پہنچتے رہے۔ ان کو عالمِ نور کا ادراک ہو جاتا تھا اور وہ نظری طور پر رازوں سے واقف ہو جاتے تھے۔ ادھر مشرق میں روحانیت کا زوال ہوا کہ مغرب میں سائنس کی ترقی ہونے لگی۔ وہ مفکرین جو خلقتِ کائنات میں غور و خوض کر کے فطرت کے راز تلاش کرتے تھے اپنی

ریاضت کا صلہ پاتے اور قدرت کے راز ان پر منکشف ہوتے رہے تاکہ وہ مادی علوم کے ذریعے رب کی معرفت تک پہنچ جائیں۔ اب مغربی مفکرین معرفت باری کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اگر اسی طرح ترقی کرتے رہے تو ان کو معرفت حاصل ہو جائے گی اور ہم اپنے قیاسی و روایتی مذہب کا ڈھول گلے میں ڈالے بجاتے پھریں گے اور آخر دنیا کی نظر میں بالکل ہی ذلیل ہو جائیں گے۔

مکرالانبیاء

سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ نبی کون ہوتا ہے۔ اگر علما متکلمین سے یہ سوال کیا جائے تو وہ کہیں گے کہ جناب باری تعالیٰ عز اسمہ فرماتا ہے "وَكَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ" (۱۲) انعام (اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اقدس پر رحمت کو لازم قرار دے لیا ہے) لہٰذا ضروری ہے کہ اپنی مخلوق پر رحمت نازل فرماتے۔ دنیا کے گمراہ انسانوں پر وہ یہ کرم فرماتا ہے کہ اپنے پاک و پاکیزہ نفس بندوں کو خلق کرتا رہتا ہے جو نیکیوں کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ ہر شر و بدی سے پاک ہوتے ہیں۔ ان ہی کو منصب نبوت عطا فرما کر ہدایت خلق کے لئے مامور فرماتا ہے۔ ان پر ہی بذریعہ الہام یا وحی ہدایت خلق کے لئے وقتاً فوقتاً فرشتوں کے ذریعے احکام نازل فرماتا رہتا ہے۔

اوصاف انبیاء کے متعلق علمائے اسلام میں بہت اختلافات ہیں۔ جن کے بیان کرنے کے لئے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں تو قارئین کی آگاہی کے لئے مجملاً محض چند اختلافات کا ذکر کرتا ہوں :-

کہتے ہیں نبی معصوم ہوتا ہے یعنی اس سے گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ بعض کا قول ہے کہ پیدائش سے آخر عمر تک اس سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوتی۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ اس کی فطرت صحیحہ کی وجہ سے ہے۔ کچھ کہتے ہیں، اس میں گناہ اور خطا کی اہلیت تو ہوتی ہے مگر خود شر سے اجتناب کرتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرتا ہے اور برائی سے محفوظ رکھتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ بعثت سے پہلے گناہ صادر ہو سکتا ہے بعد کو نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انبیاء سے خطائیں ہوتی ہیں مگر ان کا تعلق شریعت ظاہری سے نہیں ہوتا۔ بعض کہتے ہیں کہ انبیاء کی خطا ہماری جیسی نہیں ہوتی بلکہ ایسا فعل، جس کا ترک کرنا بہتر ہوتا۔ اگر ان سے

صادر ہو جاتا ہے تو چونکہ جن کا مرتبہ سوا ہے ان کو سوا مشکل ہے اس لئے وہ بھی ان کے لئے مثل خطا کے ہی ہو جاتا ہے، اس کو ترکِ اولیٰ کہنا چاہیئے۔

بعض کہتے ہیں کہ امورِ دین میں ان سے غلطی سرزد نہیں ہوتی البتہ امورِ دنیا میں ہو سکتی ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ سہو و نسیان ان کو عارض نہیں ہوتا بعض کا قول ہے کہ کسی معاملہ میں بھی ان سے بھول چوک نہیں ہوتی مگر بعض کا قول ہے کہ تبلیغِ احکام اور امورِ دین میں سہو و نسیان نہیں ہوتا مگر اور معاملات میں ہو سکتا ہے۔

بعض کا قول ہے کہ نبی تمام کمالات میں افرادِ اُمّت سے افضل ہوتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ صرف ان ہی کمالات سے متّصف ہوتا ہے جن کی من حیث النبوۃ ضرورت ہوتی ہے یعنی تبلیغ و ہدایات کے لئے جو کمالات ضروری ہیں بس ان ہی سے متّصف ہوتا ہے۔

بعض لکھتے ہیں کہ نبی کی خلقت اس طینت سے نہیں ہوتی جس سے عام انسانوں کی ہوتی ہے بلکہ وہ نوری مخلوق ہیں ہم خاکی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ہماری مثل بشر ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پیغام پہنچانے کا ذریعہ اختیار کیا ہے یعنی نبی کی حیثیت ایک پوسٹ مین جیسی ہے اس سے زیادہ نہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ نبی کو تمام علم حاصل ہوتا ہے، اس کو علمِ غیب بھی ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ نبی کو غیب کا علم نہیں ہوتا بس اتنا ہی علم ہوتا ہے جتنا وحی و الہام سے اس پر نازل ہوتا ہے۔ غرضکہ ان اختلافات کی کوئی حد نہیں کہاں تک لکھا جائے۔

نبی بلحاظِ اصولِ فطرت

(۱) قانونِ توارث (LAW OF INHERITANCE)

یہ قریب قریب ہر شخص اپنے مشاہدے سے جانتا ہے کہ ماں باپ، آباؤ اجداد کی کیفیات جسمانی اور نفسانی نسلاً بعد نسلاً اولاد میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ جس خاندان کا مورث کسی مرضِ مزمن میں مبتلا ہوتا ہے اس خاندان کے اکثر افراد اسی مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ باپ کے اعضا جسمانی میں بوقت انعقادِ نطفہ جو عضو بھی کمزور یا مبتلاءِ مرض ہو بچہ کا وہی عضو کمزور ہوتا ہے۔ جو کیفیتِ نفس اس وقت باپ

کی ہوتی ہے اولاد میں اس کی تصویر نظر آتی ہے۔

ایک انگریز نے قانون توارث (LAW OF INHERITANCE) پر عرصہ ہوا ایک کتاب لکھی تھی۔ اس نے دو سو سال قبل کے دو افراد کے حالات معلوم کئے۔ ایک نیک نفس کی اولاد میں کثرت شریف افراد کی تھی جن میں ڈاکٹر، پادری اور بعض معلم و پروفیسر ہوئے۔ بے ایمان و بد افعال شاذ تھے۔ دوسرے بد باطن کی اولاد میں شاذ ہی نیک پیدا ہوئے کثرت بد معاشوں، چوروں، رہزنوں کی تھی۔ اس سے اس نے ثابت کیا کہ کیفیاتِ نفسی اولاد میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔

اسی قانونِ فطرت کے ماتحت ایک صاحبِ معرفت، حاملِ نور، صاحبِ شعور کامل کی اولاد میں صاحبانِ شعور کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

(۲) غیر مرئی نوری شعاعوں کے اثرات:۔ آفتاب ماہتاب اس نظامِ شمسی کے سیاروں کی شعاعوں اور کاسمک شعاعوں کے اثرات اجسام و نفوس پر پڑتے ہیں۔ بعض وقت وہ نہایت مفید اور بعض اوقات مہلک ہوتے ہیں پس اگر انعقادِ نطفہ کے وقت اور ولادت کے وقت مبارک اثر پیدا کرنے والی شعاعیں حامل ہوں گی تو بچہ یقیناً صالح، نیک اور مبارک ہوگا۔

ان ہر دو قوانین کے تحت ایک صاحبِ شعورِ کامل، حاملِ نور کی اولاد میں ایسی اولاد کا ہونا ضروری ہے جن میں ایک نہ ایک صاحبِ شعورِ کامل ہو جس کے نفس پر غفلت کے حجاب نہ ہوں۔ اور ایسے افراد ہی ہدایتِ خلق کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہی انبیاء کہلاتے ہیں۔ اسی توارث کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے " وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا " (سورہ حدید کا آخری رکوع) صاحب کتاب انبیاء اور دوسرے تمام انبیاء، بعد جناب ابراہیمؑ، کا جناب ابراہیمؑ ہی کی اولاد میں ہونا جیسا کہ آیہ مذکورہ میں بیان ہوا ان قوانینِ فطرت کے اثبات پر ایک قوی دلیل ہے۔

مثال کے لئے حضرت عیسیٰؑ کا واقعہ موجود ہے۔ جب حضرت مریم کے پاس لوگ آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں تو وہ بچہ کی طرف اشارہ فرماتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ہم اس بچے سے

کیسے بات کریں جو گہوارے میں ہے تو حضرت عیسیٰ بولتے ہیں: " اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ " (میں اللہ کا بندہ ہوں) اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝۳۰ مریم (مجھے اس نے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے) تا آخر۔

حضور سرورِ دو عالم کو جب دائی حلیمہ نے اپنی اس چھاتی سے جو خشک نہ تھی دودھ پلانا چاہا تو حضرتؐ خشک چھاتی کی طرف بڑھے۔ جب کئی مرتبہ باوجود اصرار ایسا ہی ہوا تو دائی حلیمہ نے خشک چھاتی ہی دے دی اور حضرتؐ کے منہ لگاتے ہی اس خشک چھاتی سے دودھ جاری ہو گیا جس میں کبھی دودھ آیا ہی نہ تھا۔

باب سوم میں بہ تفصیل ثابت کیا گیا ہے کہ انسان سے جو برائی بھی سرزد ہوتی ہے وہ اس کی غفلت کے سبب سے ہوتی ہے۔ پس اگر غفلت نہ ہو تو اللہ کی طرف سے تو ایسی پاک و پاکیزہ فطرت انسان میں ڈالی گئی ہے کہ اس سے کوئی فعل مکروہ بھی صادر نہیں ہو سکتا۔ انبیاء جو ذی شعور پیدا ہوتے ہیں ان سے کوئی فعلِ مکروہ کیسے صادر ہو سکتا ہے؟ نبی کو تو اللہ تعالیٰ مخلوق میں سے خود چنتا ہے اور فرماتا ہے:۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۴۴ البقرۃ

(کیا تم دوسروں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے نفسوں کو بھلاتے ہوئے ہو۔ حالانکہ تم کتاب (فطرت) کا مطالعہ کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے)۔

تو پھر وہ خود ہی ایسے شخص کو ہدایت کے لئے کیسے چنے گا جس سے غلطی ہونے کا امکان ہو؟

(۳) ارشادِ باری ہے: "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ العلق (اس (اللہ) نے سکھا دیا انسان کو تمام وہ جو کچھ بھی نہ جانتا تھا)۔ سورہ علق یعنی اقرأ اور سورہ شمس میں ارشاد ہے:۔ " وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ "

(قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اس کو پورا کیا۔ الہام کر دی ہیں اس کے اوپر ساری برائیاں اور بھلائیاں)۔ نیز سورہ رحمٰن میں ہے:۔

اَلرَّحۡمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۝۳ الرحمٰن

(رحمٰن نے سکھا دیا قرآن۔ پھر پیدا کیا انسان کو)۔ ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ نفسِ انسان پر پیدائش سے قبل ہی خالق نے تمام علم الہام کر دیا ہے مگر چونکہ اس پر غفلت و لاشعوری کے حجاب ہوتے ہیں اس میں سے بہت قلیل جزو، گویا بحرِ اعظموں میں سے ایک قطرہ ہی شعور میں آتا ہے۔ باقی تمام علم کا خزانہ لاشعوری کے دبیز حجابوں میں دفن رہتا ہے لیکن نبی تو صاحبِ شعور پیدا ہوتا ہے اس کے نفس پر غفلت نہیں ہوتی لہٰذا تمام علم اس کے شعور میں ہوتا ہے۔ البتہ ہر نبی کی منزل کے مطابق شعور کی بھی منازل ہوتی ہیں۔

اب لائقِ غور اَمر یہ ہے کہ انسان سے غلطیاں تو جہالت و نادانی کے سبب سے ہوتی ہیں، قدرت کے الہام کردہ علم کا جس کو شعور حاصل ہو اس سے غلطی کیسے ہو سکتی ہے؟ نبوّت کی حقیقی دلیل علم ہی ہے، وہ اپنے تمام اہلِ زمانہ میں اعلم ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ نبی کے اہلِ زمانہ میں سے کوئی شخص کسی علم میں نبی سے زیادہ عالم ہو۔ اگر ایسا ہو تو اعلم کو نبی پر اس علم میں فضیلت حاصل ہوگی اور یہ ممکن نہیں کہ زمانۂ نبی میں کوئی شخص اس سے کسی اَمر میں افضل ہو۔ نبی تو ہر صفت میں کامل پیدا ہوتا ہے۔ باب چہارم میں جو صفات حاملانِ نور کی بیان ہوئی ہیں وہ تمام اس میں ہونا لازم ہیں۔

انبیاء اور عوام کا فرق

انبیاء و عوام کے درمیان کیا فرق ہے اگر اس کو سمجھنا چاہیں تو باپ اور نوزائیدہ بچے کا فرق پہچانیں۔ اسلام دینِ فطرت ہے اس کا ہر مسئلہ فطرت ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نفس کی فطرت کا مطالعہ کریں۔ ابواب سابق میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے کسی بات کو سمجھنے کا انحصار ان نقوش کے خزانوں پر ہے جو حواس خمسۂ ظاہری کے ذریعے اس کے نفس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بچّہ جس وقت پیدا ہوتا ہے تو جو کچھ وہ دیکھتا ہے ہر پلک جھپکنے پر اس کی تصویر اس کے نفس پر بنتی ہے۔ جو کچھ سُنتا ہے ان آوازوں کے نقوش بنتے ہیں۔ جن اشیاء سے اس کی جلد مس ہوتی ہے۔ ان کے لمس کی کیفیات نفس پر

نقش ہوتی رہتی ہے۔ چکھنے سے ذائقہ کی اور سونگھنے سے خوشبو و بدبو کے احساس کی کیفیات کے خزانے میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔جس بصر کی ایک تمثیل یاد آگئی جو پیش خدمت ہے:۔
۱۹۴۲ء میں بھارت کے صوبہ اتر پردیش (یوپی) میں ضلع جونپور کے ایک سید صاحب نے یہ واقعہ سُنایا:۔

جونپور کے ایک موضع میں ایک صاحب کے یہاں بچّہ کی پیدائش ہوئی۔بڑی خوشیاں منائی گئیں۔چھٹے دن عقیقہ تھا۔اس تقریب پر شہر اور دیہات سے رشتے دار مدعو کئے گئے۔ عورتوں سے گھر بھرا تھا۔مکان کی دیواریں اور چھت کچّی تھی۔زچّہ کے سرہانے دیوار میں ایک کھونٹی گڑی ہوئی تھی جس پر اس نے اپنا سونے کا ہار لٹکا دیا تھا۔صبح کو زچّہ کو نہلایا گیا۔ اَب زیور پہناتے وقت ہار اُتارنے کو کھونٹی کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھا۔ہر طرف تلاش کیا، ہر جگہ ڈھونڈا مگر ہار کا پتہ نہ چلا۔زچہ بے چاری روتی رہی۔مہمان عورتیں سب حیران اور شرمندہ تھیں۔ہر ایک کو یہ خیال کہ مہمانوں ہی پر شُبہ ہوگا۔آخر کسی نے تو ہار چرایا ہی ہے۔ جنّات یا فرشتے تو لے نہیں گئے۔گھر والوں کے لئے یہ مشکل کہ زبان نہیں کھول سکتے۔تمام شریف و ذی عزّت عورتیں تھیں، کہیں تو کیا کہیں۔غرضکہ تقریب ختم ہوئی۔مہمان رُخصت ہوئے اور بچّے کے ماں باپ کے دل پر ہار کا زخم چھوڑ گئے۔رفتہ رفتہ بالآخر سب اس ہار کو بھول گئے۔ یہاں تک کہ وہ بچّہ ۹ برس کا ہو گیا۔ایک روز وہ ماں کے سامنے کھڑا تھا کہ ماں کو ہار یاد آگیا۔ کہنے لگی افسوس مجھے سونے کے ہار کے چوری جانے کا تو اتنا غم نہیں جتنا اس کا غم ہے کہ وہ میری ماں کی نشانی تھی۔تو کم بخت جب پیدا ہوا تو تیری چھٹی میں میری اماں جان کی وہ نشانی جو مجھے بہت پیاری تھی غائب ہو گئی۔لڑکا پوچھنے لگا اماں کیا ہوا تھا۔ماں نے کہا تیری چھٹی کی رات میرا سونے کا ہار سرہانے کھونٹی پر لٹکا ہوا تھا۔رات کے رات غائب ہو گیا۔خدا معلوم جن لے گئے یا فرشتے، اس لئے کہ گھر میں تو سب شریف اور اعلیٰ خاندانوں کی عورتیں تھیں جن پر چوری کا شُبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور کوئی گھر میں آیا بھی نہیں تھا۔یہ سُن کر لڑکا سوچ میں پڑ گیا۔تھوڑی دیر میں ایک دم چونکا اور کہنے لگا امّاں تمہارا ہار چوہے کے اس بل میں ہے۔ماں کہنے لگی، تجھے کیا خبر، تو کیا جانے؟ لڑکا کہنے لگا واہ، مَیں نے خود دیکھا ہے۔میں

تمہارے پاس لیٹا ہوا تھا اور تم سو رہی تھیں۔ میں چراغ کو تک رہا تھا کہ ایک کالی کالی چیز نظر آئی اور دیوار پر چڑھی، کھونٹی سے ہار اُتارا پھر دیوار سے نیچے اُترنے لگی اس کے ساتھ ساتھ میری نظر بھی پھرتی رہی اور وہ اس سوراخ میں چلی گئی۔ اس وقت تو میں کچھ جانتا ہی نہ تھا مگر اب تو جانتا ہوں وہ کالی چیز چوہا تھا۔

یہ پتہ کی بات سُن کر ماں نے کہا جا ذرا اپنے ابا کو بُلا لا۔ وہ گھر میں آئے تو لڑکے کا بیان پھر لیا گیا۔ کھدائی شروع کر دی گئی۔ چند فٹ گہرا کھودنے پر چوہے کا قلعہ برآمد ہوا۔ تقریباً دو فٹ لانبا، ایک یا سوا فٹ گہرا اتنا ہی چوڑا ایک غار سا تھا جس کے بیچ میں چند انچ اونچا چبوترا بنا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف کوڑیاں اور سیپیاں بچھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں سونے کے ہار کا فرش تھا۔ گویا یہ چوہے کی سلطنت کا تخت تھا جس پر بیٹھ کر وہ گرد و نواح کی فضا پر حکومت کرتا تھا۔ غرضکہ ہار اُٹھا لیا گیا۔ خوب خوشیاں منائی گئیں۔ یہ حیرت انگیز واقعہ جب مشہور ہوا تو شہر اور گرد و نواح کے دیہات سے لوگ اس لڑکے کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ ہر شخص متعجب تھا۔ عرصہ تک ان آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔

المختصر ایک باپ اور اس کے شیر خوار بچے کے درمیان یہی فرق ہوتا ہے کہ باپ کو اس عالم مادّی کا کافی علم و شعور ہوتا ہے اور بچے کو بہت کم۔ اب انبیاء اور عوام کا فرق سمجھیے۔ نبی تو صاحبِ شعور پیدا ہوتا ہے اس کو تو عالم غیب یعنی غیر مرئی عالم کا شعور حاصل ہوتا ہے اور عالم نور مادّی عالم کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لہٰذا نبی کو ہر شئے کا شعورِ کامل ہوتا ہے۔ مگر اس عالم مادّی کے پچاس ساٹھ سالہ سائنس دان یا فلاسفر کو عالم غیب کا اتنا بھی ادراک و شعور نہیں ہوتا جتنا پانچ چھ دن کے بچے کو اس مادی دُنیا کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کی پیدائش کے وقت ہی اس کے سامنے علماء و عقلاءِ دہر کی اتنی بھی حیثیت نہیں ہوتی جتنی باپ کے مقابل اس کے نوزائیدہ بچے کی۔ اسی وجہ سے انبیاء کو امّت کا باپ کہا جاتا ہے اور ان کی ازواج اُمّت کی مائیں کہلاتی ہیں۔

نبی تو نورِ حبّ اللہ سے معمور خلق اللہ کا عاشق پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تمام زندگی ہدایتِ خلق کے لئے ہوتی ہے کہ ان انسان نما حیوانوں کو راہِ شعور کی طرف دعوت دے

اور حصولِ شعورِ غیب کی راہ پر چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ فساد فی الارض مٹانے کے لئے انسان دنیا میں فطرت کے مضرات سے محفوظ ہو سکیں، آخر میں عالمِ نور کی نعمات سے مستفیض ہوں اور عذاب و ہلاکتِ ابدی سے نجات پائیں۔

ہدایت کے بنیادی اصول فطری

فطرتِ نفس پر غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ ہدایتِ خلق کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ بچے کو جس وقت سے انانیت کا احساس ہوتا ہے خواہشِ بقا بھی شعور میں آتی ہے وہ راحت و آرام کو بقا کا ذریعہ اور اذیت و اضطرار کو باعثِ فنا جانتا ہے۔ لہٰذا انسان کی زندگی کے تمام کام آئندہ کے حصولِ آسائش اور ناکامی و احتیاج کے خوف کے باعث ہی ہوتے ہیں۔ پس ہدایت کی بنیاد بھی انہیں دو اصولوں پر قائم ہے کہ انسان کو آئندہ کے راحت و آرام کی خوشخبری سنائی جائے اور آئندہ کی ہلاکت و تباہی سے ڈرایا جائے۔ اسی لئے انبیاء و رسل بشیر و نذیر ہوتے ہیں۔ ان ہی دو فطری امورِ شوق اور خوف پر ان کی تبلیغ و ہدایت مبنی ہوتی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (۲۱۳) البقرة

(تمام لوگ ایک ہی گروہ تھے پس اللہ نے انبیاء بھیجے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے)۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (۴۸) الانعام

(اور نہیں بھیجے ہم نے رسول مگر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے)۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (۱۶۵) النساء

(رسول آئندہ کی خوشخبری دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے)

انبیاء کی ہدایت کے فطری طریقے

ان کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ فطرتِ نفسِ انسانی کا مطالعہ کیا جائے جس کے بغیر کسی شخص کے لئے ممکن ہی نہیں کہ اس کے متعلق کچھ سمجھ سکے۔ لوگوں کی ہدایت کے لئے

جو اُمور لابد ہیں وہ ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اِن کو ذہن میں محفوظ رکھیں ورنہ آئندہ کے بیانات کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا:۔

① اُنس : ہر شخص جانتا ہے کہ وہ اسی شخص سے مانوس ہوتا ہے جس کے اعمال و افعال جس کی خواہشات رُجحانات اس کی اپنی خواہشات و رُجحانات کے مماثل ہوں مثل مشہور ہے کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ بچہ، بچے کی، جوان جوان کی، بوڑھا بوڑھے کی رفاقت چاہتا ہے جس کے خواہشات و جذبات اس کے اپنے خواہشات و جذبات سے ملتے جلتے نہیں ہوتے اس سے مانوس نہیں ہوتا جس میں اپنے سے بہت زیادہ طاقت و قوت، وجاہت و ثروت دیکھتا ہے اس سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اگر کسی میں اپنے خیال سے مافوق الفطرت قوتیں دیکھتا ہے اس سے متوحش ہوتا ہے۔ بات اسی کی سُنتا ہے جس کو اپنے جیسا سمجھے۔ اسی لئے ہادیانِ دین انبیاء و رُسل کے لئے لازم ہے کہ بچپن سے آخر تک عوام الناس کی طرح معمولی انسان بن کر رہیں۔ اپنی قوائے باطنی کا اظہار نہ کریں اور اسی پر وہ مامور ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری ہے: " قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ " (کہہ دو کہ میں تمہاری مثل ہی ایک بشر ہوں)۔ حضور سرورِ کائنات کا ارشاد بھی ہے:

" اِنَّا مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ اُمِرْنَا اَنْ نُّكَلِّمَ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ "

(ہم گروہ انبیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کے اندازۂ عقل کے مطابق کلام کریں)۔ اسکی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ یہاں کہنے اور کلام کرنے سے صرف بات چیت ہی مراد نہیں بلکہ زندگی کا ہر قول و فعل ہر حرکت و سکون مراد ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایسے وقت جب گرمی شدت کی پڑ رہی ہو، لوگ کہہ رہے ہوں آج تو سخت گرمی ہے اور ایک شخص کہے کہ ہاں بھائی مجھے بھی تمہاری ہی طرح گرمی کی شدت محسوس ہو رہی ہے۔ پھر وہ لحاف اوڑھ کر آگ تاپنے بیٹھ جائے تو لوگ اس سے متنفر ہو جائیں گے یا مانوس؟ پس جب انبیاء کو حکم ہے کہ لوگوں سے کہو کہ ہم تمہاری مثل ہی بشر ہیں تو ان پر لازم ہے کہ ان ہی جیسے کیفیات، جذبات و خواہشات کا اظہار بھی کرتے رہیں ورنہ لوگ ان سے متنفر ہو جائیں گے اور ان کی بات بھی کوئی سُننا گوارا نہ کرے گا۔

انبیاء تو کامل پیدا ہوتے ہیں۔ جب وہ پیدا ہوتے ہی گفتگو کرسکتے ہیں تو کیا کھڑے ہو کر چل پھر نہیں سکتے ؟ اگر ایسا کریں اور اپنی باطنی قوتوں کا اظہار کرنے لگیں تو لوگ ان سے مانوس نہیں ہوسکتے بلکہ متوحش ہوں گے۔ پھر وہ ان کو ہدایت بھی نہ کرسکیں گے۔ لہٰذا لازم ہے کہ بچپن میں بچے بنے رہیں اور تمام عمر اسی رنگ میں رنگے رہیں جس میں عام آدمی ہوتے ہیں۔ گویا کہ ان میں عوام سے زیادہ کوئی باطنی قوت نہیں ہے اور وہ بھی ان ہی کی مثل ایک انسان ہیں۔ لہٰذا عام انسانوں کی طرح پاؤں پاؤں یا سواری پر چلیں، ان ہی کی طرح اٹھیں بیٹھیں، ان ہی کی طرح سوئیں، جاگیں، کھائیں پیئیں غرضکہ تمام زندگی عام لوگوں کی طرح گزاریں۔

مکر النّاس کے زیر عنوان یہ بیان ہو چکا ہے کہ بچے کو مانوس کرنے کے لئے بچہ بن کر اس کے ساتھ کھیلنا، اسی کے جیسے حرکات کرنا اس کو مانوس کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ کشتی لڑی گر گئے کہنے لگے، ارے ڈھا دیا شاباش پہلوان! وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہادیانِ دین کو بھی اُمّت کے لاشعوروں سے جو ان کے سامنے چند روزہ بچے سے بھی کم تر حیثیت میں ہیں ایسا ہی سلوک کرنا لازم ہے۔

بچہ اسی وقت مُتاثّر ہوتا ہے جب اس کے احساسات کی مرقع کشی کی جائے مثلاً گڑیا سو رہی ہے، وہ اُٹھی تو بہت خوش ہوئی، تمہاری گڑیا بھوکی ہے، چڑیا کے بچے ماں کو ڈھونڈ رہے ہیں، انھیں بھوک لگی تھی بیچارے رو رہے تھے، چڑیا آئی تو چیں چیں کر کے اس سے لپٹ گئے وغیرہ وغیرہ۔ پس انبیاء پر لازم ہے کہ عالمِ غیب کے متعلق اُمّت کے لاشعور بچوں کو ایسی ہی کہانیاں سُنائیں۔ بچے کو جب تمیز آتی ہے تو بچپن کی سُنی ہوئی تمام کہانیوں کی حقیقت بغیر اس کے کہ کوئی اسے بتائے سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح سے یہ لاشعور انسان بھی اگر شعور حاصل کرلے تو عالمِ غیب کے متعلق تمام روایات کی حقیقت بغیر کسی کے بتائے سمجھ جائے گا۔ مگر جو بدنصیب شعور حاصل ہی نہیں کرتے وہ ان ہی روایات کو حقیقت سمجھتے رہتے ہیں اور تمام عمر اسی ضلالت و گمراہی میں بسر کر دیتے ہیں۔

(۲) توجہ :۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دُنیا کا کوئی کام بغیر توجہ کے نہیں کیا جاسکتا۔ کام

کے لئے توجہ پہلی ضرورت ہے لہٰذا کسی کو کچھ سنانے کے لئے پہلا کام اس کی توجہ جذب کرنا ہے! اور جب کسی سے کوئی کام لینا چاہیں تو بھی جذب توجہ لازم ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس کا بہترین طریقہ کیا ہوسکتا ہے توجہ کا فرضی تجزیہ کرنا چاہیئے۔ ہم جب غور کرتے ہیں تو توجہ کی تین ہی اقسام ذہن میں آتی ہیں:۔

پہلی : توجہ ارادی (INTENTIONAL ATTENTION) ۔جب کوئی شخص سائیکل چلانا سیکھتا ہے کتنی مشکل پیش آتی ہے۔ تھوڑی تھوڑی دور سائیکل چلا کر رکنا، ہر طرف غور سے دیکھتے رہنا، دونوں ہاتھوں سے ہینڈل زور سے پکڑے رہنا غرض کہ عجیب حالت ہوتی ہے۔ بیس پچیس منٹ یا آدھے گھنٹہ میں تکان کا احساس ہونے لگتا ہے۔

یا جب ریاضی کا کوئی نیا قاعدہ یا شکل پڑھتے ہیں اور اس کی مثالیں حل کرتے ہیں تو چند مثالیں حل کرنے سے ہی دماغ میں تکان محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارادی توجہ مشکل ہوتی ہے۔

دوسری : توجہ اضطراری (SPONTANEOUS ATTENTION)

بچّہ کو دیکھئے اگر اس سے کہیں کہ دروازے تک دوڑ کے جاؤ اور دیکھ آؤ کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ وہ نہ جائے گا۔ اگر باجے کی یا شور کی آواز آئے بھاگا ہوا جائے گا۔ اس کو بلائیں تو بہ مشکل متوجہ ہوتا ہے۔ اگر مضحکہ خیز حرکت کرنے لگیں، کسی چیز کو بجانے لگیں دوڑ آئے گا۔ بچّہ کو کوئی دعا یا سورۃ قرآنی یاد کرانا ہو تو اس سے نہ کہیں کہ یاد کرو بلکہ خود پڑھتے رہیں۔ سنتے سنتے اس کو حفظ ہو جائے گا یا اس سے بڑے بچے کو پڑھائیں اسے پاس بٹھالیں مگر اس سے یہ نہ کہیں کہ تم بھی سنو تو چھوٹے کو جلد یاد ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس نے ارادے سے توجہ نہیں کی یہ تو غیر ارادی توجہ تھی۔ ارادی توجہ مشکل ہے جس سے بچّے کے ذہن پر بار پڑتا ہے۔ بچّوں کو جو کچھ بھی سکھانا چاہیں ان کی توجہ اضطراری سے کام لیں۔ جلد سیکھ لیں گے۔ بچّوں کو حروف تہجی یاد کرانے ہوں تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ حروف کے کارڈ بنائیں۔ ان سے بچّوں کو کھلائیں۔ بہت تھوڑے وقت میں یاد ہو جائیں گے۔

تیسری: توجّۂ عادی (HABITUAL ATTENTION)

جب کسی کام کی عادت ہو جاتی ہے اِس میں بالارادہ توجّہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب سائیکل چلانے کی مشق ہو جاتی ہے تو موڑ پر ایک طرف کو جو جھکنا پڑتا ہے سوار کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس نے جسم کا وزن ایک طرف جھکایا ہے۔ کسی ریاضی کے قاعدے کی مشق ہو جانے پر کتنے ہی سوال حل کر لینے پر بھی دماغ پر بار محسوس نہیں ہوتا۔ جب ایک مبتدی لوہار ہتھوڑا چلاتا ہے تو بغور دیکھتے رہنے پر بھی مرکز پر چوٹ مارنا اور ہر مرتبہ اسی مقام پر مارنا ممکن نہیں ہوتا مشق کے بعد مرکز کو دیکھے بغیر چوٹ مسلسل ایک ہی جگہ پڑتی ہے۔ یہ توجّہ عادی ہے۔ بس بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے توجّہ اضطراری جذب کی جائے اور اس کو توجّہ عادی تک پہنچا دیا جائے۔

④ جذبۂ محاکات: بندر آدمی کو جو کرتے دیکھتا ہے اس کی نقل کرتا ہے۔ بچّہ جو کچھ بڑوں کو کرتے دیکھتا ہے اس کی نقل کرتا ہے۔ اس جذبہ سے وہ کھانا پینا اور تمام اُمور جو زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہیں سیکھتا ہے، اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو بچّہ کبھی بھی نہ سیکھ سکتا۔ نفسِ اِنسان جس سے مرعوب ہو جائے اس کے ہر فعل کی نقل کرنا فخر سمجھتا ہے۔ وہ اقوام جو کسی دوسری قوم سے مرعوب ہو جاتی ہیں اس کے ہر کام کی نقل اُتارنے لگتی ہیں اور اس میں کبھی عقل سے کام نہیں لیتیں۔ جو فیشن یورپ و امریکہ میں نکلتے ہیں اِنسان نما بندران کی نقل کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ایک ٹیڈی ازم ہی کو لے لیجئے یہ ایسا رائج ہوا ہے کہ ہر گھر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پوشاک دیکھئے تو جسم سے ایسی متصل ہے گویا گوند سے کپڑا چپکا دیا ہے۔ اگر بندر کا خواص نہ ہوتا تو عقل سے کام لیتے اور سمجھتے کہ تنگ پوشاک صحت کے لئے مضر ہے اور عقل کا یہی حکم ہے کہ مضر کام نہ کرو مگر بنی نوعِ اِنسان ڈھور ڈنگروں سے زیادہ گمراہ ہو جائیں ان میں عقل ہوتی ہی کہاں ہے جس سے کام لے کر مضرات سے بچ سکیں۔

آج کل تمام ممالک میں نوجوانوں کے جرائم کی طرف رُجحان (JUVENILE DELIQUENCY) کا شور ہے مگر یہ عقلاء دہر ایسے غافل ہیں کہ قوانینِ فطرت کو جانتے ہوئے ان سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ایسے ڈرامے یا

سنیما ہیں جن میں جرائم کا ارتکاب دکھایا جاتا ہے۔ اوّل تو دیکھنے والوں کے نفسوں میں تصویریں بنتی ہیں۔ جب خزانہ جمع ہوجاتا ہے تو اس کی نقل کرنے کی خواہش ہیجان میں آتی ہے اور وہ ارتکاب جرم پر مائل ہوجاتے ہیں۔ اصلاحِ نفس بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے تو طلب اور شوق کے ساتھ بہت وقت درکار ہے مگر تخریب بہت سہل ہے۔ جو عمارت برسوں میں بنتی ہے چند دنوں میں گرائی جاسکتی ہے اور اگر ایک بم گرا دیا جائے تو منٹوں میں۔

غرضکہ جب کسی کو کوئی کام سکھانا ہو تو جذبہ محاکات سے کام لینا چاہئے کہ وہ عمل اس کے سامنے مسلسل اور تکرار سے کرتے رہیں۔

④ **ھنگامہ**: روزانہ ہم بازار میں گھومتے ہیں۔ لوگ میلوں میں، نمائشوں میں جاتے ہیں، ہر طرف گھومتے پھرتے رہتے ہیں مگر ایک شخص کی تصویر کا نقش بھی ذہن میں نہیں بیٹھتا۔ اگر ان میں سے کسی شخص کو بعد میں دیکھیں تو پہچاننا مشکل ہوگا۔ البتہ کسی دکاندار اور گاہک کے درمیان جھگڑا ہوجائے، تو تو میں میں ہاتھا پائی کی نوبت آجائے یا بازار میں دو آدمی لڑ رہے ہوں، تو ان آدمیوں کی تصاویر کے نقوش نفس پر ایسے گہرے بیٹھ جائیں گے کہ پھر جہاں بھی ان کو دیکھیں گے آپ پہچان لیں گے کہ یہ وہی ہیں۔

دیکھنا تو بڑی بات ہے، آپ کسی ہنگامہ کا یا اس جنگ کا تذکرہ سنا دیں تو سننے والوں کے ذہن نشین ہوجائے گا۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ کسی بات کا نفس پر گہرا نقش بٹھانے کے لئے ہنگامہ بہترین ذریعہ ہے۔

معمولی یا ذلیل ہنگاموں کا اثر شرفا اور معقول لوگوں پر نہیں ہوتا۔ اگر بازار میں دو آدمیوں میں گالی گلوچ ہو رہی ہو یا کچھ اشخاص اچھلتے کودتے بندروں جیسی حرکات کرتے ہوئے گزریں تو کوئی معقول شریف شخص متوجہ نہ ہوگا۔ لونڈہار، جہلا اور اراذل ہی متوجہ ہوں گے۔ مگر جب کوئی روتا ہوا، فریاد کرتا ہوا گزرے تو کسی شریف انسان کو چین نہ آئے گا جب تک یہ معلوم نہ کرلے اس پر کیا مصیبت آپڑی ہے کیا واقعہ ہوگیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جذبِ توجہ کے لئے بہترین ذریعہ ہنگامۂ درد ہے۔

⑤ **مظاہرہ** (DEMONSTRATION): جب ۱۸۵۱ء کے قریب

انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا تو اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک صوبیدار صاحب خچر باٹری کے انچارج تھے۔ ایک رات ایک خچر بھاگ گیا۔ صبح کو صوبیدار او۔سی (O.C) کو رپورٹ کرنے گئے۔ انگریز افسر نیا آیا ہوا تھا اور اردو نہیں جانتا تھا۔ صوبیدار نے انگریزی کے کچھ الفاظ یاد کر رکھے تھے۔ اب رپورٹ کریں تو کیسے کریں۔ بڑی ہمت کر کے کہنا شروع کیا۔ ان کی پُر لطف گفتگو کچھ یوں تھی:۔

صوبیدار	آفیسر کمانڈنگ
SIR........ (جناب)۔	O! YES? (او۔ہاں)
SIR........ (جناب)	OH YES GO ON! (او۔ہاں کہو آگے)
SIR LAST NIGHT....... (جناب گزشتہ رات)	YES, WHAT HAPPENED? (ہاں، کیا ہوا)
SIR LAST NIGHT ONE MULE..........	(O : YES, GO ON) (او ہاں آگے کہو)
(جناب گزشتہ رات ایک خچر)	OH! WHAT HAPPENED TO THE BLOODY MULE?
SIR LAST NIGHT ONE MULE	(اوہ! اس خچر کو کیا ہوا؟)
(جناب گزشتہ رات ایک خچر)	WELL DEMONSTRATED SUBEDAR, WELL-DONE!!
اب صوبیدار صاحب خاموش سوچتا رہا۔ بالآخر صاحب کی ٹانگ سے ٹانگ ملا کر ہنہناتے ہوئے منہ پھیر کر کچھ دور بھاگے چلا گیا۔	(خوب مظاہرہ کیا صوبیدار صاحب بہت خوب!)

اس مظاہرہ کا اثر دیکھیں سو سال سے زیادہ گزر چکے مگر آج بھی زبان زد ہے۔ اسے جو ایک مرتبہ سن لے گا تمام عمر نہ بھولے گا۔ میں نے ۱۹۴۲ء میں سنا تھا ایسا محسوس ہوتا ہے گویا بچشم خود دیکھا ہو۔

کیفیات نفسی میں کوئی کیفیت ایسی نہیں جو لفظوں میں کسی کو سمجھائی جا سکے۔ مثلاً غم، غصہ، خوف، خشیت، الحاح، زاری وغیرہ۔ جب تک کیفیت طاری کر کے نہ دکھائی جائے

بچہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جس نے ان جذبات کی کیفیات کسی پر طاری ہوتے نہ دیکھی ہوں اس کے لئے ان کا مفہوم سمجھنا محالِ عقلی ہے لہٰذا کیفیاتِ نفسی کو سمجھانے کے لئے مظاہرہ کرنا لازمۂ فطرت ہے۔

قوانینِ فطرت کے مطابق ہدایتِ خلق کے لئے انبیاء کے لوازمات

خالقِ کائنات کے مُعیّن کردہ اصولِ فطری کے مُطابق ہادیانِ دین پر لوازمات عائد ہوتے ہیں وہی تو اس ذاتِ اقدس کے احکام ہیں۔ اوراقِ سابق میں جو قوانینِ فطری بیان کئے گئے ہیں ان کے مُطابق ہادی پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی تفصیل کے لئے تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی البتہ مجملاً کچھ حسبِ ذیل درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) اپنے باطنی قوائے روحانی کا اخفا" قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" (کہہ دو کہ میں تمہاری مثل ایک بشر ہوں) کی عملی تفسیر دکھاتے رہنا مثلاً انبیاء علیہم السّلام کے کھانے کے متعلق کلام اللہ میں جو رب العزت کا فرمان ہے۔ وہ نہ احتیاج کی نفی کرتا ہے اور نہ ہی غنا کی، عجیب طریقہ بیان ہے۔ اس سے اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ عوام النّاس کی طرح اگر کھانا کھائیں تو کھا سکتے ہیں اور وہ ارشاد یہ ہے" وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ " (۸) الانبیاء (ہم نے ان کے جسم ایسے نہیں بنائے جو کھانا نہ کھاتے ہوں)۔ کلام اللہ میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ہم نے ان کے جسم ایسے نہیں بنائے جو غذا کے محتاج نہ ہوں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ وہ کھانے کے محتاج نہیں ہوتے۔

(الف) جب نور سے اتصال ہو جاتا ہے تو انسان آب و غذا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بس ان کا کھانا پینا سب تعلیمِ خلق کے لئے ہے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کھانا نہ کھائیں اور فاقہ ہو تو جیسی کیفیت عوام پر فاقہ میں وارد ہوتی ہے اسی کا اظہار کریں۔ اگر کسی شخص پر چند روز کا فاقہ ہو تو قلب اور پھیپھڑے نیچے کو کھنچے محسوس ہوتے ہیں اور اس کیفیت میں ہاتھ پیر ایسے ڈھیلے ہو جاتے ہیں کہ حرکت دینا مشکل ہوتا ہے۔ جنگ میں دُشمن کے مقابل ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں کہ کئی کئی وقت کھانا میسّر نہیں آیا۔ اگر ایسا موقع پیش آجائے تو دشمن کا

مقابلہ مشکل ہو جائے گا۔ اس کا علاج بتاتے ہوئے ہادیانِ دین پیٹ پر پتھر باندھ کر دکھاتے ہیں۔ پیٹ پر کوئی گول کپڑا گیند جیسا باندھنے سے وہ کھچاؤ کی کیفیت باقی نہیں رہتی اور ہاتھ پیر اسی طرح کام دینے لگتے ہیں جیسے کہ سیری کی حالت میں۔

(ب) صاحبِ معرفت جذباتِ حیوانی سے منزہ ہو جاتا ہے پس انبیاء جو عارفِ کامل پیدا ہوتے ہیں ان پر کوئی جذبہ طاری نہیں ہوتا مگر ان کا فریضہ ہے کہ غصّے کے موقع پر غصّے کا، سرور کے موقع سرور، غم کے موقع پر کیفیتِ الم کا اظہار کریں۔

(ج) برقی قوت کے ذریعہ سے ہر شخص ہزاروں میلوں کی آوازیں سُنتا ہے۔ زندہ تصاویر بھی دیکھتا ہے۔ ریڈیو، ٹیلیفون اور ٹیلیویژن ہمارے سامنے ہیں! اور اگر برق کو پیدا کرنے والی نور کی شعاعیں جس کے قلب سے متصل ہو جائیں تو کیا وہ دُور دراز کے فاصلوں پر دو یا زائد آدمیوں کی باہمی گفت گو نہیں سُن سکتا؟ یقیناً سُن سکتا ہے، مگر ہادیانِ دین پر لازم ہے کہ جب ایسے اشخاص میں سے ایک ان کے سامنے آئے تو عام آدمیوں کی طرح دریافت کریں کہ بتلاؤ بھئی اس نے تم سے کیا کہا تھا؟ —

(د) صاحبِ معرفتِ کامل کو سونے اور آرام کرنے کی حاجت نہیں ہوتی تو انبیاء تو بدرجۂ اولیٰ اس کے محتاج نہ ہوں گے مگر ان کو لازم ہے کہ سو کر آرام کر کے بھی دکھائیں۔ موقع و محل پر کسل و تکان کا بھی اظہار کریں۔

(ہ) حاملِ نور ہر ایک کی باطنی کیفیت، نفسی خواہشات و جذبات و خیالات سے واقف ہوتا ہے۔ انبیاء پر لازم ہے کہ بلا ضرورت اس کا اظہار نہ کریں۔ البتہ اگر ایسے اظہار سے وہ جانتے ہوں کہ کوئی شخص ہدایت پا جائے گا تو ظاہر کرنا لازم ہوگا۔

(س) حاملانِ نور کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے حرکت کی ضرورت نہیں ہوتی، محض ارادہ کافی ہوتا ہے مگر انبیاء پر لازم ہے کہ عوام النّاس کی طرح پیدل یا سواری پر ہی سفر کریں۔

(ص) ایک عارفِ کامل کی صحتِ جسمانی کامل ہوتی ہے۔ وہ امراض میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ پھر انبیاء کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ مگر انبیاء کے لئے ضروری ہے کہ بیمار ہو کر دکھائیں

جس کے دو اسباب ہیں ایک تو یہ ان پر لازم ہے کہ عملی طور سے سکھائیں کہ حالتِ مرض میں عبادتِ الٰہی کس طرح کرنی چاہیئے اور کیا عمل کرنا چاہیئے۔ دوسرے یہ اظہار کہ ہم بھی تمہاری طرح بیمار ہوتے ہیں۔

(ط) **آئندہ کے حالات کا اظہار:** باب چہارم میں واضح ہو چکا ہے کہ حاملِ نورِ آئندہ کے حالات سے آگاہ ہوگا۔ پھر انبیاء تو بدرجہ اولیٰ واقف ہوں گے مگر بلا ضرورت اظہار نہیں کرسکتے۔ حضور سرورِ دو عالم نے اکثر مواقع پر بضرورت اظہار فرمایا ہے جن میں سے ایک موقع سریۂ موتہ کا ہے جب حضرت نے شرجیل حاکم شام کے نام خط بھیجا۔ اس نے حضرت کے قاصد کو قتل کر دیا تو اس کے قصاص کے لئے آنحضرت نے تین ہزار فوج شام کو روانہ کی اور اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو سردار فوج مُعیّن کیا اور ارشاد ہوا یہ شہید ہو جائیں تو جعفر سردارِ لشکر ہوں، وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ سردار ہوں، وہ بھی شہید ہو جائیں تو اہلِ لشکر کسی کو سردار بنالیں۔ چنانچہ یہ تینوں بزرگوار شہید ہو گئے۔

(ع) **شہادت:** ہم دیکھتے ہیں کہ برقی شعاعوں سے ٹیلی ویژن پر ہزار ہا میل کے حالات کا مشاہدہ کر لیا جاتا ہے۔ تو پھر وہ نوری شعاعیں جو برق پیدا کرنے والی ہیں جس کے قلب سے واصل ہو جائیں اس کے لئے کیوں ممکن نہ ہوگا کہ دنیا کے ہر مقام اور ہر شخص کے عمل کو دیکھ سکے؟ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ التوبۃ

(اے رسول کہہ دو تم عمل کرو پس تمہارے اعمال اللہ دیکھتا ہے اور اس کا رسول اور کچھ مومنین)۔ انبیاء پر لازم ہے کہ اپنی اس قوت کے مشاہدات کو بلا ضرورتِ ہدایت ظاہر نہ کریں۔

(ل) ایک یہ امر بھی ضروری ہے کہ کفار و مشرکین کے مقابل جہاد میں کبھی مغلوب ہو کر بھی دکھائیں۔ اس کے دو فطری اسباب ہیں:

اوّل: انبیاء و رسل کا جہاد دفعِ فساد کے لئے ہوتا ہے تاکہ ایسے خبیث نفوس کو جو فساد فی الارض کا باعث ہوں، جن کے زندہ رہنے سے فساد بڑھنے، شرک و کفر زیادہ ہونے کا ضرر ہو، ان کو مٹا دیا جائے۔ پس اگر ہمیشہ فتح ہی کرتے رہیں تو مشرکین ایسے خائف ہو جائیں گے کہ پھر میدانِ قتال میں آنے سے گریز کرنے لگیں گے لہٰذا ان کو قتل نہ کیا جا سکے گا۔

ایک آدھ مرتبہ تھوڑی شکست اٹھا لینے سے ان کی ہمتیں بڑھتی رہیں گی اور قتل ہونے کے لئے مقابل آتے رہیں گے۔

دوم: انبیاء و رسل کا مقصد تزکیہ نفوس خلق ہے۔ تزکیہ کیلئے ضروری ہے کہ جہاد کیلئے شوق شہادت میں مرنے کے لئے تیار ہو کر نکلے اگر لشکر انبیاء کو شکست نہ ہو تو مجاہدین کے نفوس میں یہ خیال جاگزیں ہو جانے کا امکان ہے کہ بس مشرکین کو قتل کرنے کے لئے ہی جانا ہے پھر اپنی فتح کا ہی یقین ہوگا تو موت کے لئے تیار ہو کر کوئی نہ نکلے گا۔ اس طرح مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

(۲) انذار: عذاب سے ڈرانا۔ تبلیغ میں پہلا کام انذار ہے آخرت کے عذاب کی حسی تمثیل سے مرقع کشی کرنا لازم ہے تاکہ نفوس متاثر ہوں۔

(۳) بشارت: نعیم اخروی کی خوش خبری سنائیں اور مادی نعمتوں کی تمثیلوں سے شوق دلائیں جس سے عمل کی طرف رغبت پیدا ہو۔

(۴) ایسے اعمال کر کے دکھلائیں جن سے غفلت و لاشعوری کم ہوتی ہے اور عمل لوگوں کے سامنے کریں تاکہ جذبہ محاکات جوش میں آجائے اور لوگوں میں ان اعمال کی نقل کرنے کا شوق پیدا ہو۔ اس طرح توجہ اضطراری سے کام لیں۔

(۵) اعمال و افعال کا تسلسل اتنا قائم رہے کہ جب توجہ اضطراری سے لوگ اعمال کی نقل کرنے لگیں تو رفتہ رفتہ وہ عادی ہو جائیں اور توجہ عادی سے وہ کام لوگوں پر سہل و آسان ہو جائیں۔

(۶) ہنگامہ درد: جب کوئی اہم مسئلہ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہو تو توجہ اضطراری جذب کرنے کے لئے ہنگامہ برپا کریں تاکہ ذہنوں پر گہرا نقش بیٹھ جائے اور ایک قصہ بن جائے تاکہ واقعہ زبان زد ہو کر ہر بوڑھے، جوان اور بچے تک پہنچ جائے۔

غفلت دور کرنے کا بہترین ذریعہ درد ہے اور اضطراری توجہ جذب کرنے کے لئے بھی اس سے بہتر عمل کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا اپنے لئے مصائب و آلام پیدا کر کے مظلومیت کا اظہار کریں تاکہ جو لوگ ان سے مانوس ہو چکے ہوں ان کے دلوں میں درد پیدا ہو اور

ان کے نفوس کی غفلت ولاشعوری کم ہو۔ اگر بہت زیادہ دَرد دینے کی ضرورت ہو تو اپنی قربانی پیش کردیں۔

⑦ **مظاہرہ:** سب سے زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ اُمت کے لوگوں کو خشوع و توبہ و استغفار کرنا، گناہوں کی معافی چاہنا کیسے سکھایا جائے؟ یہ تو کیفیاتِ نفسی ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کیفیات کا مظاہرہ کیا جائے ورنہ الفاظ سے تو کوئی تو کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ لوگوں پر ظاہر کریں کہ ہم سے ایک غلطی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سے ناخوش ہوگئے پھر تضرع زاری کرتے ہیں توبہ واستغفار میں مصروف ہیں۔ اور یہ بھی دکھلادیں کہ اس غفور الرحیم نے توبہ قبول کرلی ہمارا جرم بخش دیا گیا۔ اس سے ایک تو توبہ وانابت، تضرع و زاری کی تعلیم لوگوں کو ہوگی۔ دوسرا امر یہ کہ بارگاہِ احدیت کے عظمت وجلال کا نقش لوگوں کے دلوں پر بیٹھ جائے گا۔ تیسرے یہ کہ لوگوں پر یہ اثر ہوگا کہ حبیب خدا کے پیارے نبی سے ذرا سی غلطی ہوجانے پر عتاب ہوگیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ چوتھے یہ کہ ہر فاسق و فاجر کو اُمید ہوجائے گی کہ اسی طرح میں بھی توبہ کرلوں تو میرے گناہ بھی معاف ہوجائیں گے۔ فاسقوں کے دلوں میں بھی اُمید اور نیکوکاروں کے دل میں خوف پیدا ہوگا جس سے ایمان حاصل ہوگا۔

ممکن ہے بعض قارئین اس بیان کو صحیح تسلیم کرنے میں پس وپیش کریں تو اس کا ثبوت کلام اقدس الٰہی سے دیکھ لیں۔ ارشاد باری ہے: " اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ " (بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور اچھے وعظ سے)۔ حکمت کے معنی ہیں علم باعمل یعنی جو کچھ لوگوں کو عمل کا علم دیا جائے نصیحت کی جائے اس پر خود عمل کرکے دکھاؤ۔ اس کی تفصیل انبیاء علیہم السّلام کی زندگی میں واضح ہوجائے گی۔

حضرت آدمؑ کا مکر

خلقتِ انسان کے بیان میں اس آیت تک بیان ہوچکا ہے:۔

"قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ۙ﴿۳۷﴾ اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۳۸﴾ الحجر

اب اس سے اگلی آیت دیکھیں:۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ
اَجْمَعِيْنَ (۳۹) اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (۴۰) قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ
عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ (۴۱) اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ
مِنَ الْغٰوِيْنَ (۴۲) وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۴۳) الحجر

(کہا چونکہ تو نے مجھے راستہ سے ہٹایا میں بھی ان کی نظر میں دُنیا کے ساز و سامان کو زینت دوں گا اور ضرور سب کو راہ سے ہٹاؤں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔ کہا یہ سیدھا راستہ مجھ تک ہے۔ جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا قابو نہ ہوگا۔ سوائے ان کے جو بے راہوں میں سے تیری پیروی کریں۔ پس ان سب کا ٹھکانا یقیناً جہنم ہے)۔

یہ تمام آیات متشابہ ہیں۔ جو کچھ مفہوم ان کے الفاظ سے ظاہراً سمجھ میں آئے گا وہ حقیقت نہیں ہوگا۔ ایک نادان و ناواقف کے ذہن میں اِن آیات سے کچھ نقشہ کھنچ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں ایک تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں، سامنے شیطان کھڑا بکواس کر رہا ہے اور جھڑکیاں بھی کھا رہا ہے۔ اگر تخیل کی یہ ظاہری صورت حقیقت سمجھ لی جائے تو پھر بتلایئے شیطان کے پھندے سے مرد نادان کس طرح بچ سکتا ہے؟۔۔

جب قرآن کریم نے بتلا دیا ہے کہ اس میں جتنی بھی آیات ادامر و نواہی کے سوا ہیں وہ نفسِ انسان کی کیفیات ظاہر کرتی ہیں اور یہ سب کی سب متشابہ ہیں۔ یہ بھی آگاہ کر دیا کہ متشابہ کی پیروی وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دل ٹیڑھے ہیں یعنی جو گمراہ اور بندگانِ شیطان ہیں۔

اَب یہ سمجھنا چاہیئے کہ متشابہ کی متابعت و پیروی سے کیا مُراد ہے اس لئے کہ متشابہ آیات میں احکام ادامر یا نواہی تو ہے نہیں جس کی کوئی پیروی کرسکے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ متشابہ آیات کو حقیقت جان کر ان کے الفاظ کے ظاہری معنی مُراد لینا ہی متشابہ کی پیروی کرنا ہے اور یہی گمراہی اور ہلاکت کا باعث ہے۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ متشابہات کی پیروی یا متابعت سے یہی مُراد ہوسکتی ہے کہ ان کو حقیقت اور قصّے کہانیاں جان کر ان پر بحثیں کریں۔ پھر ان پر جو ایراد ذہن میں آئیں

اور وساوس پیدا ہوں ان کی تاویلیں سوچتے رہیں اور قیاسی بحثوں میں پھنسے رہیں اس کتاب کے باب اوّل و دوم میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ سوائے اوامر و نواہی اور وہ آیات جن میں ایسی کیفیاتِ نفس کا بیان ہے جو ہر شخص پر وارد ہوتی رہتی ہیں اور ان کا احساس بھی ہر شخص کو ہوتا ہے، باقی تمام قرآن متشابہ ہے۔ اور اس کو وہی لوگ قصّے کہانیاں سمجھتے ہیں جو کافر ہیں۔ یعنی جو محکمات پر عمل کرنے اور عالمِ غیب کی طرف توجّہ کرنے سے روگرداں ہیں، جیساکہ ارشادِ باری ہے:۔

يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾ الانعام

(کہتے ہیں اور کہتے رہیں گے وہ لوگ جو کافر ہیں (یعنی جو حق سے یا عالمِ غیب سے منہ پھرائے ہوئے ہیں) کہ یہ قرآن نہیں ہے سوائے پرانے لوگوں کے قصّے کہانیوں کے)۔ چنانچہ آج تک عالمِ غیب سے منہ پھرانے والے یہی کہتے رہتے ہیں کہ یہ حضرت آدمؑ کا قصّہ ہے، یہ حضرت نوحؑ کا قصّہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

پس جو لوگ متشابہات کو قصّے کہانیاں اور واقعاتِ حقیقی سمجھ کر ان پر بحثیں کرتے ہیں اور اپنے قیاس سے ان کی تاویلیں سوچتے ہیں ان کا حال کلام اللہ میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴿١٢١﴾ الانعام

(بے شک شیاطین اپنے دوستوں کے دلوں میں باتیں ڈالتے ہیں تاکہ تم سے جھگڑتے رہیں اور اگر تم ان کی بات مانو تو یقیناً تم مشرک ہو)۔

یہ حق سے منہ پھرانے والے وحیِ شیطان کو حق سمجھ لیتے ہیں جس سے نجاست، شرکِ باطنی، غفلت و لاشعوری اور بڑھ جاتی ہے۔ جتنی قیاسی تاویلیں سوچتے ہیں ان پر پھر ایراد ذہن میں آتے ہیں، پھر ان کے لئے تاویلیں سوچنے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور نفسِ امّارہ ان کو اسی جھگڑے میں پھنسائے رہتا ہے۔ ان کو قرآن میں حقائق نظر ہی نہیں آسکتے۔ قرآن نے تو صاف طور سے بیان کر دیا ہے کہ اس کتاب میں کس چیز کا بیان ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

وَمَا كَانَ هَٰذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ

الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ الْکِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۷﴾ یونس

(اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ خدا کے سوا کوئی اپنی طرف سے بنا لائے بلکہ یہ تصدیق کرنے والا ہے۔ اس سے پہلے کی (کتب سابقہ) اور تفصیل ہے اس کتاب کی جس میں کوئی شک نہیں جو تمام جہانوں کے رب کی طرف سے ہے)۔

اولب سابق میں یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں نفسِ انسان ہے جس پر پیدائش سے لے کر آخر عمر تک جو نقوش بنتے رہتے ہیں اس تحریر میں کسی شک و شبہ کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اسی کو مالک نے اپنی کتاب فرمایا ہے:۔

هٰذَا کِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْکُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ الجاثیہ

(یہ ہے ہماری کتاب جو تم پر حق ہی کہے گی۔ ہم تو لکھتے رہتے تھے جو کچھ تم کرتے رہتے تھے)۔

ان آیات مبارکہ سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ تمام آیات متشابہات میں نفس انسان کی کیفیات کا بیان ہے۔ پس جو لوگ قرآن کو خدا کا کلام مانتے ہوئے ان کو قصے کہانیاں سمجھ کر ان آیات کی تکذیب کرتے ہیں وہ تو منافق ہیں اور ان کے لئے درکِ اسفل کی وعید وارد ہوئی ہے مشکل یہ ہے کہ انسان کیفیاتِ نفس کو اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب حصولِ شعور کی راہ پر چلے۔ ان احکام پر عمل کرے جو آیات محکمات میں صاف طور پر بیان کئے گئے ہیں جن کا تعلق حصولِ شعور و تزکیہ نفس سے ہے۔ مثلاً نماز کے لئے حکم ہے:۔

وَّ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ﴿۲۹﴾ الاعراف

(اور ہر نماز کے وقت اپنے نفسوں کو قائم کرو اور اسے پکارو خالص کرتے ہوئے دین اسی کے لئے (جس طرح کشتی میں موجوں کے گھیرے میں پکارتے ہیں))۔

پس جب نماز کے لئے قوم کے اکثر افراد بلکہ اکثر علماء دین کا بھی یہ عقیدہ ہو کہ اٹھا بیٹھی کر لینے ہی سے اللہ تعالیٰ خوش ہو جاتے ہیں تو پھر توجہ کی کوشش کوئی کیوں کرے گا؟ حالانکہ

علماء کرام یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ سرکارِ دوعالم نے فرمایا: "لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ" (بغیر حضورِ قلب کوئی نماز بھی نماز نہیں ہے)۔ اس کے باوجود توجّہ کا جب ذکر آجائے تو لایعنی تاویلیں کر کے ٹال دیتے ہیں۔ ایک مفتی صاحب کے سامنے ایک شخص نے کہا (اتّفاق سے بندہ حقیر بھی حاضر تھا) کہ نماز تو طہارتِ باطنی کے لئے ہے جو بغیر توجّہ قلبی حاصل نہیں ہو سکتی، مَیں نے دیکھا کہ مفتی صاحب کو غصّہ آگیا۔ آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ کہنے لگے "ہاں صاحب ایک فرقہ باطنیہ بھی پیدا ہُوا تھا اُسے حسن بن صباح نے بنایا تھا، انھوں نے بڑا فساد پھیلایا۔ توجّہ توجّہ کی یہ تم کیا رَٹ لگاتے ہو۔ یہ اختیاری چیز نہیں، اس پر اِنسان کو قابو نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا"، (اللہ کسی نفس کو وُسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا)۔ وہ شخص حضرتِ علّامہ کے سامنے خاموش ہوگیا۔ کیا کہتا؟۔

قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں بہت زیادہ اللہ کا ذکر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے "وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" (۱۰) الجمعہ۔ (اللہ کا ذکر بہت زیادہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ) ـــــ اس کے لئے بہت سی لایعنی تاویلیں کر لیتے ہیں کہ نماز کے بعد ایک دو تسبیح پڑھ لو یہ ہی ذکرِ کثیر ہے۔ حالانکہ سورہ جُمعہ میں واضح طور پر حکم دیا گیا ہے: "فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" (اور جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی روزی کماؤ) اور اللہ کا ذکر بہت کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ)۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں نماز کے بعد تسبیح پڑھ لینے کا ذکر نہیں ہے بلکہ کاروبارِ دُنیا میں مصروف رہتے ہوئے اس کی یاد کرتے رہنا، اس کے ذکر سے غافل نہ ہونا ہی مراد ہے۔

بکثرت آیات ایسی ہیں جن میں خلق اللہ میں اور اپنے نفس میں تفکّر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اِن میں سے صرف دو مثالیں پیشِ خدمت ہیں:۔

سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ (۵۳) حٰم السجدہ (عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں کائنات میں دکھائیں گے اور خود ان کے نفسوں میں یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ حق یہی ہے)۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ﴿٢٠﴾ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٢١﴾ الذّٰریٰت
(اور زمین میں یقین والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفسوں میں ہیں تم دیکھتے ہی نہیں ؟)۔

درست ہے کہ ہر شخص ان احکام پر عمل نہیں کرسکتا۔ یہ عوام کے لئے نہیں، یہ تو صرف خواص ہی کا کام ہے۔ پھر یہ تو توفیق ایزدی پر منحصر ہے۔ طلب نور ایمان تو ہر مسلمان پر فرض کی گئی ہے جیسا کہ حضور سرورِ دو عالم کا ارشاد ہے "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ" (ہر ایمان لانے والے مرد اور عورت پر علم کی طلب واجب ہے) اور علم کے معنی بھی بتلا دیئے کہ "اَلْعِلْمُ نُوْرٌ يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِي قَلْبِ مَنْ يَّشَاءُ" (علم تو وہ نور ہے جو اللہ ڈالتا ہے جس کے دل میں وہ چاہتا ہے)۔ پس اگر مسلمانوں میں طالبان نور ایمان کی کثرت ہو جائے تو کیسے ممکن ہے کہ رحمتِ باری کا نزول نہ ہو اور ان میں چند افراد ایسے پیدا نہ ہو سکیں جو نعماتِ الٰہیہ سے سرفراز ہوں جن کو اتنا شعور حاصل ہو جائے کہ وہ کیفیاتِ نفسی کا مطالعہ کر سکیں اور بعض متشابہات کا حقیقی مفہوم سمجھ سکیں۔ ایک شخص بھی ایسی کیفیت کو پہنچ جائے تو وہ ہزاروں برادرانِ اسلامی کو فیض پہنچانے کا اہل ہو جائے گا۔ تین چار سال کے بچے اگر اپنے باپ سے سوال کرتے ہیں بچہ کہاں سے آجاتا ہے تو ہر باپ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اپنے بچے کی ذہنی اہلیت کے مطابق اس کو ایسا جواب دیدے جس سے اس ہیجان میں جو بچے کے ذہن میں پیدا ہوا ہے سکون ہو جائے۔ جب اس کو تمیز آئے گی بغیر کسی کے بتلائے خود ہی سمجھ جائے گا۔ اسی طرح اُمت کے روحانی باپ انبیاء علیہم السّلام اُمّت کے لاشعور بچوں کو عالم غیب کے تذکروں کے یعنی متشابہات کے متعلق، سائل کی اہلیت کے مطابق مادی تمثیلات میں ایسے جواب دے دیتے تھے جن سے ان کے ذہن میں پیدا شدہ ہیجان میں سکون ہو جائے اور وہ حصولِ شعور کی راہ پر چل کر خود ہی سمجھنے کے اہل ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح وہ شخص بھی جس کو شعورِ باطنی حاصل ہو جائے گا، انبیاء علیہم السّلام کی پیروی کرتے ہوئے ایسے ہی جواب دے سکے گا۔

پس اگر آدم و شیطان کے قصّہ کو کیفیاتِ نفس کے مطابق سمجھنا چاہیں تو پہلے چند نکات کا ذہن نشین ہو جانا ضروری ہے :۔

(۱) **آدم**: ایک تو یہ پہلے نبی کا نام ہے مگر اس لفظ کے معنی ہیں خاکی یا جسم مادی۔ تو جہاں اے آدم خطاب ہوگا وہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد جسم خاکی ہو۔ اس کا روح اس کا ساتھی نفسِ قدسیہ ہو۔

(۲) **روح**: باب چہارم میں دو مقامات پر اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ روح سے مراد دراصل اوّلِ مخلوق نور کی شعاعیں ہیں۔

(۳) **جنّت**: باب سوم میں تفصیل سے اس کا بیان گزر چکا ہے کہ یہ کیفیتِ نفسی ہے۔ جب نوری شعاعوں سے اِتصال ہو جائے تو بندہ جنّت میں پہنچ جاتا ہے اس کے ماحول میں جنّت کا سماں ہر دم موجود رہتا ہے۔

(۴) **شیطان**: نفوسِ مادی جو لطیف گیس سے خلق ہوتے ہیں یہی شیطان ہیں چنانچہ ربُ العزّت کا فرمان ہے "کَانَ مِنَ الْجِنِّ" (یعنی شیطان جنّات میں سے تھا) جن کہتے ہیں پوشیدہ کو جو ظاہری نگاہ سے نظر نہ آئے۔ اور جنّات کے لئے فرمایا ہے "وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنَ النَّارِ" (۱۵) الرحمان۔ (اور اُس نے جنّات کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا)۔ اب ہر تعلیم یافتہ جانتا ہے کہ شعلہ گیس ہی ہوتا ہے۔

(۵) **شیطان کی اولاد**: ارشاد باری ہے: "اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۔۔۔" (۵۰) الکہف (کیا تم اس کو یعنی شیطان کو اور اس کی اولاد کو اپنا کارساز بناتے ہو میرے سوا حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں)۔ اور حدیث میں ہے کہ شیطان سانپ کے مُنہ میں بیٹھ کر جنّت میں چلا گیا۔ اس کے لئے پہلے تو یہ جاننا چاہیئے کہ یہ کونسی جنّت ہے۔

سورہ طٰہٰ میں جنّت کا ایک وصف یہ بیان کیا گیا ہے "اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى (۱۱۸) وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۱۱۹) طٰہٰ (تجھے اس میں نہ بھوک ہوگی اور نہ برہنگی، نہ پیاسا ہوگا نہ دھوپ لگے گی)۔ اور دعاء صباح میں ہے۔ "يَا مَنْ اَرْقَدَنِيْ فِيْ مِهَادِ اَمْنِهٖ وَاَمَانِهٖ وَاَيْقَظَنِيْ اِلٰى مَا مَنَحَنِيْ بِهٖ مِنْ مِنَنِهٖ وَاِحْسَانِهٖ" (اے وہ جس نے مجھے اپنے امن وامان کے گہوارے میں سُلایا

اور اپنی بخشش واحسان سے جگایا تو ان نعمتوں کی طرف جو اپنی منت واحسان سے مجھے عطا فرمائیں)۔

اب غور کریں کہ یہ کونسا گہوارہ اور کونسی جنت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے رحم مادر مراد ہے کہ وہاں نہ بھوک، نہ پیاس، نہ برہنگی، نہ دھوپ ہے اور وہاں سانپ کے منہ میں بیٹھ کر ہی شیطان جاتا ہے جو بہ شکل جراثیم نطفہ ہوتا ہے۔ انھیں سے یہ نفس مادی ہو کر پورا ہوتا ہے۔ یہ نفوس امارہ ہی اس کی اولاد ہیں! اسی لئے حدیث میں ذکر ہے کہ شیطان نے یہ بھی طلب کی تھی کہ جتنی آدم کی اولاد ہو اس سے دوگنی میری ہو۔ چنانچہ ہر آدمی کے لئے نفسِ امارہ ضروری ہے یہی اس کی ایک ذریت ہے اور دوسرا ہمزاد خارجی! اب قارئین یہ خیال کریں گے کہ رحم مادر جسے آدم کی جنت بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل تشنہ رہ گئی۔ تو عرض ہے کہ جب آدم کو شجرِ نوری سے یہ ہدایت مل جاتی ہے کہ اب تو اس جنت سے نکل تو وہ نکلتے ہی روتا ہے۔ پھر فرمان ہوتا ہے کہ جب تو ہماری ہدایات پر عمل کرلے گا تو پھر جنت میں داخل کردیا جائے گا جیسا سورۂ بقر میں ارشاد ہے " فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۞ (۳۸) البقر (۲) أَنتَ وَزَوْجُكَ " ارشاد باری ہے " قُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ " (۳۵) البقرۃ (ہم نے کہا اے آدم تو اور تیرا ساتھی یا تیری ساتھی جنت میں ٹھہرو) یہاں لفظ "زَوْج" استعمال ہوا ہے۔ زوج معنی جوڑا جوڑا، خواہ شوہر یا زوجہ مگر کلام پاک میں کہیں " زَوْجَتُكَ " نہیں آیا۔ اگر " زَوْجَتُكَ " ہوتا تو سوائے بیوی کے اور کچھ مفہوم نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر زوج کے معنی ساتھی ہوئے۔ خواہ نر ہو یا مادہ۔ تو آدم خطاب ہے جسم مادی کی طرف اور اس کا ساتھی نفسِ قدسیہ نورانی ہے۔ اگر یہاں زوج سے بیوی مراد ہے، جو آدم کی پسلی سے پیدا ہوئیں، تو گویا سنت اللہ ہی بدل گئی حالانکہ کلام پاک میں کتنی جگہ ارشاد ہے " وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا " (اور تو اللہ کے قانون کو کبھی بدلا ہوا نہ پائے گا)۔ اگر آدم کی پسلی سے ان کی زوجہ پیدا ہوئیں تو اللہ کی سنت تو بدل ہی نہیں سکتی وہ تو جاری رہنا چاہیے۔؟

اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ سورۃ نساء کی پہلی آیت میں تو ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ.... (۱) النساء

(اے لوگوں اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دُنیا میں پھیلائے)۔ اس سے تو ظاہرا جُہلا کے تخیل کی تائید ہوتی ہے کہ ایک نفس سے اس کی زوجہ کو پیدا کیا اور پھر ان دونوں سے مرد اور عورتیں مگر یہ آیات متشابہ ہیں۔ یہاں نفس واحد سے وہ نور مراد ہے جو اوّل مخلوق ہے اس سے اجسام پیدا ہوئے اور اسی سے نفس قدسیہ نفس امّارہ پیدا ہوئے۔ پھر جسم و نفس سے ہی مرد اور عورتیں پیدا ہوتیں۔

(۷) **شجر ممنوعہ:** باب چہارم میں بیان ہو چکا ہے کہ علم طبیعیات کی حالیہ معلومات میں نوری شعاعوں کو شجر ہی کہا گیا ہے۔ اور ہر انسان کے قلب کو حلقہ نوری گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی خبر جناب باری تعالیٰ نے دے دی ہے "اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ" چونکہ نور جو مخلوق اوّل ہے اس کی جان ذات واجب ہے۔ لہٰذا نور کا حائل ہونا اللہ تعالیٰ کا حائل ہونا ہے جیسا کہ ارشاد ہے تحقیق کہ اللہ حائل ہوتا ہے ہر شخص کے اور اس کے قلب کے درمیان۔ یا ارشاد ہوا ہے "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ہم تو انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں)۔ یہی شجر نوری ہے۔ اس کے لئے ارشاد ہے "وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" (۳۵) البقرہ (اس شجر کے قریب نہ جانا ورنہ اپنے کو تکلیف میں ڈالو گے)۔ اصل مفہوم تو یہاں نہیں لکھ سکتا مگر اتنا ظاہر کرنا ضروری ہے۔ یہ "نہی" نہیں ہے بلکہ آگاہی ہے جیسے یہ کہا جائے۔ "اسے نہ چھونا ورنہ ہاتھ جل جائے گا!"

(۸) **پھل کھانا:** سورۃ ابراہیم میں بھی ایک آیت میں شجرہ طیبہ کا ذکر آیا ہے:

...مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۲۴) تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۲۵) ابراہیم

(پاکیزہ کلمہ کی مثال شجر پاکیزہ کی مثال ہے۔ جڑ اس کی مضبوط ہے اور شاخیں اس کی تمام بلندیوں میں ہیں (یعنی کائنات میں پھیلی ہوں) ہر وقت یا ہر موسم میں اپنا پھل دیتا رہتا ہے) ۔ یہاں شجر سے نور مراد ہے اور شجر نوری کا پھل بھی نور ہی ہوگا جو حسب فرمان رسول علم ہے ۔ لہذا آدم نے شجر نوری سے جو قلب کو گھیرے ہوئے ہے علم حاصل لیا۔ ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس شجر نوری سے یہی حکم ملے گا کہ اپنے لئے مصیبت بنا۔ ورامت کو عملی طور پر تضرع وزاری کر کے بارگاہ احدیت سے گناہوں کی معافی چاہنا اور توبہ کرنا سکھاؤ۔ اس کے لئے بڑے مظاہرے کی ضرورت ہے جو تبلیغ حق کے لیے اشد ضروری ہے۔

(۹) یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ جب قرآن نے بتادیا کہ یہ کیفیات نفسی کا بیان ہے تو آدم شیطان کا قصہ بھی لامحالہ نفس امارہ اور نفس قدسیہ متعلقہ قوانین فطرت اور رازہائے قدرت کا ہی بیان ہوگا۔

آدم وشیطان کے متعلق جو آیات کلام پاک میں نازل ہوئی ہیں ان میں سے اکثر کو نقل کیا ہے اس کے بعد وہ روایات جو ان کی تفسیر میں کتب تفاسیر میں منقول ہیں نقل کی گئی ہیں۔ بعدہ ان آیات و روایات کو محکم سمجھ لینے سے جو شکوک وسواس و اعتراضات وارد ہوتے ہیں تحریر کئے ہیں۔ ہر چند کہ یہ بہت نصیحت آموز و مفید ہیں مگر ان کے اندراج سے اصل مقصد سے کچھ دوری ہوئی جاتی ہے' اس لئے اب اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

غرضکہ حضرت آدم عارف کامل تھے ان کے اندر حلقہ نوری کی شعاعیں چمکتی ہی تھیں جن کا شعور ان کو حاصل تھا۔ وہ اس سے آگاہ تھے کہ اس کے قرب کی وجہ سے ایک نہ ایک دن اپنے لئے مصائب آلام بنانے پڑیں گے۔ اپنے تئیں مصیبت میں ڈالنا ہوگا۔ انہوں نے پھل کھایا یعنی یہ علم ہوا کہ اب لوگوں کو توبہ واستغفار کرنا سکھانا لازم ہے۔

قوانین فطری کے مطابق ہدایت خلق کے لئے جو لوازمات اس باب میں پہلے آچکے ہیں ان میں ساتواں یہ ہے کہ تضرع وزاری کے ساتھ توبہ واستغفار کرنے کا طریقہ خلق اللہ کو سکھانے کے لئے عملی مظاہرے کی ضرورت ہے۔ لہذا جب انہوں نے شجر نوری سے پھل کھایا یعنی یہ علم ہوا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہنگامہ مظاہرہ کر کے توبہ واستغفار کرنا اور بہ تضرع و زاری

بارگاہ احدیت سے گناہوں کی بخشش چاہنے اور اس سے مغفرت طلب کرنے کا طریقہ سکھائیں، تو حضرت نے گریہ وزاری شروع کر دی۔ ان پر ایمان لانے والوں نے پوچھا ہوگا یا نبی اللہ کیا ہوگیا ہے، تو کہا ہوگا: کیا بتاؤں میرے رب نے کہا تھا تُو اور تیرا ساتھی جنت میں رہو۔ جو چاہو کھاؤ پیو مگر اس شجر کے قریب نہ جانا۔ دیکھو شیطان تمہارا کھلا ہُوا دشمن ہے وہ تم کو بہکا نہ دے۔ اس سے ہوشیار رہنا کہیں وہ تمہیں جنت سے نکلوا نہ دے۔ افسوس کہ شیطان نے مجھے بہکا دیا۔ اس نے خدا کی قسم کھا کر کہا تھا کہ تم کو اس درخت سے نہیں بلکہ اسی طرح کے اور درخت سے منع کیا ہے اگر اس کا پھل کھا لو گے تو فرشتہ ہو جاؤ گے۔ ہمیشہ جنت میں رہو گے۔ تمہارے لئے فنا نہ ہوگی۔ مَیں نے اس کی قسم پر اعتبار کر لیا اور اس درخت کا پھل کھا لیا۔ افسوس میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور گمراہ ہوگیا۔ خدا کے عتاب میں گرفتار ہوگیا۔ پس گریہ وزاری توبہ و استغفار کرتے رہے اسی طرح ایک مدت گزار دی۔

جب مشیتِ ایزدی کے مطابق توبہ و انابت و استغفار سکھانے کی مدت پوری ہوئی تو فرحاں وشاداں ہو گئے۔ لوگوں سے کہہ دیا کہ میرے رب کی طرف سے مجھے کچھ کلمات ملے جن کے ذریعے سے مَیں نے دُعا کی تو میری توبہ قبول ہو گئی۔ گناہ معاف ہوگیا۔ وہ تو بڑا غفور رحیم ہے۔ اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ دیکھو مَیں نے توبہ و استغفار کیا میرے رب نے میرا گناہ معاف کر دیا۔ کوئی کیسا ہی گناہگار ہو۔ اگر میری طرح توبہ کرے گا اس کا گناہ ضرور بخشا جائے گا۔ میرا رب تو ارحم الراحمین ہے وغیرہ وغیرہ۔ پس جو کچھ حضرت آدمؑ نے اُمت کے لوگوں پر ظاہر کیا ہوگا، جو کچھ کہا ہوگا اس کا لبِ لباب رَبُّ العزت نے اپنے کلام مقدس میں نازل فرما دیا۔ یہ حضرت آدمؑ کا مکر ہے۔

حضرت نوحؑ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَـكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۙ ﴿۲۵﴾

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ ہود

(البتہ ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا (اس نے قوم سے کہا) مَیں تمہارے لئے خدا کے

عذاب سے) ڈرانے والا ہوں کہ تم خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ میں تمہارے اوپر دردناک عذاب کے دن سے ڈرتا ہوں)۔

اور سورہ نوحؑ میں ہے:۔ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝٢ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝٣ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝٤ نوح ۔ (حضرت نوحؑ نے) کہا اے میری قوم میں تمہیں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں (عذاب سے) کہ تم اللہ کی ہی بندگی کرو۔ اسی سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ خدا تمہارے گناہ بخش دے گا اور وقت معین تک تمہیں مہلت دے گا۔ جب اللہ کا معین کردہ وقت آجاتا ہے تو اسے ہٹایا نہیں جاسکتا۔ اگر تم اس کا علم رکھتے ہو)۔

باب سوم میں یہ بتلایا جاچکا ہے کہ نفس انسان کو اپنا آبائی دین بہت پیارا ہوتا ہے۔ جو نقوش بچپن سے اس کے ذہن میں نقش ہوجاتے ہیں ان سے ایسی محبت ہوتی ہے کہ یہ ان کے دفاع میں جان تک قربان کردیتا ہے۔ جب اس کے کانوں میں حق کی آواز پڑتی ہے اور اس کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ میرے محبوب تخیل وعقائد کے خلاف ہے تو سخت وحشت ہوتی ہے۔ غربا وعوام میں سے تو بہت سے حق قبول بھی کرلیتے ہیں۔ اس لئے کہ تکلیف ومصیبت کے وقت ان کی توجہ خلوص سے غائب کی طرف ہوجاتی ہے لہٰذا ان کے قلوب میں حق پر غور کرنے اور قبول کرنے کی کچھ صلاحیت ہوتی ہے۔ مگر عیش وعشرت میں بسر کرنے والوں میں اکثریت کے قلوب میں کبر ونخوت بھرا ہوتا ہے۔ ان کے سامنے جب حق آتا ہے تو اس کے دشمن ہوجاتے ہیں۔ اور حق کو مٹانے اور ہر طرح کی اذیت پہنچانے کے درپے ہوجاتے ہیں اور بہت سے غربا۔ اور عوام جو ان کے متوسلین ہوں اُن کو بھی قبول حق سے باز رکھتے ہیں۔ قرآن کریم میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان علامات وکیفیات نفسی کو جو ہلاک ہونے والی اقوام کی بیان کی گئی ہیں اپنے نفسوں میں تلاش کریں۔ اگر ویسی ہی کیفیات موجود ہوں تو خدا سے توبہ کریں۔ اس کے عذاب سے ڈریں اور صدق دل سے اس سے ہدایت طلب کریں۔ جب حق کی آواز کان میں پڑے خواہ وہ ہمارے ذہنی عقائد سے کتنی ہی مخالف ہو اس کو قبول کریں۔ ذیل میں حضرت نوحؑ کی تبلیغ کا ردعمل بیان کیا جاتا ہے:۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ ھود ۔ (ان کی قوم میں سے جو سردار روگردانی کرنے والے (کافر) تھے انھوں نے کہا ہم نہیں دیکھتے ہیں تجھے مگر اپنی مثل بشر۔ ہم نہیں دیکھتے کہ کسی نے تمہاری پیروی کی ہو سوائے ان کے جو ہماری قوم میں رذیل ہیں۔ بڑی ضعیف رائے والے! اور ہم یہ بھی نہیں دیکھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت ہو، بلکہ گمان کرتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو)۔

اِن معبودوں کی عبادت چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے جن کی محبت ذہن میں بیٹھ جاتی ہے، خواہ وہ پتھر کے بت ہوں یا بولتی مورتیاں مثلاً علماء، پیر، پنڈت، پروہت، پادری وغیرہ۔ اَب سورۂ نوحؑ دیکھئے۔ حضرت نوحؑ عرض کرتے ہیں:۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾ نوح

(نوحؑ نے کہا اے رب انہوں نے میری نافرمانی کی اور اس شخص کی پیروی کی جس نے ان کے مال و اولاد میں کوئی زیادتی نہ کی تھی سوائے نقصان کے اور انہوں نے بڑی بڑی چالیں چلیں اور (افراد قوم نے) کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور ہرگز نہ چھوڑیو۔ وَدّ کو نہ سواع کو، نہ یغوث کو، نہ یعوق کو اور نسر کو)۔

نفسِ انسان کی فطرت کو کھول کھول کر بیان فرمایا ہے کہ اپنے پتھر کے بتوں سے، جن کو بچپن سے پوجتا رہا ہے، کتنی محبت ہوتی ہے کہ اِن کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتا اور ہلاک ہونا گوارا کر لیتا ہے۔ پھر غور کیجیے کہ بولتے بتوں (پیروں، عالموں، پنڈتوں) سے اس کو کتنی محبت ہوگی؟ ان کا چھوڑنا تو پتھر کے بتوں کو چھوڑنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

حضرت نوحؑ تو ساڑھے نو سو برس قوم کو بُلاتے رہے، ان کے ہاتھوں مصائب اُٹھاتے رہے اس پر بھی بہت کم ایمان لائے۔ دیکھیں سورہ عنکبوت:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ

عَاماً ... (۱۴) عنکبوت ۔ (اور ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا پس وہ ان میں رہے (یعنی ہدایت کرتے رہے) پچاس کم ہزار سال)۔

اللہ اکبر انبیاء علیہم السّلام خلق اللہ کے کیسے عاشق ہوتے ہیں کہ ان کو عذاب سے بچانے کے لئے ہر طرح سے مصائب اور بلائیں، مصیبتیں جھیلتے رہتے ہیں مگر شکایت زبان پر نہیں آتی۔ ان پر شفقت ہی کرتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السّلام جس طرف سے گزرتے لوگ آوازے کستے، مجنوں ہے، پاگل ہے، اس کی بات نہ سننا، بچے تالیاں پیٹتے، پتھر مارتے، لوگ بچوں کو گود میں لئے یا کندھوں پر بٹھائے آتے اور بچوں کو دکھا دکھا کر کہتے یہ شخص پاگل ہے اس کی بات نہ سننا۔ جب حق کی آواز دلوں پر اثر کرنے لگی تو ہر طرف سے حضرت پر پتھر برسانے لگتے اور سنگسار کر کے جب سمجھ لیتے کہ مر گیا ہے تب چھوڑتے۔ حضرتؑ عرصہ تک زخم کھائے بیہوش پڑے رہتے۔ جب ہوش آتا پھر کارِ ہدایت میں مصروف ہو جاتے۔

ممکن ہے کسی کے دل میں وسوسہ آئے کہ جب وہ عارفِ کامل تھے، نبی تھے، معیت اللہ حاصل کئے ہوئے تھے تو وہ سنگسار کیوں ہوتے تھے۔ وہ تو قوّتِ ارادی سے ہی انھیں مرعوب کر سکتے تھے، پتھروں کو انھیں کی طرف لوٹا سکتے تھے۔ پھر کیا ان میں یہ قوّت نہ تھی؟۔

یہ امر تو یقینی ہے کہ نبی کو معیت اللہ حاصل ہوتی ہے۔ بغیر خود اپنے اذن کے کوئی مادّی شے ان پر اثر نہیں کر سکتی۔ مگر خلق اللہ کے عاشق مخلوق کی ہدایت پر حریص ہوتے ہیں۔ قانونِ فطرت ہے کہ قلوب کو متاثّر کرنے کا بہترین ذریعہ ہنگامہ دَرد ہے۔ اس لئے انبیاء پر لازم ہے کہ مظلوم بن کر دلوں کو کھینچیں اگر وہ جانتے ہوں کہ ان کی مظلومی کے اثر سے ایک شخص بھی متاثّر ہو کر ایمان لے آئے گا تو وہ انتہائی مظالم اُٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور اس وقت تک مظالم سہتے رہیں گے جب تک ایک بھی ایمان لانے والا باقی ہوگا بس باوجود اس کے کہ خدائی طاقتیں ان کے ساتھ ہیں ان کا ظلم سہنا ان کا مکر ہے۔ لیکن جب حضرت نوحؑ پر منکشف ہو گیا کہ اب اس قوم میں ایمان لانے والا نہیں تو آپؑ نے بددعا کی جیسا کہ ذیل کی آیات سے ظاہر ہے:۔

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (۳۶) وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ

فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ ہود

(اور نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ اب تیری قوم میں سے کوئی بھی ایمان نہ لائے گا علاوہ ان کے جو ایمان لا چکے ہیں۔ اب تم ان کے لئے غم نہ کھاؤ۔ اس پر جو یہ کرتے ہیں اور ہماری نگرانی اور حکم سے کشتی بناؤ اور مجھ سے ظالموں کے بارے میں بات نہ کرنا لازماً وہ غرق ہونے والے ہیں)۔

خدا کا حکم جاری ہو چکا۔ خبر دے دی گئی کہ اس قوم پہ عذاب آئے گا۔ سب کے سب غرق ہو جائیں گے۔ پھر بھی حضرت نوحؑ یہ دعا فرماتے ہیں:-

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾ نوحؑ

(اور نوحؑ نے کہا اے میرے رب زمین پر کافروں کو بسا ہوا نہ چھوڑ تحقیق کہ اگر تو ان کو چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان سے نہیں پیدا ہوں گے مگر بدکار کٹر کافر۔ اے میرے رب میرے مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اس کو بھی جو میرے گھر میں ایمان لائے ہوئے داخل ہو۔ اور ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کو بھی اور ظالموں کے لئے کچھ زیادہ نہ کر سوائے تباہی کے)۔

درست ہے ان کو معلوم تھا کہ عذاب آنے والا ہے سب غرق ہو جائیں گے مگر لوگوں کو وحی کی کیا خبر۔ اس لئے بددعا کرتے ہیں کہ سب پر ظاہر ہو جائے ممکن ہے کسی دل پر عذاب کا خوف غالب آجائے اور وہ حق کی طرف رجوع کرے۔ یہ بھی ایک مکر ہے۔

بددعا کے بعد مغفرت کی دعا فرماتے ہیں تو اس میں اپنے اہل وعیال کے لئے کچھ نہیں کہتے، جانتے ہیں کہ وہ غرق ہونے والے ہیں۔ اس لئے صرف مومنین اور مومنات کے لئے ہی دعا فرماتے ہیں۔

غرضکہ حضرت نوحؑ نے کشتی بنانا شروع کی تو حسب مشیت ایزدی اسکی لمبائی بارہ سو ہاتھ، چوڑائی آٹھ سو ہاتھ اور اونچائی اسی ہاتھ رکھی۔ حضرت نوحؑ نے عرض کی ربا اس کے بنانے

میں میری کون مدد کرے گا۔ حکم ہوا اعلان کر دو کہ جو شخص کشتی بنانے میں میری مدد کرے گا تو جتنا وہ چھیلے گا وہ سب چاندی سونا بن جائے گا۔ جب کسی شخص نے امتحاناً لکڑی کاٹنی چھانٹنی شروع کی تاکہ دیکھے یہ سچ کہتا ہے یا نہیں اور لکڑی کا چھیلن واقعی سونا بن گیا تو قوم کے اکثر افراد کشتی بنانے میں سونے کے لالچ میں آگئے اور کشتی تیزی سے بننے لگی۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ جب خدا کی مدد ان کے ساتھ تھی تو کیا مومنین ہی ان کی مدد کے لئے کافی نہ تھے۔ پھر کفار و مشرکین کی امداد کی کیا ضرورت تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کا ہر کام ہدایت خلق کے لئے ہوتا ہے۔ اس میں چند خاص اہم امور ہیں۔ ایک تو یہ کہ قوم کو معلوم تھا اور خبر دی گئی تھی کہ طوفان آئے گا اور وہ سب غرق ہو جائیں گے۔ پھر جب لکڑی کا تراشا ان کے سامنے سونے چاندی میں تبدیل ہوگا تو ممکن ہے یہ معجزہ دیکھ کر ہی کوئی شخص وعید عذاب کو سچا سمجھ لے دوسرے یہ کہ قیامت تک آنے والوں کے لئے کھلی ہوئی ہدایت ہے کہ دیکھو سونے چاندی کا لالچ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے غرق ہونے کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ یہ پوشیدہ تدابیر ہیں اور انہیں کو مکر کہتے ہیں۔

غرضکہ جب کشتی تیار ہوگئی تو ارشاد ہوتا ہے:۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ قف وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ط قَالَ إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿٣٨﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُقِيمٌ ﴿٣٩﴾ ہود

(اور نوحؑ کشتی بنانے لگے۔ جب بھی قوم کے سربرآوردہ لوگ ان کے پاس سے گزرتے تو ہنسی اڑاتے تھے۔ (حضرتؑ) کہتے اگر اس وقت تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو ہم بھی تمہاری ہنسی اڑائیں گے جیسے کہ آج تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو اور عنقریب جان لو گے کس پر عذاب آتا ہے کہ ذلیل کر دے اس کو اور کس پر عذاب مقیم آتا ہے)۔

قوم کے رؤسا جب گزرتے تو ہنسی اڑاتے تھے کہ دیکھو اس کی بے عقلی خشکی میں کشتی بنا رہا ہے۔ کلام اللہ کے ہر فقرے میں ہدایت ہے۔ یہ کیفیت نفس بیان کی گئی ہے کہ عقائد باطلہ جو بچپن سے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں وہ اندھا کر دیتے ہیں۔ آنکھوں پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں۔

حضرت نوحؑ کی قوم کے لوگ یہ دیکھتے ہوئے کہ معجزے سے لکڑی کے تراشے سونا چاندی ہو جاتے ہیں پھر بھی حضرت نوحؑ کی تصدیق نہیں کرتے اور ان کے وعید عذاب کو سچا نہیں سمجھتے۔ اس سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے کہ جب حق واضح ہو جائے اس کو قبول کرنا لازم ہے، آگے ارشاد ہے:۔

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۴۰﴾ ہود۔

(یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا اور تنور جوش مارنے لگا ہم نے کہا (اے نوحؑ) ہر قسم کے جانداروں میں سے جوڑا (دو) لے لو اور اپنے گھر والوں کو، سوائے ان کے جن کی ہلاکت کا حکم پہلے ہو چکا ہے، اور جو لوگ ایمان لائے ہیں سب کو کشتی میں بٹھا لو اور ان کے ساتھ تھوڑے ایمان لائے)۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰی نُوْحُ ِۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۴۲﴾ ہود

(حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھیوں سے) کہا اس میں سوار ہو جاؤ اللہ کے نام سے ہی اس کا بہاؤ اور ٹھیراؤ ہے۔ بے شک میرا رب غفور رحیم ہے۔ اور کشتی ان کو لے کر پہاڑ جیسی موجوں پر چل رہی تھی اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا جو ایک گوشہ میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ اے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ نہ ہو)۔

حضرت نوحؑ جانتے تھے یہ غرق ہوگا ہرگز ایمان نہ لائے گا۔ یہ تو تعلیم دینی تھی کہ وقت آخر تک بھی اتمام حجت لازم ہے۔ جب اس نے کشتی میں بیٹھنے سے انکار کیا۔ اور کہا:۔

قَالَ سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ﴿۴۳﴾ ہود

(اس نے کہا میں کسی پہاڑ کا سہارا لئے لیتا ہوں وہ مجھے پانی سے بچا لے گا (حضرت نوحؑ نے) کہا آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں بس (وہی بچ سکے گا) جس پر وہ (رب) رحم کرے اور ان کے درمیان موج حائل ہو گئی پس وہ غرق ہونے والوں میں ہو گیا)۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَتَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۴۷﴾ ہود

(اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا پس کہا اے میرے رب تحقیق کہ میرا بیٹا میرے اہل سے ہے۔ اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو احکم الحاکمین ہے۔ خدا نے فرمایا یہ تیرے اہل سے نہیں ہے وہ بیشک بداعمال ہے۔ پس نہ سوال کرو مجھ سے اس چیز کا جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔ ہم تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم نادانوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ کہا (نوحؑ نے) اے رب میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں سوال کروں ایسی بات کا جس کا مجھے علم نہ ہو اور اگر تو مجھے نہ بخشے گا اور مجھ پر رحم نہ کرے گا تو میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہو جاؤں گا)۔

اس پر وساوس پیدا ہوتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کو حکم دیا گیا تھا: "لَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ" (مجھ سے ظالموں کے متعلق بات نہ کرنا وہ تو غرق ہونے والے ہیں) لیکن پھر بھی اس نہی کے باوجود جب بیٹا غرق ہونے لگا تو حضرت نوحؑ اس کے بچانے کی دعا کرنے لگے؟ بہت سے یہ کہتے ہیں کہ جب بیٹا غرق ہونے لگا تو محبت پدری جوش میں آئی فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھ گئے۔ یہ سب نادانی کی باتیں ہیں: انبیاء پر جذبات حیوانی غالب نہیں ہوتے۔ ان کی تو محبت بھی اللہ کے لئے ہوتی ہے اور عداوت بھی اللہ کے لئے اگر بیٹے کو عذاب سے بچانے کے لئے ان کے دل میں خواہش ہوتی تو جس وقت قوم کی ہلاکت کے لئے بددعا کی تھی اور مومنین و مومنات کی بخشش طلب کی تھی اسی وقت یہ بھی کہتے کہ الٰہی سب کو ہلاک کر دینا سوائے میرے بیٹے کے۔

انبیاء کا ہر کام ہدایت خلق کے لئے ہوتا ہے ان حالات پر غور کریں کہ ان سے کتنے مطالب نکلتے ہیں جو باعث ہدایت خلق ہیں:۔

① حق کی راہ میں قرابت کا لحاظ نہیں کرنا چاہیئے۔ مومن کو محبت یا عداوت خدا کے لئے

ہی کرنی چاہئے۔

(۲) بارگاہِ احدیت میں کسی عارفِ کامل، کسی متقی و پرہیز گار، حتیٰ کہ کسی نبی و رسول کی قرابت بھی کام نہیں آسکتی۔ وہ تو دلوں کا حال جانتا ہے۔ وہاں تو بندے کے اعمالِ خیر ہی کام آتے ہیں۔

(۳) اہلِ علم کو دکھانا تھا کہ میں خدا کے مقرب و برگزیدہ بندوں میں سے ایک بندہ ہوں۔ مجھ سے لاعلمی میں ذراسی غلطی ہوگئی۔ فوراً عتاب آمیز خطاب ہوگیا۔ اس کی بارگاہِ عظمت و جلال سے ہر وقت پناہ مانگتے رہنا کہ وہ غلطیوں سے محفوظ رکھے۔

(۴) ذراسی بھول پر ایک برگزیدہ بندہ ہوتے ہوئے بھی مجھے بخشش طلب کرنی پڑی۔ اس کے عذاب سے ہر وقت ڈرتے رہو کسی چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو بھی ہلکا نہ جانو۔

غرضکہ مقصد تو ہدایتِ خلق ہے مگر ظاہر یہ کرتے ہیں کہ بیٹے کی محبت غالب آگئی۔ اس کا غرق ہونا نہ دیکھا گیا۔ فوراً بے اختیار اس کے بچانے کے لئے دُعا کرنے لگے۔ یہ حضرت نوحؑ کا مکر ہے۔ اگر انبیاء کرام کی زندگی کے مفصّل حالات لکھے جائیں تو ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا بعض انبیاء کے حالات میں سے صرف چند ایسے واقعات قارئین کرام کے لئے پیش کرتا ہوں جن سے اصل مقصد ظاہر ہو جائے۔

حضرت ابراہیمؑ

نمرود عراق میں ایک وسیع و عظیم سلطنت کا بادشاہ تھا۔ اس کو نجومیوں نے خبر دی تھی کہ ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو اس مروّجہ دین کو باطل کردے گا اور تیری سلطنت زائل ہو جائیگی۔ نمرود نے حکم دیا کہ مرد عورتوں سے علیحدہ رہیں اور بہت سی دائیاں مقرر کردیں کہ حاملہ عورتوں کی نگرانی کریں اور جو بچّہ پیدا ہو اسے قتل کردیا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ کی والدہ کا حمل ظاہر نہ ہوا۔ جب آثارِ وضعِ حمل محسوس ہوتے تو پہاڑ کے ایک غار میں چلی گئیں۔ وہیں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے۔ ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر وہیں چھوڑ دیا۔ غار کے دروازے کو ایک پتھر سے بند کر دیا اور اپنے گھر واپس آگئیں۔ نمرود کے خوف سے بار بار وہاں نہیں جاسکتی تھیں کہ اگر خبر ہوگئی تو وہ بچّے کو قتل کروادے گا۔ اسی طرح کتنے ہی روز گزر گئے۔ پھر ایک روز غار میں

گئیں تاکہ بچے کا حال دیکھیں۔ دیکھا کہ ان کی آنکھیں ستارے کی طرح چمک رہی ہیں اور اپنا انگوٹھا چوس رہے ہیں! انگوٹھا منہ سے نکال کر دیکھا تو اس میں سے دودھ کی دھاریں نکل رہی تھیں (منقول از روایات)۔ انبیاء کو معیت اللہ حاصل ہوتی ہے۔ وہ تو حامل نور پیدا ہوتے ہیں اور ان کو مادے کی احتیاج نہیں ہوتی مگر ہدایتِ خلق کے لئے لازم ہے کہ بشر بنے ہوئے رہیں۔ اہلِ دنیا پر ایسے حالات ظاہر کرتے رہیں جیسے کہ عام لوگوں کے ہوتے ہیں۔ روایات میں وارد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ایک دن میں اتنے بڑھتے تھے جتنے اور بچے ایک مہینہ میں بڑھتے ہیں۔ روایات پڑھنے والے اس پر غور نہیں کرتے کہ جو قادرِ مطلق انگوٹھے سے دودھ نکال سکتا ہے وہ کیا بغیر دودھ کے پرورش نہیں کر سکتا؟ مگر چونکہ انسان کی نظر اسبابِ ظاہری پر ہی رہتی ہے لہٰذا ایک سبب ظاہری ان کی تسلی کے لئے دکھا دیا جاتا ہے اور یہی مکر ہے۔

غار سے نکلنا اور قوم کو ستارہ پرستی میں دیکھنا

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٨﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٧٩﴾ الانعام

(پس جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو ایک ستارے کو دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ پس جب وہ غروب ہوا تو کہا میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ پھر جب چاند کو چمکتے دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ غروب ہوا تو کہا اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ کرتا تو میں گمراہوں میں شامل ہو جاتا۔ پس جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ غروب ہو گیا کہا: اے قوم میں بیزار ہوں اس سے جو تم شرک کرتے ہو۔ تحقیق کہ میں نے اپنے نفس کو متوجہ کیا ہے اس ذات کے لئے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور میں مشرکوں

میں سے نہیں ہوں)۔

اِس سے ظاہراً تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؑ کو رب کی معرفت حاصل نہ تھی بلکہ جستجو تھی کہ اس کائنات کی علت کیا ہے۔ لہٰذا ستارے کو پہلے رب سمجھ لیا پھر چاند کو رب جانا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو اس قول کا کیا مطلب ہوتا ہے کہ اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ کرتا تو میں گمراہ ہو جاتا؟۔ انبیاء کا ہر کام ہدایتِ خلق کے لئے ہوتا ہے اِس وقت کے (ستارہ) اور مظاہر پرستوں کی ہدایت کے لئے پہلے ان پر ان کا ہم خیال ہونا ظاہر کیا جس سے وہ ان کی بات سننے پر توجہ دے سکیں۔ پھر ان پر حجّت قائم کر دی اور ظاہر کر دیا کہ جس میں تغیّر ہو وہ رب نہیں ہو سکتا۔ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ہدایت کا دروازہ کھول دیا کہ مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ کریں اور ان کی علت کی تلاش کریں کہ ان کا پیدا کرنے والا کون ہے۔ یہ تمام جو کچھ ظاہر کیا مکر ہی تھا۔ اس لئے جو ظاہر کیا جائے اور وہ حقیقت نہ ہو اسی کو مکر کہتے ہیں۔

مُردوں کو زندہ کرنا

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ البقرة

(جب ابراہیمؑ نے کہا اے رب میرے مجھے دکھا دے تو کس طرح مردے زندہ کرتا ہے فرمایا کیا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا۔ عرض کی بے شک (میں) ایمان رکھتا ہوں مگر یہ تو اس لئے چاہتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان حاصل ہو جائے۔ کہا چار پرندے لے لو۔ ان کو اپنے سے ہلا لو۔ پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ٹکڑا رکھ دو۔ پھر ان کو بلاؤ۔ تمہارے پاس دوڑتے آئیں گے۔ اور جان لو اللہ ہر شے پر غالب اور حکمت والا ہے)۔

حضرت ابراہیمؑ نے حسبِ حکم چار پرندے ذبح کر کے ان کے اجزا پہاڑوں پر منتشر کر دیئے اور ان کے سر اپنے پاس رکھے۔ روایت کے مطابق ایک مور، ایک کوا، ایک

مرغ اور ایک کبوتر تھا۔ مور کو پکارا تو اس کے اجزاء اکٹھے ہوئے اور مور پورا بن کر اُڑا۔ اسی طرح چاروں کے اجزاء ان کے سروں سے آکر ملے اور سب زندہ ہو گئے۔

لائق غور امر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیا اس پر یقین قلبی حاصل نہ تھا حالانکہ خود ہی اس کا اقرار کر رہے ہیں کہ ربّا میں اس پر تو پورا ایمان رکھتا ہوں کہ تو مُردے کو زندہ کر سکتا ہے لیکن یہ سوال اس لئے کرتا ہوں کہ میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔ تو ایمان بالقلب رکھتے ہوئے بھی اطمینان نہ ہونا چہ معنے دارد؟۔ اور کمال یہ کہ خدا سے مظاہرہ کی درخواست پر اصرار۔ یہ سب کیا ہے؟

انبیاء علیہم السلام کا ہر کام ہدایتِ خلق کے لئے ہوتا ہے۔ یہ تو ہر شخص جو خدا کو مانتا ہے ضرور جانتا ہے کہ اللہ مُردے زندہ کرنے پر قادر ہے مگر یہ تو محض الفاظ ہیں انسان کے ذہن پر گہرا نقش بٹھانے کے لئے مظاہرے کی ضرورت ہے۔ جب کوئی مظاہرہ کر کے دکھایا جاتا ہے تو جو لوگ حاضر ہوتے ہیں بچشم خود مشاہدہ کر لیتے ہیں اور بعد کے آنے والوں کے لئے وہ ایک قصّہ بن جاتا ہے جو زبان زد ہو جاتا ہے اور نسلاً بعد نسلاً نقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے آنحضرتؑ نے یہ مظاہرہ کر کے ہمارے لئے شمع ہدایت روشن کر دی تاکہ آنکھوں والے دیکھ لیں۔ ظاہر کچھ ہے اور حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ ہی انبیاء کا مکر ہے۔

بُت شکنی اور آگ میں ڈالا جانا

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ
﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ
سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا
تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾
فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ

وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾ قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿٩٧﴾ فَأَرَادُوا بِهِ
كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴿٩٨﴾ الصّٰفّٰت

(اور تحقیق کہ اس (نوحؑ) کے گروہ میں ہی ابراہیم تھے جب کہ وہ اپنے رب کی طرف پوری توجہ قلبی سے متوجہ ہوئے جب اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو۔ کیا جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا چاہتے ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا جہانوں کے رب کے ساتھ۔ پس انہوں نے ستاروں کی طرف نظر کی اور کہا میں بیمار ہوں پس لوگ ان کو چھوڑ کر چلے گئے، پس وہ ان کے معبودوں (بتوں) کے پاس گئے۔ کہا تم کھاتے کیوں نہیں تم کو کیا ہوا کہ تم بولتے نہیں، پھر قوت سے مارتے ہوئے ان پر آئے۔ پس لوگ دوڑتے ہوئے ابراہیم کے پاس آئے! انہوں نے کہا تم ان ہی چیزوں کی عبادت کرتے ہو جن کو آپ ہی تراشتے ہو حالانکہ تم کو اور ان سب چیزوں کو جو تم بناتے ہو اللہ نے ہی پیدا کیا ہے انھوں نے (آپس میں) کہا ایک بھٹی سی عمارت بناؤ اس میں اسے آگ میں ڈال دو۔ انھوں نے ارادہ کیا اس (ابراہیمؑ) کے ساتھ چال چلنے کا پس ہم نے انھیں نیچا دکھا دیا)۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ﴿٥١﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ
وَقَوْمِهِ مَا هَٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ﴿٥٢﴾ قَالُوا وَجَدْنَا
آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ﴿٥٣﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿٥٤﴾
قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ ﴿٥٥﴾ قَالَ بَلْ رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٥٦﴾ وَتَاللَّهِ
لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ بَعْدَ أَنْ تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ ﴿٥٧﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا
لَهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ﴿٥٨﴾ قَالُوا مَنْ فَعَلَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ
الظَّالِمِينَ ﴿٥٩﴾ قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ ﴿٦٠﴾ قَالُوا
فَأْتُوا بِهِ عَلَىٰ أَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ ﴿٦١﴾ قَالُوا أَأَنْتَ فَعَلْتَ هَٰذَا
بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِنْ

كَانُوا يَنطِقُونَ ﴿٦٣﴾ فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنتُمُ الظَّالِمُونَ
﴿٦٤﴾ ثُمَّ نُكِسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هَٰؤُلَاءِ يَنطِقُونَ ﴿٦٥﴾
قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ أُفٍّ
لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا
آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ﴿٦٨﴾ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ
إِبْرَاهِيمَ ﴿٦٩﴾ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ﴿٧٠﴾ الانبیاء۔

(اور ہم نے اس سے پہلے ابراہیمؑ کو فہم سلیم دی تھی اور ہم اس کو جانتے تھے جب اس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا یہ کیا مورتیاں ہیں تم جن کے لئے اعتکاف کرتے ہو، انھوں نے کہا ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔ ابراہیمؑ نے کہا بے شک تم اور تمہارے باپ دادا کھلی ہوئی گمراہی میں تھے ۔ انہوں نے کہا کیا تو ہمارے واسطے حق لایا ہے یا دل لگی کرنے والوں میں ہے (حضرتؑ نے) کہا بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور میں اس بات پر گواہوں میں سے ہوں (اپنے دل میں کہا) قسم خدا کی تمہارے پیٹھ پھیرنے کے بعد تمہارے بتوں کے ساتھ ایک چال چلوں گا پس ان کو (حضرت ابراہیمؑ نے) ٹکڑے ٹکڑے کر دیا سوائے بڑے بت کے تاکہ لوگ اس کی طرف رجوع کریں۔ انہوں نے کہا۔ یہ کام جس نے ہمارے معبودوں سے کیا ہے وہ یقیناً بڑا ظالم ہے۔ لوگوں نے کہا ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا ہے جس کو ابراہیم کہا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا سب لوگوں کی نگاہوں کے سامنے اسے لے آؤ تاکہ سب اس کو دیکھیں انہوں نے (ابراہیمؑ سے) کہا کیا تم نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کیا ہے اے ابراہیم۔ (حضرتؑ نے) کہا بلکہ وہ تو ان کے اس بڑے بت نے کیا ہے پوچھ لو ان سے اگر یہ بول سکتے ہیں پس انہوں نے اپنے جی میں سوچا اور (آپس میں) کہنے لگے بیشک تم ہی لوگ ناحق پر ہو۔ پھر انہوں نے اپنے سر کو جھکا لیا اور کہا تم کو تو معلوم ہے یہ بولتے نہیں۔ (حضرت ابراہیمؑ نے کہا) کیا تم خدا کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور ان پر جن کی تم عبادت کرتے ہو پس کیا تم عقل سے کام نہیں لوگے؟ وہ (آپس میں) کہنے لگے اگر

تم کچھ کر سکتے ہو تو اس کو آگ میں جلادو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ (جب ان کو آگ میں ڈالا) ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کے لئے سلامتی کا باعث۔ انہوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ چال چلنی چاہی ہم نے ان کو ناکام کر دیا)۔

روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے آذر کو اور اپنی قوم کو بُت پرستی سے باز رکھنے کے لئے بہت کچھ نصائح کئے ان پر حجتیں قائم کیں۔ جب ان سے دریافت کیا کہ تم اپنی ہی تراشی ہوئی پتھر کی مورتیوں کو کیوں پوجتے ہو تو قوم کا یہی جواب تھا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو یہی کرتے ہوئے پایا ہے۔

کلام اللہ میں ہر نبی و رسول کے ذکر میں یہ موجود ہے کہ جب کسی قوم سے دریافت کیا گیا کہ تم ان معبودوں کو کیوں پوجتے ہو جو نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان تو ہر قوم کا یہی جواب ہوا ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی دین پر اور ان کی پرستش کرتے پایا ہے، ہم اپنے باپ دادا کے دین کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ نفسِ انسان کی فطرت ہے کہ جو نقوش بچپن سے اس پر بن جاتے ہیں اس کو بہت محبوب ہوتے ہیں۔ جب پتھر کے صامت بتوں کا چھوڑنا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب محال ہے تو پھر آبائی مذہب کے علماء یا فقراء جو بولتے بُت ہیں ان کا چھوڑنا کتنا مشکل ہوگا؟ ان کے لئے تو کلام پاک میں فرمانِ ربّ العزت ہے:۔ (انہوں نے اپنے عالموں اور پیروں کو خدا کے سوائے ربّ قرار دے لیا)۔ بس ان کے قول کو بغیر عقل سے کام لئے حق سمجھ لیتے ہیں۔ واقعی ان بولتے بتوں کی بندگی سے چھٹکارا پانا بہت دشوار ہے۔ اس شرک سے تو وہی نجات پا سکتا ہے جو بصدقِ دل بارگاہِ ربّ العزت سے نصرت و تائید طلب کرے اور "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" کا ورد رکھے۔

غرضکہ حضرتؑ کے مواعظ و نصائح کا کسی پر اثر نہ ہوا۔ وہ لوگ سال میں ایک بڑی عید مناتے تھے۔ بتوں کو کندھوں پر رکھ کر شہر سے باہر جاتے وہاں جنگل میں منگل ہو جاتا۔ خوب ڈیرے خیمے سجاتے، جشن مناتے عید آئی تو سب لوگ مع نمرود عید گاہ گئے۔ حضرت ابراہیمؑ سے آذر نے کہا تم بھی چلو آپ نے جواب دیا۔ میں بیمار ہوں۔ مطلب یہ تھا کہ لوگ مجھے

یہاں چھوڑ جائیں۔ آذر نے بُت خانے کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں اور کہا، بتوں کے سامنے کھانا رکھ دیجیو۔ جب یہ لوگ چلے گئے تو حضرت ابراہیمؑ نے سب بتوں کے سامنے کھانا رکھا اور ہر ایک سے کہتے تھے ارے کھاتا کیوں نہیں! ارے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم بولتے کیوں نہیں؟ پھر تیشہ لے کے ہر ایک کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے اور تیشہ کو بڑے بُت کے گلے میں لٹکا دیا یا اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔

صاحبانِ فکر غور کریں کیا حضرتؑ نہ جانتے تھے کہ یہ بُت نہ کھا سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں؟ پھر ان سے یہ کہنا کہ کھاتے کیوں نہیں، بولتے کیوں نہیں، یہ تو ایک فعلِ عبث ہُوا۔ بچوں اور نادانوں کی سی باتیں ہو گئیں۔ مگر انبیاء کے کام تو عقل پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کا ہر کام ہدایتِ خلق کے لئے ہوتا ہے۔ وہ مظاہرہ تو اسی لئے کیا کرتے ہیں کہ وہ قصّے کے طور پر زبان زد ہو جائے۔ یہ تو محض اس لئے کہا ہے کہ قصّہ پُر لطف ہو جائے۔ بچوں کو سنائیے وہ بھی اس سے لطف اُٹھائیں گے اور ان کو بھی حفظ ہو جائے گا۔

جب نمرود، رؤسا۔ وسردارانِ لشکر اور تمام لوگ واپس آئے اور بتوں کو ٹوٹا ہُوا دیکھا تو کہنے لگے جس نے بھی یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ کی ہے اس نے بڑا ظلم کیا ہے۔ لوگوں نے کہا ایک نوجوان کو ہم نے بتوں کو بُرا بھلا کہتے سُنا ہے اس کا نام ابراہیمؑ ہے نمرود نے حکم دیا اس کو سب کے سامنے حاضر کرو۔ پس ان کو نمرود کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے حضرتؑ سے دریافت کیا کہ یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ کس نے کی ہے حضرتؑ نے کہا یہ تو بڑے بُت نے کی ہے تم ان ہی سے پوچھ لو۔

سُبحان اللہ کیسی حجت اُن پر تمام کی ہے کہ سب سردارانِ لشکر اور حاضرین کے شرم سے سَر جُھک گئے اور دل میں تو سمجھ گئے کہ ہم بڑی نادانی اور غلطی پر ہیں مگر آبائی مذہب کا تعصب غالب آیا اور بے شرمی سے کہنے لگے، یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ یہ بول نہیں سکتے۔ حضرتؑ نے فرمایا پھر تم اس خدا کو چھوڑ کر جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اپنے تراشے ہوئے بے جان پتھروں کو کس لئے پوجتے ہو جو بول بھی نہیں سکتے اور تم کو کوئی نفع بھی نہیں پہنچا سکتے۔ نہ تم کو کوئی نقصان ہی دے سکتے ہیں جس کے ڈر سے انہیں پوجتے ہو، اس

حجت کا ان کے پاس کیا جواب تھا۔ آپس میں کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کی توہین کا انتقام لینا ضروری ہے، اس کو آگ میں جلا دینا چاہیئے، یہ فطرتِ نفسِ انسان ظاہر کی گئی ہے کہ جب حق سامنے آتا ہے اور حجت تمام ہو جاتی ہے، کوئی حیلہ باقی نہیں رہتا تو وہ حق گو کا دشمن ہو جاتا ہے اس کو ہی مٹا ڈالنا چاہتا ہے اور کوئی کوشش و کسر باقی نہیں چھوڑتا۔

بالآخر تعصبِ مذہب آبائی غالب آیا اور نفسِ امارہ نے شرم دلائی: اے بے غیرتو! اپنے معبودوں کی مدد کرو اس توہین کا انتقام لو، اپنے معبودوں کے ہاتھ پیر توڑنے والے کو آگ میں جلا دو! چنانچہ متفقہ فیصلہ ہو گیا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں جلا دینا چاہیئے۔ نمرود نے حکم دیا کہ ابراہیمؑ کو قید خانے میں ڈال دو۔ اور آنحضرتؑ قید کر دیئے گئے۔

صاحبانِ عقل کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس پر غور کریں کہ حضرت ابراہیمؑ اگر چاہتے تو کسی وقت بھی بُت کے قریب نہ جاتے اور بُتوں کو حکم دیتے کہ گر کر ٹوٹ جائیں تو کیا ایسا نہ ہوتا؟ دُوسرا امر یہ کہ جس کو معیت اللہ حاصل ہو اس پر تو کوئی غلبہ حاصل نہیں کر سکتا لیکن حضرتؑ عام آدمیوں کی مانند قید میں بیٹھے رہے۔

قارئین خود ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ اگر بُت اس طرح توڑے نہ جاتے بلکہ خود بخود گر کر ٹوٹ جاتے تو ان کے پجاری یہ سمجھتے کہ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جس کے باعث ہمارے معبود ہم سے ناراض ہو گئے۔ اگر حضرت ابراہیمؑ خود بھی کہتے کہ مَیں نے تمہارے بتوں کو گرایا ہے تو کوئی یقین نہ کرتا اور مُشرکین پر حُجّت تمام نہ ہوتی اور نہ یہ ہنگامہ برپا ہوتا جس کا تذکرہ آج تک باعثِ ہدایتِ خلق ہے۔ اور قید ہونا اس لئے ضروری تھا تاکہ عملی طور پر یہ دکھادیں کہ مَیں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں۔ اس طرح حکم باری "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" (کہہ دو مَیں تمہاری مثل ایک بشر ہوں) کی عملی تفسیر دکھادیں۔

نمرود نے تمام رعایا کو حکم دیا کہ فلاں میدان میں لکڑیاں جمع کریں۔ ہر شخص اس میں مُعاون ہُوا اور لکڑیاں جمع ہونے لگیں۔ اسی انبار کے قریب ایک بلند مقام یا عمارت تعمیر کی گئی تاکہ نمرود اور اس کے وزرا۔ وہاں بیٹھ کر حضرتؑ کو آگ میں جلتے ہوئے دیکھیں۔ جب انتظام مکمل ہو گیا تو لکڑیوں کے انبار میں آگ لگا دی گئی۔ نمرود بلند عمارت پر بیٹھا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کو لایا گیا تو مشکل یہ پیش آئی کہ آگ کے قریب جانا تو ممکن نہیں تھا شعلے اتنے بلند تھے کہ پرندہ بھی اُوپر سے اُڑ کر نہیں گزر سکتا تھا، آگ میں ڈالا جائے تو کیسے ڈالا جائے۔ کسی شیطان نے یہ تجویز پیش کی، حضرت ابراہیمؑ کو گوپھن میں ڈال کر پھینکا جائے۔ گوپھن تیار کی گئی اور حضرتؑ کو اس میں بیٹھا کر پھینکا گیا۔ فوراً حکم ہوا "یَانَارُ کُونِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرٰهِیْمَ" (۶۹) الانبیاء (اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیمؑ کے لئے سلامتی کا باعث ہو جا)۔ نمرود اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ ایک پُر فضا باغ میں بہ آرام بیٹھے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف لالہ و گل اُگے ہوئے ہیں۔ اس وقت نمرود نے آذر سے کہا، تیرا فرزند اپنے پروردگار کے نزدیک کس قدر گرامی ہے۔

صاحبانِ فکر غور کریں کہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لکڑیاں آگ ہی نہ پکڑیں یا جس وقت آنحضرتؑ کو آگ کے قریب لایا گیا تھا اسی وقت آگ سرد ہو جاتی مگر اتمام حجّت نہ ہوتا۔ لہٰذا اس وقت تک ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے، مجھے معیت اللہ حاصل ہے، جب تک کہ شعلے ایسے تیز نہ ہو گئے کہ کسی کو اس کے قریب جانے کی سکت نہ رہی۔ اس وقت بھڑکتے شعلوں میں پہنچ کر اپنے رب کی قدرت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ نمرود کو بھی ان کے پروردگار کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا مکر تھا۔

غرضکہ جب حضرت ابراہیمؑ کئی روز ٹھہرنے کے بعد آگ سے صحیح و سلامت باہر آئے اور نمرود کو معلوم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو شہر سے نکال دو کیونکہ اگر وہ شہر میں رہیں گے تو تمہارے دین کو فاسد کر دیں گے اور تمہارے خداؤں کو ضرر پہنچائیں گے، چنانچہ ابراہیمؑ اپنے خالہ زاد بھائی حضرت لوطؑ کو، جو ان پر ایمان لائے تھے، اور ان کی بہن حضرت سارہ کو جن سے حضرتؑ نے عقد کر لیا تھا ہمراہ لے کر مع اموال و اسباب شام کی طرف روانہ ہوئے اور کہا اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (۹۹) الصافات (میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں وہ ہی میری رہبری کرے گا)۔ آپ نے حضرت سارہؑ کو ایک صندوق میں بٹھا لیا تھا، مال مویشی ساتھ تھے۔ نمرود کے ملک سے نکل کر ایک قبطی بادشاہ کے ملک میں داخل ہوئے تو چنگی والوں نے روکا اور مال کا محصول لینا شروع کیا۔ جب

صندوق کی باری آئی تو انہوں نے کہا اس صندوق کو کھولو تاکہ جو کچھ اس میں ہے اس کا بھی محصول لیا جائے ۔ حضرتؑ نے کہا اس کو نہ کھولو بلکہ جو کچھ بھی تم فرض کر لو اس کے اندر ہے اس کے انداز سے جتنا چاہو محصول لے لو ۔ مگر وہ نہ مانے اور کہا پھر اس کا فیصلہ تو ہمارا بادشاہ ہی کر سکتا ہے اور اب یہ صندوق اس کے سامنے پیش ہوگا ۔

وہ لوگ صندوق کو لے کر چلے تو حضرتؑ نے لوطؑ کو اموال کے پاس چھوڑا اور خود صندوق کے ساتھ بادشاہ کے پاس پہنچے ۔ بادشاہ نے جبراً صندوق کھلوایا تو حضرت سارہؑ کے حسن و جمال کو دیکھ کر مبہوت ہوگیا ۔ پوچھا یہ تمہاری کون ہے ؟ حضرتؑ نے فرمایا یہ میری (دینی خالہ زاد) بہن ہے ۔ بادشاہ ضبط نہ کر سکا بے اختیار اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا ۔ خلیل اللہ نے منہ پھیر لیا اور کہا ، خدایا اس کے ہاتھ کو باز رکھ ۔ فوراً اس کا ہاتھ خشک ہوگیا ۔ وہ اس کو حرکت نہ دے سکا تو کہا کیا تمہارے خدا نے ایسا کیا ہے ؟ حضرتؑ نے کہا ، ہاں میرا خدا ہر شے پر قادر ہے ۔ اس نے کہا ، اپنے خدا سے کہو میرا ہاتھ درست کر دے پھر ایسی حرکت نہ کروں گا ۔ خلیل اللہؑ نے کہا ، خدایا اس کا ہاتھ اس کو واپس کر دے اور فوراً ہاتھ ٹھیک ہوگیا ۔ پھر جب اس نے حضرت سارہؑ کی طرف نظر کی تو ضبط نہ کر سکا اور پھر ان کی طرف ہاتھ بڑھایا ۔ خلیل اللہؑ نے منہ پھیر کر دعا کی ، بادشاہ کا ہاتھ پھر خشک ہوگیا ۔ تو کہنے لگا تمہارا خدا بڑا صاحبِ غیرت ہے ۔ پھر اپنے خدا سے دعا کرو کہ میرا ہاتھ درست کر دے ۔ آئندہ ہرگز ایسی حرکت نہ کروں گا ۔ حضرتؑ نے دعا کی کہ اگر یہ سچ کہتا ہے تو بارِ الہا اس کا ہاتھ اس کو پھیر دے ۔ فوراً اس کا ہاتھ درست ہوگیا ۔

جب بادشاہ نے یہ حالات دیکھے تو اس کے دل میں خلیل اللہ کا رعب پیدا ہوگیا ۔ آنحضرتؑ کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور کہنے لگا کہ تمہارا پروردگار بڑا صاحب کرم اور حلیم ہے ۔ میں اس کی شہادت دیتا ہوں ۔ اب تمہاری حرمت و تکریم مجھ پر لازم ہے ۔ تم جہاں چاہو جاؤ میں کچھ تعرض نہ کروں گا مگر تم سے میری ایک حاجت ہے ۔ حضرتؑ نے پوچھا وہ کیا ہے ۔ کہا میرے پاس حسین و جمیل عاقل و دانا ایک کنیز ہے ۔ میں اسے سارہؑ کی خدمت میں دینا چاہتا ہوں ، اس کو قبول فرمائیں ۔ درحصل وہ بادشاہ کی بیٹی تھی جسے حضرت نے منظور کر لیا ۔ یہی وہ حضرت ہاجرہؑ ہیں جو والدہ حضرت اسمٰعیلؑ ہوئیں ۔ المختصر سب کو ساتھ لے کر شام کی طرف روانہ ہوگئے ۔

اَب اولوالالبابؑ صاحبان فکر غور کریں کہ حضرت ابراہیمؑ کیا جنگی پر ہی یہ عرض نہ کرسکتے تھے کہ خدایا ان لوگوں سے مجھے نجات دلا۔ ان کی آنکھوں پر حجاب ڈال دے کہ یہ صندوق کو دیکھ ہی نہ سکیں۔ یا جب بادشاہ کے پاس پہنچے تو اس وقت بھی کہہ سکتے تھے کہ خدایا ان کو صندوق کھولنے کی مہلت نہ دے، ان کے ہاتھوں کی قوت سلب کرلے! مگر وہ ایسا کیوں کرتے؟ ان کو تو دو خاص مقصد حاصل کرنے تھے۔ اس لئے مکر کرتے رہے اور عام لوگوں کی مثل مجبور بنے رہے۔ اس ہنگامے سے جن مقاصد کا حصول پیش نظر تھا وہ یہ ہیں: پہلا، اس بادشاہ کو حق کی طرف ہدایت کرنا تھی۔ دوسرا یہ کہ اس مقدس بی بی کو حاصل کرنا تھا جو حضرت اسمٰعیلؑ کی ماں ہونے والی تھیں اور جن کی نسل سے افضل ترین خلائق، محبوب رب العالمین عالم وجود میں آنے والے تھے ۔۔۔ ایسا ہوتا ہے انبیاء کا "مکر"۔

صَلٰوۃُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِمْ

حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ (اللہ کے نام سے (رہے)، جو رحمٰن و رحیم ہے)

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ قف ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ
تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ھٰذَا
الْقُرْاٰنَ وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ﴿۳﴾ اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْہِ
یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُہُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ﴿۴﴾
قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰٓی اِخْوَتِكَ فَیَکِیْدُوْا لَكَ کَیْدًا ط اِنَّ
الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۵﴾ وَکَذٰلِكَ یَجْتَبِیْكَ رَبُّكَ وَیُعَلِّمُكَ
مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَیُتِمُّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْكَ وَعَلٰٓی اٰلِ یَعْقُوْبَ کَمَآ اَتَمَّہَا
عَلٰٓی اَبَوَیْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ ط اِنَّ رَبَّكَ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۶﴾ لَقَدْ
کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِہٖٓ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ ﴿۷﴾ یوسف

الف۔ لام۔ را۔ یہ بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں ہم نے اس کو نازل کیا ہے

قرآن عربی ہیں۔ تاکہ تم سمجھ سکو۔ ہم تم پر ایک قصہ بیان کرتے ہیں جو بہترین قصص ہے اس کے ذریعے جو ہم نے تم پر وحی کی اس قرآن میں حالانکہ اس سے قبل تم بے خبر تھے۔ جب کہا یوسفؑ نے اپنے باپ (یعقوبؑ) سے اے بابا میں نے (خواب میں) دیکھا گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں (یعقوبؑ نے) کہا اے بیٹے نہ بیان کرنا اپنا خواب اپنے بھائیوں سے ورنہ وہ تمہارے لئے بری تدبیر کریں گے۔ تحقیق کے شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور ایسا ہی ہوگا۔ تیرا پروردگار تجھے برگزیدہ کرے گا۔ اور سکھلائے گا تجھ کو خوابوں کی تعبیر۔ اور اپنی نعمت تجھ پر پوری کرے گا۔ اور آل یعقوبؑ پر جیسا کہ اس نے اپنی نعمت تیرے آباء پر پہلے پوری کی ابراہیمؑ اور اسحقؑ پر بے شک تیرا رب بڑا دانا اور حکمت والا ہے یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کے قصے میں پوچھنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں)۔

آغاز سورہ یوسف کی مندرجہ بالا آیات غور سے پڑھنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو تمام آنے والے واقعات و حالات کا علم تھا۔ اور چند فقروں میں اس کو ظاہر کر دیا کہ تمہارے بھائی تمہارے ساتھ بری بری تدبیریں کریں گے اور تم کو اللہ چن لے گا۔ تعبیر خواب کا علم عطا ہوگا۔ وہ نعمت جو اللہ نے تمہارے آباؤ اجداد کو عطا کی۔ اس سے تمہیں اور آل یعقوبؑ کو سرفراز کرے گا یعنی نبی بنائے گا۔ یہ سب آئندہ ہونے والے واقعات کی خبریں ہیں۔ اب روایات کی طرف توجہ دیں:۔

واقعات کا لب لباب

حضرت یعقوبؑ روزانہ ایک گوسفند ذبح کر کے کچھ اس میں تصدق کرتے۔ سائلین کو دیتے باقی خود کھاتے اور اپنے اہل و عیال کو کھلاتے۔ ایک روز افطار کے وقت ایک سائل انکے دروازے پر آیا۔ کہا کہ میں روزہ دار ہوں، بھوکا ہوں مجھے سیر کرو۔ مگر حضرت یعقوبؑ اور ان کے گھر والوں نے توجہ نہ کی، وہ مایوس لوٹ گیا۔

ان پر وارد شدہ ایراد اور توضیح

صاحبان عقل و فکر غور کریں کیا یہ ممکن ہے کہ دروازے پر ایک سائل آواز لگائے اور گھر والے نہ سنیں خصوصاً پیغمبر جو شہید ہوتا ہے اور دور دراز کی آوازیں سنتا ہے، لوگوں کے اعمال دیکھتا ہے، اس نے بھی نہ سنا اور سنا تو سائل کی مدد نہ کی۔

صبح کو حق تعالیٰ نے وحی کی اے یعقوبؑ تم نے میرے ایک بندے کو ایسا ذلیل سمجھا کہ اسکی فریاد نہ سُنی وہ بھوکا رہا۔ اس سبب سے تم نے میرے غضب کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔ لہٰذا اب میری طرف سے اہل وعیال پر ابتلا کے منتظر رہو۔ تم اور تمہارے فرزند سیر ہو کر سوئے ہو اور صبح تمہارے پاس کھانا بچا ہُوا تھا۔ اے یعقوبؑ میری عقوبت و بلا بہ نسبت میرے دشمنوں کے دوستوں کو بہت جلد پہنچتی ہے اپنی عزت کی قسمت تم پر بلا نازل کروں گا اور تمہارے فرزند پر مصائب نازل کروں گا۔ میری بلاؤں کے لئے تیار رہو، میرے حکم پر راضی رہو اور مصیبتوں پر جو میری جانب سے نازل ہوں صبر کرو۔

ذرا سوچیں اور سمجھیں کہ کسی شخص کو خبر نہیں ہو سکتی کہ اللہ پاک نے اپنے بندوں پر کیا الہام کیا ہے جب تک کہ وہ خود ہی نہ بیان کریں۔ عالم غیب سے روگردانی کرنے والے (کافر) تو انبیاء کو خطاکار و مجرم سمجھ لیتے ہیں مگر جو عقل سے کام لینے والے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ انبیائے کرام کا مکر ہوتا ہے، وہ ہدایتِ خلق کے لئے ایک قصّہ بناتے ہیں، اور ان کو دکھاتے ہیں کہ ہم سے ذرا سی غلطی ہو گئی اور اس پر ہی باری تعالیٰ کا عذاب نازل ہو گیا۔ یہ تو حضرت یعقوبؑ کا ایک مکر ہے جس سے خلق اللہ کی ہدایت مقصود ہے کہ کسی بندۂ خدا کا بھوکا رہنا اور خود سیر ہو کر سو جانا، اس اَمر کو سہل سمجھنا باعثِ غضبِ الٰہی ہے۔

اَب روایات میں وارد ہے کہ جس رات سائل بھوکا سویا اسی شب حضرت یوسفؑ نے خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند و سورج انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ جب انہوں نے خواب حضرت یعقوبؑ سے بیان کیا تو چونکہ ان کو وحی ہو چکی تھی کہ بلا کے لئے تیار رہو اسی واسطے یوسفؑ کو کہا کہ اپنے بھائیوں سے خواب کو بیان نہ کرنا۔ میں ڈرتا ہوں کہ تمہارے ہلاک کرنے میں کوئی مکر نہ کریں۔

یوسفؑ نے اس نصیحت پر عمل نہ کیا، اور اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان کر دیا۔

دیکھو ہم سے یہ غفلت ہو گئی جس کی وجہ سے رَبُّ العزّت کا عتاب نازل ہو گیا اور ہم بلا میں گرفتار ہو گئے۔ رَب تو فرماتا ہے۔ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بہت سہل کر دیا ہے مگر ہم ایسے بدبخت ہیں کہ نصیحت حاصل کرنے کے بجائے انبیاء معصومین کو خاطی ٹھہراتے ہیں۔ یہاں راوی صاحب نے اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ باوجود وحی کے حضرت یعقوبؑ قضائے الٰہی سے فرار کرنا چاہتے تھے، کلام اللہ میں خواب بیان کرنے کا ذکر نہیں اگر بیان بھی کیا تو یہ

مکر ہے تاکہ ان کے نفوس میں آتشِ حسد بھڑکے اور
ان کے ستانے پر آمادہ ہو جائیں ؛

سورہ یوسف کی کچھ دیگر آیات

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا
لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۨ ﴿۸﴾ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ
وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾ یوسف

(جب اُنہوں (برادرانِ یوسفؑ) نے کہا۔ کہ البتہ یوسفؑ اور اُس کا بھائی (بن یامین) ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں۔ حالانکہ ہم ایک بڑی جماعت ہیں۔ بلاشبہ ہمارا باپ ایک واضح غلطی میں مبتلا ہے ۝ (اور اُنہوں نے باہم مشورہ کیا کہ یا تو) یوسفؑ کو قتل کر دو۔ یا اُسے (کسی دُور دراز) سرزمین میں ڈال آؤ۔ تو البتہ تمہارے والد کی توجہ تمہاری ہی طرف ہو جائے گی۔ اس کے بعد تم نیک لوگ بن جانا)۔

(توضیح) ـــــ اس میں ہمارے لئے کتنی نصیحت ہے کہ حسد کا نتیجہ ہمیشہ حاسدوں ہی کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے کہ وہ ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔ اس بلا سے ہمیشہ محفوظ رہنے کی توفیق بارگاہِ احدیت سے طلب کرتے رہو۔ یہاں فریبِ نفس کو کیسا واضح کر دیا ہے کہ وہ ایسے ہی مشورے دیا کرتا ہے کہ اَب تو یہ عمل کر لو بعد کو توبہ کر لیں گے۔ جب پہلے ہی نیت بد ہو تو پھر توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِىْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ
بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ
وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ
﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّىْ لَيَحْزُنُنِىْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ
اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ
اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ یوسف

(اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو۔ بلکہ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو

تو اُسے کسی تاریک کنوئیں میں ڈال دو۔ کوئی قافلہ اُسے اُٹھائے جائے گا ○ انہوں نے کہا۔ اے بابا! کیا بات ہے کہ آپ یوسفؑ کے بارے میں ہم پر اعتبار نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم تو اُس کے خیر خواہ ہیں ○ اُسے کل ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔ کہ (جنگل کے) پھل وغیرہ کھائے اور کھیلے کودے۔ اور ہم سب اُس کے نگہبان ہوں گے ○ اُس نے (یعقوبؑ نے) کہا۔ البتہ یہ بات مجھے بہت صدمہ پہنچاتی ہے کہ تم اُس کو لے جاؤ۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اُسے بھیڑیا نہ کھا جائے۔ دراں حالیکہ تم اُس سے غافل ہو جاؤ ○ انہوں نے کہا کہ اگر اُسے بھیڑیا کھا جائے دراں حالیکہ ہم ایک بڑی جماعت ہیں۔ پھر تو ہم بالکل ہی ناکارہ (نکمے) ہوئے ○)

توضیح:۔ افسوس کہ ہماری آنکھوں پر کیسا پردہ پڑا ہوا ہے' اور دلوں پر کیسی مہریں لگی ہوئی ہیں کہ ہم قرآن کو قصے کہانی ہی سمجھتے رہے حالانکہ اس کے ایک ایک فقرے میں ہدایت ہے۔ یہی دیکھیں کہ یہ نفسِ امّارہ کی کیسی مرقع کشی ہے کہ کیسی کیسی تجویزیں اور تدبیریں سُجھاتا ہے۔ تاریک سمت دیکھنے ہی نہیں دیتا۔ آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے وہ تو یہی کہتا ہے سوچنے کی ضرورت نہیں جو میں کہتا ہوں کر ڈالو۔ سورہ حشر کی آیت ۱۶ میں ہے کہ "اس کی مثل شیطان کی سی ہے جبکہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر۔ پھر جب وہ کافر ہوا تو کہتا ہے میں تجھ سے بَری ہوں میں ڈرتا ہوں اللہ ربّ العالمین سے" اس سے یہ بات یہاں واضح ہو جاتی ہے کہ ایک ہنگامہ در در برپا کیا جا رہا ہے' جو کچھ ہونے والا ہے اس کی حضرت یعقوبؑ کو کھلی ہوئی خبر دی جا رہی ہے۔ نفسِ امّارہ کی عیاریاں ایسی ہوتی ہیں۔ ہم اپنے اندر غور ہی نہیں کرتے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَ
أَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ⑮ وَجَاءُوا
أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ⑯ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا
يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا
صَادِقِينَ ⑰ وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ
أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ⑱ یوسف

(پس جب وہ اُس کو (یوسفؑ کو) لے گئے اور اس بات پر متفق ہو گئے کہ اُسے تاریک

کنوئیں میں ڈال دیں گے۔ تو ہم نے اُس (یوسفؑ) کو وحی کی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم اُن (بھائیوں) کو اُن کے اِس فعل سے آگاہ کرو گے۔ جبکہ اُنہیں (اس سے قبل) اس کا شعور نہ ہوگا ○ اور وہ رات کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے ○ اُنہوں نے کہا۔ اے بابا ہم آپس میں دوڑ لگانے لگے اور یوسفؑ کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑا۔ پس اُسے بھیڑیا کھا گیا۔ اور اگرچہ ہم سچے بھی ہوں تو آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے ○ اور وہ اُس کی قمیض پر جھوٹا خون لگا لائے۔ اُس نے (یعقوبؑ نے) کہا۔ بلکہ تمہارے لئے یہ بات تو تمہارے نفسوں نے گھڑلی ہے۔ پس صبرِ جمیل (ہی بہتر ہے)۔ اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اُس پر اللہ ہی کی مدد مانگی جاتی ہے ○)

توضیح :- غرضکہ بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا۔ یہ ہے شقاوت اس نفسِ امارہ کی کہ خون بھی سفید ہو جاتے ہیں۔ اس کے فریب سے ہر وقت چوکنا رہنا لازم ہے۔

دیکھیں نفسِ امارہ کے فریب کہ قمیص پر بکری ذبح کر کے اس کا خون لگا لیا۔ اتنا بھی نہ سوچ سکے کہ بھیڑیا کھائے گا تو قمیص کیسے سالم رہے گی؟ اللہ اکبر ہوائے نفس کیسا اندھا کردیتی ہے کہ انسان سوچ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہوائے نفس تو عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ لازم ہے کہ ہم بارگاہِ ایزدی سے اس کے شر سے پناہ مانگتے رہیں۔

صاحبانِ عقل کے لئے دعوتِ فکر ہے۔ کیا حضرت یوسفؑ یہ دُعا نہیں کر سکتے تھے کہ ربّا مجھے گھر پہنچا دے؟ اگر وہ چاہتے تو کیا وہ باپ کے پاس صحیح وسالم پہنچ نہ سکتے تھے؟ آخر یہ دُعا کرنے میں کونسا اَمر مانع تھا؟ صاحبانِ فہم سمجھ لیں گے کہ انبیاء کے کام اختیاری ہوتے ہیں۔ یہ تو ہنگامہ دَرد اس لئے بنایا گیا تھا تاکہ لوگوں کے لئے باعثِ ہدایت ہو۔ اور خصوصاً برادران یوسفؑ کے لئے دَرد وحسرت کا سامان ہو۔ جس سے ان کے نفوس کی غفلت کم ہو، ہر وقت سوچتے اور اپنے کئے پر پچھتاتے رہیں۔ دُوسرا اَمرِ خاص یہ تھا کہ سات سال کے قحطِ شدید کا علم تھا کہ وقت معلوم پر قحطِ شدید ہوگا۔ اور اس کے قبل سات سال بہت افراط سے غلّہ پیدا ہوگا۔ اس کا انتظام کرنا عام انسان کا کام نہ تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ خلق اللہ کو وقتِ مُعیّن پر ہلاکت و تباہی سے بچانے کے لئے مصر جائیں اور ایسی تدابیر کریں کہ اس زمانہ کا

انتظام وانصرام کرسکیں۔

وَجَآءَتۡ سَیَّارَةٌ فَاَرۡسَلُوۡا وَارِدَهُمۡ فَاَدۡلٰی دَلۡوَهٗ ؕ قَالَ یٰبُشۡرٰی هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوۡهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوۡهُ بِثَمَنٍۭ بَخۡسٍ دَرَاهِمَ مَعۡدُوۡدَةٍ ۚ وَكَانُوۡا فِیۡهِ مِنَ الزّٰهِدِیۡنَ ﴿۲۰﴾

(اور وہاں) ایک قافلہ آگیا۔ اُنہوں نے اپنے سقّہ کو (پانی لینے) بھیجا۔ اُس نے اپنا ڈول ڈالا۔ (تو یوسفؑ اُس میں بیٹھ گئے)۔ وہ خوشی سے) پکارا۔ زہے نصیب۔ یہ تو ایک لڑکا ہے۔ اُنہوں نے (قافلہ والوں نے) اُسے ایک قیمتی سرمایہ سمجھ کر چھپالیا۔ حالانکہ جو کچھ وہ کرتے تھے اللہ اُس سے باخبر تھا○ (برادرانِ یوسفؑ جب اِس بات سے مطلع ہوتے تو قافلہ والوں کے پاس پہنچے) اور (یوسفؑ کو اپنا غلام بتلا کر) گنتی کے چند درہموں کے عوض اُسے بیچ ڈالا۔ اور وہ تو اُس کے معاملہ میں بیزار ہی تھے)۔

(روایات)۔ برادرانِ یوسفؑ کنویں پر شام تک انتظار میں رہے کہ یوسفؑ غرق ہوجائے تب جائیں۔ شب کو واپس ہوئے۔ صبح پھر خبر لینے کنویں پر گئے تو یوسفؑ کو قافلہ والوں میں دیکھا۔ کہا یہ ہمارا غلام ہے کل کنویں میں گر گیا تھا آج ہم اس کو نکالنے کے لئے آئے تھے غرضکہ بیس درہم کو قافلہ والوں کے ہاتھ حضرت یوسفؑ کو فروخت کردیا۔ پس یہ قافلہ ان کو لے کر مصر پہنچا اور خریدار نے بادشاہ کے ہاتھ ان کو فروخت کردیا۔

وَقَالَ الَّذِی اشۡتَرٰىهُ مِنۡ مِّصۡرَ لِامۡرَاَتِهٖۤ اَكۡرِمِیۡ مَثۡوٰىهُ عَسٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمۡرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱﴾

(اور مصر کے جس شخص (عزیزِ مصر) نے اُسے (یوسفؑ کو) خریدا۔ اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو اچھی طرح رکھنا۔ شاید کہ یہ ہمارے لئے سُود مند (ثابت) ہو۔ یا ہم اسے اپنا متبنّٰی بنا لیں۔ اس طرح ہم نے یُوسف کو اُس سرزمین میں مقیم کیا۔ اور تاکہ ہم اُس کو قصّوں (یا خوابوں) کی تاویل (یعنی معاملہ فہمی) سکھلائیں! واللہ تو اپنے امر پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ (اس

بات کو) نہیں جانتے)۔

توضیح:۔ اس آیہ وفی ہدایہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ مسبب الاسباب پیدا کر رہا تھا تاکہ حضرت یوسفؑ کو بادشاہت تک پہنچائے اور ایک مدت معیّن کے بعد جو قحط کی بلا آنے والی تھی اس سے مخلوق کو بچانے کا انتظام ان کے ذریعے سے کیا جاسکے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾
وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ
لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىْۤ اَحْسَنَ مَثْوَاىَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾
وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ
عَنْهُ السُّوْۤءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ یوسف

(اور جب وہ (یوسفؑ) بلوغت کو پہنچا تو ہم نے اُس کو دانائی اور علم عطا کیا۔ اور ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں ○ اور وہ عورت جس کے گھر میں وہ مقیم تھا۔ اُس پر (اپنی مطلب برآری کے لئے) ڈورے ڈالنے لگی۔ اور اُس عورت (زُلیخا) نے دروازے بند کرلئے۔ اور کہنے لگی۔ آجاؤ۔ اُس نے (یوسفؑ نے) کہا۔ معاذاللہ۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ میرے رب (میرے مُربّی۔ عزیزِ مصر) نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے۔ بیشک ظلم کرنے والے فلاح نہیں پاتے○ اور اُس عورت نے اُس کے ساتھ (بدی کا) ارادہ کیا۔ اور وہ بھی اُس کے ساتھ (بدی کا) ارادہ کرتا۔ اگر اپنے پروردگار کی واضح دلیل نہ دیکھ لیتا۔ یہ اس لئے ہوا کہ ہم اُس کو بُرائی اور بے شرمی کے کام سے دُور رکھیں۔ یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا)۔

روایت و وضاحت:۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ جب زلیخا نے دروازے بند کرکے یوسفؑ سے خواہش کی تو اس مکان میں ایک بُت تھا اس پر پردہ ڈال دیا۔ یوسفؑ نے کہا کیا کرتی ہے۔ کہا اس بُت پر پردہ ڈالتی ہوں تاکہ وہ ہمیں نہ دیکھے کیونکہ اس سے شرم کرتی ہوں۔ یوسفؑ نے کہا تو اس بُت سے شرم کرتی ہے جو نہ دیکھتا ہے نہ سُنتا ہے اور میں اپنے پروردگار سے شرم نہ کروں، جو ظاہر و پوشیدہ پر مطلع ہے؟ اس بات سے یوسفؑ جونک گئے ورنہ وہ بھی زلیخا کا قصد کر چکے تھے۔ کلام پاک میں تو اتنا ہی ہے

"هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ" یعنی (اس عورت (زلیخا) نے اس مرد (یوسفؑ) کا قصد کیا اور وہ (یوسفؑ) اس عورت (زلیخا) کا قصد کرتے، اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھی ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ عالم نور کا جو رب کی دلیل ہے مشاہدہ کئے ہوئے تھے جس کے بعد کوئی فعل مکروہ بندے سے صادر نہیں ہوتا چہ جائیکہ نبی سے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۭ
قَالَتْ مَا جَزَاۗءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْۗءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾
قَالَ هِىَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ
قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ
مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ
دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ
عَنْ هٰذَا ۫وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـــِٕيْنَ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ
نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا
حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ یوسف

(اور وہ دونوں دروازے کی طرف لپکے۔ اور اُس عورت نے (زلیخا نے) اُس کی (یوسفؑ کی) قمیص کو پیچھے سے (کھینچ کر) پھاڑ دیا۔ اور اُن دونوں نے اُس کے خاوند (عزیز مصر) کو دروازے پر پایا۔ اُس عورت (زلیخا) نے کہا۔ اُس کی کیا سزا ہے جو تیری بیوی کے ساتھ بدی کا ارادہ کرے؟ بجز اس کے کہ یا تو اُسے قید کر دیا جائے۔ یا دردناک عذاب (دیا جائے)! ○ اس نے (یوسفؑ نے) کہا۔ کہ اس عورت نے (خود) ہی مجھے پھسلانا چاہا۔ اور اُس عورت کے کُنبے کے ایک گواہ (شیر خوار بچے) نے شہادت دی کہ اگر اُس (یوسفؑ) کی قمیص آگے سے پھٹی ہو تو عورت سچی ہے۔ اور وہ مرد جھوٹا ہے ○ اور اگر اُس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو وہ جھوٹی ہے، اور وہ (یوسفؑ) سچوں میں سے ہے ○ پس جب اُس نے (عزیز مصر نے) دیکھا کہ اُس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے۔ تو کہنے لگا کہ یہ تم عورتوں کا چلتر ہے۔ بیشک تمہارا چلتر بہت بڑا ہے ○ اے یوسف تو اس بات سے درگزر کر۔ اور (اے زلیخا) تو اپنے

گناہوں کی معافی مانگ بیشک تو ہی خطاکار ہے ○ اور شہر کی عورتوں نے کہنا شروع کیا۔ کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان (پارسا) غلام کو پھسلانے پر تُلی ہوئی ہے۔ بیشک اُس نے (یوسفؑ نے) اُس کو (زلیخا کو اپنی) محبت میں لبھالیا ہے۔ اور تحقیق ہم تو اُس (زلیخا) کو کھلی گمراہی میں پاتی ہیں)۔

توضیح :۔ اہل فہم غور کریں کیا یوسفؑ رب سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ اُس کے دل کو مجھ سے پھیر دے مگر ایسا کرتے تو کوئی ہنگامہ نہ ہوتا۔ انبیاء کا ہر فعل ہدایت خلق کے لئے ہوتا ہے۔ یہ تو ہم بدبختوں کی ہدایت کے لئے ہے کہ گناہ کے لئے کیسے ہی اسباب ترغیب مہیا ہوں اگر رب کو یاد کرے اور اس کی نصرت طلب کرے تو وہ ضرور ایسی قوت عطا فرمائے گا اور ایسے اسباب پیدا کرے گا کہ بندہ اس گناہ سے بچ سکے۔

اگر یوسفؑ رب سے چاہتے کہ عزیز مصر اُن کے قول کو صحیح مان لے تو اس کے دل پر اپنی برأت کا نقش بٹھا سکتے تھے۔ مگر وہ اسی تک بات رہتی۔ اس پر شیر خوار بچے سے جو عزیز کے خاندان سے تھا اور اس کی ماں اس وقت اس کو لئے ہوئے آگئی تھی۔ اس سے گواہی دلوا کر شہر کے ہر فرد کے لئے ہی نہیں بلکہ اس زمانہ سے لے کر اس وقت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لئے یوسفؑ نے اپنی عصمت کا واضح ثبوت پیش کر دیا اور اس خرق عادت واقعہ سے عزیز مصر کے قلب پران کی عظمت کا نقش بیٹھ گیا۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ
وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۖ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ
أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿٣١﴾
قَالَتْ فَذَٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ ۖ وَلَقَدْ رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۖ
وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِّنَ الصَّاغِرِينَ ﴿٣٢﴾ قَالَ
رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ
أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٣٣﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ
كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٤﴾ ثُمَّ بَدَا لَهُم مِّن بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ

لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾ یوسف

(پس جب اُس نے (زلیخا نے) اُن عورتوں کی طعن آمیز باتیں سُنیں۔ تو اُنہیں بُلوا بھیجا اور اُن کے لئے ضیافت کا اہتمام کیا۔ اور اُن میں سے ہر ایک کے آگے ایک ایک چُھری (اور کچھ پھل) رکھ دیئے۔ اور اُس سے (یوسفؑ سے) کہا کہ اِن کے سامنے سے نکلو۔ (آجاؤ) پس جب اُن عورتوں نے اُسے (یوسفؑ کو) دیکھا تو (اُس کے حُسن وجمال سے) ششدر رہ گئیں۔ اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ اور بول اُٹھیں۔ اُوہ خدایا۔ یہ بشر نہیں۔ یقیناً یہ تو ایک معزّز فرشتہ ہے ○ اُس نے (زلیخا نے) کہا۔ یہ وُہی تو ہے جس کے بارے میں تم سب مجھے الزام دیتی تھیں۔ بیشک میں نے اِس کو پھسلانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بچا رہا۔ اور جو حکم میں اِسے دیتی ہوں اگر وہ اُسے بجا نہ لایا تو وہ ضرور قید کر دیا جائے گا۔ اور ذلیل ہو جائے گا ○ اُس نے (یوسفؑ نے) عرض کیا۔ اے میرے پروردگار مجھے قید خانہ کہیں زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اُس کے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں۔ اگر تُو ہی اِن کے چلتّر کو مجھ سے دفع نہ کرے۔ تو (کہیں ایسا نہ ہو کہ) میں اِن کی طرف راغب ہو جاؤں اور جہلا میں سے ہو جاؤں ○ پس اُس کے رب نے اُس کی دُعا قبول کی۔ اور اُس سے اُن عورتوں کے مکر کو دُور کر دیا۔ بیشک وہ بڑا سُننے والا جاننے والا ہے ○ پھر اُن لوگوں کو یہی سوجھی کہ اُس (یوسفؑ) کو ایک مدّت کے لئے قید کر دیں۔ باوجودیکہ وہ (اُس کی پاکدامنی کی واضح) نشانیاں دیکھ چکے تھے ○)

__توضیح:__- یہاں نفس امّارہ کی فطرت واضح کر دی گئی ہے کہ یہ حُسن ظاہری پر مرتا ہے کسی فرد یا شئے کو دیکھ کر جب اس کا دل آجاتا ہے تو ایسا بے چین ہوتا ہے کہ خواب و خور حرام ہو جاتے ہیں، اس کے حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے بعض اوقات تو ایسے کام کر بیٹھتا ہے کہ ان کا انجام ہلاکت ہوتا ہے، مگر یہ جوش وخروش اسی وقت تک رہتا ہے جب تک کہ مطلوب حاصل نہ ہو۔ ملتے ہی وہ جذبۂ شوق سرد پڑ جاتا ہے، مثل مشہور ہے کہ خبثِ نفس کا تو برسوں بھی پتہ نہیں چلتا۔ یہی سبب ہے کہ محبت کی شادیاں جو محض حُسنِ ظاہری سے متاثر ہو کر کی جاتی ہیں اکثر ناکام ہی ہوتی ہیں۔ کسی پر دل آجائے اور سخت اضطراب لاحق ہو جائے تو اس کا علاج بھی ہمیں بتلا دیا گیا ہے۔ کہ رب سے دُعا کرے کہ وہ تُو میرا دل اس سے پھیر دے۔

اگر درود کے ساتھ یہ دُعا کرتا ہے "اَللّٰھُمَّ قَلِّبْ قَلْبِیْ عَنْ فُلَانٍ۔ یا۔ اَللّٰہُ فُلَانٌ" شخص یا شئے سے میرے دل کو پھیر دے۔ تو خدا کی شان دیکھئے گا اور قلب کو سکون نصیب ہو گا۔

ہم بدنصیبوں کی ہدایت کے لئے انبیاء کرام نے کیسی کیسی مصیبتیں جھیلیں اور ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ اگر تم گناہوں اور نافرمانیوں کی فضا میں گھرے ہوئے ہو تو رب سے استدعا کرو کہ تمہارے لئے ایسی فضا پیدا کر دے جس کے سبب تم جرائم کی فضا سے نکل سکو، اگر صدق دل سے طلب کرو گے تو مسبب الاسباب ایسے سبب پیدا کر دے گا خواہ وہ اس دنیا کا قید خانہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس دُنیا کا قید خانہ ابدالآباد کے دائمی عذاب سے ہزاروں گنا بہتر ہے۔ قید میں جانے کا ایک مقصد تو ہماری ہدایت تھا۔ دوسرا یہ کہ عورتوں کے ہر وقت کے پیغامات و تقاضوں سے محفوظ ہونا۔ تیسرا یہ کہ ذکر اللہ کے لئے گوشۂ تنہائی مل جائے۔ چوتھا یہ کہ باہر رہ کر لوگوں کو حق کی طرف بلانا ممکن نہ تھا۔ قید خانہ میں قیدیوں کی خدمت کر کے ان کو دعوت توحید دینا ممکن تھا۔ چنانچہ وہاں تبلیغ دین حق کرتے رہے؛

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٦﴾ قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٧﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٨﴾ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ یوسف

(اور قید خانے میں اُس کے ہمراہ (اور بھی) دو جوان داخل ہوئے۔ اُن دونوں میں سے ایک نے کہا کہ میں نے (خواب میں) دیکھا کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں۔ دُوسرے نے کہا میں نے (خواب میں) دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوئے ہوں پرندے اُس میں سے کھا رہے ہیں۔ ہمیں اِن کی تعبیر بتلا۔ ہم تجھے نیکو کاروں میں خیال کرتے ہیں ○ اُس نے (یوسفؑ نے) کہا۔ جو کھانا تمہیں

(اس جیل میں) دیا جاتا ہے وہ تم تک نہیں آپائے گا کہ اس سے پہلے ہی میں تمہیں اس (خواب) کی تعبیر بتلا دوں گا۔ یہ بھی منجملہ ان باتوں کے ہے جن کی میرے رب نے مجھے تعلیم دی ہے۔ میں نے اُن لوگوں کا مذہب چھوڑ دیا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ آخرت سے بھی انکاری ہیں ○ اور میں نے اپنے آباء ابراہیمؑ و اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے دین کی پیروی کی۔ اور ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ یہ ہم پر اور (تمام) لوگوں پر خدا کا فضل ہے۔ ولیکن بہت سے لوگ شکر نہیں کرتے ○ اے میرے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق معبود اچھے ہیں یا خدائے واحد جو بڑا زبردست ہے؟)

توضیح:۔ ایک نکتہ لطیف کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ نفسِ انسان غرض کا بندہ ہے۔ اسی وقت تک بات سنتا ہے جب تک اس کی غرض وابستہ ہو۔ اس کے بعد توجہ نہیں کرتا۔ تعبیر دریافت کرنے والوں کو اگر پہلے تعبیر بتلا دیتے تو پھر ان کی دعوتِ حق کو توجہ سے نہ سنتے۔ اس لئے تعبیر بتلانے سے پہلے ان کو دین حق کی دعوت دیتے ہیں، یہ داعیانِ حق کے لئے ایک سبق ہے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

(تم لوگ تو اُس کے سوا صرف چند ناموں کی ہی عبادت کرتے ہو۔ جو تم نے اور تمہارے آباء نے سُن رکھے ہیں۔ جن کے متعلق اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ بیشک حکم (یعنی تمام اختیار) تو بس اللہ ہی کا ہے۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ تم بجز اسی کے کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا (بیش قیمت) دین ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس سے ناواقف ہے)۔

توضیح:۔ یہاں دلیل بیان فرمائی کہ ظن و قیاس کی پیروی گمراہی ہے۔ کسی امر کو بے دلیل بیّن مان لینا جہالت و نادانی ہے۔ باپ دادا سے سُنے سُنائے دین کی پیروی کرنا گمراہی ہے۔ ہر بات کے لئے دلیل ہونی چاہیئے جو خالق نے نازل کی ہو اور اس کی نازل کردہ ہماری فطرت ہے جو اس نے ہر انسان کے اندر ڈالی ہے۔ پس فطرت کی دلیل قبول کرو۔

پُوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

(اقبالؔ)

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ
فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾ وَقَالَ لِلَّذِيْ
ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ
فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ
يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۭ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ
فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ
بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ
اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ
سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ
لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ
دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾
ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾
ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالَ
الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَاۗءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔــلْهُ مَا
بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾ قَالَ
مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ
مِنْ سُوْۗءٍ ۭ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْــٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ
نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ
اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَاۗىِٕنِيْنَ ﴿۵۲﴾

(اے میرے زنداں کے رفیقو! تم میں سے ایک تو اپنے رب (یعنی آقا) کو شراب پلائے گا۔
رہا دوسرا سو وہ پھانسی دیا جائے گا۔ اور پرندے اُس کے سر کو (نوچ نوچ کر) کھائیں گے۔
اُس معاملے کا جس کے بارے میں تم نے مجھ سے سوال کیا ہے فیصلہ ہو چکا ہے ○ اور اُن
دونوں میں سے جس کی بابت یہ گمان تھا کہ وہ رہائی پائے گا اُس سے اُس نے (یوسف ؑ نے)

کہاکہ اپنے رب (یعنی آقا) سے میرا تذکرہ کر دینا۔ مگر (اُس شخص کی رہائی کے بعد) شیطان نے اُسے اپنے آقا سے یہ تذکرہ کرنا بُھلا دیا۔ پس وہ (یوسفؑ) کئی برس قید خانے میں رہا ○ اور بادشاہِ (مصر) نے کہا کہ مَیں نے (خواب میں) سات موٹی تازی گائیں دیکھیں جن کو سات دبلی پتلی گائیں کھائے جاتی ہیں۔ اور سات ہری بھری بالیاں۔ اور دوسری (سات) سوکھی بالیاں۔ اے سردارو! اگر تم تعبیر دے سکتے ہو تو مجھے اِس خواب کی تعبیر دو ○ (تو) اُنہوں نے کہا۔ یہ تو خوابِ پریشاں ہے۔ ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے ○ اور اُن دونوں میں سے جس نے رہائی پائی تھی۔ اُسے ایک مدّت دراز کے بعد (یوسفؑ کی) بات یاد آئی۔ اور اُس نے کہا۔ مجھے (یوسفؑ کے پاس قید خانہ میں) بھیج دو۔ تو میں تمہیں اس کی تعبیر بتلاؤں گا ○ (غرضکہ وہ قید خانے میں گیا اور یوسفؑ سے کہا) اے یوسفؑ۔ اے راستباز۔ ہمیں اس کی تعبیر بتلا۔ کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دُبلی گائیں کھاتے جاتی ہیں۔ اور سات ہری بھری بالیاں ہیں۔ اور دوسری (سات) سوکھی۔ (مجھے اس کی تعبیر بتا) تاکہ مَیں لوگوں کے پاس لوٹ کر جاؤں تو وہ بھی جان لیں ○ اُس نے (یوسفؑ نے) کہا۔ کہ تم لوگ سات برس متواتر کاشت کرتے رہو گے۔ اُس (مدّت) کے دوران جو فصل تم کاٹو گے۔ اُسے بالیوں میں ہی رہنے دینا۔ سوائے تھوڑی سی (فصل) جسے تم کھا سکو ○ پھر اس کے بعد سات برس بڑے سخت (قحط سالی کے) آئیں گے۔ کہ جو کچھ اُن (سالوں) کے لئے تم نے جمع کر رکھا ہوگا۔ سب کھایا جائے گا سوائے قدر قلیل کے جو تم (بیج کے لئے) بچا سکو گے ○ پھر اس کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارشیں ہوں گی اور جس میں وہ (پھلوں کا) خوب رس نچوڑیں گے ○ اور بادشاہ نے کہا۔ کہ اسے (یوسفؑ کو) میرے پاس لاؤ۔ پس جب قاصد اُس کے پاس آیا۔ تو اُس نے (یوسفؑ نے) کہا کہ اپنے آقا کی طرف لوٹ جا۔ اور اُس سے پوچھ کہ (اب) اُن عورتوں کے دلوں کی کیفیت کیا ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے؟ میرا رب اُن کے چلتّر سے خوب واقف ہے ○ (چنانچہ بادشاہ نے اُن عورتوں کو طلب کیا اور) دریافت کیا کہ جب تم نے یوسفؑ کو اُس کی مرضی کے خلاف پھسلایا تھا تو تمہارا مقصد کیا تھا؟ اُن سب عورتوں نے کہا۔ حاشا للہ ہم نے اُس میں کوئی (بدی) بُرائی نہیں پائی۔ عزیز مصر کی بیوی نے کہا۔ اب تو حق واضح ہو ہی چکا ہے۔ مَیں نے ہی اُسے (اپنی

مطلب برآری کے لئے) اُس کی مرضی کے خلاف پھسلایا تھا۔ اور وہ تو بالیقین سچا ہے ○ (میں نے صریح بیان دے دیا ہے) اِس لئے کہ وہ (عزیزِ مصر) جان لے کہ (اگرچہ میں بھٹک گئی تھی تاہم) میں نے اُس کی عدم موجودگی میں اُس کے حق میں خیانت نہیں کی۔ اور بیشک اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو چلنے نہیں دیتا ○)

توضیح :- یہاں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ احقاقِ حق کے لئے ایسے وقت کا انتظار کرو جب لوگوں کو اپنی کوئی غرض ہو۔ اسی وقت نفسِ انسانی حق سُننے اور اس پر غور کرنے کی طرف توجّہ کر سکتا ہے۔ عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کا واقعہ نہ بادشاہ کو معلوم تھا نہ عوام کو۔ یہ حضرت یوسفؑ نے ایسی تدبیر کی کہ اس وقت کے ہر فرد کو حقیقت معلوم ہو جائے اور آئندہ کے آنے والوں پر بھی حق زلیخا کے مُنہ سے واضح ہو جائے۔ یہ ایسا مظاہرہ کیا کہ آج تک قصّے کے طور پر ہر شخص کی زبان پر ہے۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ یوسف

(اور میں اپنے نفس کی برأت (پاکی ظاہر) نہیں کرتی۔ بیشک نفس تو (بالطبع) بدی کا حکم ہی دیتا ہے۔ مگر (اس کے شر سے وہی محفوظ رہتا ہے) جس پر میرا پروردگار رحم کرے۔ تحقیق میرا پروردگار بخشنے والا الرحیم ہے ○ اور بادشاہ نے کہا۔ اس کو (یوسفؑ کو) میرے پاس لاؤ۔ میں اُسے اپنی ذات کے لئے مخصوص کر لوں گا۔ پس جب اُس نے (یوسفؑ نے) اُس سے (بادشاہ سے) کلام کیا۔ (تو بادشاہ پر اُس کی اعلیٰ قابلیت کا اظہار ہوا اور) اُس نے کہا۔ آج سے تو ہماری سرکار میں باوقار اور امانتدار (بلند مرتبہ و معتمد) ہے ○ اُس نے (یوسفؑ نے) کہا۔ مجھے مُلک کے خزانوں پر مامور کیجیے۔ تحقیق میں امانتدار محافظ (اور اِس کام کا) خوب جاننے والا ہوں ○

اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو (مصر کی) سرزمین پر اقتدار بخشا۔ کہ اس میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔ ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت پہنچاتے ہیں! اور ہم نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے ○ اور یقیناً اُن لوگوں کے لئے آخرت کا صلہ بہتر ہے کہ جو ایمان لاتے اور پرہیزگار تھے ○)

توضیح:۔ آیت (۵۳) میں ہمارے لئے ایسا سبق ہے جو ہمیشہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ نفس امارہ تو برائی کا ہی حکم دیتا ہے کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ میں اس کے فریب سے بچ سکتا ہوں بلکہ یہ تو مولا کے کرم پر منحصر ہے نفسِ امارہ کے فریب سے وہی بچ سکتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ اپنا رحم فرمائے بغیر اس کی نصرت و تائید کوئی شخص برائی سے نہیں بچ سکتا۔

آیت (۵۵) و (۵۶) سے واضح ہو گیا کہ یہ تمام مظاہرہ اسی لئے تھا کہ حضرت یوسفؑ کو مصر کے تخت تک پہنچا دیا جائے تاکہ آنے والے قحط کے سات سال کے لئے انتظام کریں، اور مخلوقِ خدا کو قحط میں ہلاک ہو جانے سے بچایا جا سکے۔ یہ ایسا سخت کام تھا کہ ایسے کامل صاحبِ معرفتِ تامہ کے سوائے اور کوئی شخص اس کا انتظام نہیں کر سکتا تھا۔

وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ (۵۸)
وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَكُمْ مِنْ أَبِيكُمْ أَلَا تَرَوْنَ
أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ (۵۹) فَإِنْ لَمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا
كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ (۶۰) قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا
لَفَاعِلُونَ (۶۱) وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا
إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۶۲) فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ
قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۶۳)
قَالَ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنْتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ فَاللَّهُ خَيْرٌ
حَافِظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (۶۴) وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا
بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي هَٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ
إِلَيْنَا وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ذَٰلِكَ كَيْلٌ
يَسِيرٌ (۶۵) قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي

بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ
وَكِيْلٌ ﴿٦٦﴾ یوسف

(اور یوسف کے (سوتیلے) بھائی (غلّہ خریدنے کے لئے) آئے۔ پس جب وہ اُس کے (یوسفؑ کے) پاس پہنچے تو اُس نے اُنہیں پہچان لیا۔ مگر اُنہوں نے اُسے نہ پہچانا ○ اور جب اُس نے (یوسفؑ نے) اُن کا سامان درست کر دیا۔ (یعنی غلّہ بھروا دیا)۔ تو اُن سے کہا کہ اپنے سوتیلے بھائی (بن یامین) کو میرے پاس لیتے آنا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ بلاشبہ میں پورا ناپ دیتا ہوں۔ اور میں اچھا مہمان نواز ہوں ○ پس اگر تم اُس کو (ہمراہ) نہ لاؤ گے تو تمہارے لئے میرے پاس کوئی غلّہ نہ ہوگا۔ اور نہ تم میرے قریب پھٹک سکو گے ○ اُنہوں نے کہا کہ ہم جاتے ہی اُس کے لئے اُس کے باپ کو بہلائیں پھُسلائیں گے۔ اور ہم یہ کام ضرور کریں گے ○ اور اُس نے (یوسفؑ نے) اپنے مُلازمین سے کہہ دیا کہ اِن کی پونجی (چپکے سے) اُن کے بوروں میں کھ دو تاکہ جب یہ اپنے اہل و عیال میں لوٹ کر جائیں تو اُس کو پہچان لیں۔ تاکہ (یہ احسان و کرم دیکھ کر) پھر لوٹ آئیں ○ پس جب وہ اپنے والد کے پاس آئے تو کہنے لگے اے بابا۔ ہمیں (آئندہ) غلّہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ پس ہمارے ساتھ ہمارے بھائی (بن یامین) کو بھیج دیجئے تاکہ ہم اپنی رَسد لائیں اور ہم ضرور اُس کی حفاظت کریں گے ○ اُس نے (یعقوبؑ نے) کہا۔ کیا میں اس کی نسبت تمہارا ویسا ہی اعتبار کر لوں جیسا کہ اس سے قبل اِس کے بھائی کے متعلق کیا تھا۔ پس اللہ ہی بہتر محافظ ہے۔ اور وہ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ○ اور جب اُنہوں نے اپنا اسباب کھولا تو اپنی پونجی کو دیکھا کہ وہ (تو) اُنہیں لوٹا دی گئی ہے۔ تو کہنے لگے۔ اے بابا ہمیں اور کیا چاہیئے یہ ہماری پونجی ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ (اب بن یامین کو ہمارے ہمراہ بھیج دیجئے) اور ہم اپنے کُنبے کے لئے رَسد لے آئیں گے۔ اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے۔ اور ایک بارِ شتر (غلّہ) بڑھوا لائیں گے۔ یہ رَسد (جو ہم لائے ہیں) تھوڑی ہے ○ اُس نے (یعقوبؑ نے) کہا۔ میں اس کو ہرگز تمہارے ہمراہ نہ بھیجوں گا جب تک کہ تم میرے سامنے خدا سے یہ عہد نہ کر لو کہ تم اسے ضرور میرے پاس (واپس) لے آؤ گے۔ سوائے اس صورتِ حال کے کہ تم خود گھِر جاؤ۔ پس جب اُنہوں نے اُس کے سامنے عہد کر لیا"

(یعقوبؑ نے) کہا۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اللہ اُس پر ضامن ہے ○)

توضیح:۔ قرآن تو معجزہ ہے۔ اس کے ایک ایک فقرے میں راز پنہاں ہیں۔ یہ حضرت یُوسفؑ کا مکر دیکھئے کہ بھائیوں کی پونجی جس سے غلّہ لیا تھا، ان کے اسباب میں رکھوا دیتے ہیں تاکہ یہ لوگ دوبارہ غلّہ لینے کے لئے جلدی واپس آجائیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو جب تک غلّہ قریب اختتام کو نہ پہنچتا اور مزید رقم دستیاب نہ ہوتی وہ لوگ دوبارہ غلّہ خریدنے کا ارادہ نہ کرتے۔ دوسرے یہ کہ سب کو یہ احساس ہوگیا کہ بادشاہ ان پر بہت مہربان ہے پھر اپنے بھائی کے لانے کے لئے بھی کہہ دیا۔ اور یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اپنے سوتیلے بھائی کو نہ لائے تو پھر غلّہ نہ ملے گا۔ ایک تو بادشاہ کی مہربانی اور عنایت کا شوق اور دوسرے غلّہ نہ ملنے کا خوف۔ اب دو محرّک ان کے لئے ہوگئے اس امر کے کہ وہ بن یامین کو ضرور لائیں، جب باپ سے کہتے ہیں تو وہ ان کو یوسفؑ کا واقعہ یاد دلاتے ہیں جس سے ان کے نفوس کو ذلّت ہوتا کہ ان کی کچھ اصلاح کا باعث ہو اور آئندہ ہونے والے واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں کہ کیا اس طرح اعتبار کرلوں جیسے یوسفؑ کے بارے میں کیا تھا، دوسری مرتبہ پھر در پردہ اظہار کردیتے ہیں اس طرح کہ ان سے عہد لیتے ہیں کہ خدا کو ضامن بنائیں کہ اس کو ضرور واپس لائیں گے سوائے اس کے وہ خود کسی معاملہ میں گھر جائیں۔ صاحبانِ عقل و ہوش کے لئے معاملہ صاف ہوجاتا ہے کہ یہ تو تمام قصّہ ہدایتِ خلق کے لئے ایک مظاہرہ ہے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا
تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ
فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا
عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿٧١﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ
بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ
وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٧٤﴾ قَالُوْا
جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٧٥﴾
فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾ یوسف

(پس جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اُس نے اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس جگہ دی۔ اور (چپکے سے اسے) کہہ دیا۔ میں ہی تیرا بھائی ہوں۔ پس جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں، اُس کا ملال نہ کرنا ○ پس جب اُس نے (یوسفؑ نے) اُن کا سامان درست کروا دیا تو پانی پینے کا پیالہ اپنے بھائی (بن یامین) کے اسباب میں رکھوا دیا۔ (پھر جب وہ روانہ ہو چکے) تو ایک منادی کرنے والے نے ندا دی کہ "اے قافلے والو۔ تم ضرور چور ہو ○ وہ (قافلے والے) اُن کی طرف پلٹے۔ اور کہا تمہاری کیا شئے گم ہو گئی ہے؟ ○ اُنہوں نے کہا کہ بادشاہ کا پیمانہ ہمیں نہیں ملتا جو کوئی اُسے لا کر حاضر کرے گا۔ اُسے ایک اونٹ کا بوجھ (غلّہ انعام میں) دیا جائے گا۔ اور میں اس کا ضامن ہوں ○ اُنہوں نے (برادرانِ یوسفؑ نے) کہا۔ خدا کی قسم تم جانتے ہو ہم اس جگہ فساد کرنے کی غرض سے نہیں آئے۔ اور نہ ہی ہم چور ہیں ○ انہوں نے کہا اگر تم جھوٹے نکلے تو اس کی کیا سزا ہے؟ ○ اُنہوں نے (برادرانِ یوسفؑ نے) کہا۔ اس کی جزا وہی شخص ہے جس کے اسباب میں وہ پیالہ پایا جائے۔ ہم ظالموں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں ○ پس اُس نے (یوسفؑ نے) اپنے بھائی کا شلیتہ کھلنے سے پہلے دُوسرے بھائیوں کے شلیتوں سے (تلاشی) شروع کی۔ پھر اپنے بھائی کے شلیتہ سے (پیالہ) برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسفؑ کو (اپنے بھائی کو روک لینے کی) تدبیر بتلائی۔ وَرنہ بادشاہ کے قانون کے مطابق تو وہ اپنے بھائی کو نہیں روک سکتا تھا۔ بجز اس صورت کے کہ اللہ (ہی ایسا کرنا) چاہتا۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں۔ اور ہر صاحبِ علم سے بڑھ کر اور صاحبِ علم موجود ہے ○

<u>توضیح</u>:۔ بن یامین کو حضرت یوسفؑ کا یہ تدبیر بنا کر روک لینا صرف اسی لئے تھا کہ ان کے بھائیوں کے دلوں میں اضطرار و بے چینی پیدا ہو۔ وہ سب چونکہ عہد کر کے آئے تھے کہ ہم اس کو ضرور واپس آپ تک پہنچائیں گے۔ اس لئے اس کے بغیر جاتے ہوئے ان کو سخت اضطرار لاحق ہو گا جس سے ان کے نفوس کی غفلت میں کمی ہو گی اور کچھ نہ کچھ اصلاح ہو جائے گی۔ اگر ان کے دلوں کو اضطرار دینا نہ ہوتا تو ظاہر کر سکتے تھے کہ میں ہی یوسف ہوں اس حالت میں کسی کو بھی اضطرار

نہ ہوتا۔ اور ان کے نفوس کو کچھ فائدہ نہ پہنچتا۔ انبیاء کے ہر فعل میں ہدایت ہوتی ہے۔

آیت (۷۶) سے واضح ہو گیا کہ انبیاء کے کام خدا کی مرضی سے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے ہی یوسفؑ کو یہ تدبیر بتلائی کہ اپنے بھائیوں سے پوچھ لیا کہ چور کی کیا سزا ہے۔ ان سب نے بالاتفاق کہہ دیا کہ چور اس کا غلام ہو جاتا ہے جس کا مال چرایا تھا۔ اس طرح وہ بنیامین کو روک سکے ورنہ مصر کے رائج قانون سے روک نہ سکتے تھے؛

قَالُوْا یٰٓاَیُّهَا الْعَزِیْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیْخًا كَبِیْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۷۸) قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ (۷۹) فَلَمَّا اسْتَایْــٴَـسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا ؕ قَالَ كَبِیْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَیْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى یَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْۤ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ (۸۰) اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْكُمْ فَقُوْلُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ (۸۱) وَ سْــٴَـلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَ الْعِیْرَ الَّتِیْۤ اَقْبَلْنَا فِیْهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۸۲) قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ (۸۳)

(اُنہوں نے کہا۔ اے عزیز اس کا باپ بہت بوڑھا ہے۔ پس ہم میں سے کسی ایک کو اس کے عوض لے لے۔ ہم حضور کو نیک دل پاتے ہیں ○ اُس نے (یوسفؑ نے) کہا۔ خُدا کی پناہ۔ اس (بات) سے کہ ہم کسی اور کو لے لیں۔ علاوہ اُس (شخص) کے جس کے پاس سے ہم نے اپنی چیز پائی۔ ورنہ تو ہم ضرور نا انصاف ہوں گے ○ پس جب وہ اُس سے (یوسفؑ کی طرف سے) مایوس ہو گئے۔ تو الگ ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے۔ اُن کے سب سے بڑے (بھائی) نے کہا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کا عہد لیا تھا۔ اور اس سے پیشتر تم یوسفؑ کے بارے میں کیا تقصیر کر چکے ہو۔ پس میں تو اس سرزمین سے ہرگز نہ ٹلوں گا یہاں تک کہ میرے والد مجھے اجازت دے دیں۔ یا اللہ ہی میرے لئے کوئی حکم صادر کرے۔ اور وہ تو بہترین حکم کرنے والا ہے ○ تم اپنے والد کے پاس لوٹ جاؤ۔ اور کہہ دو۔ اے بابا۔ تمہارے

بیٹے (بن یامین) نے چوری کی اور ہم تو اُسی بات کی شہادت دیتے ہیں جس کا ہمیں علم ہے۔ اور ہم غیب کی (غیبی آفت کی) نگہبانی تو نہ کر سکتے تھے ○ اور اُس بستی کے لوگوں سے پوچھ لے جس میں کہ ہم تھے۔ اور اُس قافلہ (والوں) سے بھی جس میں کہ ہم آتے ہیں۔ اور ہم بالکل سچے ہیں ○ اُس نے (یعقوبؑ نے) کہا۔ یہ بات تو تم نے اپنے دل سے جوڑ لی ہے۔ پس صبر ہی بہتر ہے۔ قریب ہے کہ اللہ اُن سب کو میرے پاس پہنچا دے۔ بیشک وہی صاحبِ علم و حکمت ہے ○

توضیح:۔ دیکھیے حضرت یوسفؑ نے اس مکر سے بھائیوں کے دلوں میں کیسی تڑپ اور اضطراب پیدا کر دیا۔ اور یہی اصل مقصد تھا۔ اب ان کو یوسفؑ کے ساتھ جو بدسلوکی کر چکے تھے اس کی یاد تازہ ہو گئی کیا اور کوئی صورت ممکن تھی جس سے ان کے نفوس پر یہ کیفیات طاری ہو سکتیں۔

جب اپنے والد کے پاس پہنچے۔ خوف بھی طاری تھا اور شرمندگی بھی۔

آیت نمبر (۸۳) سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو تمام حالات کا علم تھا۔ وہ خبر دے رہے ہیں کہ اللہ عنقریب سب کو ملا دے گا۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ

يَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ آثَرَكَ
اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِينَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ
اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٩٢﴾ اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَٰذَا فَأَلْقُوهُ
عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾ يوسف

(اور اُس نے (یعقوبؑ نے) اُن سے مُنہ پھیر لیا اور کہا ہائے یوسفؑ۔ اور اُس کی آنکھیں اس (ضبطِ) غم میں سفید ہو گئیں۔ اور (اگرچہ وہ بڑا ضبط کرنے والا تھا مگر) اُس کا دل رنج سے بھر پور تھا ○ اُنہوں نے (بیٹوں نے) کہا۔ بخدا آپ تو یوسفؑ ہی کو یاد کئے جائیں گے، یہاں تک کہ آپ بیمار پڑ جائیں یا ہلاک ہو جائیں ○ اُس نے (یعقوبؑ نے) کہا۔ میں اپنی بیقراری و رنج کی شکایت اللہ ہی سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ○ اے میرے بیٹو جاؤ یوسف اور اُس کے بھائی کو ڈھونڈ لاؤ۔ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ بیشک کافر لوگوں کے سوا اللہ کی رحمت سے کوئی مایوس نہیں ہوتا ○ پس جب وہ (پھر) یوسفؑ کے پاس گئے تو کہا۔ اے عزیز ہمیں اور ہمارے کنبہ کو بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ ہم تھوڑی پونجی لے کر آئے ہیں۔ آپ ہمیں پورا غلہ دلوا دیں۔ اور ہم پر تصدق کیجیے۔ اور اللہ صدقہ دینے والوں کو بڑی جزا دیتا ہے ○ اُس نے (یوسفؑ نے) کہا۔ کیا تم جانتے ہو کہ جب تم جہالت (غفلتِ نفس یا نفس پرستی) میں مبتلا تھے تو تم نے یوسفؑ اور اُس کے (حقیقی) بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ ○ وہ بولے۔ کیا تم ہی یوسفؑ ہو؟ فرمایا ہاں مَیں ہی یوسفؑ ہوں۔ اور یہ میرا بھائی ہے۔ یقیناً اللہ نے ہم پر احسان کیا ہے۔ بیشک جو بھی پرہیزگاری اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ○ اُنہوں نے کہا۔ خدا کی قسم یقیناً تمہیں اللہ نے ہم پر فضیلت دی ہے اور بیشک ہم ہی خطاکار تھے ○ اُس نے (یوسفؑ نے) کہا۔ آج تم پر کوئی الزام نہیں۔ اللہ تمہیں بخش دے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنیوالا ہے ○ لو۔ میری یہ قمیص لے جاؤ۔ اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دینا۔ وہ بینا ہو جائیں گے اور اپنے تمام اہل و عیال کو لے کر میرے پاس آ جاؤ ○

<u>توضیح</u>:۔ اب اس پر بھی غور کریں کہ حضرت یعقوبؑ تمام حالات اور آنے والے واقعات سے واقف ہوتے ہوئے فراقِ یوسفؑ میں مسلسل روتے رہے یہاں تک کہ آنکھیں سفید ہو گئیں حالانکہ

یعقوبؑ و یوسفؑ دونوں شہید ہیں اور ایک دوسرے سے کسی وقت بھی غائب نہ ہوئے تھے۔

اب تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ہنگامہ درد برپا کرنا تھا جس سے خلق اللہ کے قلوب کو درد دے کر متوجہ کرنا تھا اور بالخصوص اپنے فرزندوں کے غافل نفوس کو غفلت سے جگانے کی کوشش کرنا بھی۔ انبیاء کی ہدایت کا بہترین ذریعہ ہنگامہ درد ہی ہے۔ اسی سے لوگوں کی توجہ جذب کی جاتی ہے اور اسی سے نفوسِ خلقت کی غفلت ولاشعوری میں تخفیف ہوتی ہے جس سے وجود باری کا یقین قلبی حاصل ہوتا ہے اگر اس کو حقیقت نہ سمجھیں تو ایسے اعتراض وارد ہوتے ہیں جن کا کوئی معقول جواب نہیں ہو سکتا۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾ قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾ فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ﴿٩٧﴾ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٩٨﴾ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ ﴿٩٩﴾ وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ۖ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۚ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِمَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿١٠٠﴾ یوسف

(جیسے ہی (مصر سے) قافلہ روانہ ہوا۔ اُن کے والد نے کہا۔ اگر تم مجھے سٹھیا یا ہوا نہ سمجھو تو یقیناً میں یوسفؑ کی خوشبو پا رہا ہوں (سونگھ رہا ہوں) ○ انہوں نے کہا۔ واللہ آپ اپنی پرانی خام خیالی میں پڑے ہیں ○ پھر جب خوش خبری دینے والا آیا۔ اور اُس (کرتے) کو اُس کے چہرے پر ڈالا۔ بس وہ بینا ہو گیا۔ اور کہا کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔! ○ اُن سب نے کہا۔ اے ہمارے بابا۔ ہمارے لئے ہمارے

گناہوں کی بخشش کی دُعا کر۔ بیشک ہم سرتاپا خطا کار ہیں ○ اُس نے (یعقوبؑ نے) کہا۔ میں تمہارے لئے اپنے رب سے بہت جلد استغفار کروں گا۔ بیشک وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے ○ پس جب وہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اُس نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی! اور اُن سے کہا۔ اگر خدا کو منظور ہے تو مصر میں اَمن و امان سے داخل ہو جیئے ○ اور اپنے ماں باپ کو اُونچے تخت پر بٹھایا۔ اور (سب) اُس (یوسفؑ) کے لئے سجدہ ریز ہوئے۔ اُس نے کہا اے بابا۔ یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے۔ پس میرے رب نے اُسے سچا کر دکھایا۔ اور اُس نے یقیناً میرے ساتھ احسان کیا۔ جبکہ اُس نے مجھے قید خانہ سے نکالا۔ اور تم (سب) کو دیہات سے نکال لایا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے مابین وسوسہ (جھگڑا) ڈال دیا تھا تحقیق میرا رب جس کے لئے چاہے بڑا صاحب لطف و کرم ہے۔ بیشک وہی صاحبِ علم و حکمت ہے ○)

توضیح :- قرآن و حدیث میں جو کچھ حضرت یعقوبؑ و یوسفؑ کے متعلق بیان ہوا ہے اگر اس کو اداری ہنگامہ درد اور مکر نہ سمجھا جائے بلکہ جو کچھ ظاہری حالات و واقعات ہیں انکو حقیقت سمجھ لیا جائے تو اس پر ایسے ایراد وارد ہوتے ہیں کہ اصل دین ہی متزلزل ہوتا نظر آتا ہے مثلاً

(۱) ایک روزے دار سائل دروازے پر سوال کرتا ہے اور ایک پیغمبر اور اس کے گھر والے سُنتے ہی نہیں ایسا حال اور ایسی غفلت تو ان لوگوں ہی کی ہو سکتی ہے جو دل سے خدا کے وجود پر یقین نہ رکھتے ہوں یہ کیسے پیغمبر تھے؟

(۲) حدیث میں ہے جو رات کو پیٹ بھر کر سویا، اور اس کے پڑوس میں کوئی بندۂ خدا بھوک سے کروٹیں بدلتا رہا تو یہ سونے والا خدا پر ایمان نہیں لایا۔ یعقوبؑ اور ان کے گھر والے سیر ہو کر سوتے اور ان کے مکان کے قریب ہی ایک روزہ دار بھوکا پڑا رہا۔ حالانکہ ان کو علم تھا تو یہ حضرات کیا خدا پر ایمان نہ رکھتے تھے؟۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے یعقوبؑ پر وحی کی کہ تم نے میرے غضب کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔ جس پر خدا کا غضب نازل ہو وہ تو مغضوب ہے۔ وہ نبی اور پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے؟

(۴) باوجود اس گمان کے کہ سوتیلے بھائی یوسفؑ کے ساتھ غداری کریں گے۔ ان کی

حرکات وسکنات سے ان پہ واضح ہو چکا تھا۔ اس پر بھی یوسفؑ کو جو نو برس کے تھے ان کے ساتھ بھیج دیا۔ ان کی قوتِ ارادی اتنی ضعیف تھی کہ انکار نہ کر سکے پھر وہ نبی کیسے ہو سکتے ہیں؟

(۵) قرآن تو کہتا ہے اللہ والے ہی غالب رہتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے "تم ہی غالب ہو گے۔ اگر تم مومن ہو گے"۔ یہاں برادرانِ یوسفؑ جو اس وقت گروہِ شیطان بنے ہوئے تھے غالب رہے اور یوسفؑ مغلوب، کیا وہ اللہ والے یا مومن نہ تھے؟

(۶) قرآن تو خدا کی محبّت کی علامت یہ بتلاتا ہے کہ خدا کے دوستوں پر خوف و حزن نہیں ہوتا، اور یعقوبؑ پر ایسا حزن طاری ہوا کہ "وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ" (ان کی دونوں آنکھیں روتے روتے سفید ہو گئیں) تو کیا یہ اولیاء اللہ میں سے نہ تھے؟

(۷) ایک صاحبِ ریاضت فقیر دُور دراز کے حالات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بعض ٹیلی پیتھی کے عامل ہزاروں میل کے حالات دیکھ لیتے ہیں مگر یہ کیسے نبی تھے جن میں اتنی بھی بصیرت نہ تھی کہ یوسفؑ کے حالات دیکھ سکتے؟

اگر ان تمام وساوس و ایرادات کے جوابات کو لکھا جائے جو اس قصّے پہ وارد ہوتے ہیں تو بہت طول ہو جائے گا اور تضیعِ اوقات بھی، اس لئے کہ یہ وساوس و ایرادات تو ان ہی کے تخیل پر وارد ہوتے ہیں جو "يَقُوْلُ الْكَافِرُوْنَ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ" (اور کہتے ہیں اور کہتے رہیں گے کافر کہ نہیں ہے یہ قرآن مگر پہلے لوگوں کے قصّے) کے مصداق ہوتے ہوئے ان کو بجائے درسِ ہدایت قصّے کہانی سمجھتے ہیں۔ خدا ان کو قرآن پر ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۴۷) البقرہ

(اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے ○ اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو، جو میں نے

تم پر انعام کیں اور میں نے تم کو سارے جہان کے لوگوں پر فضیلت دی ۝

وَاِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾ البقرۃ

(اور جب نجات دی ہم نے تم کو آلِ فرعون سے جو تم کو بہت بڑے عذاب دیتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری سخت آزمائش تھی ۝)

فرعون بادشاہِ مصر بڑی سلطنت کا حکمراں تھا، وہ اپنے کو خدا کہلواتا تھا۔ جب مجمع کے سامنے آتا تو کہتا میں خدائے بزرگ و برتر ہوں مجھے سجدہ کرو۔ جیسا کہ سورۃ نازعات میں ہے "فَحَشَرَ فَنَادٰی" (پس اس نے (فرعون نے) لوگوں کو جمع کیا اور بلند آواز سے پکارا)۔ "فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی" ﴿۲۴﴾ (پس کہا میں ہی تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں)۔ پس جو اس کی خدائی کو تسلیم نہ کرتا اس کو قتل کروا دیتا۔ یا قید کر دیتا، یا غلام بنا لیتا۔ تمام بنی اسرائیل کو اس نے اور اس کی قوم نے غلام بنایا ہوا تھا۔ ان سے جانوروں کی طرح کام لئے جاتے تھے۔ بیلوں کی جگہ ہل میں جوتے جاتے۔ چرس کھنچوائے جاتے، عمارتوں کی تعمیر میں ان سے کام لیا جاتا اور اس خیال سے کہ کہیں بھاگ نہ جائیں، پیروں میں زنجیر ڈال دی جاتی۔ ان کے علماء جنگلوں میں روپوش ہو گئے تھے۔ جب کبھی کچھ ان میں سے علماء کی جستجو کرتے ہوئے کسی عالم تک پہنچتے وہ انہیں بشارت دیتا کہ ان کا نجات دہندہ لاوی کی اولاد سے آنے والا ہے اور وہی ان کو ان مصائب سے نجات دلائے گا اور فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کرے گا۔

جب بنی اسرائیل میں نجات دہندہ کا چرچا ہوا اور یہ خبر فرعون کے کانوں تک پہنچی اس نے ان پر عذاب اور شدید کر دیا۔ اور جب اس کے درباری منجموں نے خبر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو اس کی سلطنت کو تباہ کر دے گا تو اس نے اپنی قبطی قوم کی دائیوں کو مقرر کر دیا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کی نگرانی کرتی رہیں اگر کسی میں حمل کے آثار پائیں تو فوراً اطلاع دیں۔ ہر حاملہ پر ایک دائی متعین کر دی جاتی کہ ہر وقت اس کے ساتھ رہے

اگر لڑکی پیدا ہو تو تعرض نہ کیا جائے، اگر لڑکا پیدا ہو تو فوراً ذبح کر دیا جائے۔

(نوٹ): ہم تو ان واقعات کو قصّہ سمجھ کر تفریحِ طبع کے لئے سُنتے یا پڑھ لیتے ہیں حالانکہ قرآن کہتا ہے "لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ" (ان قصّوں میں تو صاحبانِ عقل کے لئے عبرت ہے) اس جز کو دیکھیں اور سبق حاصل کریں کہ قضائے الٰہی کو مادّی دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ دُنیا کے شہنشاہوں کی مسلح افواج اُن کے سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے خزانے سب بے کار ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم میں تقریباً ہر شخص دعوائے اسلام کرتے ہوئے فرعونِ بے ساماں بنا ہوا ہے۔ خدائے قہار کے غضب کا ہمیں کبھی خوف نہیں ہوتا۔ بے ایمانی، دغابازی، چوربازاری میں مصروف ہوتے ہوئے زبان سے یہی کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، خدا کو مانتے ہیں۔ یہ تو کھلا ہوا نفاق ہے۔ رب ہمیں توفیقِ ایمان عطا فرمائے تاکہ ہم دل سے اس کو مان سکیں اور اس کی نافرمانی اور اس کے احکام سے بغاوت سے باز رہ سکیں۔

روایات:۔ جب مادر جناب موسیٰؑ حاملہ ہوئیں تو بعض روایات میں ہے کہ ان کے حمل کا کسی دایہ کو علم نہ ہو سکا۔ مگر بعض روایات میں وارد ہے کہ جب مادرِ موسیٰؑ حاملہ ہوئیں تو بہت غمگین رہتی تھیں۔ روز بروز چہرہ زرد ہوتا جاتا تھا۔ اور جو قابلہ ان پر متعین تھی اس نے پوچھا تم کو کیا ہو گیا ہے، کمزور ہوتی جا رہی ہو، کہا کہ مجھے خوف ہے کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو قتل کر دیا جائے گا۔ خدا نے اس کے دل کو نرم کر دیا اور اس کی محبت ڈال دی۔ اس نے کہا تم غمگین نہ ہو۔ میں تمہارے فرزند کو بالکل پوشیدہ رکھوں گی کسی کو اس کی خبر نہ ہو گی، مگر مادرِ موسیٰؑ کو یقین نہ آیا۔ جب موسیٰ علیہ السّلام پیدا ہوئے تو آپ کی ماں بہت بے چین ہوئیں۔ قابلہ نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہہ دیا ہے کہ تمہارے فرزند کو چھپا لوں گی۔ پھر اس نے ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر تہ خانہ میں چھپا دیا اور فرعون کے پاسبانوں سے جو دروازہ پر قتلِ فرزند کے لئے جمع تھے کہہ دیا جاؤ اس کے شکم سے ایک لوتھڑا خون بھرا خارج ہوا ہے، اس کے پیٹ میں بچّہ نہ تھا۔ پھر مادرِ موسیٰؑ نے ان کو دودھ پلایا لیکن خائف تھیں، ایسا نہ ہو کہ بچّہ کی آواز نکلے اور قوم فرعون آگاہ ہو جائے) اب سورہ قصص دیکھیں:۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي ۖ إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ⑦ فَالْتَقَطَهُ

آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا
خٰطِـِٕيْنَ ⑧ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ڰ عَسٰٓى
اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ⑨ القصص

(اور ہم نے مادرِ موسیٰ کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس کو دودھ پلاؤ پھر جب تمہیں خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دو اور بالکل خوف نہ کرو نہ غم کھاؤ ہم اس کو تیری طرف لوٹا دیں گے اور اس کو رسولوں میں سے قرار دیں گے ○ (صندوق میں رکھ کر جب دریا میں ڈال دیا) تو فرعون کے گھر والوں نے اُسے اُٹھا لیا تاکہ ان کا دشمن اور ان کے غم کا باعث بنے، بیشک فرعون و ہامان اور ان کے لشکر خطاکار تھے ○ اور زنِ فرعون نے کہا، میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس کو قتل نہ کرنا، کیا عجب ہے کہ ہمارے لئے نفع کا باعث ہو یا اس کو ہم بیٹا ہی بنا لیں اور انہیں شعور نہیں تھا ○)

(روایات: اللہ تعالیٰ نے مادرِ موسیٰؑ پر وحی کی اس کو دودھ پلاؤ اور صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آسیہ زنِ فرعون دریائے نیل کے کنارے محل میں بیٹھی تھیں۔ انھوں نے وہ صندوق نکلوایا اور کھولا تو اس میں ایک حسین و جمیل بچّہ دیکھا۔ دیکھتے ہی بے اختیار ہو گئیں اور اس کی محبّت دل میں بیٹھ گئی۔ فرعون سے کہا میں نے ایک لڑکا نہایت خوبصورت اور پاکیزہ پایا ہے۔ چاہتی ہوں اسے اپنا بیٹا بنا لوں۔ جو میری تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ اس کو قتل نہ کرنا)۔

نوٹ: خدائے علیم و قدیر دکھلا رہا ہے کہ لوگوں کے نفوسِ خبیثہ جو تدبیریں سوچتے ہیں خلق اللہ پر ظلم کرنے کے لئے اسکیمیں بناتے ہیں اور اپنی سیاسی اور مالی قوّتوں پر ان کو گھمنڈ ہوتا ہے، ایسے فرعون سمجھ لیں کہ خدا تو خود ان کے ہاتھوں سے ہی ان کی ہلاکت کے سامان تیّار کروا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف اعضاء و جوارح پر بلکہ خیالات پر بھی متصرف ہے۔ اس کے غضب سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۡ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ⑪
وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ

تَكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ القصص

(اور (مادرِ موسیٰؑ نے) ان کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ پس وہ دُور سے دیکھتی رہیں، اور ان لوگوں کو خبر نہ ہوئی ○ اور ہم نے اس پر دائیوں کا دودھ پہلے ہی حرام کر دیا تھا۔ پس وہ لڑکی بولی، کیا تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ بتاؤں کہ تمہارے لئے اس بچّہ کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیر خواہ ہوں گے ○)

جب صندوق کو پانی میں ڈالا تو مادرِ موسیٰؑ نے ان کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جاؤ اور صندوق کو نظر میں رکھو، اس نے صندوق کو نکالتے دُور سے دیکھا، اور محل کے قریب چلی گئی۔ زنِ فرعون نے کہا کہ بچّے کے لئے دائی مجھے چاہیئے۔ کتنی ہی عورتیں دودھ پلانے آئیں مگر موسیٰؑ نے کسی کی چھاتی کو مُونہہ نہ لگایا۔ تب ان کی بہن نے حاضر ہو کر کہا۔ مَیں نے سُنا ہے آپ کو بچّے کے لئے دائی چاہیئے۔ قریب ہی ایک اچھی عورت رہتی ہے وہ دودھ پلائے گی اور بچّے کی اچھی طرح پرورش کرے گی۔ جنابِ آسیہ زنِ فرعون نے کہا کہ اس کو لے آؤ۔ جب مادرِ موسیٰؑ نے ان کو گود میں لیا تو شوق سے دُودھ پینے لگے۔ باری تعالیٰ نے اس کی خبر یوں دی ہے:۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ القصص

(پس ہم نے اس کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا۔ تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو جائے اور غم نہ کھائے اور جان لے کہ خدا کا وعدہ سچّا ہے لیکن بہت سے اس کو نہیں جانتے ○)

قارئین غور فرمائیں کہ ایک ایک بات میں نصیحت و انذار پوشیدہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت ہی کو دیکھ لیں کیا یہ نہ ہو سکتا تھا کہ مادرِ موسیٰؑ کا حمل مثل مادرِ حضرت ابراہیمؑ ظاہر نہ ہوتا۔ اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے غار میں پرورش پائی اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی بھی پرورش ہو جاتی۔ لیکن ایسا نہ ہوا، کیوں؟ اس لئے کہ ہم جیسے فراعنہ پر آشکار ہو جائے کہ حق کے خلاف اپنی نفس پرستی کے لئے تمہاری تمام تدابیر اسی طرح اُلٹائی جا سکتی ہیں۔ اپنی قوت و طاقت، مال و دولت پر مغرور ہو کر فرعونیت کا مظاہرہ کرنے سے باز رہو اور خدا کے

علیم وحکیم وقادر کے مقابلہ کی جسارت کا خیال تک نہ کرو۔ دیکھ لو فرعون مصر کی تمام تدابیر، تمام احتیاطیں کس طرح باطل کردی گئیں کہ اپنے دشمن، اپنی سلطنت کے برباد کرنے والے کو خود ہی پرورش کر رہا ہے۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔

روایت: ایک روز فرعون حضرت موسیٰؑ کو گود میں لئے کھلا رہا تھا کہ آپؑ نے اس کی داڑھی پکڑ کر اس زور سے کھینچی کہ اس کو سخت اذیت ہوئی۔ پس غضبناک ہوگیا اور کہنے لگا یہ تو موسیٰؑ ہے میں اس کو ابھی قتل کرتا ہوں۔ جناب آسیہ اس کی بیوی اس پر ملامت کرنے لگیں۔ کہا کہ بچے جب ہاتھ پیر چلاتے ہیں تو جو چیز ہاتھ میں آجائے اس کو پکڑا ہی کرتے ہیں، تُو نے اس کو موسیٰؑ کیسے جان لیا۔ تُو خدا ہوتے ہوئے اتنے سے بچے سے ڈرتا ہے، کچھ تو شرم کر۔ کہنے لگا اتنا سا بچہ جو ابھی پیروں بھی نہیں چلتا، اتنے زور کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری داڑھی کیسے کھینچ سکتا ہے۔ یہ ضرور موسیٰؑ ہی ہے میں تو اس کو ضرور قتل کروں گا۔ حضرت آسیہ نے کہا اچھا ایک امتحان اس کا کرلو۔ اس کے سامنے لعل اور دہکتا کوئلہ رکھ دو۔ اگر یہ لعل اٹھالے تو جانو موسیٰؑ ہے اور اگر کوئلہ اٹھالے تو یقیناً موسیٰؑ نہیں۔ فرعون اس پر راضی ہوگیا۔ جب ان کے سامنے سرخ کوئلہ اور لعل رکھے گئے تو حضرت نے دہکتا کوئلہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ زبان جل گئی اور رونے لگے۔ حضرت آسیہ نے کوئلہ ان کے منہ سے نکالا اور فرعون کو ملامت کرتی رہیں کہ بچے کی زبان جلادی۔

نوٹ: زخم تو بتدریج اچھا ہوگیا۔ مگر حضرت کی زبان میں لکنت پیدا ہوگئی۔ صاف طور پر بات نہیں کرسکتے۔ اگر رب چاہتا تو صحت کلی دے دیتا۔ مگر اس واقعہ کی کھلی نشانی باقی رکھنی تھی۔ اگر صحت کلی ہوجاتی تو دنیا پر اس واقعہ کا اظہار کیسے ہوتا؟ اس واقعہ کا مفصل ذکر تو کلام اللہ میں نہیں ہے، مگر اجمالی تذکرہ موجود ہے:

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٨﴾ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ﴿٢٩﴾ هَارُونَ أَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ﴿٣١﴾ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ﴿٣٣﴾ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ﴿٣٤﴾ طٰہٰ

(حضرت موسیٰؑ نے) کہا اے میرے رب میرا سینہ کشادہ کردے اور میرے کام کو میرے لئے

ایک بوجھ بٹانے والا میرے اہل سے قرار دے میرے بھائی ہارون کو، اس سے میری پُشت مضبوط کر دے اور شریک بنا دے اس کو میرے کام میں تاکہ ہم دونوں تیری بہت تسبیح و ذکر کرتے رہیں ۞

حضرت موسیٰؑ کی اس دُعا میں زبان جلنے کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔ دیکھیں کیسے اپنی زبان جلائی اور اپنے موسیٰؑ نہ ہونے کا ثبوت دے دیا۔ یہ ہی آپ کا بہترین مکر تھا۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ

روایات: جب خدائے برتر نے حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا اور تورات نازل کی جس میں ہر چیز کی نصیحت اور تفصیل درج تھی۔ اور حضرت موسیٰؑ اپنی قوم میں پلٹ کر آئے تو منبر پر جا کر ان کو بتایا کہ خدائے تعالیٰ نے مجھ پر تورات نازل فرمائی اور مجھ سے کلام کیا اور ساتھ ہی ان کے دل میں خیال گزرا کہ خدا نے مجھ سے بڑھ کر کسی کو عالم نہیں بنایا۔ یہ خیال آتے ہی جبریل امینؑ نازل ہوئے اور وحی کی کہ موسیٰؑ یہ کیا خیال آیا اب جاؤ سفر کرو اور دریاؤں کے ملنے کی جگہ ہمارے ایک بندے سے ملاقات کرو اور اس سے علم سیکھو۔ غرض موسیٰؑ اپنے وصی یوشع بن نون کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے یہاں تک کہ خدا کے اس مقدس بندے یعنی حضرت خضرؑ تک پہنچے۔ آیات کلام پاک میں اب اس طرح ذکر آتا ہے:-

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾ قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ﴿٦٨﴾ قَالَ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ﴿٦٩﴾ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾ فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۖ قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا ﴿٧١﴾ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي

عُسْرًا ﴿۷۳﴾ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓی إِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً
بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكَ إِنَّكَ لَنْ
تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ إِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِي
قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّي عُذْرًا ﴿۷۶﴾ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓی إِذَآ أَتَيَآ أَهْلَ قَرْيَةِ ٍاسْتَطْعَمَآ
أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُّضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُّرِيدُ أَنْ يَّنْقَضَّ فَأَقَامَهٗ
قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ﴿۷۷﴾ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ
سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾ أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ
لِمَسٰكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ
يَّأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾ وَأَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ أَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَآ
أَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَأَرَدْنَآ أَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ
زَكٰوةً وَّأَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيمَيْنِ
فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ
أَنْ يَّبْلُغَآ أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ
أَمْرِي ذٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾ الکہف

پس ان دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جس کو ہم نے اپنے حضور سے رحمت دی تھی اور علم لدنی اس کو سکھایا تھا ○ اس سے موسیٰؑ نے کہا کیا میں اس غرض سے آپ کے ساتھ رہوں کہ جو رہنمائی کا علم آپ کو سکھایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھے سکھائیں ○ (حضرت خضرؑ نے) کہا آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا ○ اور آپ کیوں کر صبر کر سکتے ہیں اس چیز پر جو آپ کے احاطہ علمی سے باہر ہو ○ (موسیٰؑ نے) کہا خدا نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا ○ کہا کہ اگر تم میرے ساتھ چلتے ہی ہو تو کسی بات کا مجھ سے سوال نہ کرنا جب تک میں آپ ہی تم سے اس کا ذکر نہ کروں ○ پس وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک کشتی میں سوار ہوئے تو اس (حضرت خضرؑ) نے کشتی میں سوراخ کر دیا (حضرت موسیٰؑ نے) کہا کیا تم نے کشتی میں اس لئے سوراخ

کیا ہے کہ کشتی والوں کو ڈبو دیں۔ یہ تو تم نے عجیب کام کیا ○ (خضرؑ نے) کہا کیا میں نے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے ○ کہا تم میری گرفت نہ کرو اس پر جو میں بھول گیا اور میرے کام پر اتنی سختی نہ کرو ○ پس چلے یہاں تک کہ ایک لڑکے سے ملے پس اس (خضرؑ) نے اسے قتل کر دیا۔ (موسیٰؑ نے) کہا، کیا تم نے ایک پاک جان کو بغیر کسی جان کے بدلے قتل کر دیا۔ یہ تو تم نے ناپسندیدہ کام کیا ○ کہا کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکو گے ○ کہا اگر اب میں تم سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا۔ بیشک تم میری طرف سے معذرت تک پہنچ گئے ہو ○ پس آگے چلے یہاں تک کہ ایک گاؤں والوں کے پاس پہنچے وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا۔ انھوں نے انہیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا پس اس گاؤں میں ایک دیوار کو دیکھا جو گرا ہی چاہتی تھی۔ پس خضرؑ نے اس کو سیدھا کر دیا (موسیٰؑ) بولے اگر تم چاہتے تو (ان لوگوں سے) اس کی اُجرت لے سکتے تھے ○ (خضرؑ نے) کہا میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔ اَب تم کو آگاہ کرتا ہوں اس کی حقیقت سے جس پر تم صبر نہ کر سکے ○ پس وہ کشتی محتاجوں کی تھی جو دریا میں کام کر کے گزارہ کرتے تھے۔ میں نے چاہا اسے عیب دار کر دوں، ان کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی بیگار میں پکڑ لیتا تھا ○ اور وہ لڑکا، تو اس کے والدین مومن تھے۔ پس ہمیں خوف ہوا یہ ان کو بھی سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے ○ سو ہم نے چاہا کہ ان کا رَب انہیں اس کے بدلے ایسا لڑکا دے جو پاک نفسی اور پاک قرابت میں اس سے بہتر ہو ○ اور وہ دیوار پس وہ شہر میں دو یتیم لڑکوں کی تھی اس کے نیچے ان کا خزانہ تھا۔ ان کا باپ نیک شخص تھا۔ پس تمہارے رَب نے چاہا کہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچیں تو تمہارے رَب کی مہربانی سے اپنا خزانہ نکال لیں۔ اور میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کئے۔ یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جن پر تم صبر نہ کر سکے ○"

ہر ظاہر بین و بے بصیرت اِن آیات کو محکمات ہی سمجھے گا۔ حالانکہ یہ متشابہات میں سے ہیں۔ جن لوگوں کو دین کے رازوں سے واقفیت نہیں ہے اور ان رموزِ فطرت کو نہیں جانتے جو ہدایت خلق کے لئے اُصول فطرت کے تحت انبیاء پر لازم ہوتے ہیں وہ تو ان واقعات کو حقیقت ہی سمجھیں گے۔ ان آیات کو محکمات کہنے والوں پر مشکلین کے ایسے ایراد وارد ہوتے ہیں کہ ان کے پاس ان کا کوئی معقول جواب نہ ہوگا اور یہ حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) حضرت موسیٰؑ جیسے پاک نفس پیغمبر کے دل میں ایسا خیال آیا جو غرور و تکبر سے پیدا ہوتا ہے؟ اگر واقعتاً ایسا ہو تو یہ شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ ایسا خیال تو ایک مردِ عارف کے دل میں بھی نہیں آسکتا۔

(۲) حضرت موسیٰؑ جب حضرت خضرؑ کے پاس پہنچتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ کیا میں تمہارے ساتھ رہوں یا رہ سکتا ہوں اس غرض سے کہ جو کچھ راہ نمائی کا علم آپ کو سکھایا گیا ہے اس میں سے مجھے بھی کچھ سکھا دیں۔ کیا علم زبانی نہیں سیکھا جاسکتا تھا جو اُن کے ساتھ رہنے کی اجازت مانگ رہے ہیں؟

(۳) موسیٰؑ و خضرؑ دونوں ہی پیغمبر ہیں۔ خضرؑ، موسیٰؑ کے سوال کا عجیب جواب دیتے ہیں کوئی صاحبِ مروّت ایسا جواب نہ دے گا۔ چھوٹتے ہی کہتے ہیں کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کرسکو گے۔ کیا اخلاقاً یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ میرے ساتھ صبر کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر تم صبر کرنے کا وعدہ کرو تب ہی ساتھ لے جاسکتا ہوں۔

(۴) موسیٰؑ وعدہ کرتے ہیں کہ میں آپ سے کسی بات کے متعلق سوال نہ کروں گا یہاں تک کہ آپ خود ہی ہر چیز یا کام کی حقیقت بیان کریں اور اس وقت تک صبر کروں گا۔ مگر کشتی میں سوار ہو کر بھول گئے اور جیسے ہی خضرؑ نے کشتی میں سوراخ کیا اپنا عہد توڑ کر اُن پر اعتراض کر دیا۔

(۵) پھر یہ کشتی کا معاملہ کہ ایک ظالم بادشاہ کشتیاں غصب کرتا چلا آرہا تھا۔ ایسا تھا کہ ایک سفلی عمل والا بھی اس سے واقف ہوسکتا ہے۔ مگر حضرت موسیٰؑ کو اولوالعزم پیغمبر ہوتے ہوئے بھی اس کا علم نہ ہوسکا؟

(۶) جب حضرت خضرؑ نے ان کو متنبہ کیا میں نے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کرسکو گے۔ تب وہ اپنی وعدہ خلافی سے آگاہ ہوئے اور اپنے بھول جانے کا عذر کیا گویا کہ وعدہ پر قائم رہنے کا دوبارہ اقرار کیا۔ مگر تھوڑی دیر میں پھر بھول گئے۔

(۷) اب دوسری مرتبہ عہد توڑنے کے بعد بھی کہہ دیا کہ اب سوال کروں تو میرے ساتھ نہ رہنا۔ مگر اس کے باوجود پھر بھول گئے اور خضرؑ کے کام پر پھر اشارتاً اعتراض کر بیٹھے۔

اس واقعہ میں اور بھی شکوک و وساوس پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان تمام وساوس کے جوابات حسبِ ذیل ہیں:۔

اسی باب میں قوانین فطری کے مطابق ہدایتِ خلق کے لئے انبیاء کے لوازمات کے عنوان کے تحت نمبر ۶ میں بیان ہو چکا ہے کہ جب کوئی اہم مسئلہ لوگوں کے ذہن نشین کرانا ہو تو انبیاء پر لازم ہوتا ہے کہ افرادِ اُمّت کی توجہ اضطراری جذب کر کے اس مسئلہ کا گہرا نقش ذہنوں میں بٹھانے کے لئے کوئی ہنگامہ برپا کریں۔ نیز انبیاء کی ہدایت کے فطری طریقے کے تحت چوتھے طریقہ میں بھی واضح کیا گیا ہے کہ نفسِ انسان پر گہرا نقش بٹھانے کا ذریعہ محض ہنگامہ ہے۔ پس حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کا یہ واقعہ بھی ایک ہنگامہ ہے جو ارادتاً ہدایتِ خلق کے لئے برپا کیا گیا ہے جس کا مقصد، اگر فطرتِ نفس پر غور کریں گے تو، بالکل واضح ہو جائے گا۔

جو شخص بھی حصولِ ایمانِ حقیقی، حُبّ اللہ، وجودِ باری کا یقینِ قلبی حاصل کرنے کی راہ پر چلتا ہے اور بارگاہِ الٰہی سے اس کا طالب ہوتا ہے تو اس پر مالک کی نظرِ رحمت ہوتی ہے اور اس الہامی علم میں سے جو، حسبِ فرمان ربّ العزت "فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا" (۸) الشمس (پس نفسِ انسان پر اس کی تمام برائیاں اور پرہیزگاری الہام کر دی) نفسِ انسان میں ڈالا ہوا ہے، کچھ شعور میں آنے لگتا ہے۔ پس جب کچھ علم شعور میں آتا ہے تو نفسِ امّارہ کی فطرت ہے کہ یہ بہکانا شروع کر دیتا ہے۔ کہتا ہے، ہاں تم تو بہت کچھ جان گئے ہو اور دوسرے لوگ قطعاً ناواقف ہیں، تم ہی ان میں سب سے زیادہ جاننے والے ہو۔ اگر یہ خیال کہیں کچھ دیر کے لئے بھی قائم ہو جائے تو وہ نعمات جو ملی تھیں سلب ہو جائیں گی۔ ایسی فطرت ہر نفس میں راسخ ہے اسی لئے ہم بدبختوں کی ہدایت کے واسطے حضرت موسیٰؑ اپنی عزتِ ظاہری قربان کر کے یہ ہنگامہ برپا کرتے ہیں، لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں کہ مجھے بس یہ خیال آ گیا کہ اس وقت دنیا میں میری مثل کوئی عالم نہیں، یہ خیال آتے ہی مجھ پر وحی ہوتی کہ اے موسیٰؑ تم کو یہ کیا خیال آیا؟ جاؤ اور ہمارے بندے سے علم سیکھو! اب روانہ ہوتے ہیں تو راستے میں ایسے حالات بناتے ہیں کہ خواہ مخواہ قصے کی طرف سننے والوں کی توجہ غیر ارادی طور پر جذب ہو جاتی ہے کے لئے جو مچھلی ساتھ لی تھی وہ آپ کے وصی حضرت یوشع بن نون کے

ہاتھ سے نکل کر دریا میں چلی گئی اور پھر وہ بھول بھی گئے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے ناشتہ مانگا تب انھوں نے کہا کہ میں تو آپ سے ذکر کرنا ہی بھول گیا۔ میں نے مچھلی کو دریا میں دھونا چاہا مگر وہ ہاتھ سے نکل کر دریا میں چلی گئی اور مجھے شیطان نے بالکل بھلا دیا۔

صاحبانِ عقل وشعور پر تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا کہ یہ ہدایتِ خلق کے لئے ایک ہنگامہ ہے جس میں سب سے بڑا سبق تقرب الی اللہ کی راہ پر چلنے والوں کے لئے یہ ہے کہ جو رب کی طرف سے نعمتیں ملیں ان پر کبھی یہ خیال بھی دل میں نہ آنے پائے کہ ہم کچھ جانتے ہیں ورنہ اس کا نتیجہ ہلاکت ہوگا۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ نفسِ امارہ، ایسی بات پر جس کا اس کو علم نہ ہو صبر نہیں کر سکتا۔ جب تمہارے سامنے کوئی عاقل، جو کسی فن یا علم میں ماہر ہو، کوئی ایسا کام کرے جس کا مقصد تمہیں معلوم نہ ہو تو اس کی مخالفت نہ کرو بلکہ نتیجہ کا انتظار کرو۔

تیسرا سبق یہ کہ جو کسی سے وعدہ کرو اس کو یاد رکھو اور عہد کو پورا کرو ورنہ ذلت و خواری نصیب ہوگی۔

چوتھا سبق یہ کہ بچوں اور نادانوں کے ذہنوں میں اگر کوئی نقش گہرا بٹھانا چاہتے ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے، اس کے متعلق ایک ہنگامہ برپا کرو۔

اگر یہ ہنگامہ نہیں تھا تو بتائیے کہ موسیٰؑ گئے تو تھے علم سیکھنے وہاں جا کر کون سا علم حاصل کیا اور سیکھا؟ اس تمام ہنگامہ میں صرف یہ ہی ظاہر کیا گیا ہے کہ دیکھو یہ خیال کہ میں بھی کچھ ہوں اتنا مہلک ہے کہ پیغمبر ہوتے ہوئے بھی مجھے کتنی ذلت و خواری اٹھانا پڑی۔

حضرت یونسؑ

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٩٨﴾ یونس

(پس کیوں نہ ہوئی کوئی بستی ایسی کہ ایمان لاتی تو فائدہ دیتا اس کو ایمان اس کا سوائے یونس کی قوم کے جب وہ ایمان لائے تو ہم نے رفع کر دیا ان سے رسوائی کا عذاب

زندگانی دنیا میں اور ہم نے انہیں آسائش مہیا کی ایک مدت تک ○)

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى
فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾
فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ الانبیاء

(اور صاحب نون (یونسؑ) جب چلے گئے غصہ میں آکر اور گمان کیا کہ ہم ان پر روزی تنگ نہ کرینگے۔ پس پکارا اندھیرے میں کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے تیرے پاک و پاکیزہ ہے تو بیشک میں تقصیر وار ہوں پس ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم ایمانداروں کو نجات دیتے ہیں ○)

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾
فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾
فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِىْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾
فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾
وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾ الصّٰفّٰت

(بے شک یونس پیغمبروں میں سے تھے ○ جب بھاگ کر پہنچے ایک بھری ہوئی کشتی کے پاس ○ پس قرعہ ڈالا گیا تو وہ زک اٹھانے والے ہوئے ○ پس ان کو مچھلی نگل گئی اور وہ ملامت کر رہے تھے ○ (اپنے آپ کو) پس اگر تسبیح کرنے والے نہ ہوتے ○ تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے ○ پھر ہم نے ان کو کھلے میدان میں ڈال دیا اور وہ بیمار تھے ○ ہم نے ان پر کدو کا بیل دار درخت اگا دیا ○ ہم نے ان کو ایک لاکھ سے کچھ زیادہ آدمیوں کے پاس بھیجا تھا ○ پس وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان کو ایک وقت آسائش مہیا کی ○)

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ
مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ
مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ القلم

(پس اپنے رب کے حکم کے لئے صبر کرو اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو جانا۔

جب اپنے رب کو پکارا اور غصے میں تھے○ اگر رب کی نعمت اسے نہ پہنچتی تو میدان میں ڈال دیئے جاتے اور ان کا بُرا حال ہوتا○ پس ان کے رب نے انہیں برگزیدہ کیا اور ان کو نیکو کاروں میں قرار دیا○)

روایات کا ماحصل

حضرت یونسؑ تیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے۔ ۳۳ سال قوم کو ہدایت کرتے رہے۔ اس تمام مدّت میں صرف دو آدمی ایمان لائے۔ ایک صاحب علم و حکمت روبیل جو خاندانِ نبوّت سے تھے، دوسرا مردِ جاہل تنوخا جو بڑا عابد و زاہد تھا۔

پس جب حضرت یونسؑ نے دیکھا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو خدا کی درگاہ میں شکایت کی اور عرض کی پروردگارا تُو نے مجھے تیس سال کے سِن میں نبی بنا کر بھیجا اب مجھے ۳۳ برس ان میں گزر گئے ہیں۔ میں برابر ان کو تجھ پر ایمان لانے اور اپنی رسالت کی تصدیق کرنے کی دعوت دیتا رہا ہوں، تیرے عذاب سے ڈراتا رہا ہوں مگر یہ لوگ مجھے جھٹلاتے رہے اب مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں یہ قوم مجھے قتل نہ کردے لہٰذا تو ان پر اپنا عذاب نازل کر۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کی اے یونسؑ اس قوم میں کچھ حاملہ عورتیں ہیں، کچھ بچے ہیں، کچھ بوڑھے بھی ہیں، میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔ مجھے گوارا نہیں کہ تمہاری اُمّت میں بڑوں کے گناہوں کے سبب چھوٹوں پر عذاب کروں۔ اے یونسؑ، یہ میری مخلوق ہیں، میرے شہروں میں آباد ہیں۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ عذاب میں توقف کروں۔ ان کی توبہ کا منتظر رہوں۔ میں نے تم کو تمہاری قوم کی طرف اس لئے بھیجا ہے کہ تم ان کی حفاظت کرو، ان کے ساتھ نرمی اور رحمدلی سے پیش آؤ اور رسولوں کی سی دانائی کے ساتھ ان کے اذیت دینے پر صبر کرو۔ تمہیں ان کے لئے علاج کرنے والے طبیب کی مثل ہونا چاہیئے جو دوا کا استعمال جاننے والا ہوتا ہے۔ تم نے ان کے ساتھ نادانی کا سلوک کیا اور ان کے دلوں میں نرمی کو جگہ نہ دی اور پھر اپنی سخت نظری کے سبب ان پر عذاب نازل کرنے کا سوال کرتے ہو۔

حضرت یونسؑ نے عرض کی پروردگارا میں نے تو ان پر تیری محبت میں غصّہ کیا ہے۔ جب وہ تیری نافرمانی کرتے رہے تو میں نے بددعا کی ہے۔ تیری عزّت کی قسم اب میں ان پر

مہربانی نہ کروں گا۔ پس اب تو ان پر عذاب نازل کردے۔ یہ لوگ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ ارشادِ باری ہوا، یہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی میری مخلوق ہیں، میرے شہروں کو آباد کرتے ہیں۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ ابھی ان کو مہلت دوں۔ مگر حضرت یونسؑ نزولِ عذاب کے لئے مصر رہے تو حکم ہوا اے یونسؑ، میں نے تیری دُعا کو قبول کرلیا۔ شوّال کے وسط میں چہار شنبہ کے دن طلوعِ آفتاب کے بعد ان پر عذاب نازل ہوگا۔ جاؤ انہیں خبر دے دو۔ حضرت یونسؑ تنوخا (عابد) کے پاس گئے اس سے تمام حال بیان کیا کہ اب فلاں روز اس قوم پر عذاب نازل ہوگا۔ چلو ان کو خبر دے دیں۔ تنوخا بولا انہیں غفلت میں اپنے گناہوں میں پڑا رہنے دو یہاں تک کہ عذاب ان پر آپڑے۔ حضرت یونسؑ نے کہا اچھا روبیل کے پاس چلیں دیکھو وہ اس معاملہ میں کیا رائے دیتا ہے۔ وہ خاندانِ نبوّت کا عالم ہے۔ اس سے بھی مشورہ لے لیں۔

دونوں روبیل کے پاس گئے۔ حضرت یونسؑ نے کہا میرے پاس وحی آئی ہے کہ وسطِ شوّال میں چہار شنبہ کے دن طلوعِ آفتاب کے بعد اس قوم پر عذاب نازل ہوگا اب تمہاری کیا رائے ہے۔ کیا اس قوم کو نزولِ عذاب کی خبر دے دیں۔ روبیل نے کہا آپ خدا کی طرف سے پیغمبر ہیں۔ ایک صاحبِ حکمت رسول کی مانند سلوک کریں اور عذاب کی واپسی کی دُعا کریں۔ خدا ان کے عذاب سے غنی ہے، وہ اپنے بندوں پر رحیم ہے اور مہربانی کو پسند کرتا ہے۔ اگر ان پر عذاب نازل ہوا تو اس سے آپ کو کوئی نفع نہ ہوگا اور نا ہی خدا کے نزدیک آپ کی منزلت بڑھے گی۔ شاید کہ یہ کسی دن ایمان لے آئیں۔ پس آپ انبیاء اولوالعزم کی طرح صبر کریں اور ان کو اور مہلت دیں۔

تنوخا بولا: افسوس ہے تم پر روبیل کیسی رائے دیتے ہو حالانکہ انھوں نے خدا کے نبی کو جھٹلایا، ان کو گھر سے نکال دیا، سنگسار کرنے کا ارادہ کیا۔ روبیل نے کہا تو مردِ عابد ہے لیکن علم نہیں رکھتا پس چُپ رہ! پھر اس نے حضرت یونسؑ سے کہا یہ تو فرمائیے کہ جب عذاب نازل ہوگا تو کیا سب ہلاک ہو جائیں گے یا بعض باقی رہیں گے۔ یونسؑ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہلاک کردے گا۔ یہی میں نے خدا سے دُعا کی ہے۔ روبیل نے عرض کی۔ اے خدا کے نبی کیا آپ کو یہ خبر ہے کہا اگر وہ لوگ عذاب آتا دیکھیں تو اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور بخشش کی دعا مانگیں۔ پس خدا ان پر رحم کرے، وہ تو ارحم الراحمین ہے اور وہ عذاب ان سے

لوٹادے جب کہ آپ چہار شنبہ کے دن عذاب کی خبر دے چکے ہوں۔ تو پھر کیا آپ ان کے نزدیک جھوٹے نہ ٹھہریں گے؟

تنوخا نے کہا اے روبیل وائے ہو تجھ پر۔ تو نے بڑی گستاخی کی۔ خدا نے نزول عذاب کی وحی کی ہے اور خدا کا رسول خبر دے رہا ہے مگر تو خدا اور رسول کے قول کو جھٹلاتا ہے۔ تیرے سارے اعمال حبط ہو گئے۔ روبیل نے کہا تیری عقل خراب ہو گئی ہے۔ میں تجھ سے بات نہیں کرتا۔ پھر روبیل نے حضرت یونسؑ سے کہا: آپ کو اختیار ہے اپنی قوم پر عذاب نازل کرا لیجیے، جب ساری قوم ہلاک ہو جائے گی تو آپ کی نبوت کس پر ہو گی؟ پھر آپ کا نام نبیوں کی فہرست سے کٹ جائے گا۔ کیا آپ کو ایک لاکھ بندوں کی ہلاکت پسند ہے؟ مگر حضرت یونسؑ نے روبیل کی نصیحت نہ سُنی وہ تنوخا کو ساتھ لے کر قوم کے پاس گئے اور وسط شوال میں بدھ کے روز عذاب نازل ہونے کی خبر دی۔ ان لوگوں نے حضرت یونسؑ کو جھٹلایا ان کا مضحکہ اُڑایا اور بُری طرح اپنی بستی سے نکال دیا۔ حضرت یونسؑ تنوخا کو لے کر بستی سے نکل گئے اور بستی سے تھوڑی دُور جا ٹھہرے مگر روبیل اپنی قوم کے ساتھ بستی میں رہا۔

جب ماہ شوال شروع ہوا تو روبیل نے ایک بلند ٹیلے پر کھڑے ہو کر بہت اونچی آواز سے پکارا: اے میری قوم، میں تمہارا بڑا خیر خواہ روبیل ہوں۔ تم نے اپنے نبی کو جھٹلایا اب وہ مہینہ جس میں نزولِ عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ شروع ہو گیا اس مہینہ کے وسط میں بدھ کے دن عذاب تم پر نازل ہو گا۔ خدا اپنے رسول سے ہرگز جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ اب تم سوچ لو۔ روبیل کے اس کلام نے سب کے دلوں کو ہلا دیا اور خوف زدہ ہو گئے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ عذاب ضرور آئے گا۔ پس تمام افراد قوم روبیل کے گرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے اے روبیل تم عالم ہو، حکیم ہو، تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں۔ ہم نہ جانتے تھے تم ہمارے اوپر اتنے مہربان ہو۔ جب تم نے حضرت یونسؑ سے کہا تھا کہ عذاب ٹالنے کی دعا کریں۔ اور ہماری سفارش کی تھی۔ ہمارے جاسوس وہاں موجود تھے۔ ہمیں تمہاری باتوں کی خبر پہنچ گئی تھی۔ اب ہم تمہارے مشورے پر ہی عمل کریں گے۔

روبیل نے کہا میری رائے یہ ہے کہ وسط شوال کا انتظار کرو اور چہار شنبہ سے پہلی شب

شہر سے باہر پہاڑیوں کے قریب چلے جاؤ۔ شب میں اپنے گناہوں سے توبہ کرتے رہو۔ جب سحر کا وقت ہو عورتیں پہاڑی پر چڑھ جائیں۔ بچوں کو ماؤں سے الگ میدان میں ڈال دو۔ جانوروں کے بچوں کو بھی ماؤں سے جدا کر دو۔ پھر سب بوڑھے، بچے، جوان مل کر فریاد کرو، خوب روؤ توبہ استغفار کرو۔ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہو۔ ربّا ہم نے ظلم کیا، تیرے نبی کو جھٹلایا اب ہم تیری بارگاہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ تو ارحم الراحمین ہے۔ ہم پر رحم فرما، پس جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے یا عذاب نہ ٹل جائے برابر روتے پیٹتے رہو۔

جب نزول عذاب کا دن آیا تو سب نے وہی عمل کیا جس کی روبیل نے ہدایت کی تھی جس وقت آفتاب بلند ہوا تو سیاہ آندھی تیزی سے اٹھنے لگی۔ بھیانک آوازیں اس سے آتی تھیں لوگ پہلے سے ہی توبہ و استغفار کر رہے تھے، آندھی کو دیکھتے ہی سب چیخنے لگے اور فریاد کرنے لگے، بخشش کی دعائیں مانگنے لگے۔ عورتیں الگ فریاد کر رہی تھیں۔ بچے ماؤں کے لئے رو رہے تھے۔ یہاں تک کہ پروردگار نے ان کی توبہ قبول کی اور اس آندھی کا رُخ پھیر دیا اور وہ موصل کے پہاڑوں پر جا گری۔

جب قوم نے دیکھا کہ عذاب ہٹ گیا تو وہ سب کے سب اپنے اہل و عیال و مویشیوں کو لئے گھروں کو آگئے اور روبیل بھی آکر ان سے مل گئے"۔

اس تمام روایت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام تدبیر حسب مشیت الٰہی پہلے سے تجویز کی ہوئی تھی جس میں روبیل بھی شریک تھے۔ البتہ تنوخا کو اس کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ یہ ایسی اعلیٰ تدبیر تھی کہ قوم کے تمام افراد ایک دفعہ ہی ایمان لے آئے اور ایک فرد بھی مشرک نہ رہا۔ یہ حضرت یونسؑ کا عجیب مکر تھا۔ اگر یہ تدبیر نہ کی ہوتی تو حضرت یونسؑ سو برس بھی تبلیغ کرتے رہتے پھر بھی یہ ممکن نہ تھا کہ تمام قوم ایمان لے آتی۔

بعض اشخاص شاید اس امر کو تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوں گے کہ یہ پہلے سے تجویز کی ہوئی ایک تدبیر تھی بلکہ اس واقعہ کے ظواہر کو حقیقت سمجھنے پر اصرار کریں گے۔ ان کو ذرا غور کرنا چاہیئے کہ اگر یہ تمام حقائق ہیں اور مکر نہیں تب تو تمام دین ہی ایک مضحکہ خیز کہانی

بن جاتا ہے۔ ذرا واقعات پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کتنے اعتراضات سامنے آجاتے ہیں:۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو ہدایتِ خلق کے لئے منتخب کیا جس میں اُمّت کی ایذا رسانی پر صبر کرنے کی اہلیت نہ تھی۔

(۲) ایک مُلازم بھی اپنے آقا سے ایسی گستاخی کی باتیں نہیں کرتا جیسی کہ حضرت یُونسؑ نے اللہ تعالیٰ سے کیں۔ اللہ تعالیٰ تو فرما رہے ہیں کہ ہم ان کو اور مہلت دینا چاہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا منتخب بندہ اس کی مشیت کے خلاف فوری عذاب کے نزول کے لئے اصرار کر رہا ہے۔ یہ امر تو اللہ اور اس کے رسول دونوں کی شان کے خلاف ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ کا رسول اس کی مشیت کے خلاف عمل کرے اور مالک کی مرضی پر راضی اور خوشنود نہ ہو؟

پس معلوم ہوا کہ ایک طے شدہ تدبیر کے مُطابق حضرت یونسؑ نے روبیل سے یہ سب کچھ اس لئے کہا تاکہ تمام افرادِ قوم کو اس کی اِطلاع ہو جائے اور وہ سُن لیں کہ باوجودیکہ یُونسؑ ہمارے لئے عذاب کی دَرخواست کرتے رہے مگر اللہ تعالیٰ ہم نافرمانوں پر بھی شفیق ہے۔ وہ برابر یہی ارشاد کرتا رہا کہ ان کو مہلت دو شاید ایمان لے آئیں۔ اس سے بھی افرادِ قوم کے قلوب میں نرمی پیدا ہونے کا اِمکان تھا۔ انبیاء و رُسل کی اپنی کوئی چاہ نہیں ہوا کرتی۔ ان کے لئے تو ارشادِ ربّ العزّت ہے: "وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ" (تم تو کچھ چاہتے ہی نہیں ہو مگر جو اللہ چاہے)۔ انبیاء کے حالاتِ زندگی پر شکوک و وساوس اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب انہیں اپنی مثل بندۂ آزاد سمجھ لیا جائے۔

(۳) روبیل نے حضرت یونسؑ کو صحیح مشورہ دیا مگر وہ حق کو نہ سمجھ سکے۔ اگر یہ مکر نہیں تو اللہ تعالیٰ کا اِنتخاب ہی غلط ہُوا جاتا ہے۔ نبوّت کے اہل تو روبیل تھے نہ کہ حضرت یونسؑ جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ نہ کر سکے۔

(۴) حضرت یونسؑ نے عالم و حکیم کے مقابل تنوخا جاہل کے مشورہ کو ترجیح دی۔ ایسا شخص قابلِ نبوت کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ تمام وساوس اسی وقت باطل ہو سکتے جب یہ سمجھ لیں کہ یہ پہلے سے طے شدہ

اسکیم کے تحت عمل کیا گیا ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ تمام قوم ایک دم ایمان لے آئی۔ اگر یہ مکر نہ کیا جاتا تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔ فاطر فطرت اور اس کے رسولوں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔

روایت: قوم کو عذاب کی خبر دے کر حضرت یونسؑ اور تنوخا بستی سے دُور جا کر ٹھہرے اور عذاب کا انتظار کرنے لگے اور جب نزول عذاب کے دن افرادِ قوم توبہ واستغفار کر رہے تھے تو دونوں ان کا چیخنا، ان کی فریاد وزاری کی آوازیں سُن رہے تھے۔

نوٹ:۔ اگر حضرت یونسؑ کو یقین ہوتا کہ عذاب واقعی نازل ہوگا تو بھلا کیسے ممکن تھا کہ نزولِ عذاب کے مقام سے اتنے قریب ٹھہرتے کہ لوگوں کی آواز سُن سکیں؟

روایت: پس حضرت یونسؑ اور تنوخا پنجشنبہ کی صبح کو اس جگہ سے جہاں وہ ٹھہرے ہوتے تھے اُٹھے اور شور وغل نہ ہونے سے یہ جان لیا کہ سب کو عذاب نے ہلاک کر دیا تو ان کا حال دیکھنے بستی کی طرف چلے۔ دیکھا کہ لکڑ ہارے، چرواہے مع گلوں کے بستی سے نکل رہے ہیں۔ تنوخا نے ان لوگوں سے قوم کا حال پوچھا۔ ان لوگوں نے حضرت یونسؑ کو نہ پہچانا اور کہنے لگے کہ حضرت یونسؑ نے ان کے لئے بددعا کی تھی۔ خدا نے ان کی دُعا قبول فرمائی۔ عذاب نازل ہوا وہ سب پہلے ہی جمع تھے توبہ واستغفار کر رہے تھے عذاب کو دیکھ کر رو رو کر فریاد کی، خدا کی رحمت طلب کی تو مالک نے رحم فرمایا اور عذاب ٹال دیا۔ اب سب لوگ نبی کو تلاش کر رہے ہیں تاکہ ان کی تصدیق کریں۔

جب یہ حال دیکھا تو حضرت یونس علیہ السّلام نے تنوخا سے کہا کہ وحی نے میری تکذیب کی خدا کی قسم اب یہ لوگ میرا مُنہ نہ دیکھیں گے، مَیں ہرگز ان کے پاس نہ جاؤں گا۔

تنوخا نے دیکھا کہ وہ غصّہ میں بھرے ہوئے ایک طرف چل دیئے۔ اسی واقعہ کی طرف یہ اشارہ ہے وَذَا النُّونِ إِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَن لَّن نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (۸۷) الانبیاء (اور صاحب نون یعنی یونسؑ جب غصّے میں بھرے ہوئے چل دیئے اور گمان کیا کہ ہم اس پر روزی تنگ نہ کریں گے) پس وہ دریا کی طرف گئے دیکھا کہ ایک کشتی میں لوگ بیٹھے ہیں اور وہ چلنے کے لئے تیار ہے ان سے کہا مجھے بھی کشتی میں بٹھالو کشتی والوں نے سوار کر لیا۔ جب کشتی دریا کے بیچ پہنچی ایک بہت بڑی مچھلی مُنہ کھولے سامنے آگئی اور کشتی کو روک دیا۔ یہ حال دیکھ کر کشتی والے کہنے لگے ضرور ہم

میں کوئی نافرمان بندہ ہے۔ ان لوگوں نے قرعہ ڈالا تو حضرت یونسؑ کے نام نکلا جیسا کہ خدا فرماتا ہے "فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ" (۱۴۱) الصّٰفّٰت (پس قرعہ ڈالا تو زک اٹھانے والے ہوئے)۔ پس حضرت یونسؑ دریا میں کود گئے تو فوراً مچھلی نے انہیں نگل لیا اور کئی دن ان کو پیٹ میں لئے ہوئے دریا میں پھرتی رہی اور حضرت یونسؑ ہر دم و ہر لحظہ عرض کرتے رہے۔ "لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ" (۸۷) الانبیاء۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے انھیں کنارے پر ڈال دیا۔ ان کی کھال زخمی ہوگئی تھی۔ جتنی جگہ گوشت نمایاں ہوگیا تھا کدّو کی ایک بیل نے ان پر سایہ کرلیا۔ کتنے ہی دن اس حال میں رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت عطا کی اور حکم دیا کہ تم اہل نینوا کی طرف، جو ایمان لے آئے ہیں اور پرہیزگار ہوگئے ہیں، جاؤ۔ پس حضرت یونسؑ چلے۔ جب بستی کے پاس پہنچے تو ایک چرواہا ملا۔ اس سے کہا اہل نینوا کو خبر دے کہ یونسؑ آگئے۔ چرواہا بولا آپ کو جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔ یونسؑ تو دریا میں غرق ہو چکے ہیں۔ حضرت یونسؑ نے کہا اگر تیری کوئی بکری گواہی دے کہ میں ہی یونسؑ ہوں تب تو مان لے گا؟ اس نے کہا، ہاں۔ چنانچہ ایک بکری بہ قدرت خدا گویا ہوئی اور اس نے گواہی دی کہ یہ ہی یونسؑ ہیں۔ تب وہ چرواہا شہر کو گیا اور اہل شہر کو مطلع کیا۔ شہر والے بھی نہ مانے تو اس نے اپنی اسی بکری کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پھر گواہی دی تو سب لوگ حضرت یونسؑ کی تلاش میں نکلے اور سب کے سب حاضر ہوئے اور صدقِ دل سے ایمان لائے۔

<u>توضیحی نوٹ</u>:۔ یہ تمام حضرت یونسؑ کا مکر ہے جس میں ہماری ہدایت کے لئے بہت سے سبق ہیں۔ اگر اس کو ان کی طے شدہ تجویز نہ سمجھا جائے تو ایسے ایراد وارد ہوتے ہیں جس کا کوئی معقول جواب اور توجیہہ نہیں ہوسکتی۔ مثلاً نبی کا اپنے پروردگار پر غصہ ہونا۔ اس کے فعل پر ناراض ہوجانا، یہ ایسے خیال ہیں جن کو نادانی ہی کہا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی برگزیدہ بندہ اس کے کسی فعل سے ناخوش نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ اپنے مالک کے فعل پر غصے میں بھر جائے۔ یہ تو صرف تو خدا کو دکھانا تھا تاکہ یہ خبر قوم تک پہنچ جائے۔ جو شخص حقیقت سمجھنا چاہتا ہے اس کو چاہیئے فطرتِ نفس پر غور کرے۔ کیفیاتِ نفسی سمجھنے کے بغیر انبیاء و رسل کے کاموں کی حقیقت جاننا ممکن نہیں۔

یہ حضرت یونسؑ نے بموجب مشیتِ باری ایسی تدبیر کی کہ تمام افرادِ قوم ایمان لے آئے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو سیکڑوں برس حق کی طرف بلاتے رہنے سے بھی تمام قوم کا ایمان لے آنا ممکن نہ تھا۔ اس تدبیر میں بہ ظاہر یہ تھا کہ میں نے قوم کے لئے نزولِ عذاب کی دعا کی اور اللہ تعالیٰ عذاب کرنا نہ چاہتے تھے۔ مگر میں نے اصرار کیا اور قسم کھائی کہ میں اس قوم پر نرمی نہ کروں گا۔ لہٰذا اب یہ سبق بھی دینا تھا کہ رضائے الٰہی پر راضی نہ ہونے کی کیسی سزا ملتی ہے۔ دیکھو میں کیسی بلا میں گرفتار ہو گیا۔

دوسرا امر یہ ہے قوم کے دل میں کانٹا بیٹھ گیا تھا کہ یونسؑ نے ہمارے لئے بد دعا کی اور ہمیں ہلاک ہونے کے لئے چھوڑ کر چلے گئے مگر روبیل نے ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ ہم پر مہربان ہے اور یونسؑ کے دل میں ہمارے لئے مہر نہیں۔ دلوں کو صاف کرنے اور کدورت دور کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اپنے لئے بڑی شدید مصیبت پیدا کریں اور مصیبت زدہ بن کر لوگوں کے دلوں میں نرمی پیدا کریں۔

تیسرا امر: ہم بدبختوں کو اس کی عملی تفسیر دکھانی تھی۔ "یَا مَنْ لَا مَهْرَبَ مِنْكَ اِلَّا اِلَیْكَ" (اے وہ کہ جس سے بھاگ کر پناہ کی کوئی جگہ نہیں سوائے اسی کی طرف)۔ یہ ہمیں عملی سبق دیا کہ اس کے حق، اس کی مشیت سے بھاگ کر کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ اگر پناہ کی جگہ تلاش کرنا چاہتے ہو تو اسی کی طرف رجوع کرو۔

چوتھا امر: ہمیں یہ بتلایا کہ جب تم اس کی بارگاہ سے اپنے گناہوں اور جرائم کی بخشش چاہو یا کسی خاص امر کی طلب کرنا ہو تو اس طرح دعا کرو جیسے میں نے ہر وقت اس کی بارگاہ میں کی۔ "لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝" (اے پیارے مولا تیرے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں، تو ہر عیب سے منزّہ ہے۔ بیشک میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے)۔

پانچواں امر: ایک مقصد یہ تھا کہ اپنے مالک کی قدرت کا اظہار کریں کہ دیکھو کتنے دن مچھلی کے شکم میں رہا پھر بھی زندہ و سلامت رہا۔ چاہیئے تھا کہ تمام جسم گل جاتا مگر ایسا نہ ہوا۔ بدن پر صرف گہرے زخم ہی آئے تھے۔ جب مچھلی نے اگل دیا تو بغیر آب و غذا

عرصہ تک زمین پر پڑا رہا اور بغیر دوا دارو شفا ملی۔ میرا مالک ہر شے پر قادر ہے۔

چھٹا امر: سب سے بڑا سبق ہمارے لئے اس واقعہ میں یہ ہے کہ ہر آنے والی یا آئی ہوئی بلا و مصیبت خواہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو۔ اس کے دفع کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ تمام افراد قوم ایک جگہ جمع ہو کر بارگاہ احدیت میں توبہ واستغفار کریں اور بہ تضرع وزاری ارحم الراحمین کی بارگاہ سے رحمت طلب کریں۔ اس کو صدق دل سے پکاریں تو اس کی رحمت شامل حال ہوگی اور وہ ہر قسم کی بلا و مصیبت کو دفع فرما دے گا۔ رب العزت ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کے کلام سے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے نصیحت حاصل کریں اور اس کے احکام پر صدق دل سے عمل کر سکیں۔ آمین۔

اہلِ پاکستان کو تو اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جب بری، بحری اور ہوائی افواج بھارت کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں چلی گئیں تو فوجیوں کے اہل و عیال اور دوسرے شہری مرد، عورتیں اور بچے روزانہ ایسی محفلیں منعقد کرتے تھے جہاں سب جمع ہو کر بارگاہِ ایزدی میں اسی قسم کی دعائیں بصدقِ دل خلوص سے کرتے تھے جس کی وجہ سے اللہ پاک نے اس مصیبت ناگہانی کو دفع کر دیا۔ پاکستان کو اپنے سے پانچ گنا طاقتور دشمن پر فتح نصیب ہوئی۔ یہ ہمارا سب کا چشم دید واقعہ ہے اب تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ یہی مصیبتوں کو دور کرنے کا افضل طریقہ ہے۔

اگر دیگر انبیاء کے حالات بھی تحریر کئے جائیں تو کئی ضخیم جلدیں ہو جائیں گی۔ انبیاء کی زندگی کا ہر حرکت و سکون مشیتِ الٰہی کے مطابق خلق اللہ کو سبق دینے کے لئے ہوتا ہے۔ انکی زندگی کو اپنے جیسے لاشعوروں کی زندگی سمجھ لینا باعثِ گمراہی ہے۔ جو لوگ ایسا خیال کریں گے ان کو کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اب حضورؐ سرورِ کائنات کی مقدس زندگی کے حالات کی طرف رجوع کرتا ہوں:

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے کچھ حالات

بعض مشککین کہتے ہیں کہ آپ کس دلیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سید الانبیاء

والمرسلین کہتے ہیں جب کہ سورہ بقرہ میں یہ آیت موجود ہے:۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴿۲۸۵﴾ البقرۃ

(ایمان لایا رسول اس پر جو نازل کیا گیا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مومنین بھی سب کے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے ملائکہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں کے درمیان کسی ایک میں بھی ہم فرق نہیں کرتے ۝)

اس کے متعلق مولانا شبلی مرحوم نے سیرت النبیؐ جلد اول صفحہ ۲ کے حاشیہ پر جو تحریر فرمایا ہے پہلے وہی پیش کرتا ہوں:۔

"از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے "لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" (ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے) اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالات نبوت سے متصف مانا جائے اور دوسری طرف ارشاد ہے:۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ ﴿۲۵۳﴾ البقرۃ

(یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا ہے اور عیسیٰ ابن مریم کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس سے کی ۝)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے۔ ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تمام کمالات نبوت و فضائل اخلاق سے یکساں سرفراز تھے مگر زمانہ اور ماحول کی ضروریات اور مصالح الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور تمام انبیاء میں یکساں نہیں ہوا بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے۔ یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا اور دوسرے کمالات کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی بہ مصلحت ظہور نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع و محل کی ضرورت ہوتی ہے اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا اظہار نہ ہوا تو اس سے نفس کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورت حال ان انبیاء کرام کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات سے متصف نہ تھے (صفحہ ۴)"۔

ہر چند کہ حضرت علامہ کی یہ توضیح کافی ہے مگر ممکن ہے بعض حضرات کیلئے باعث تسکین نہ ہو تو اوّل تو اس توضیح سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ انبیاء کی زندگی تمام ہدایت خلق کے لئے ہوتی ہے۔ وہ صرف ضرورت کے مطابق ہی اظہار کمال کرتے ہیں۔ باقی کا اخفا کرتے ہیں اور یہی "مکر" ہے جو انبیاء پر لازم ہے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ انبیاء کا اظہار کمالات مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ جو کچھ معجزات ان سے ظاہر ہوتے ہیں وہ ان کی اپنی قوت سے نہیں ہوتے بلکہ وہ قدرت و قوت ربانی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر خدا چاہے تو ہر نبی سے تمام معجزات ظاہر فرما سکتا ہے۔ تیسرا امر یہ کہ جہاں تک عصمت الٰہیت اور ہدایت کا تعلق ہے سب یکساں ہیں۔ کسی سے کوئی ناشائستہ فعل صادر نہیں ہو سکتا۔ ان کی فطرت پاک و پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس امر میں تمام انبیاء و رسل میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں البتہ فضیلت ایک کو دوسرے پر کمالات روحانی میں ضرور ہوتی ہے۔

باب چہارم میں واضح ہو چکا ہے کہ انبیاء بیت نور ہوتے ہیں جس کی مثال جناب ربّ العزت نے برقی قمقمے سے اپنے کلام پاک میں دی ہے۔ زمانہ حال میں اسی سے باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ برقی لیمپ چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا

دونوں روشنی دیتے ہیں۔ بے عیب ہونے میں مُساوی ہیں۔ دونوں تاریکی کو رفع کرتے ہیں۔ مگر ان کا دائرہ تنویر کم و بیش ہوتا ہے۔ لہٰذا انبیاء کی بھی ایسی ہی مثال ہے کہ کوئی ایک قریہ کے لئے بھیجا گیا۔ کوئی ایک بڑے شہر کے لئے، کوئی ایک قوم کے لئے اور کوئی دُنیا کے لئے۔ اس لحاظ سے جو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا وہی سیدالانبیاء والمرسلین ہوگا۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

بعض متشککین کو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور قوم کے لوگوں نے حضرت مریمؑ سے سوال کیا تو انہوں نے بچّے کی طرف اشارہ کردیا جیسا کلام پاک میں ارشاد ربُّ العزّت ہے:۔

.... قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ قف اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ المریم

(انھوں نے کہا ہم اس سے کیسے بات کریں جو بچہ گہوارے میں ہے (حضرت عیسیٰؑ) بولے میں خدا کا عبد ہوں مجھے اس نے کتاب عطا فرمائی اور نبی بنایا ہے ○)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو وقتِ ولادت ہی کتاب عطا کی گئی اور وہ پیدا ہی نبی ہوئے۔ یہ بات کسی اور نبی یا رسول کے تذکرے میں نہیں پائی جاتی، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کو چالیس سال کے سن میں نبوت عطا ہوئی۔ اور یہ کہ آنحضرتؐ عرصہ تک غارِ حرا میں ریاضت کرتے رہے جس کے بعد نزولِ وحی کی ابتدا ہوئی جیسا کہ حضرت علامہ شبلی نے سیرت النبی جلد اوّل میں نقل فرمایا ہے (صفحہ ۲۰۱):۔

"مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا جس کو حرا کہتے ہیں۔ آپ مہینوں وہاں جاکر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے۔ وہ ختم ہوجاتا تو پھر گھر پر تشریف لاتے اور واپس جاکر مراقبہ میں مصروف ہوتے"۔

صحیح بُخاری میں ہے کہ غارِ حرا میں تحنیث یعنی عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ عبادت کیا تھی؟ عینی شرح بُخاری میں ہے" تسلی ماکان صفة تعبده اجیب .

بان ذٰلك كان بالتفكر والاعتبار" (سوال کیا گیا کہ آپ کی عبادت کیا تھی۔ جواب یہ ہے کہ غور وفکر و عبرت پذیری)۔ یہ وہی عبادت تھی جو آپ کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے نبوت سے پہلے کی تھی۔ ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلّی کی جھلک تھی دھوکا ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا۔ آفتاب پر اس سے زیادہ لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے "لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ" (۷۶) الانعام (میں فانی چیزوں کو نہیں چاہتا)" اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" (۷۹) الانعام۔ (میں اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین و آسمان بنائے)۔

ایک مغربی مورخ نے آنحضرتؐ کی اس عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی ہے:۔

> " سفر و حضر میں ہر جگہ آنحضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے (صفحہ ۲۰۲) میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ کیا کوہ حرا کی چٹانیں، کوہ طور کی سر بفلک چوٹیاں، کھنڈر، درمیدان کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ گنبد گردش لیل و نہار، چمکتے ہوئے ستارے، برستے ہوئے بادل کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا"۔ (صفحہ ۲۰۲)۔

اس باب میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ نبی کی تمام زندگی ہدایت خلق کے لئے ہوتی ہے۔ جو لوگ محض ظاہر قرآن اور روایات کو دیکھتے ہیں ان کو ایسے ہی وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ کسی سیرت کی کتاب میں حقائق نہیں لکھے جاتے۔ مولف کا کام صرف روایات کو جمع کر دینا ہوتا ہے۔ قارئین پر واضح ہو چکا ہے کہ انبیاء کی زندگی کا تذکرہ خواہ قرآن میں ہو یا حدیث میں متشابہ ہی ہوگا۔ اس لئے کہ ان کو حکم ہے وہ عوام الناس کی طرح ہی بشرین کر رہیں اور اپنے کمالات کا اظہار نہ کریں سوائے اس وقت کہ جب اس کا اظہار لازم ہو جائے۔ نبی تو کامل پیدا ہوتا ہے اس کو ماسوا اللہ کی احتیاج نہیں ہوتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام بارہ سال تک غار میں پرورش پاتے رہے جب کہ ان کی والدہ پیدا ہوتے ہی انہیں

غار میں رکھ آئی تھیں؟ ہاں ان کو دودھ، آب و غذا مہیا کرنے والا کون تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں گزر چکا ہے کہ آنحضرتؐ کا ستارہ، چاند، سورج دیکھ کر "هٰذَا رَبِّیْ" کہنا قوم پر حجت قائم کرنے کے لئے تھا نہ کہ معاذ اللہ انہوں نے واقعتاً انھیں رب سمجھ لیا تھا یا یہ کہ آنحضرتؐ کو ان روشن اجسام پر رب ہونے کا دھوکا ہوا۔ نبی تو صاحبِ معرفت پیدا ہوتا ہے پھر اس کو دھوکا کیسے ہو سکتا ہے؟ روایات تو ظاہری رنگ ہی میں نقل کی جاتی ہیں۔ البتہ طالبین کے لئے کہیں کہیں حقیقت کی جھلک بھی دکھا دی جاتی ہے جیسا کہ مولانا شبلی نے الکلام حصّہ اوّل میں صفحہ ۱۴۳ پر تحریر کیا ہے: "نبی کو حقائق کے ادراک میں تدریجی ترقی کی ضرورت نہیں پڑتی اس کو ابتداءً ہی بغیر غور و فکر کے القا ہوتی ہے۔"

اَب غور کریں جب ابتداء ہی میں بغیر غور و فکر علم حقائق ہو جاتے تو پھر مراقبہ تدبّر و تفکّر کی احتیاج کب باقی رہ جائے گی؟ اگر حصولِ نبوّت کے لئے مراقبہ ضروری ہوتا تو دیگر انبیاء کے حالات میں بھی ایسی مثالیں ملتیں کہ وہ کسی غار میں ریاضت کرتے رہے۔ مگر جب کسی نبی کے حالات میں ایسا تذکرہ نہیں ملتا تو اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کا غارِ حرا میں مراقبہ کرنا اُمّت کی تعلیم کے لئے تھا کہ عالمِ نور اور علمِ حقیقی کے ادراک کا بہترین ذریعہ یہ ہے اگر میری پیروی کرو گے تو تم کو حقائق کا ادراک ہو گا۔

مولائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کے حاملِ علم پیدا ہونے پر ایک دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیٰ نبیّنا و علیہ السّلام نے بارگاہِ ربّ العزّت میں دعا فرمائی تھی۔ جیسا کہ ارشادِ ربّ العزّت ہے:۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص ..... ﴿۱۲۸﴾ البقرہ

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ..... الخ ﴿۱۲۹﴾ البقرہ

(اور جب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خانہ (کعبہ) کی دیواریں اُٹھا رہے تھے (تو کہتے تھے) اے رب ہمارے ہماری طرف سے قبول کر تو سُننے اور جاننے والا ہے ○ اے رب ہمارے ہم

دونوں کو اپنا مسلم بنالے اور ہماری اولاد سے بھی ایک گروہ کو اپنا مسلم بنالے (تا آخر آیت) اے رب ہمارے ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیج ○)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تو کوئی شک و شبہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ صاحب شعور، نجاستِ لاشعوری سے پاک و پاکیزہ معرفتِ باری حاصل کئے ہوئے پیدا ہوئے تھے تو حسب فرمانِ الٰہی ہم اس کے رسولوں میں (کسی) ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے یعنی حضرت اسمٰعیلؑ بھی پاک و پاکیزہ پیدا ہوئے اور جو غفلت و لاشعوری سے پاک و پاکیزہ ہوگا وہ حامل علم ہوگا اس لئے کہ ارشادِ باری ہے :۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ⑦ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ⑧ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ⑨ الشمس

(قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اس کو پورا کیا ○ پس الہام کردیں اس پر اس کی ساری برائیاں اور پرہیزگاری ○ فلاح اس نے پائی جس نے اس کو پاک کیا ○)

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ⑤ العلق

(پڑھ اور تیرا رب سب سے زیادہ صاحب کرم ہے ○ جس نے قلم سے علم سکھلایا ○ انسان کو وہ سب کچھ سکھلادیا جو کچھ وہ نہ جانتا تھا ○)

ان آیات سے یہ ظاہر ہے کہ نفسِ انسان میں رب کریم نے علم حقیقتِ اشیاء ودیعت فرمادیا ہے۔ تمام برائیوں اور بھلائیوں کا علم اس پر الہام کیا ہوا ہے مگر اس پر غفلت و لاشعوری کے حجاب ایسے پڑے ہوتے ہیں کہ اس میں سے کچھ بھی اس کے شعور میں نہیں آتا۔ رستگاری اس کو حاصل ہوگی جو اس نجاستِ لاشعوری سے پاک ہو جائے۔ اسی وقت پاکیزگی کی منزل کے مطابق الہام شدہ علم بھی شعور میں آئے گا۔ پس جب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ صاحبانِ شعور، حاملانِ علم پیدا ہوئے تو ان کی دعا کے مطابق ان کی اولاد میں بھی ایسے ہی صاحبانِ شعور اور حاملانِ علم پیدا ہونا لازم ہے خصوصاً وہ جس کو رسول بنایا جائے۔ اس کے لئے تو پاک و پاکیزہ صاحب و حامل علم پیدا ہونا لازمی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی نسل سے سوائے حضور

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور کوئی رسول پیدا نہیں ہوا اس لئے حضورؐ کا نجاست لاشعوری سے پاک حامل علم پیدا ہونا لازم ہے۔ اس کا اظہار ایام رضاعت میں ہی ہوگیا تھا کہ جب دائی حلیمہؓ نے اس مولود مسعود کو دودھ پلانا چاہا تو چونکہ ان کی دائیں چھاتی خشک تھی جس سے کبھی دودھ نہ نکلا تھا اور اپنے سب بچوں کو صرف بائیں چھاتی سے دودھ پلاتی رہی تھیں لہٰذا آنحضرتؐ کو بھی اسی چھاتی سے پلانا چاہا۔ مگر آنحضرتؐ داہنی چھاتی کی طرف بڑھے۔ جب چند مرتبہ ایسا ہی ہوا تو حلیمہؓ خاتون نے کہا "اچھا لو دیکھ لو اس میں دودھ ہے ہی نہیں"، اور اپنی داہنی چھاتی منہ میں دے دی۔ فوراً اس سے جوئے شیر جاری ہوگئی۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ۔

متشککین تو کہہ سکتے کہ یہ روایت مرسل یا ضعیف ہے مگر وہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے کیا کہیں گے جن کے لئے ان کے اپنے انگوٹھے سے ہی جوئے شیر جاری ہوگئی تھی۔ پس جب دادا کے لئے انگوٹھے سے دودھ جاری ہوا تو جس کو کہا گیا ہو "مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ" اس کے لئے خشک چھاتی سے دودھ جاری ہونے پر کیسے تشکک کیا جا سکتا ہے جب اس کے لئے حضرت ابراہیمؑ کی دعا بھی موجود ہو۔

ایک صاحب شعور کامل کے لئے تو ضروری ہے کہ اس کو یہ علم ہو کہ کیا نعمتیں بارگاہ احدیت سے اسے عطا فرمائی جائیں گی۔ اگر حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پرنور کے اندر قرآن کریم مخزون نہ ہوتا تو یہ آیات بے معنی ہو جاتیں:۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ القیمہ

(تم اس کے ساتھ اپنی زبان نہ ہلاؤ کہ (پڑھنے میں) جلدی کرو ۞ اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے ۞ پس جب ہم اسے پڑھ لیں تب اس کی متابعت کرو ۞ پھر اس کا واضح طور پر بتانا ہمارے ذمہ ہے ۞)

..... وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ..... ﴿۱۱۴﴾ طٰہٰ

(اور قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کرو قبل اسکے تمہاری طرف اس کی وحی نازل ہو چکے ۞)

اگر محبوب کردگار کے سینہ میں قرآن حکیم مخزون نہ ہوتا تو تکمیل وحی سے پہلے پڑھ سکنا کیسے ممکن تھا؟ قبل انقضاءِ وحی زبان ہلانے کی ممانعت اسی لئے کی گئی ہے کہ جو کچھ تکمیل وحی سے پہلے زبانِ مبارک پر جاری ہو جائے گا وہ حضورؐ کا کلام ہو جائے گا۔ لہٰذا تقدیس کلام کے لئے ضروری تھا کہ رب کا کلام سن لینے کے بعد اس کی قرأت فرمائیں۔

اس امر کے ثبوت کے لئے کہ تمام علم حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ پرنور میں مخزون تھا۔ صرف چند مثالیں ہی کافی ہیں۔ خدا کا بندہ اس کے اذن کے بغیر ایک حرف بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس کو لازم ہوتا ہے کہ بالکل عامۃ الناس کی طرح بشر بن کر زندگی گزارے چنانچہ حسبِ ضرورت ہی حضورؐ نے اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً علامہ شبلیؒ سیرت النبیؐ جلد اول صفحہ ۳۳۵ پہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"عمیر ابن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا۔ وہ اور صفوان بن امیہ حجر میں بیٹھے ہوئے مقتولینِ بدر کا ماتم کر رہے تھے۔ صفوان نے کہا خدا کی قسم اب جینے کا مزہ نہیں۔ عمیر نے کہا سچ کہتے ہو اگر مجھ پہ قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر آتا۔ میرا بیٹا بھی وہاں ہے۔ صفوان نے کہا تم قرض اور بچوں کی فکر نہ کرو ان کا میں ذمہ دار ہوں۔ عمیر نے گھر آ کر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے تیور دیکھ لئے۔ گلا دبائے آنحضرتؐ کی خدمت میں لائے آپ نے فرمایا عمرؓ اسے چھوڑ دو۔ عمیر قریب آ جاؤ۔ پوچھا۔ کس ارادے سے آئے ہو؟ جواب دیا، بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ فرمایا، تلوار کیوں حمائل کی ہے؟ عمیر نے کہا: آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں؟ فرمایا، کیا تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی؟ عمیر آنحضرتؐ کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔ بے اختیار ہو کر بولا: محمدؐ بیشک تم پیغمبر ہو۔ بخدا میرے اور صفوان کے سوا اس معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ قریش جو آنحضرتؐ کے قتل کی خبر کے منتظر تھے انھوں نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سنی۔ حضرت عمیر رضؓ مسلمان ہو کر بہادرانہ مکہ میں آئے جہاں کا ہر ذرہ اس وقت مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا۔ ان کو اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی

اسی شدت سے اب وہ دشمنانِ اسلام کے دشمن تھے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا اور ایک مجمع کثیر کو اس روشنی سے منور کر دیا۔"

قارئین کرام دیکھ لیں کہ اس خبر کے اظہار سے کیسا مفید نتیجہ برآمد ہوا۔ اگر حضورؐ کو اس کا یقین نہ ہوتا کہ عمیر اس خبر کو سن کر مسلمان ہو جائے گا تو ہرگز اس کا اظہار نہ فرماتے۔ انبیاء علیہم السّلام کو بغیر ضرورتِ ہدایت اپنے علم باطن کے اظہار کی جنابِ ربُّ العزّت کی طرف سے اجازت ہی نہیں ہوتی لہٰذا وہ ظاہر نہیں کرتے۔ اور یہی مکر ہے۔ اسی طرح کتاب سیر و تاریخ میں بہت سے مواقع کی مثالیں ملتی ہیں۔

مثلاً غزوہ موتہ: شرجیل حاکم بصرہ نے حارث بن عمر کو جو حضورؐ کے قاصد تھے اور حضورؐ کا خط لے کر اس کے پاس گئے قتل کر دیا تھا۔ سرکارِ دو عالم نے حارث بن عمر کے انتقام کے لئے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔ زید بن حارثہ کو جو حضورؐ کے آزاد کردہ غلام تھے سپہ سالاری عطا کی اور ارشاد فرمایا: اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر طیارؓ سردار ہوں۔ وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ سردار ہوں۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان اپنے میں سے کسی کو سردار بنالیں۔ چنانچہ یہ تینوں حضرات شہید ہوئے تو خالدؓ سردار بنے۔ اس موقع پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ وحی نازل ہوئی تھی؟ یہ خبر تو بغیر نزولِ وحی ہی دی گئی تھی۔

مولانا شبلی سیرت النبیؐ جلد اوّل صفحہ ۵۱۱ پر فتح مکہ کے بیان میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی تیاریاں کیں تو اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں۔ احتیاط کی گئی کہ اہلِ مکہ کو خبر نہ ہونے پائے حضرت حاطبؓ بن بلتعہ ایک معزز صحابی تھے انہوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آنحضرتؐ کو اس واقع کی اطلاع ہو گئی تو حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت ابو مرثدؓ غنوی کو بھیجا ... کہ قاصد سے خط چھین لائیں (صفحہ ۵۱۲)۔"

کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ اس کے متعلق وحی نازل ہوئی۔ دیگر روایات میں ہے کہ وہ ایک عورت تھی جو اپنے بالوں میں خط چھپائے ہوئے تھی۔ جب صحابہ کرام

اس کے پاس پہنچے تو تلاش کرنے سے خط نہ ملا۔ جب اس کو قتل کی دھمکی دی تو اس نے خط نکال کر دیا۔ یہ خط حضرت کے پاس پہنچا تو ممبر پر جا کر فرمایا تم میں سے ایک شخص نے مکہ والوں کو خط لکھا ہے اگر وہ اقرار کرے تو خیر ورنہ رسوا ہوگا۔ حاطبؓ بن بلتعہ اٹھے اور کہا میں نے لکھا ہے مگر خدا آگاہ ہے میں نے اسلام کے بعد نفاق اختیار نہیں کیا میرے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں ہیں اور ان کا کوئی وہاں حامی نہیں اس لئے میں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے بدلے میں قریش میرے اعزہ کو اذیت نہ پہنچائیں حضورؐ نے عذر قبول فرمایا اور توبہ کرائی۔

اسی واقعہ کے متعلق سورہ ممتحنہ کی آیات نازل ہوئیں۔ پہلی آیت یہ ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١﴾ الممتحنة

اے ایمان لانے والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کی طرف محبت سے پیغام بھیجتے ہو حالانکہ وہ اس کے منکر ہیں جو دین حق تمہارے پاس آیا۔ رسول کو اور تمہیں وطن سے نکالتے ہیں صرف اسی بات پر کہ تم اپنے رب پر ایمان لائے ہو۔ اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی طلب کرنے (اپنے وطن سے) نکلے ہو تو تم انہیں پوشیدہ پیغام دوستی کے بھیجتے ہو اور میں جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو کوئی تم میں سے یہ کام کرے وہ راہ راست سے بہک گیا ○ (اسی کے متعلق نو آیات نازل ہوئیں)۔

اسی کی مثل یہ واقعہ ہے کہ آخر ۶ھ ہجری جبکہ صلح حدیبیہ کے بعد کچھ سکون ہو گیا تھا اور قریش کے ہنگامے بند ہو گئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم، خسرو پرویز شہنشاہ عجم، نجاشی شاہ حبش، عزیز مصر اور سرداران عرب کے نام تبلیغی خطوط بھیجے۔ خسرو پرویز شاہ ایران کے نام جو خط تھا اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمدؐ اللہ کے رسول کی طرف سے کسریٰ رئیس کے نام۔

سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور گواہی دے اس کی کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں خدا کا رسول ہوں تمام لوگوں کی طرف تاکہ میں ڈراؤں (عذابِ خدا سے) ہر اس شخص کو جو زندہ ہو۔ اسلام قبول کر سلامت رہے گا۔ پس اگر انکار کرے گا تو مجوسیوں کا گناہ تیری گردن پر ہوگا۔

خسرو نے جب نامہ مبارک پڑھوایا تو یہ دیکھ کر کہ میرا نام لکھنے والے نے اپنے نام کے بعد لکھا ہے غصہ سے کانپنے لگا اور کہا کہ میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے اور نامہ مبارک کو چاک کر ڈالا اس وقت یمن بھی کسریٰ کے زیرِ نگین تھا اور باذان، خسرو کی طرف سے یمن کا گورنر تھا۔ خسرو نے اس کو فرمان بھیجا کہ حجاز میں جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اس کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیجدو۔ باذان نے اپنے دو فوجیوں کو حضرتؐ کی خدمت میں بھیجا۔ ان دونوں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا "شہنشاہِ عالم (خسرو) نے تم کو بلایا ہے اگر ہمارے ساتھ نہ جاؤ گے تو ہمارا شہنشاہ تمہارے شہر اور ملک کو برباد کر دے گا" حضورؐ نے فرمایا: "صبح میرے پاس آؤ" جب وہ صبح حاضر خدمت ہوئے تو ارشاد فرمایا: "جاؤ اپنے حاکم سے کہہ دینا کہ رات تمہارے شہنشاہ کو اس کے بیٹے نے ہلاک کر دیا اور اب اس کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔ یہ سن کر دونوں قاصد لوٹ گئے باذان چند دن منتظر رہا۔ آخر خبر آگئی کہ خسرو پرویز کے بیٹے نے اس کو قتل کر دیا۔ پس باذان اور بہت سے افراد مسلمان ہو گئے۔

اس واقعہ میں اس خبر کے ظاہر کرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس سے کچھ بندگانِ خدا راہ راست کی طرف ہدایت پانے والے تھے ورنہ ان کو یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ابھی کچھ عرصہ انتظار کرو یہاں تک کہ دوسرا حکم آجائے۔

غرضکہ ان امثال سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ خدا کے بندگانِ خاص ان عطیاتِ ربانی کو جو ان کے باطن میں مخزون ہوتے ہیں صرف ہدایتِ خلق کی ضرورت کے لئے ہی ظاہر کرتے ہیں ورنہ ہمیشہ ان کو پردہ اخفا میں رکھتے ہوئے یہی ظاہر کرتے رہتے ہیں کہ ہم بھی تم جیسے

معمولی انسان ہیں اور یہی مکر ہے۔

نورِ قدس کا ظہورِ مبارک

حضرت عبداللہ ذبیح اللہ کی نشانی، آمنہ بنت وہب کا جانی، علتِ وجود و بقاء عالم فانی، مسند نشین عالم جاودانی، منبع رحمتِ رحمانی، خلاقِ کائنات کی سب سے بڑی نشانی رسول و پیغمبر یزدانی کا نور روز دوشنبہ ۹ ربیع الاوّل بہ روایتے دیگر ۱۲ ربیع الاوّل سنہ عام الفیل ۲۰ یا ۲۲ اپریل ۵۷۱ء پردۂ غیب سے عالم شہود میں ظہور پذیر ہوا۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ صَلٰوۃً دَائِمَۃً مِنْ یَوْمِ الْوُجُوْدِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔

ہو سلام نام رسول پر جو حبیب ربّ علیٰ ہوا — خدا نہ اس کا شریک ہے، نہ خدا سے ہے وہ جدا ہوا
وہ احد جو لیس کمثلہٖ کفواً احد ہی ازل سے ہے — مگر ہے وہ اس کا حبیب ہی جو مثیل شانِ خدا ہوا
وہ عزیز ہے وہ حکیم ہے، وہ کریم ہے وہ رحیم ہے — وہ یا فصِ حق کی شمیم ہے، وہ ہی دردِ دل کی دوا ہوا
وہ قریب ہے، وہ بعید ہے، وہی تو ربّ مجید ہے — وہ ہر ایک خلق کے پاس ہے، نہ علیحدہ نہ ملا ہوا
وہ بشیر ہے، وہ نذیر ہے، وہ امیر ہے، وہ قدیر ہے — وہ ہی نصر وہ ہی نصیر ہے، وہ ہی رب کی حمد و ثنا ہوا

افسوس ہم تو اس قابل بھی نہیں کہ یہ بھی کہہ سکوں کہ میرے ماں باپ اس پر فدا ہو جائیں۔ بارگاہ قدس میں تو پاک پاکیزہ قربانی قبول ہوتی ہے۔ قربانی کا بے عیب ہونا لازم ہے مگر اس پر بھی صبر نہیں آتا کہ بارگاہ قدس میں نذرِ عقیدت پیش نہ کروں۔

پیدا ہوئے جو مصطفےٰ کرنے دلوں کو مطمئن — نکلیں شعاعیں نور کی پھیل گیا فضا میں دن
ہو گئے سرنگوں صنم، حل ہوئیں مشکلیں کٹھن — پڑھنے لگے ملائکہ اور تمام انس و جن
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ — صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
خلق وہ دہر میں ہوا، ہے جو حبیب کبریا — جس کا نہ مثل ہو سکے اور کبھی ہوا نہ تھا
دستِ خدا کا شاہکار خلق میں آج آ گیا — دل سے کہے ہر اک بشر خواہ جواں ہو یا مسن
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ — صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
حق کے نبی کی منزلت کون بھلا بتا سکے — اس کی وہ مرتبت جہاں وہم و گماں نہ جا سکے

عقل کی کیا مجال ہے کنہ کو اس کی پاسکے
وصف نہ اسکے گن سکیں چاہیں جو سارے انس و جن
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

ایسا کریم خلق کو جس نے کیا کرم عطا
اس کا غلام جو ہوا وہ بھی کریم بن گیا
اسکے جو تھے عدو چال ان پہ بھی لطف ہی کیا
کیوں نہ کہوں پھر اس کو میں اَرْحَمُ کُلِّ رَاحِمٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

عالم نور کی خبر اہل زمیں کو تھی کہاں
اس نے بتا دیا ہمیں عالم نور کا نشاں
چشم و قلوب کھول دیں نور خفی کیا عیاں
اب تو یہ حال ہوگیا آتی ہے مادہ سے گھن
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

پردۂ غیب میں چھپا روز ازل سے تھا جو نور
آج اسی کا دوستو خلق میں ہوگیا ظہور
بن گیا آمنہ کا گھر رشک فضائے کوہ طور
آگیا تہنیت لیے عُصْبَةٌ مِّنْ مَلَائِكٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

آگیا آج خلق میں حضرت آمنہؓ کا لال
جس نے دکھا دیا ہمیں شاہد غیب کا جمال
جس نے تمام خلق پر کھول دیا در وصال
شور ہے کائنات میں صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

آمنہ جی کے صحن میں نور خدا ہے ضو فشاں
بن گیا آج دہر میں خانہ برائے لامکاں
اس کا نشان آگیا جس کا نہیں کوئی نشاں
اَشْرَقَتِ الْفَضَاءُ فِيْ مَشْرِقٍ وَّمَغْرِبٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

آگیا آج آگیا فارقلیط آگیا
بن کے کرم کا ابر وہ سارے جہاں پہ چھا گیا
اس کے قدم جسے ملے وہ ہی خدا کو پا گیا
ہے وہی واسطہ بڑا اَوْصَلُ کُلِّ وَاصِلٍ

صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ روسا شہر شیر خوار بچوں کو قصبات و دیہات بھیج دیتے تھے تاکہ اچھی آب و ہوا میں پرورش پائیں اور فصیح زبان سیکھیں۔ سال میں دو مرتبہ

عورتیں دیہات سے شہر آیا کرتی تھیں تاکہ دودھ پلانے کے لئے بچے حاصل کریں اور ان کو پرورش کر کے اچھے انعامات حاصل کریں۔ حضورؐ کی ولادت سے کچھ روز بعد قبیلہ ہوازن کی عورتیں بچوں کی تلاش میں مکہ آئیں ان میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں۔ حضرت آمنہؓ نے سرکارِ دو عالم کو بی بی حلیمہ خاتون کے سپرد کر دیا۔ وہ آپ کو اپنے قبیلہ میں لے گئیں۔ ایام رضاعت کے بعد جب حضرت آمنہؓ کے پاس لائیں تو اس زمانے میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی لہٰذا حضرت آمنہؓ نے مزید عرصہ باہر رہنے کے لئے حلیمہ خاتون کو واپس کر دیا۔

اکثر کتب سیر میں ایک مہمل روایت وارد ہے کہ جب حضرتؐ چار سال کے ہوئے تو اپنے رضاعی بھائیوں کے ہمراہ بکریاں چرانے گئے ہوئے تھے کہ دو فرشتے آئے انہوں نے حضرتؐ کو لٹا کر پیٹ چاک کیا، قلب کو نکالا، اس سے سیاہ نقطہ علیحدہ کیا، قلب اور آنتوں کو دھویا پھر اندر رکھ کر بند کر دیا۔ آپ کے رضاعی بھائی دوڑے ہوئے گئے اور اپنی والدہ کو اس کی اطلاع دی۔ حلیمہ خاتون کو خوف پیدا ہوا کہیں کوئی اور واقعہ پیش نہ آئے لہٰذا آپ کو حضرت آمنہؓ کے پاس لائیں اور واقعہ شق صدر سے مطلع کیا۔ حضرت آمنہؓ نے کہا یہاں کی آب و ہوا ابھی انؐ کے موافق نہ ہوگی۔ اس لئے ان کو واپس ہی لے جاؤ۔

ایسی روایات نقل کرنے والوں پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ ان کی لغویت نہیں سمجھتے۔ تمام انبیاء کے حالات لکھتے ہیں کسی نبی کے لئے بھی شقِ صدر کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ نبی تو پاک و پاکیزہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کے شق صدر کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ ایسی بے شمار موضوعہ روایات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ افسوس تطہیر کتب کی طرف کسی غیرت مند صاحب نظر کی توجہ ہی نہیں ہوتی۔ گو کہ ان کو دیکھتے اور سنتے چودہ صدیوں سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ نبی معصوم پیدا ہوتا ہے۔ وہ بچپن میں بھی لہو و لعب میں مشغول نہیں ہوتا۔ علامہ شبلی سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۱۹۱ پر تحریر فرماتے ہیں: "یہ قطعاً ثابت ہے کہ آپ بچپن و شباب میں بھی جب کہ منصب پیغمبری سے ممتاز نہیں ہوئے تھے مراسم شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

"ایک دفعہ قریش نے آپ کے سامنے کھانا لاکر رکھا۔ یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا۔ جانور جو ذبح کیا گیا تھا وہ کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا۔ آپ نے کھانے سے انکار کیا۔"

اسی کتاب کے صفحہ ۱۹۹ پر ہے " عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا۔ راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام پر جمع ہوتے تھے۔ ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا داستان شروع کرتا تھا۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے رات رات بھر سنتے تھے۔ بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا دیکھنے کے لئے کھڑے ہوگئے وہیں نیند آگئی۔ اُٹھے تو صبح ہو چکی تھی۔

ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا۔ چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ ایسا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ توفیقِ الٰہی نے بچا لیا کہ تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے "۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معصوم تو لہو و لعب کا ارادہ ہی نہیں کر سکتا۔ کیا توفیقِ الٰہی ارادہ سے نہیں بچا سکتی تھی؟ صاحبانِ عقل و فکر سمجھ سکتے ہیں کہ عوام کے لئے عملی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انبیاء کرام پر مکر لازم ہے کہ ہر امر کے لئے مظاہرہ کر کے تعلیم دیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ارادہ ظاہر کر کے یہ مظاہرہ نہ دکھایا ہوتا تو آج ہم تک یہ ثبوت کیسے پہنچتا؟ یہ تو ایک مکر تھا۔

بعثت: روایات میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں ایک مراقبہ میں مصروف تھے کہ حضرت جبرئیلِ امین نازل ہوئے اور کہا " اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ① " حضرتؐ نے فرمایا میں تو پڑھا ہوا نہیں۔ تو انہوں نے اپنے پروں میں دبا لیا اور زور سے بھینچا۔ پھر کہا پڑھو! مگر آپؐ نے پھر یہی کہا۔ آخر تیسری مرتبہ حضرتؐ نے یہ آیت پڑھی۔

ان روایات پر سخت افسوس ہوتا ہے کہ حقائق کو مسخ کر کے قصے کہانیاں بنا دیا ہے۔ اگر روایت میں یہ ہوتا کہ جبرئیلِ امین نے لکھی ہوئی آیت پیش کی اور کہا پڑھو تب تو یہ جواب درست ہو سکتا تھا کہ میں تو پڑھا ہوا ہی نہیں کیسے پڑھوں؟ یہاں تو یہ کہا جا رہا ہے " اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا "۔ کیا اس فقرے کو دہرانے کے لئے یہ کہا جا رہا ہے کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں؟ خیر اسے نظر انداز کر کے اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

یہ امر بین المسلمین مسلمات سے ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی

جو غارِ حرا میں نازل ہوئی سورہ علق کی ابتدائی آیات ہیں:۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿۵﴾

(پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے (تمام کائنات) کو پیدا کیا○ اُس نے انسان کو جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے خلق کیا○ پڑھ۔ تیرا رب سب سے زیادہ کریم ہے○ جس نے قلم (نور) سے علم سکھایا○ سکھادیا انسان کو وہ سب کچھ جو کچھ بھی وہ نہ جانتا تھا○)

تمام روایات میں متفقہ بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا سے دولت کدہ پر تشریف لائے تو حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان فرمایا اور ارشاد کیا مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا آپ متردد نہ ہوں اللہ آپؐ کو نہ چھوڑے گا، وہ آپؐ کی حفاظت کرے گا۔ پھر آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو تورات وانجیل کے عالم تھے۔ ان سے تمام سرگزشت بیان کی تو انہوں نے فرمایا، یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہُوا تھا۔ آپؐ ہی وہ پیغمبر ہیں جس کی بشارت کتب سابقہ میں دی گئی ہے۔

تمام جن وانس اس کے قدموں پر قربان ہوں جس نے وہ بارِ گراں اُٹھایا جس سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں جس کے لئے خود ربّ العزت ارشاد فرماتا ہے "لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴿۲۱﴾ الحشر۔

(اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے اس کو کہ وہ خدا کے خوف سے لرز لرز کر ٹکڑے ہو جاتا)۔ پس عظمتِ الٰہی سے خوف ولرزہ طاری ہونا فطری امر ہے۔

ورقہ کے پاس جاتے ہیں تو خود نہیں فرماتے ہیں کہ میں پیغمبر ہوں بلکہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ وہ خود ہی شہادت دیتا ہے۔ یہیں سے ہدایت شروع ہو جاتی ہے کہ دیکھو حقیقت کی تصدیق اس طرح کرائی جاتی ہے اور یہی مکر ہے۔

یہاں مولانا شبلی کی سیرت النبی صفحہ ۲۰۵ سے کچھ نقل پیش قارئین ہے:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرضِ نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیشِ نظر تھیں۔ اگر آپ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام

کی طرح تبلیغِ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیم اللہ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی۔ لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغِ اسلام سے منور کرنا تھا۔ اس لئے نہایت تدبیر و تدریج سے کام لینا پڑا۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ پُرخطر راز سب سے پہلے کس کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اس غرض کے لئے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جاسکتے تھے جو فیضیاب صحبت رہ چکے تھے جن کو آپ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا۔ تجربوں کی بنا پر آپ کے صدق اور دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے۔ یہ لوگ حضرت خدیجہ رضؓ آپ کی حرم محترم تھیں، حضرت علیؓ تھے جو آپ کی آغوش میں پلے تھے۔ زیدؓ تھے جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور بندہ خاص تھے۔ حضرت ابوبکرؓ تھے جو برسوں سے فیضیاب خدمت تھے۔ سب سے پہلے آپ نے خدیجہؓ کو یہ پیغام سُنایا۔ وہ سُننے سے پہلے مومن تھیں۔ پھر اور بزرگوار کی باری آئی اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔"

غرضکہ تین سال تک خُفیہ تبلیغ جاری رہی۔ مولانا شبلی نے صفحہ ۲۰۶ پر بہت سے ایمان لانے والوں کے اسماء گرامی تحریر فرمائے ہیں۔ یہ بھی تحریر فرمایا ہے "لیکن جو کچھ ہوا وہ پوشیدہ طور پر ہوا۔ نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمانِ خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔"

قارئین کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا ضروری ہے کہ آخر اتنی رازداری کی کیا ضرورت تھی جس کو معیت اللہ حاصل ہو اس کو کسی اندیشہ کی کیا ضرورت ہے۔ جب یہ امر ذہن نشین ہو جائے کہ انبیائے کرام کا ہر فعل تعلیم و ہدایتِ خلق کے لئے ہوتا ہے اسی وقت ان کے افعال سے ہدایت پا سکتے ہیں سبق لینے والے ہی اس سے نصیحت حاصل کر سکتے ہیں کہ جب کسی امرِ حق کی ترویج کرنا ہو تو پہلے خُفیہ تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ نفسِ انسان کو اپنے تخیل کے وہ نقوش جو بچپن سے ذہن نشین ہو گئے ہوں بہت محبوب ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف وہ کچھ سُن ہی نہیں سکتا بلکہ وہ حق اور حق گو کا بھی دشمن ہو جاتا ہے اس لئے ابتدا میں خُفیہ تحریک سے اس کے مُعاون پیدا کرنے چاہئیں۔ یہی مکر یعنی تدبیرِ ہدایت ہے۔

تین سال کی تبلیغ کے بعد جب یہ آیت نازل ہوئی " وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء ۲۱۴) " (اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈراؤ) اس حکم کی تعمیل جس طرح کی گئی وہ مختلف روایات میں مذکور ہے۔

شعب ابیطالب میں محصور ہونا

علامہ شبلی لکھتے ہیں " قریش دیکھتے تھے کہ روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے اس لئے یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیں۔ چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ کوئی شخص نہ خاندانِ بنی ہاشم سے قرابت کرے گا نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا جب تک وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لئے حوالے نہ کر دیں۔ یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔ جناب ابو طالب تمام خاندان کو لے کر پہاڑ کے ایک درّے میں چلے گئے جو خاندانِ بنی ہاشم کا موروثی تھا۔ اس کو شعب ابیطالب کہتے تھے۔ تقریباً تین سال بنی ہاشم اس درّہ میں محصور رہے۔ اکثر درختوں کے پتّے کھاتے۔ جب بچّے بھوک سے روتے اور باہر آواز آتی تو قریش سُن کر خوش ہوتے۔ سال میں دو دفعہ رجب اور ذوالحجہ میں بنی ہاشم شعب سے باہر آتے اور کچھ خرید و فروخت کر کے پھر شعب میں چلے جاتے۔ اس مظلومیت نے دشمنوں کے پتھر کے دلوں کو بھی نرم کر دیا۔

مسلسل تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آلِ ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں۔ آخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود ان ہی کی طرف سے اس معاہدے کو توڑنے کی تحریک ہوئی۔ ہشام عامری بنی ہاشم کا قریبی رشتہ دار تھا اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا وہ چوری چھپے بنی ہاشم کو غلّہ بھیجتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ زبیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے گیا اور کہا، کیوں زبیر تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو اور ہر قسم کا لطف اُٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو؟ زبیر نے کہا کیا کروں تنہا ہوں۔ ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدے کو پھاڑ کر پھینک دوں۔ ہشام نے کہا کہ میں موجود ہوں۔ دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے۔

ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا۔ دوسرے دن سب مل کر حرم گئے۔ زبیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: اے اہلِ مکہ کیا یہ انصاف ہے کہ ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنوہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو۔ خدا کی قسم جب تک ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔ ابوجہل برابر سے بولا: ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے۔ غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی۔" (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۲۴۵ تا صفحہ ۲۴۷)

اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب زبیر نے حرم میں تقریر کی اور بعض مشرکین مخالفت کر رہے تھے کہ جناب ابوطالب آ پہنچے اور کہا کہ اے گروہ قریش محمدؐ نے مجھے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان کو اطلاع دی ہے کہ جو عہد نامہ تم نے لکھا تھا اس کو کیڑا کھا گیا سوائے اللہ کے نام کے اور کوئی مضمون اس میں باقی نہیں رہا۔ تم اپنے عہد نامے کو دیکھو اگر میرے بھتیجے کی خبر صحیح ہو تو جان لو کہ تم ہم لوگوں پر ظلم اور قطع رحم کر رہے ہو اور اگر ان کی خبر جھوٹ نکلے تو ہم جان جائیں گے کہ تم لوگ ہی حق پر ہو اور ہم لوگ باطل پر ہیں۔ یہ سنتے ہی سب کے سب کھڑے ہو گئے اور اس عہد نامے کو اتار کر لائے تو دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبر دی تھی وہ بالکل صحیح تھی۔ پس وہ عہد نامہ منسوخ ہو گیا۔ یہ اظہارِ حقیقت بغرض ہدایت کیا گیا جو مکر تھا۔

ہجرت:

"جب مسلمانوں پر قریش مکہ کے مظالم حد سے بڑھنے لگے تو آنحضرتؐ نے صحابہ کو اجازت دے دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ قریش کو معلوم ہوا تو انھوں نے روک ٹوک شروع کی لیکن چوری چھپے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے۔ جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے وہ مدت تک نہ جا سکے۔" (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۲۶۷)

قریش نے دیکھا کہ مسلمانوں کو مدینہ میں جائے پناہ مل گئی ہے اور اسلام صعب طرف

پھیلتا جاتا ہے مسلمانوں کی قوت برابر بڑھ رہی ہے تو دار الندوہ میں تمام سرداران قریش جمع ہوئے تاکہ اس کے انسداد کی تدبیر سوچیں۔ مختلف تجاویز ہوئیں۔ بالآخر ابو جہل نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر قبیلہ سے ایک آدمی انتخاب کرو اور ایک بنی ہاشم سے بھی لے لو اور وہ سب مل کر محمدؐ پر یکبارگی حملہ کر کے قتل کر دیں اس طرح ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا۔ اور بنی ہاشم سب کے مقابل خون کا مطالبہ نہ کر سکیں گے۔ اس پر سب کا اتفاق ہوا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں:۔

"آپؐ نے حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا: مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے۔ میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا۔ تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو۔ صبح کو سب کی امانتیں جا کر دے آنا۔ یہ سخت خطرے کا موقع تھا حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ علیہ وسلم کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتح خیبر کے لئے قتل گاہ فرش گل تھا۔" (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۲۷۰)

کفار محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ جب رات زیادہ گزری تو آنحضرتؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ" (۹) یٰسین (اور ہم نے ان کے آگے دیوار قرار دی اور ان کے پیچھے دیوار قرار دی اور اوپر سے پاٹ دیا پس وہ دیکھ نہیں سکتے) اور ایک مشتِ خاک کفار پر پھینکی تو ان پر نیند کا غلبہ ہو گیا آنکھیں بند ہو گئیں اور حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان سے نکل کر چلے گئے۔ راہ میں حسبِ قراردادِ سابقہ حضرت ابوبکرؓ بھی آ کر مل گئے اور دونوں غارِ ثور میں جا کر پوشیدہ ہو گئے۔"

ہر صاحب فہم سمجھ سکتا ہے کہ رسول کے اعمال اُمّت کی تعلیم کے لئے ہوتے ہیں۔ بھلا جو دشمنوں کے مجمع کے درمیان سے نکلا چلا جائے اسے غار میں جا کر پوشیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے افعال ہی کو مکر کہتے ہیں۔

قریش تمام رات محاصرہ کئے رہے صبح کو جب گھر میں داخل ہوئے تو آنحضرتؐ

کے فرش پر علی کرم اللہ وجہ کو دیکھا بہت برہم ہوئے اور کہا محمدؐ کہاں ہیں۔ علیؓ نے جواب دیا کیا تم آنحضرتؐ کو میرے سپرد کر گئے تھے جو مجھ سے پوچھتے ہو؟ اس پر یہ لوگ شرمندہ ہو گئے۔ شبلی لکھتے ہیں:۔ "ظالموں نے علیؑ کو پکڑا اور حرم لے گئے۔ کچھ دیر وہاں محبوس رکھا پھر چھوڑ دیا۔"

بعض روایتوں میں ہے کہ علی کرم اللہ وجہ نے تلوار کھینچ لی تو کفار کہنے لگے ہمیں تم سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم تو محمدؐ کو چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ لوگ حضرتؐ کی تلاش میں نکل گئے۔ قریش حضرتؐ کو تلاش کرتے رہے۔ آنحضرت تین روز غار میں مقیم رہے پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ شبلی تحریر فرماتے ہیں:۔

"قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمدؐ یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو ایک خونبہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم نے سُنا تو انعام کی اُمید میں نکلا۔ عین اس حالت میں کہ آپ روانہ ہو رہے تھے اس نے آپ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گر گیا۔ ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیئے کہ نہیں جواب میں نہیں نکلا لیکن سو اونٹوں کا گرانبہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھا۔ اب کے گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ گھوڑے سے اُتر پڑا اور پھر فال دیکھی اب بھی وہی جواب تھا لیکن مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ آنحضرتؐ کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سُنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا۔"

(سیرت النبی صفحہ ۲۷۳-۲۷۴)

قارئین کرام پر مذکورہ بالا واقعہ سے ظاہر ہو جائے گا کہ حضور کو بھلا غار میں چھپنے کی ایسی کیا ضرورت پیش آئی؟ اسی کو مکر کہتے ہیں۔

مشورہ: اکثر روایات میں وارد ہے کہ بہت سے مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا اور بعد مشورہ کسی ایک صحابی کی رائے کو پسند فرمایا۔ ظاہر بیں نگاہیں تو ظاہری روایت سے آگے نہ جائیں گی مگر ایک صاحب فہم مفکر سمجھ سکتا ہے کہ حامل وحی کو کسی سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ یہ تمام تو تعلیم اُمت کے لئے تھا نہ یہ کہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ کے محتاج تھے۔ یہی انبیاء علیہم السلام کا مکر ہوتا ہے۔ ایک صاحبِ معرفت ولی اللہ کو بھی کسی سے مشورہ کی احتیاج نہیں ہوتی تو پھر نبی کو لوگوں سے مشورہ کرنے کی ضرورت کیسے ہو سکتی ہے؟ ہادی دین کا ہر فعل اُمت کی تعلیم کے لئے ہوتا ہے۔

حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کو قیام گاہ بنانے کے فوراً ہی بعد قریش نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، مولانا شبلی لکھتے ہیں:-

"آنحضرتؐ اوّل جب مدینہ میں آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے۔ صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا۔ چنانچہ حضرت سعدؓ وقاص نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا تب آپ نے آرام فرمایا۔" (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۳۰۸)

لائق غور یہ امر ہے کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا خدا کی حفاظت پر بھروسہ نہ تھا جو پہرے لگانے کی ضرورت ہوتی تھی؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اُمت کی تعلیم کے لئے ہے نہ کہ آنحضرتؐ کو اس کی ضرورت تھی۔ سراقہ نے راہ میں حملہ کرنا چاہا تو کون سے پہرے لگے ہوئے تھے؟ اسی کو مکر کہتے ہیں۔

غزوہ بدر کبریٰ

"بدر ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے۔ یہ مقام اس نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ مدینہ منورہ سے تقریباً اسی (۸۰) میل

کے فاصلہ پر ہے جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں کہ قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ عبداللہ بن ابی کو انہوں نے خط لکھ کر بھیجا کہ یا محمدؐ کو قتل کر دو یا ہم آ کر اس کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں۔ کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آ کر غارت گری کر گیا تھا۔

حملہ کے لئے سب سے ضروری چیز مصارفِ جنگ کا بندوبست تھا اس لئے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہوا اس سروسامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی کل کی کل دے دی۔ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبار میں بہت کم حصہ لیتی ہیں ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا۔ قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آ گیا جس نے قریش کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا دیا۔ اسی اثناء میں یہ غلط خبر مکہ معظمہ میں پھیل گئی کہ مسلمان قافلے کو لوٹنے کے لئے آ رہے ہیں۔ قریش کے غیظ و غضب کا بادل بڑے زور و شور سے اٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا۔" (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۳۱۵-۳۱۶)

اس قافلہ کا نام لطیمہ تھا اور اس کا سردار ابو سفیان تھا۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے جو قرینِ قیاس بھی ہے کہ جب یہ تجارتی قافلہ شام سے روانہ ہوا تو راہ میں ابن حضرمی کے قتل اور اس کے قافلے کے لٹ جانے کی خبر پہنچی تو سردارِ قافلہ ابو سفیان کو یہ خوف لاحق ہوا کہ مسلمان اس قافلہ پر حملہ نہ کر دیں۔ چنانچہ اس نے ایک شخص ضمضم ابن عمرو خزاعی کو ایک تیز رفتار اونٹنی پر مکہ روانہ کر دیا تاکہ قریش کو اس خطرے سے آگاہ کر دے۔ ضمضم وارد مکہ ہوا تو فریاد بلند کی اے آلِ غالب لطیمہ! لطیمہ! قافلہ کی خبر لو۔ تم تو خبر نہیں لیتے اور محمدؐ اور نوجوانانِ یثرب تمہارے قافلہ کی تاک میں ہیں پس تمام سردارانِ قریش نے مال اور سامانِ حرب اکٹھا کیا اور بڑے تزک و احتشام سے لشکرِ جرار لے کر نکلے۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔۔۔ "مکہ معظمہ سے قریش بڑے ساز و سامان

کے ساتھ نکلے تھے۔ ہزار آدمیوں کی جمعیت تھی سو سواروں کا رسالہ تھا۔
رؤسائے قریش سب شریک تھے ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا اس لئے
اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا۔ رسد کا انتظام یہ تھا کہ امرائے
قریش یعنی عبّاس (بن عبدالمطلب) عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن
الحارث، ابوجہل اُمیہ وغیرہ باری باری ہر روز دس اونٹ ذبح کرتے اور
لوگوں کو کھلاتے تھے۔ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے بڑا رئیس تھا فوج کا
سپہ سالار تھا۔" (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۳۱۷ - ۳۱۸)

ادھر حضور سرکارِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اصحاب کو جمع کیا اور خبر دی کہ قریش کا قافلہ شام سے آرہا ہے۔ چاہیئے کہ اس وقت مدینہ سے نکلیں اور اس قافلہ کو گرفتار کرلیں! اللہ تعالیٰ نے مجھ سے حتمی وعدہ کیا ہے کہ دو گروہوں میں سے ایک پر مجھے فتح عنایت فرمائے گا تجارتی قافلہ پر یا اعیانِ قریش پر۔ چنانچہ آپؐ کُل ۳۱۲ اصحاب کو لے کر مدینہ سے باہر نکلے۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قریش کے لشکر کی مدینہ کی طرف روانگی کی خبر پہنچ چکی تھی اس کے بعد ہی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اصحاب سے جنگ کے لئے نکلنے کو تیاری کا حکم فرمایا تھا۔ مگر کلامِ پاک میں جنابِ باری تعالیٰ عزاسمہ ارشاد فرماتا ہے:-

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ الانفال

(اور جب خدا تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے لئے ہے (یعنی قریش کا قافلہ یا لشکرِ قریش) تم چاہتے ہو بے خرخشہ والا گروہ تم کو مل جائے (یعنی قافلہ) اور خدا چاہتا ہے کہ حق کو اپنے کلمات سے ثابت کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے ۝)

پس جب جنابِ باری عزاسمہ نے دو میں سے ایک کا وعدہ ظاہر فرمایا۔ اسی طرح اس کے حبیب کو بھی ظاہر کرنا ضروری تھا۔ یہ عین مطابقِ فطرت ہے کہ نفوسِ انسانی پر دفعتاً زیادہ بار نہیں ڈالنا چاہیئے اور یہی مکر ہے۔ بہرحال جب لشکرِ قریش کی آمد کی خبر ہوئی

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب سے مشورہ کیا۔ سب نے جاں نثاری کا اظہار کیا تو آپ نے دعا فرمائی کہ جناب رب العزت ان جانبازوں کو جزائے خیر عطا فرمائے جو بے سروسامانی کی حالت میں اسلام کی نصرت کے لئے کفار کے لشکر کثیر کے مقابل سینہ سپر ہوئے اور جناب ربُّ العزت نے انہیں فتح عظیم عطا فرمائی۔

غزوہ احد

اس جنگ میں لشکرِ اسلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت سے صف آرا کیا تھا کہ احد کی پہاڑی پُشت پر تھی۔ اس میں ایک درّہ تھا جہاں حضرت نے عبداللہ ابنِ جبیر کی قیادت میں پچاس تیر اندازوں کی ایک جماعت کو تعینات کیا تھا اس حکم کے ساتھ کہ کسی حالت میں بھی خواہ فتح ہو یا شکست اپنی اپنی جگہ نہیں چھوڑنا کیونکہ اس درّہ سے دشمن کے در آنے کا امکان تھا۔ غرض لڑائی شروع ہوئی اور پہلے ہی ٹکراؤ میں مسلمانوں کا حملہ اتنا زبردست تھا کہ کفارانِ قریش کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کا مالِ غنیمت اکھٹا کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر عبداللہ ابنِ جبیر کے ساتھیوں نے باوجود عبداللہ کے روکنے اور فرمانِ رسول یاد دلانے کے درّے کو چھوڑ دیا اور لوٹ میں شریک ہو گئے۔ صرف چند صحابی وہاں رہ گئے تو کفار نے جو درّے کے پیچھے گھات میں تھے حملہ کر دیا۔ مسلمان جو لوٹ میں مصروف تھے اس حملہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ستّر صحابی شہید ہوئے اور میدان میں صرف دس بارہ ہی رہ گئے جنھوں نے اس جانبازی سے باقی جنگ لڑی کہ ابوسفیان کو اندیشہ ہونے لگا کہیں پھر شکست نہ ہو جائے لہٰذا وہ اپنی فوجوں کو ہٹا لے گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور پیشانی مبارک پر بھی زخم آیا۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ جنگ بدر میں تو حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم قبل از جنگ اور دورانِ جنگ دعا و الحاح وزاری میں مصروف تھے اور بارگاہِ ربّ العزت سے فتح و کامرانی طلب فرماتے رہے مگر غزوہ احد میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فتح و نصرت کی دُعا فرمائی ہو؟ دُعا نہ فرمانا حالات کے پیشِ نظر ایک مکر تھا جس کے راز ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) پہلا تو یہ کہ مسلمانوں کے قلوب میں غنیمت کی حُبّ شدید راسخ تھی، ان کو عملی مظاہرے سے سبق دینا تھا کہ دیکھو مالِ غنیمت کی محبت اس دُنیاوی زندگی میں بھی کتنے سخت خسران کا باعث ہوتی ہے تاکہ ان کے دلوں میں بیٹھا ہوا یہ عقیدہ کہ مالِ غنیمت حاصل کرنا بڑا کارِ ثواب ہے کمزور پڑ جائے اور غنیمت پر ان کی حرص کم ہو جائے۔ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ مالِ غنیمت کی حرص دلوں میں ایسی شدید تھی کہ اس مظاہرے اور درسِ عبرت کے بعد بھی اکثر مسلمانوں کے قلوب سے نہ نکلی اور ۸ھ میں جنگِ حنین میں بھی یہی مسلمانوں کی شکست کا باعث ہوئی۔

(۲) دوسرا راز، جس کو جناب ربّ العزّت نے اپنے کلام پاک میں ظاہر فرمایا ہے یہ تھا کہ یہ مصیبت اس لیے آئی کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے شہدا چُن لے "لِیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُهَدَاءَ" (۱۴۰) العمران۔ جو پاک نفوس دَرجۂ شہادت کے شائق تھے ان کو یہ منصب عظیم عطا فرمایا جائے! اسی طرف قرآن پاک میں اشارہ ہے "لَقَدْ کُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ" (۱۴۳) العمران (تم پہلے ہی مَوت کی آرزو کرتے تھے ○)

(۳) تیسرا یہ کہ جناب ربّ العزّت نے مومنین کی صفت یہ بیان فرمائی ہے "اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا" (۱۹۵) العمران (ہماری راہ میں انہوں نے اذیت اُٹھائی اور قتال کیا اور قتل ہوئے ○) پس اگر احد میں مثلِ بدر فتح کامل حاصل ہو جاتی تو مسلمانوں کے دل میں یہ خیال راسخ ہو جاتا کہ جہاد میں ہم مشرکین کو قتل کرنے کے لئے جاتے ہیں نہ کہ قتل ہونے کے لئے! اور اعمال کی جزا نیت پر ہے۔ جو لوگ جہاد کے لئے اس نیت سے نکلیں کہ ان کو شہادت نصیب ہو ان کو اس نیت کا اجرِ عظیم ملے گا! اس ظاہری شکست سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کے بعد مجاہدین صرف قتل کرنے کی نیت سے نہ نکلتے تھے بلکہ راہِ خدا میں قربانی دینے کی نیت بھی ہوتی تھی جس سے اجرِ عظیم کے مستحق ہو جاتے تھے۔

"اس لڑائی سے پہلے حضرتِ عبّاس، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چچا، گو اسلام لا چکے تھے لیکن اب تک مکّہ ہی میں مقیم تھے! انہوں نے

تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجے اور قاصد کو تاکید کی کہ تین دن رات میں مدینہ پہنچ جائے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے پانچویں شوال ۳ھ کو دو خبر رساں جن کے نام انس اور مونس تھے خبر لانے کے لئے بھیجے۔ انھوں نے آکر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آگیا ہے اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا ہے"۔ (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۳۷۱)

خبر رساں ایجنسی کا استعمال محض تعلیم کے لئے اور مکر ہے۔ کیا آپؐ بذریعہ وحی مُطلع نہ ہو سکتے تھے؟

واقعہ افک

واقعہ افک یعنی حضرت عائشہؓ پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی وہ ایک لڑائی سے واپسی میں پیش آیا تھا! احادیث و سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا گیا ہے لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سُننے کے ساتھ لوگوں نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بالکل افترا ہے"۔ اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

البتہ اس واقعہ سے اندازہ کرنا چاہیے کہ محض جھوٹ اور بیہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی لیکن بعض مسلمان بھی دھوکے میں آگئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے"۔

(سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۴۱۸-۴۱۹)

احادیث و سیر کی کتب میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسولؐ خدا کا یہ قاعدہ تھا جب آپ کسی جنگ میں تشریف لے جاتے تو بیبیوں کے درمیان قرعہ ڈالتے اور جس کا نام نکلتا اس کو ساتھ لے جاتے۔ چنانچہ جنگ بنی مصطلق میں میرے نام قرعہ نکلا اور میں گئی۔ ادھر سے واپسی میں مدینہ کے قریب ایک منزل میں شب کے

وقت میں ایک عورت کے ساتھ رفع حاجت کے لئے گئی۔ جب اپنی جگہ پر آئی تو اپنے گلے کا ہار نہ پایا اور قافلہ کوچ پر تیار تھا۔ پھر اسی عورت کو ساتھ لے کر ہار ڈھونڈنے گئی اور وہ مل گیا مگر جب اپنی جگہ پر آئی تو قافلہ کوچ کرچکا تھا اور میرے اونٹ والے نے بھی میرے ہودج کو یہ خیال کر کے کہ میں اس کے اندر موجود ہوں اونٹ پر رکھ کر چل دیئے۔ ناچار میں وہیں بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں سو گئی۔ صفوان بن حنظلہ جو پیچھے رہ گیا تھا جب اس جگہ پہنچا تو مجھے اونٹ پر سوار کیا اور خود مہار کھینچتا ہوا قافلہ میں پہنچا تو عبداللہ ابن ابی وغیرہ صفوان کے ہمراہ دیکھ کر مجھ پر منہ آئے بہت سے لوگ اس کے ہمراہ ہو گئے اور مجھ پر تہمت لگائی یہاں تک کہ مدینہ پہنچی تو حضرت کی توجہ میری طرف باقی نہ رہی۔ اور میں ایک مہینہ تک بیمار رہی مگر آپ مجھے دیکھنے تک نہ آئے اور اندر آتے بھی تو دوسروں سے میرا حال پوچھ لیتے اور میں اس کی وجہ بالکل نہ سمجھی۔ آخر چند دن بعد جب میں مسطح کی ماں کے ساتھ رات کو رفع حاجت کے لئے نکلی تو اتفاقاً اس کا پاؤں پھسلا اور وہ مسطح کو برا بھلا کہنے لگی۔ میں نے منع کیا تو بولی تم کیا جانو اس نے تم پر ایسی تہمت لگائی ہے۔ مجھے یہ سن کر سخت رنج ہوا اور اس وقت حضرتؐ کی بے توجہی کی وجہ سمجھ میں آئی۔ غرضکہ میں ایک روز اجازت حاصل کر کے اپنے باپ کے گھر آئی اور اپنی نسبت لوگوں کے خیالات معلوم کئے تو پتہ چلا کہ لوگ مجھے ایسا ویسا کہتے ہیں۔ پھر تو مجھے سوائے رونے کے کچھ کام نہ تھا۔ کھانا پینا ترک ہو گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہؓ اور علیؓ سے مشورہ کیا تو اسامہؓ نے کہا میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ علیؓ نے کہا آپ رنج نہ کریں آپ کے واسطے ان کے سوا بہتیری عورتیں ہیں اور اگر اس عورت سے جو ساتھ تھی دریافت کریں تو تصدیق ہو جائے گی۔ غرض آپ نے بریرہ سے دریافت کیا۔ اس نے میری پاکدامنی کی گواہی دی اور میں نے حضرتؐ کے سامنے قسم کھائی کہ میں اس تہمت سے بری ہوں۔ اس کے بعد خدا نے میری عفت پر آیتیں نازل کیں۔ تب رسولؐ کو اطمینان ہوا۔ علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں:۔

"مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا جن کی تعداد چار سو بیان کی گئی ہے۔ یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے

خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خاندان و رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوادیں۔

ابن حجر نے اصابہ میں امّ جلاح کے حال میں لکھا ہے "وکانت محرش ازواج النبی صلّی اللہ علیہ وسلم (وہ ازواج مطہرات کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں) افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آچکی تھی۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم پندرہ دن تک حضرت عائشہؓ سے کبیدہ خاطر رہے۔ حضرت حسانؓ تک افک میں شریک ہوگئے تھے۔ آنحضرتؐ کی سالی حمنہ جو حضرت زینب کی بہن تھیں سازش میں آگئی تھیں۔ چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے قریبی عزیز مسطح کو جو شریک تہمت تھے مالی امداد سے محروم کردیا تھا۔ غرض کہ حضرت عائشہؓ کی برأت پر وحی نہ آجاتی تو ایک فتنہ عظیم برپا ہوچکا تھا۔" (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۵۵۷۔۵۵۸)

حضور سرور دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خاموشی۔ جنابِ امّ المومنین سے اظہارِ ناراضگی وغیرہ سب تعلیم و ہدایت کے لئے مکر ہے جس کا راز مندرجہ ذیل ہے:۔

نفسِ انسان کی فطرت کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ حواسِ خمسہ کے ذریعے اس پر گہرے نقوش صرف مظاہرے اور ہنگامے سے ہی بیٹھتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی نمائش یا میلہ میں جائیں کسی شخص کی شکل کا ایسا گہرا نقش ذہن میں نہ بیٹھے گا کہ اس کو پھر دیکھیں تو پہچان سکیں۔ البتہ اگر دو شخص لڑ رہے ہوں ایک نے دوسرے کو گرادیا، مار پٹائی ہورہی ہو تو اس ہنگامہ کے بعد جہاں بھی آپ ان کو دیکھیں گے پہچان لیں گے۔ لہٰذا ہادیانِ دین کو جب کسی اہم مسئلہ کا نفوسِ خلقت پر گہرا نقش بٹھانا ہوتا ہے تو بحکم خدا ایک ہنگامہ برپا کرکے ایسا کرتے ہیں۔

ہر مرد و زن کے نفس میں یہ عیب عام ہے کہ اگر کسی عورت کے چال چلن کے بارے میں کوئی خراب بات سنتے ہیں تو بلاتحقیق ایک دوسرے سے کہتے رہتے ہیں اور اس کا چرچا پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس سے باز رکھنے کے لئے ایسے ہی بڑے ہنگامے کی ضرورت تھی کہ وہ ایک قصہ بن کر زبان زدِ خلائق ہوجائے اور ہر زن و مرد آگاہ ہوجائے کہ یہ بہت بڑا جرم ہے۔ اس ہنگامہ کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ واقعہ آج تک زبان زد ہے۔ کس قدر افسوس و شرم کا

مقام ہے کہ ہم بدبختوں کی ہدایت کے لئے خدا کا محبوبؐ اپنی حرمت کی قربانی دے مگر ہم اس کو قصہ کہانی کی طرح سن لیں اور جس مقصد کے لئے وہ قربانی دی گئی ہے اس کو فراموش کردیں اور اب بھی ایسی گھناؤنی باتوں کا چرچا کرنے سے باز نہ آئیں۔

حضرت زینبؓ کا زید بن حارثہ کے ساتھ عقد

مختلف روایات کا ماحصل یہ ہے کہ جب حضور سرورِ عالم صلی علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے عقد کرلیا تو ایک روز بازار عکاظہ میں مالِ تجارت لے کر تشریف لے گئے۔ وہاں زید کو فروخت ہوتے ہوئے پایا تو اسے خرید لیا۔ زید تمام قریش میں آنحضرتؐ کا غلام مشہور ہوگیا۔ جب اس کے باپ حارثہ بن شراحیل کلبی کو زید کا حال معلوم ہوا تو مکہ میں جناب ابوطالب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ میرا بیٹا قیدی ہوگیا تھا اب مجھے خبر ملی ہے کہ وہ تمہارے بھتیجے کے پاس ہے، آپ اپنے بھتیجے سے کہیے کہ یا تو اسے میرے ہاتھ فروخت کردیں یا فدیہ لے لیں یا آزاد کردیں۔ جناب ابوطالب نے یہ سارا واقعہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا میں نے زید کو آزاد کیا جہاں چاہے چلا جائے۔ حارثہ اٹھا اور زید کا ہاتھ پکڑ کر کہا اے بیٹا اب میرے ساتھ چل اور اپنے حسب و نسب میں جا مل۔ زید نے جواب دیا میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔ اور ہرگز ان کے قدموں سے جدا نہ ہوں گا۔ حارثہ نے کہا، اے فرزند کیا تو اپنے خاندانی حسب و نسب کو چھوڑ کر قریشی کا غلام بننا گوارا کرتا ہے۔ زید نے جواب دیا کہ جب تک میں زندہ ہوں آنحضرتؐ کی خدمت سے کبھی الگ نہ ہوں گا۔ یہ سن کر ان کے باپ حارثہ کو سخت غصہ آیا اور کہا، اے گروہِ قریش گواہ رہنا کہ میں زید سے بیزار ہوں اور یہ اس وقت سے میرا بیٹا نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے قوم گواہ رہنا کہ زید آج سے میرا بیٹا ہے۔ آنحضرتؐ زید سے بے حد محبت رکھتے تھے اور ان کو پیار از زید فرمایا کرتے تھے۔ جب آنحضرتؐ مبعوث برسالت ہوئے تو حضرت خدیجہؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد تیسرے ایمان لانے والے زیدؓ تھے۔ جب آنحضرتؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی

تو اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ بنت جحش سے زید کا نکاح بھی کر دیا۔

آنحضرتؐ کا حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح ۵ھ

"اس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ نکاح ایک معمولی بات ہے اور اس کی تفصیل کا موقع ازواج مطہرات کا عنوان ہے۔ لیکن اس واقعہ میں ایسے حالات جمع ہو گئے جنھوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا۔ عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے اور آنحضرتؐ کی تنقیص و نکتہ چینی (عیاذ باللہ) کے لئے ان کے نزدیک اور کوئی واقعہ بکار آمد نہیں ہو سکتا۔

ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاق و عادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے اس کا اصلی مخرج کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے زید کو جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے متبنٰی بنا لیا تھا۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کی شادی زینبؓ سے کرنی چاہی جو آنحضرتؐ کی حقیقی پھوپھیری بہن تھیں۔ ان کی ماں امیمہ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے اس لئے زینبؓ کو یہ نسبت گوارا نہ تھی۔" (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۴۴۱)

قارئین کرام غور کریں کہ قریش کو اپنے نسب پر فخر تھا۔ وہ تمام قبائل عرب کو اپنے سے کم تر و حقیر سمجھتے تھے۔ پھر جنابہ زینبؓ ایک کم تر حیثیت قبیلہ کے شخص سے، اس پر مستزاد یہ کہ وہ غلام بھی رہ چکا تھا عقد کرنا کیسے قبول کر لیتیں۔ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مشن کے مقاصد میں سے ایک خاص امر نسبی غرور کا توڑنا اور مساوات قائم کرنا تھا۔ ہدایت پہلے گھر سے شروع ہوتی ہے محض کہنے سے کسی پر اثر نہیں ہوا کرتا اس کے لئے تو عمل کر کے دکھانا لازم ہے لہٰذا حضورؐ نے پہلے اپنی پھوپھی زاد بہن کو ہی زید سے عقد کرنے کی ترغیب دی۔ مگر وہ کراہت ہی کرتی رہیں۔ نسل در نسل توارث میں پائے ہوئے خیالات کا توڑنا آسان کام نہیں ہوتا۔۔۔ علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں:۔

"لیکن بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل ارشاد کے لحاظ سے (زینبؓ) راضی ہوگئیں۔ قریباً ایک سال تک حضرت زیدؓ کے نکاح میں رہیں لیکن دونوں میں ہمیشہ شکر رنجی رہتی تھی یہاں تک کہ زید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی اور ان کو طلاق دینا چاہا۔ (اس کے بعد فتح الباری تفسیر سورہ احزاب سے یہ عبارت نقل فرمائی ہے) :- جاء زید بن حارثہ فقال یا رسول اللہ ان زینب اشتد علی لسانها وانا ارید ان اطلقها۔ (زید آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ زینب مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں)۔

لیکن آنحضرتؐ ان کو بار بار سمجھاتے تھے کہ طلاق نہ دیں۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ ﴿۳۷﴾ الاحزاب

(اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے اور تم نے احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو نکاح میں لئے رہو اور خدا سے خوف کرو ○)

لیکن کسی طرح مطلب حاصل نہ ہوا اور آخر حضرت زید نے ان کو طلاق دے دی۔ حضرت زینبؓ آنحضرتؐ کی بہن تھیں اور آپ ہی کی تربیت میں پلی تھیں۔ آپ کے فرمانے سے انہوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا جو ان کے نزدیک ان کے خلافِ شان تھا۔ لیکن آنحضرتؐ جو مساوات اسلامی قائم کرنا چاہتے تھے اس میں آزاد و غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہرحال جب وہ مطلقہ ہوگئیں تو آپ نے ان کی دلجوئی کے لئے خود ان سے نکاح کرنا چاہا۔ لیکن عرب میں اس وقت تک متبنیٰ اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپ تامل فرماتے تھے لیکن چونکہ یہ محض جاہلیت کی رسم تھی اور اس کا مٹانا مقصود تھا اس لئے یہ آیت نازل ہوئی :

وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ..... ﴿۳۷﴾ الاحزاب

(اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جس کو خدا ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے

ڈرتے ہو۔ حالانکہ ڈرنا خدا سے چاہیے ○)

غرض آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کرلیا اور جاہلیت کی ایک قدیم رسم کہ متبنّیٰ اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے مٹ گئی۔ اس پر منافقوں اور بدگویوں نے طعنے دیئے لیکن اُمرِ حق کے اجراء میں مطاعن بننا لازمی ہے۔

واقعہ کی اصل اور سادہ حقیقت یہ تھی۔ مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے گو سرتا پا کذاب و افترا ہے لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے رنگ آرائی کے لئے مواد ہمارے ہی ہاں سے مستعار لیا ہے۔

"تاریخ طبری میں ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ سے ملنے ان کے گھر گئے۔ زیدؓ نہ تھے۔ حضرت زینبؓ کپڑے پہن رہی تھیں۔ اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ لیا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے " سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ سُبْحَانَ اللّٰہِ مُصَرِّفُ الْقُلُوْبِ" (پاک ہے خدائے برتر وہ خدا دلوں کو پھیر دیتا ہے)۔ حضرت زید کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ زینبؓ اگر آپ کو پسند آگئی ہوں تو میں ان کو طلاق دے دوں"۔ میں نے یہ بیہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کر کے نقل کی ہے۔ نقلِ کفر کفر نباشد۔ یہی روایت ہے جو عیسائی مورخوں کا مایۂ استناد ہے لیکن ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصولِ فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے۔ مورخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے جو مشہور کذاب و دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے"۔
(سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۴۴۱ تا ۴۴۴)

راویانِ بد باطن نے اس واقعہ کے روایت کرنے میں عجیب گل کھلائے ہیں اور اپنی خباثتِ باطنی کا اظہار کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک دن زیدؓ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے تو ان کا حال دریافت کرنے کے لئے آنحضرتؐ بنفسِ نفیس زید کے مکان پر تشریف لے گئے۔ حضرتؐ نے دروازے کے کواڑ کھولے۔ زینبؓ بہت حسین عورت تھیں وہ اپنے حجرے میں بیٹھی خوشبو پیس رہی تھیں۔ آنحضرتؐ کی نظر ان پر جا پڑی۔ پس آنحضرتؐ نے یہ دُعا پڑھی:

"سُبْحَانَ اللّٰهِ خَالِقَ النُّوْرِ وَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" (پاک و پاکیزہ ہے وہ خدا جس نے نور کو پیدا کیا اور بڑا برکت والا ہے وہ خدا جو سب بنانے والوں سے بہترین ہے)۔ پس آنحضرتؐ اُلٹے پاؤں اپنے بیت الشرف کی طرف واپس آگئے۔ جب زیدؓ اپنے مکان میں آئے تو زینبؓ نے جناب رسولؐ خدا کا تشریف لانا اور ارشاد فرمانا زیدؓ سے بیان کیا۔ زیدؓ نے کہا اے زینبؓ کیا تم چاہتی ہو کہ میں تم کو طلاق دے دوں تاکہ جناب رسولؐ خدا تم سے نکاح کر لیں۔ شاید آنحضرتؐ کے دل پر تمہارا اثر ہوگیا۔ زینبؓ نے کہا مجھے یہ ڈر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم مجھے طلاق دے دو اور پھر جناب رسولؐ خدا بھی مجھ سے نکاح نہ کریں۔ پس زیدؓ جناب رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسولؐ اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں مجھ سے زینبؓ نے ایسا ایسا بیان کیا ہے۔ اگر حضور کی مرضی ہو تو میں زینبؓ کو طلاق دے دوں، پھر آپ اس سے نکاح کر لیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ خدا سے ڈر۔ اپنے گھر کو جا اور زینبؓ کو اپنی زوجیت میں رہنے دے .....؛

اس واقعہ پر توضیحی نوٹ تو بعد میں پیش کیا جائے گا پہلے اس کے متعلق جو آیات کلام اللہ میں نازل ہوئی ہیں ان کو دیکھنا ضروری ہے:۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۳۷) مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا (۳۸) الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (۳۹) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۴۰) الاحزاب

(اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے اور تم نے احسان کیا تھا کہہ رہے تھے اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رکھو اور خدا سے ڈرو۔ تم اس بات کو دل میں چھپاتے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا

تھا۔ تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو پس جب زید اپنی حاجت پوری کر چکا (طلاق دے چکا) تو ہم نے اس کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ مومنوں کو اپنے لے پالک لڑکوں کی بیویوں سے (نکاح کرنے میں) حرج نہ ہو۔ جب کہ وہ ان سے (عورتوں) مطلب پورا کر لیں (طلاق دے دیں) اور خدا کا حکم تو پورا ہو گا ○ نبی پر کوئی حرج نہیں ہے اس میں جو اللہ نے اس پر ذمہ کر دیا یہی دستور اللہ کا ان لوگوں میں جاری رہا جو پہلے گزر چکے اور خدا کا حکم تو صحیح اندازے سے مقرر کیا ہوا ہوتا ہے ○ وہ جو خدا کا پیغام لوگوں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے سوائے اللہ کے اور حساب لینے کے لئے اللہ ہی کافی ہے ○ اور محمدؐ نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کو ختم کرنے والے۔ اور اللہ تو ہر چیز سے خوب واقف ہے ○)

توضیح:۔ بیہودہ روایات کے متعلق تو حضرت علامہ شبلی نے سیرت النبی جلد اوّل، صفحہ ۴۴۴ پر لکھ دیا ہے کہ یہ موضوع ہیں! اور اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے (واضعین کا) مقصد یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔ اس کے علاوہ حضرت علامہ نے صفحہ ۶۶ پر تحریر فرمایا ہے :۔

”فن تاریخ و روایات پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا۔ حدیثوں کی تدوین بنی اُمیّہ کے زمانہ میں ہوئی جنھوں نے پورے نوّے برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آل فاطمہ رضؓ کی توہین کی اور جمعہ میں برسرِ منبر حضرت علیؓ پر لعن کہلوایا۔ سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیش گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں۔ آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے اور بنو اُمیّہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے اسی مقام پر

نظر آتے ہیں جہاں ان کو ہونا چاہیئے تھا۔"

قارئین اگر غور کریں گے تو یہ راز منکشف ہو جائے گا کہ جب آلِ فاطمہؑ یعنی آلِ رسولؐ کی توہین کی جاتی تھی تو ان کی توہین کے لئے روایات وضع کروانا بھی لازمی تھا اور آلِ رسولؐ کی توہین کے ساتھ خود رسولؐ کی توہین آمیز روایات وضع کروائی گئیں۔ جب تدوین کتب شروع ہوئی تو لاکھوں موضوعہ روایات و احادیث کا انبار لگا ہوا تھا۔ سلاطین بنوامیہ جو خلیفہ رسولؐ کہلواتے تھے انہوں نے اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ایسی بیہودہ روایات وضع کروائیں۔ محدثین نے بہت سخت محنت و جانفشانی سے روایات کا انتخاب کیا مگر پھر بھی صحاح میں آج تک بکثرت موضوعات موجود ہیں۔ اگر قرآن اور عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو موضوعات ہی کی کثرت نظر آئے گی! اس کتاب کا چونکہ ان معاملات سے تعلق نہیں لہٰذا یہ بحث اس میں نہیں لکھی جا سکتی۔ قارئین میں سے جس کو اس بندۂ حقیر کے کلام میں شک ہو وہ صحیح بخاری شریف جلد چہارم میں "باب لعب المرء بامرتہ فی الصلوٰۃ" خود مطالعہ کرلیں! اس میں تمام احادیث خلافِ عقل و فطرت اور توہین رسولؐ پر دال ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہ رضؓ سے نقل کیا گیا ہے (تہمت لگائی گئی ہے) کہ "جب رسولؐ اللہ نماز پڑھتے ہوتے میں آگے لیٹی ہوتی۔ جب سجدے میں جاتے اور میں ٹانگیں نہ سکیڑتی تو گدگدیاں کر دیتے اور میں ایک دم ٹانگیں سکیڑ لیتی۔ جب سجدے سے اُٹھ جاتے تو میں پھر ٹانگیں پھیلا دیتی۔" اس باب میں تمام ایسی ہی احادیث ہیں۔

"قیاس کُن زگلستانِ من بہارِ مرا"

سورہ احزاب کی اِن آیات سے جن میں عقد زینبؓ کا ذکر ہے ہر مفکر پر آشکار ہو جائے گا کہ یہ تو ہدایتِ خلق کے لئے پہلے سے تجویز کردہ اسکیم تھی جو خریداریٔ زیدؓ سے ہی شروع ہوتی ہے گو سلسلۂ وحی اس وقت تک شروع نہیں ہوا تھا۔ مگر عقلِ فطری تو منزلِ کمال پر تھی۔ زیدؓ کو متبنّٰی کرنا بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ایک زید و زینبؓ کے ذریعے سے کتنے ہی اہم مسائل کی عملی تعلیم دی گئی ہے:۔

۱۔ عرب میں نسب کا غرور ہر فرد کے ذہن نشین تھا محض اقوال سے اس کو توڑنا ناممکن

تھا۔ اس کے لئے عملی مظاہرے کی ضرورت تھی۔

۲۔۔۔ غلام ہر چند کہ خاندان میں داخل ہو جاتے تھے مگر مساوات قائم نہیں ہوتی تھی۔ اسلام مساوات کا حکم دیتا ہے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ یہاں آزاد و غلام خدا کے سامنے برابر ہیں۔ اس کے لئے عملی مظاہرے کی ضرورت تھی۔

۳۔۔۔ زمانہ جاہلیت میں عرب کی ایک قدیم رسم تھی کہ منہ بولا بیٹا اصلی بیٹے کے حکم میں سمجھا جاتا تھا۔ اس رسم کو توڑنا ضروری تھا۔ صرف زبانی کہنے سننے سے تو کام نہیں چلتا۔ اس کے لئے عمل کر کے دکھانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ زبانی تو پہلے کہا جا چکا تھا۔ یہ آیت نازل ہو چکی تھی۔ اب اس پر عمل کر کے دکھانا لازمی تھا۔

جب حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے زینبؓ سے خواہش کی کہ وہ زید سے عقد کر لیں تو بھلا شرافتِ نسب کا غرور کیسے گوارا کرنے دیتا کہ غیر قریش اور آزاد کردہ غلام سے عقد کریں۔ یہ ذلت گوارا کرنا بہت مشکل تھا، ضرور ناگواری کا احساس ہوا اور اس نسبت کو پسند نہ کیا گیا۔ مگر بالآخر تعمیل امرِ رسولؐ کے لئے قبول کر لیا۔ زینبؓ تو زید کے ساتھ بیاہ کر لیتیں مگر خاندان کی عورتیں جو ذلیل نظر سے دیکھتیں اور طعنے دیتیں ان کی زبان کو کون روک سکتا تھا چنانچہ اس کی جھونجل زید پر ہی اُترتی تھی۔ اس طرح کب تک نباہ ہو سکتا۔ بالآخر زید نے طلاق دے دی۔

بعض نادان آیت کے اس جزو سے "وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ۖ" (۳۷) الاحزاب (یہ سمجھتے ہیں کہ رسولؐ اللہ لوگوں کے طعنوں سے ڈرتے تھے۔ ان کا یہ خیال باطل ہے اس لئے کہ صاحبانِ ایمان کی تعریف میں ارشاد ربّ العزت ہے: "لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ" (۵۴) المائدہ (حق کے معاملے میں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے)۔ پس جب غلامانِ رسولؐ حق کے معاملے میں کسی کی ملامت و طعن و تشنیع سے نہیں ڈرتے تو خود رسولؐ اس سے کیسے ڈر سکتے تھے۔۔۔؟ انبیاء و رسل کو تو صرف لوگوں کی گمراہی کا خوف ہوتا ہے۔ وہ تو جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے ہی کرتے ہیں۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ ظاہر فرما دیتے کہ یہ تو پہلے سے بنائی

ہوئی ائکیم کے مطابق ہو رہا ہے تو یقیناً بعض ضعیف الاعتقاد گمراہ ہو جاتے۔ لہٰذا ان آیات کے ذریعے واضح کر دیا گیا کہ یہ خدا کے حکم سے ہوا اس میں رسولؐ کی اپنی کوئی خواہش نہ تھی۔ پس انبیاء علیہم السّلام کے ایسے تمام کام مکر کہلاتے ہیں جن کو خدا اپنی پوشیدہ تدبیر فرماتا ہے۔

صلح حدیبیہ

علامہ شبلی رقمطراز ہیں:۔

"مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں۔ گاؤں بھی اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ چونکہ معاہدہ صلح یہیں لکھا گیا اس لئے اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔" (صفحہ ۴۴۷)

"عرب کے قبائل سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے..... تاہم چار مہینے تک جو شہر حرام کہلاتے تھے تمام لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں قبائل عرب دور دور سے سفر کر کے آتے اور اس قبلہ گاہ عالم میں (یعنی حرم کعبہ) عبادات اور عقیدت کے رسوم بجا لاتے تھے۔ وہ قبائل جن میں ایک دوسرے کا خون کا پیاسا ہوتا تھا اب یک جا نظر آتے تھے! ور شیر و شکر ہو کر ملتے گویا بھائی بھائی ہیں مسلمان بہ جبر مکہ سے نکالے گئے تھے لیکن یہ خیال ان کے دل سے نہیں گیا تھا نہ جا سکتا تھا کہ کعبہ پر ان کا بھی کم از کم اس قدر حق ہے جس قدر اور قبائل کا ہے۔" (صفحہ ۴۴۸)

تمام مہاجرین کو خصوصاً اور اکثر انصار کو خانہ کعبہ کی زیارت کا اشتیاق رہتا تھا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابؓ سے فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ اصحاب کے ساتھ مکہ گیا ہوں اور خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں۔ اصحابؓ نے سمجھا کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال ظاہر ہوگی۔ علامہ شبلی سیرت النبی میں لکھتے ہیں:

"چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے۔ چودہ سو اشخاص اس سفر میں ہمرکاب ہوئے۔ مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہو گئیں۔ یعنی

قربانی کے اونٹ ساتھ ساتھ تھے۔ ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگوا دیئے گئے۔ احتیاط کے لئے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا کہ قریش کے ارادے کی خبر لائے۔ جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا اس نے آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل عرب کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمدؐ مکہ میں کبھی نہیں آسکتے۔ غرض قریش نے بڑے زور شور سے مقابلہ کی تیاری کی۔ قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا وہ جمعیت لیکر آئے مکہ سے باہر بلدح ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں۔ خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے دوسو سوار لے کر، جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور عمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔" (صفحہ ۴۴۹)

"قبیلہ خزاعہ نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن اسلام کے حلیف اور رازدار تھے۔ اس قبیلے کے رئیس اعظم بدیل بن ورقہ تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرتؐ کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آرہا ہے۔ وہ آپؐ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قریش سے جا کر کہہ دو ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں لڑنا مقصود نہیں۔ جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک مدت معین کے لئے معاہدہ کرلیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی اگر وہ راضی نہیں تو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے۔" (صفحہ ۴۵۰)

غرضکہ بدیل پیغام لے کر گئے۔ ادھر سے عروہ بن مسعود ثقفی نے آکر حضورؐ سے گفتگو کی مگر کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس سے آگے علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔

"بالآخر آپ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کا انتخاب کیا۔ مگر انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے۔ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا وہ اپنے ایک عزیز ابان بن سعید کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا مگر عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا عثمانؓ کے

خون کا قصاص لینا فرض ہے یہ کہہ کر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہ نے جن میں مرد و زن شامل تھے ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخ اسلام کا مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے " (صفحہ ۴۵۳)

اس بیعت کے متعلق یہ آیات سورہ فتح کی نازل ہوئیں :۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ⑩ الفتح

(اور جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ تو خدا ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے پس جو توڑے گا وہ اپنے نفس کے نقصان کے لئے توڑے گا اور جس نے وہ بات پوری کی جس پر اس نے اللہ کے ساتھ عہد کیا تھا پس اللہ اس کو بہت بڑا اجر دے گا ○)

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ⑱ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ⑲ الفتح

(اللہ راضی ہو گیا مومنوں سے جب کہ بیعت کر رہے تھے تم سے درخت کے نیچے اور اللہ نے جان لیا جو ان کے دلوں میں تھا پس ان پر تسکین نازل کی اور پہنچا دیا ان کو بہت جلد قریب فتح کے ○ اور بہت مال غنیمت جو ان کو حاصل ہو گا۔ اللہ غالب اور حکمت والا ہے ○)

بیعت کے بعد معلوم ہو گیا کہ حضرت عثمانؓ کے متعلق جو خبر اڑائی گئی تھی وہ صحیح نہیں۔

حضرت علامہ شبلی رقمطراز ہیں :۔

" قریش نے سہیل بن عمر کو سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ چنانچہ لوگوں نے ان کو خطیب قریش کا خطاب دیا تھا۔ قریش نے ان سے کہہ دیا تھا کہ صلح اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں۔

سہیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک صلح کی شرائط پر گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر چند شرائط پر اتفاق ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو بُلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلمبند کریں حضرت علیؓ نے عنوان پر بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھا۔ عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوں کی ابتدا میں " بِاسۡمِكَ اللّٰھُمَّ " لکھتے تھے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ، سے وہ آشنا نہ تھے اس پر سہیل ابن عمر نے کہا کہ " بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ " کی بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں۔ آنحضرتؐ نے منظور فرمایا۔ آگے کا فقرہ تھا " ھٰذَا مَا قَضٰی عَلَیۡہِ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ " یعنی یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم کیا۔ سہیل نے کہا کہ اگر ہم آپ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا۔ آپ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گو تم تکذیب کرتے ہو لیکن خدا کی قسم میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ یہ کہہ کر آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو۔ حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرماں گزار ہو سکتا تھا لیکن عالمِ محبّت میں ایسے بھی مقام آجاتے ہیں جہاں فرمانبرداری سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا میں ہرگز آپ کا نام نہ مٹاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا اچھا مجھ کو دکھاؤ میرا نام کہاں ہے۔ حضرت علیؓ نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی۔ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ اسی بنا پر آپ کو اُمّی کہتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے لکھا ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر ابن عبداللہ لکھ دیا۔ شرائط صلح یہ تھے:۔

(۱) مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

(۲) اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

(۳) ہتھیار لگا کر نہ آئیں اور صرف تلوار ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں اور نیام جلباں میں (تھیلے وغیرہ میں)

(۴) مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں، اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

(۵) کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی

مسلمان مکّہ جائے تو واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۶) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں۔ اتفاق یہ کہ عین اس وقت جبکہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا سہیل کے صاحبزادے ابو جندل رضؓ جو اسلام لا چکے تھے اور مکّہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے۔ سہیل نے کہا محمد صلعم صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے۔ اس ابو جندل کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو۔ آنحضرتؐ نے کہا ابھی معاہدہ قلمبند نہیں ہو چکا۔ سہیل نے کہا تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں۔ آنحضرتؐ نے کہا ان کو یہیں رہنے دو سہیل نے نامنظور کیا آپؐ چند دفعہ اصرار کیا لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرنا پڑا۔ ابو جندل کو کافروں نے اس قدر مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے۔ مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا برادرانِ اسلام کیا مجھ کو پھر اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو۔ میں اسلام لا چکا ہوں کیا پھر مجھے کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو۔ تمام مسلمان تڑپ اٹھے حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے۔ آنحضرت صلعم کی خدمت میں آئے اور کہا یا رسول اللہ کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں ہوں! حضرت عمرؓ نے کہا، ہم کیا حق پر نہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا، ہاں ہم حق پر ہیں! حضرت عمرؓ نے کہا، ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ آپؐ نے فرمایا: میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کی نافرمانی نہیں کر سکتا! خدا میری مدد کرے گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا، لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے۔ حضرت عمرؓ اٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا وہ پیغمبر ہیں جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں۔

اس حالت کا گوارا کرنا گویا صحابہ کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا۔ ایک طرف ظاہر میں اسلام کی توہین، حضرت ابو جندل بیڑیاں پہنے چودہ سو جاں نثارانِ اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں۔ سب کے دل جوش سے لبریز ہیں اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذرا سا ایما ہو جائے تو تلوار فیصلہ قاطع کے لئے موجود ہے۔ دوسری طرف معاہدہ پر دستخط

ہو چکے ہیں اور ایفاء عہد کی ذمہ داری ہے رسول اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل کی طرف دیکھا اور فرمایا: "ابوجندل صبر و ضبط سے کام لو۔ خدا تمہارے لئے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح اَب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے"۔ غرض ابوجندل کو اسی طرح پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں۔ لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اُٹھا۔ یہاں تک کہ جیسا صحیح بخاری میں ہے تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہُوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور ام المومنین حضرت اُم سلمہ رضؓ سے شکایت کی! انھوں نے کہا آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اُتارنے کے لئے بال منڈوائیں۔ آپؐ نے باہر آکر قربانی کی اور بال منڈوائے اور جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اُتارا۔

صلح کے بعد تین دن تک آپؐ نے حدیبیہ میں قیام کیا پھر روانہ ہُوئے تو راستہ میں سورۃ اُتری "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝١" الفتح۔ (ہم نے تجھ کو کھُلی ہُوئی فتح عنایت کی)۔ تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے خدا نے اس کو فتح کہا آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ کو بُلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہُوئی ہے! انھوں نے تعجب سے پوچھا کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو تسکین ہو گئی اور مطمئن ہو گئے۔ نتائج مابعد نے اس راز سربستہ کی عقدہ کُشائی کی"۔ (سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۴۵۵ تا ۴۵۸)

پانچویں شرط کہ کافروں یا مُسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہّ جائے تو واپس نہ کیا جائے گا۔ گو ظاہراً اسلام کے لئے توہین آمیز تھی مگر یہی اسلام اور مسلمانوں کے لئے مُفید ہوئی اور کفّار کے لئے اتنی مُضر ثابت ہوئی کہ وہ بے حد پریشان ہو کر سال کے اندر ہی اندر اس کے منسوخ کرنے کی اِستدعا کرنے لگے۔

حضورؐ سرورِ دوعالم کا اصحابؓ کے سامنے خواب بیان فرمانا، حضرت عثمان رضؓ کے قتل کی خبر پر قصاص کے لئے بیعت لینا اور ظاہراً اہانت آمیز شرائط پر صلح کرنا یہ سب مکر تھا جس کے راز بیان کئے جا چکے ہیں۔

ردِّ سحر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَ مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ﴿۴﴾ وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾ الفلق

(اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے ○ کہو کہ پناہ مانگتا ہوں میں صبح کے رب سے ○ ان تمام چیزوں کے شر سے جو پیدا کیں ○ اور شر سے اندھیری رات کے جب کہ وہ چھا جائے ○ اور شر سے گرہوں میں پھونکنے والیوں کے ○ اور شر سے حاسد کے جبکہ وہ حسد کرے ○)

اکثر مفسرین نے اس سورہ کے شان نزول میں بیان کیا ہے کہ ایک یہودیہ نے آنحضرتؐ پر جادو کیا اور منتر پڑھ پڑھ کر بالوں میں گرہ لگائی اور ہر گرہ میں پھونکا۔ پھر گرہ لگائے ہوئے بالوں کو ایک خشک کنوئیں میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے۔ جناب باری تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے حبیب کو مطلع فرمایا تو حضورؐ نے اپنے بعض اصحاب کو اس کنوئیں کی نشاندہی فرما کر بھیجا کہ وہ گرہ لگے ہوئے بالوں کو نکال لائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ سورہ فلق نازل ہوا ہے اس کو پڑھ کر ان گرہوں پر دم کرو۔ چنانچہ تعمیل کی گئی اور سب گرہیں کھلتی چلی گئیں اور آنحضرتؐ کو مرض سے افاقہ ہو گیا۔

بعض علمائے نے اس واقعے سے صاف انکار کر دیا ہے کہ آنحضرتؐ پر سحر کا کوئی اثر ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب کلام اللہ کی تلاوت کرنے والے پر سحر کا اثر نہیں ہوتا۔ ایک علوی عامل پر کوئی جادو اثر نہیں کرتا تو پھر خدا کے رسولؐ پر جادو اثر کیسے کر سکتا ہے؟ اس سورہ کے نزول کا مقصد تو پیش بندی ہے تاکہ اس کی تلاوت کرنے والا اس سے محفوظ رہ سکے۔

یہ خیال ایک حد تک تو درست ہے مگر ان انکار کرنے والوں کا خیال اس طرف نہیں گیا کہ ہادی کو لازم ہے کہ وہ عملی تعلیم دے جس کے لئے مظاہرہ ضروری ہے۔ یہاں اُمت کو یہ دکھلانا بھی ضروری تھا کہ اس سحر سے مسحور پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری تھا

کہ وہ کیفیت بھی اپنے اُوپر طاری کر کے دِکھائیں تاکہ واقعہ قصّے کے طور پر عوام کے ذہن نشین ہو جائے۔ یہی مکر ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کرنے والوں پر یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ صفاتِ خدا اور تمام متعلقاتِ غیب جن الفاظ میں بیان کئے جائیں گے ان الفاظ کے ظاہری معنی مراد نہ ہوں گے بلکہ وہ تمام بیانات متشابہ ہوں گے اور ان پر بحث و مباحثہ کرنا گمراہی کی طرف لے جانے والا عمل ہوگا۔ انبیاء کی زندگی کے حالات کی حقیقت سمجھنا بہت دُشوار ہے۔ ان کو جنابِ ربّ العزّت کا حکم ہے کہ عوام جیسے بشر بن کر رہیں۔ اور اپنی روحانی قوّتوں کا اظہار نہ کریں جب تک کہ ہدایتِ خلق کے لئے ہی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے پاؤں پاؤں چلنے یا سواری پر سفر کرنے کی احتیاج نہیں ہوتی، وہ ارادہ کرتے ہی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔ مگر ان پر لازم ہے کہ عموماً اسباب مادّی ہی استعمال کریں۔ اس باعث ہادیانِ دین کی تمام زندگی اور ان کے تمام حرکات و سکنات متشابہ اور مکر ہوتے ہیں۔ ان کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔

اس کا دُوسرا پہلو یہ ہے کہ انبیائے کرام اس طرح زندگی گزار کر دکھاتے ہیں کہ انکی نقل کرنے والے تقربِ الٰہی حاصل کرنے میں ترقّی کر سکیں اور اُمّت پر ان کا اتباع لازم ہے۔ لہٰذا اتباع کے لئے وہی حالات محکم ہو جاتے ہیں۔ علوم ظاہری سے حقیقت تک پہنچنا بہت دُشوار ہے۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کیمیائے سعادت میں قریب قریب یہی مضمون تحریر فرمایا ہے:-

"بس یہی طریقہ ہے معرفتِ الٰہیہ حاصل کرنے کا۔ جب تک دل کو باہری دُنیا کے علوم سے پاک نہ کرے گا اس وقت تک یہ حجابات باقی رہیں گے۔ لیکن اس میں دُوسری بات بھی سمجھنے کے لائق ہے وہ یہ کہ اگر عالِم اپنے دل کو علومِ ظاہری میں مشغول نہ رکھے اور صرف معرفتِ خدا میں ہی اپنا علم صرف کرے تو یہ سب حجاب خود بخود اُٹھ جائیں گے۔ حجاب کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مثلاً کسی نے اہلِ سُنّت کے عقائد پڑھے اور سیکھے اور اس کے تمام دلائل و براہین بھی سمجھ لئے اور ان عقائد پر اتنا پختہ ہو گیا کہ دُوسرے عقائد اس کی نگاہ میں ہی نہ رہے۔ اور

اس کے بعد اگر کوئی بات اس کے دل میں پیدا ہو جائے تو اس کو وہ غلط ہی سمجھ لے اور طے کرلے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یا سُن رہا ہوں وہ بالکل غلط ہے تو وہ اپنے عقیدے پر اتنا راسخ ہو جائے گا کہ دوسری چیزیں اس پر اثر نہ کر سکیں گی۔ پس ناممکن ہے کہ ایسے آدمی کو کسی دُوسری بات کی کوئی حقیقت معلوم ہو چونکہ جو عقائد عوام کو پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں وہ حقیقت کا عکس ہیں۔

اصل معرفت تو اس کا نام ہے کہ وہ تمام حقائق اس طرح کشادہ ہو جائیں، جیسے ہڈی سے گوشت اور اسی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جو آدمی اپنے عقائد کے متعلق گفتگو کرنا یا مناظرہ مباحثہ کرنا سیکھتا ہے اس پر حقائق روشن نہیں ہوتے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اور جانتا ہوں صرف وہی درست ہے لیکن درحصل اس کا یہ یقین ہی اس کے حجاب کا باعث ہوتا ہے۔ اور چونکہ وہ آگے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا لہٰذا درجات معرفت سے محروم رہتا ہے۔ جو آدمی اس خیال کو چھوڑ دیتا ہے اس کا علم ان حجابات کی وجہ سے معرفت کے درجہ سے محروم نہیں ہوتا بلکہ اس کو کشف حاصل ہوتا ہے اور اس کے درجات میں کمال پیدا ہوتا ہے"۔ صفحہ ۷۰۔ اور صفحہ ۱۷ پر فرماتے ہیں " عام طور پر کیمیا کے متعلق سیکڑوں روایات مشہور ہیں اور کیمیا بنانے کے شوقین بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسے لوگ (یعنی کیمیا بنانے والے) کہیں شاذ ہی پائے جاتے ہیں اور بہت سے آدمی کیمیا کی تلاش میں صرف فریب ہی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پس اس طرح یہ ظاہری صوفیائے کرام ہیں جن میں باطنی معرفت لاپتہ ہے"۔ (اردو ترجمہ کیمیائے سعادت مصنفہ حضرت امام غزالیؒ (ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز)

حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بیان کہ علوم ظاہری سے حقائق کا پتہ نہیں چل سکتا۔ میرے خیال میں سورہ الرعد کی مندرجہ ذیل آیات کی تفسیر معلوم ہوتا ہے:۔

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ

جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ⑰ الرّعد

(اس نے آسمان سے پانی برسایا پس بہہ نکلے نالے اپنے اندازے سے پھر سیل نے پھولا ہُوا جھاگ اُوپر اُٹھالیا۔ اور ان چیزوں پر بھی جن کو گلاتے ہیں آگ میں زیور یا سامان بنانے کے لئے اسی طرح اس پر بھی جھاگ آجاتا ہے اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے غرضیکہ جھاگ تو رائیگاں (غائب) ہو جاتا ہے اور جو کچھ لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے وہ تو وہی (پانی) ہے جو زمین میں ٹھہرا رہتا ہے اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے ○)

اس آیہ وانی ہدایہ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علوم واعمال وافعالِ ظاہری حقیقت نہیں ہوتے۔ حقیقت وہی ہوتی ہے جو دل میں اُتر جائے اور حبُّ اللہ پیدا کردے۔

ان تمام بیانات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ہر مُسلمان کے لئے خواہ وہ کسی فرقے میں ہو یہ لازم ہے کہ بارگاہِ رب العزّت میں صدقِ دل سے دُعا کرتا رہے کہ وہ اپنے رحم وکرم سے اس کو حقیقت سے مطلع فرمائے اور اپنے سیدھے راستے پر چلائے۔ پس جو شخص خلوصِ دل سے خالص توجہ کے ساتھ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کا ورد کرتا رہے گا اس کے قلب پر رحمتِ ایزدی سے حقیقت القا ہوگی۔ پھر اس پر لازم ہوگا کہ اس کا اظہار کسی پر نہ کرے اور اس کو بطور راز سینے میں محفوظ رکھے۔ آیئے ہم سب مِل کر بارگاہِ احدیت میں بخلوصِ دل دُعا کریں:

اے رب الارباب، اے کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والے، اے ارحم الراحمین! اپنے عزّت وجلال کے صدقے، اپنے رحم وکرم کے صدقے، اپنی غفّاریت کے صدقے، اپنے تمام انبیاء ومُرسلین کے صدقے، اپنے محبوب ترین باعثِ ایجادِ خلق ختم المرسلینؐ کے صدقے، اپنے تمام اولیائے مقربین کے صدقے ہم کو اپنی سیدھی راہ دکھا اور اس پر چلنے کی توفیق بھی عطا فرماتے ہوئے نفس اور شیطان کے شر سے محفوظ رکھ اور تمام لغزشوں سے بچالے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّارْحَمْ مُحَمَّدًا وَّاٰلَ مُحَمَّدٍ كَاَفْضَلِ مَا صَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ وَتَرَحَّمْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

حرفِ آخر

یہ اَمر تو بالکل عیاں ہو گیا ہے کہ تمام عبادات نماز، روزہ، ذکر اللہ وغیرہ کا مقصد منتہی یہ ہے کہ ہم کو وجود باری کا یقین قلبی حاصل ہو جائے تاکہ ہم اس پر ایمان لاسکیں کہ کائنات کی ہر شے خالق کی ملک ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے۔ "لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" (جو کچھ زمین و آسمانوں میں ہے سب اسی کی ملک ہے) اور ہم کو یقین ہو جائے کہ جو کچھ مالِ دُنیا سے ہم کو عطا کیا گیا ہے وہ ہماری ملک نہیں ہے بلکہ ہم صرف امانت دار ہیں۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرمان سے ظاہر ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "الاَغنیاءُ خَزَنَۃُ اللهِ وَالْفُقَرَاءُ عَیَالُہٗ" (دولت مند اللہ کے خزانچی ہیں اور اہلِ حاجت اس کے عیال ہیں)۔ اب جبکہ مسلمانوں پر تمام دُنیا میں وبال آیا ہوا ہے، زمانہ مجبور کر رہا ہے کہ ہم قرنِ اوّل کے اسلام کی طرف لوٹیں اور خدا کے اس فرمان پر عامل ہوں "یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ" (اور دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان کے اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو)۔ اس ایثار و اخوت کا عملی مظاہرہ، انصار رضی اللہ عنہم نے دُنیا کو دکھلا دیا۔ ایسے ایثار مساوات و اخوت کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ اگر مسلمان اب بھی اُس اسلامِ اولیٰ کی طرف نہ لوٹیں گے تو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں گے!

بارگاہِ ربّ العزت سے ہر وقت استدعا کرتے رہنا چاہیئے کہ وہ ہم کو اس امر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! —— وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

خَادِمُ الْمُسْلِمِیْن

ابوالفارق واسطی

ابو الفارق واسطی کی مطبوعات

۱۔ تعلیم الاسلام

۲۔ جامع الانوار